فتاویٰ

اصحاب الحدیث

تالیف

فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

مکتبہ اسلامیہ

فتاویٰ

اصحاب الحدیث

تالیف

فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

مکتبہ اسلامیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب .... فتاوی اصحاب الحدیث

جلد .... سوم

تالیف .... فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

ناشر .... محمد سرور عاصم

کمپوزنگ/ڈیزائنگ .... مکتبہ اسلامیہ پرنٹرز

اشاعت .... فروری 2013ء

قیمت ....

المکتبۃ الرحمانیۃ

ج ماڈل ٹاؤن - لاہور

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 37244973-042 فیکس: 37232369-042

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد-پاکستان فون: 2631204, 2034256-041

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست

مضامین	نمبر شمار

مُقَدِّمَۃ

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین محمد وآلہ واصحابہ اجمعین ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین۔

دینِ اسلام میں منصب افتاء ایک انتہائی اہم عہدہ ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت خود اپنی طرف کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَسْتَفْتُونَكَ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۚ ﴾ [1]

''اے پیغمبر! لوگ تم سے (کلالہ کے متعلق) فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ فرما دیں کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مایہ ناز اور بلند پایہ تصنیف کا نام ''اعلام الموقعین عن رب العالمین'' رکھا ہے یعنی مفتی حضرات سے جب دینی مسائل دریافت کیے جاتے ہیں تو ان کا جواب دیتے وقت گویا وہ اللہ رب العزت کی طرف سے دستخط کرتے ہیں، علامہ موصوف لکھتے ہیں:

''جب ملوک وسلاطین کی طرف سے دستخط کرنے کا منصب اس قدر بلند ہے کہ دنیا میں اسے اعلیٰ مرتبہ شمار کیا جاتا ہے اور اس کی قدر ومنزلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تو اللہ کی طرف سے دستخط کرنے کی عظمت وشان تو اس سے کہیں زیادہ بلند اور برتر ہے۔'' [2]

چونکہ فتویٰ کا موضوع اللہ کی طرف سے نازل شدہ احکام بیان کرنا ہے، تاکہ لوگ ان کے مطابق عمل کر سکیں، اس لیے مفتی کو اللہ تعالیٰ کا ترجمان قرار دیا جاتا ہے۔

اسی طرح مفتی کسی خاص امام کا نمائندہ نہیں بلکہ وہ امام المتقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''مفتی امت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام ہوتا ہے، کیونکہ علماء حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں اور انبیاء علیہم السلام اپنے ترکہ میں درہم ودینار نہیں بلکہ بطور وراثت علم چھوڑتے ہیں۔'' [3]

منصب افتاء کی ذمہ داری اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی

---

[1] ٤/النساء: ١٧٦۔ [2] اعلام الموقعین، ص: ١٠، ج١۔ [3] الموافقات، ص: ٢٤٤، ج١۔

طرف سے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ وحی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور اگر کسی سوال کا جواب دینے کے لیے آپ کے پاس وحی کا علم نہ ہوتا تو خاموش رہتے اور اللہ کی وحی کا انتظار کرتے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ سے جب کسی چیز کے متعلق سوال کیا جاتا جس کے بارے میں وحی نہ اتری ہوتی تو آپ فرماتے: ''میں نہیں جانتا'' یا وحی اترنے تک خاموش رہتے اور کچھ جواب نہ دیتے اور آپ نے کوئی مسئلہ اپنی رائے یا قیاس سے نہیں بتایا، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ نے آپ کو شناسا کیا ہے۔'' [1]

پھر امام بخاری رحمۃ اللہ نے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے روح کے متعلق سوال ہوا تو آپ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا حتی کہ روح کے بارے میں وہ آیت (۸۵) اتری جو سورۃ الاسراء میں ہے۔ [2]

اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ نے اپنے مدعا کو مزید مضبوط کرنے کے لیے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ پیش کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بیمار ہوا تو رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ میری تیمارداری کے لیے تشریف لائے، یہ دونوں بزرگ پیدل چل کر آئے تھے، جب یہ حضرات میرے پاس آئے تو مجھے غشی کا دورہ پڑا تھا، رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا، پھر وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا، اس سے مجھے کچھ افاقہ ہوا تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اپنے مال کے متعلق کس طرح فیصلہ کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا تاآنکہ میراث سے متعلق آیت نازل ہوئی۔ [3]

امام بخاری رحمۃ اللہ کی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جاتا جس کے متعلق کوئی وحی نہ اتری ہوتی تو آپ کی دو حالتیں ہوتیں، آپ خاموش رہتے یا فرماتے مجھے اس کا علم نہیں ہے، عقل و قیاس سے جواب نہ دیتے تھے، جب وحی آتی تو جواب دیتے، بہرحال رسول اللہ ﷺ وحی کے بغیر دینی مسائل کا جواب نہیں دیتے تھے، امام بخاری رحمۃ اللہ نے اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے خاموش رہنے کی مثال تو بیان کر دی لیکن لاادری کہنے کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا، دراصل آپ نے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کرۂ ارض میں کون سا خطہ بہتر اور کون سا بدتر ہے، تو آپ نے فرمایا: ''میں نہیں جانتا ہوں، فرشتہ وحی سے معلوم کر کے بتاؤں گا۔'' چنانچہ فرشتہ وحی لے کر نازل ہوا تو آپ نے سائل کو جواب دیا: ''بہترین خطہ اللہ کی مساجد اور بدترین مقام بازار ہیں۔'' [4]

شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سوالات کا جواب دینے میں لوگوں کی تین اقسام حسب ذیل ہیں:

---

[1] ٤/النساء: ١٠٥؛ صحیح بخاری، الاعتصام، باب نمبر ٨۔ [2] صحیح بخاری، التفسیر: ٤٧٢١۔
[3] صحیح بخاری، الاعتصام: ٧٣٠٩۔ [4] مستدرك حاكم، ص: ٧، ج ٢۔

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے پاکی حاصل کرو۔'' اس نے پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اس کے ساتھ پاکی کیسے حاصل کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے پاکی حاصل کر۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی منشا کو معلوم کر لیا، چنانچہ میں نے اس عورت کو اپنی طرف کھینچ کر اسے طریقہ سکھا دیا۔ [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل و بصیرت سے رسول اللہ ﷺ کی غرض کو سمجھ گئیں کہ اس سے مراد اسے اپنے بدن پر پھیر کر اس سے پاکی حاصل کرنا ہے، چنانچہ دوسری حدیث میں اس کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حیا کی وجہ سے منہ دوسری طرف کر لیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ مشک لگا ہوا روئی کا ٹکڑا لے کر جہاں جہاں خون کے نشانات ہیں وہاں لگا دو تاکہ ناگواری کے اثرات ختم ہو جائیں۔ [2]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

سوال کرنے والی عورت کو اس بات کا علم نہ تھا کہ خون کے نشانات پر خوشبودار روئی کا ٹکڑا پھیرنا وضو کہلاتا ہے، جبکہ اس کے ساتھ خون اور ناگواری کا ذکر ہو، رسول اللہ ﷺ نے اپنی طبعی حیا داری کی وجہ سے صراحت نہ کی، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی عقل و بصیرت کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی مراد کو سمجھ لیا اور اسے بتا دیا، رسول اللہ ﷺ نے اپنی خاموشی سے اس کی تائید بھی کر دی، اس قسم کی راہنمائی کو دلالتِ عقلیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [3]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان میں دلالت کے معنی اور اس کی تفسیر کا بھی ذکر کیا تھا، تفسیر کا معنی یہ ہے کہ مکلف و مأمور کو جو حکم دیا گیا ہے اس کی تشریح اس طرح کر دی جائے کہ مامور اس پر عمل کر سکے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے درج بالا حدیث میں لفظ ''توضیٔ'' کی وضاحت کی ہے، دراصل امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اس عنوان اور پیش کردہ احادیث سے یہ مقصود ہے کہ قرآن و حدیث کی نصوص سے احکام معلوم کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں، محدثین کرام نے عام طور پر چار طریقوں کی نشاندہی کی ہے جو حسب ذیل ہے:

☆ نص کی عبارت ہی کسی حکم کو بیان کرتی ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ﴾ [4]

''جھوٹی گواہی سے اجتناب کرو۔''

اس نص کی عبارت سے ہی پتہ چلتا ہے کہ جھوٹی گواہی دینا حرام ہے۔ اسے عبارۃ النص کہتے ہیں۔

☆ نص کے الفاظ میں کسی دوسرے حکم کا اشارہ ملتا ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ [5]

''آپ ان سے مشورہ کریں۔''

اس نص کی عبارت میں اشارہ ہے کہ امتِ مسلمہ میں مجلس مشاورت ہونی چاہیے جس سے اہم معاملات میں مشورہ کیا جا سکے

---

[1] صحیح بخاری، الاعتصام: ۷۳۵۷۔ [2] صحیح بخاری، الحیض: ۳۱۴۔ [3] فتح الباری، ص: ۴۰۵، ج۱۳۔
[4] ۲۲/الحج: ۳۰۔ [5] ۳/آل عمران: ۱۵۹۔

اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اس سے پاکی حاصل کرو۔‘‘ اس نے پھر عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس کے ساتھ پاکی کیسے حاصل کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اس سے پاکی حاصل کر۔‘‘ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی منشا کو معلوم کرلیا، چنانچہ میں نے اس عورت کو اپنی طرف کھینچ کر اسے طریقہ سکھادیا۔ [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل وبصیرت سے رسول اللہ ﷺ کی غرض کو سمجھ گئیں کہ اس سے مراد اسے اپنے بدن پر پھیر کر اس سے پاکی حاصل کرنا ہے، چنانچہ دوسری حدیث میں اس کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حیا کی وجہ سے منہ دوسری طرف کرلیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ مشک لگا ہوا روئی کا ٹکڑا لے کر جہاں جہاں خون کے نشانات ہیں وہاں لگادو تاکہ ناگواری کے اثرات ختم ہوجائیں۔ [2]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> سوال کرنے والی عورت کو اس بات کا علم نہ تھا کہ خون کے نشانات پر خوشبودار روئی کا ٹکڑا پھیرنا وضو کہلاتا ہے، جبکہ اس کے ساتھ خون اور ناگواری کا ذکر ہو، رسول اللہ ﷺ نے اپنی طبعی حیاداری کی وجہ سے صراحت نہ کی، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی عقل وبصیرت کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی مراد کو سمجھ لیا اور اسے بتادیا، رسول اللہ ﷺ نے اپنی خاموشی سے اس کی تائید بھی کردی، اس قسم کی راہنمائی کو دلالتِ عقلیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [3]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان میں دلالت کے معنی اور اس کی تفسیر کا بھی ذکر کیا تھا، تفسیر کا معنی یہ ہے کہ مکلف و مأمور کو جو حکم دیا گیا ہے اس کی تشریح اس طرح کردی جائے کہ مامور اس پر عمل کرسکے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے درج بالا حدیث میں لفظ ’’توضئ‘‘ کی وضاحت کی ہے، دراصل امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اس عنوان اور پیش کردہ احادیث سے یہ مقصود ہے کہ قرآن وحدیث کی نصوص سے احکام معلوم کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں، محدثین کرام نے عام طور پر چار طریقوں کی نشاندہی کی ہے جو حسب ذیل ہے:

☆ نص کی عبارت ہی کسی حکم کو بیان کرتی ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ [4]

’’جھوٹی گواہی سے اجتناب کرو۔‘‘

اس نص کی عبارت سے ہی پتہ چلتا ہے کہ جھوٹی گواہی دینا حرام ہے۔ اسے عبارۃ النص کہتے ہیں۔

☆ نص کے الفاظ میں کسی دوسرے حکم کا اشارہ ملتا ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ﴾ [5]

’’آپ ان سے مشورہ کریں۔‘‘

اس نص کی عبارت میں اشارہ ہے کہ امتِ مسلمہ میں مجلس مشاورت ہونی چاہیے جس سے اہم معاملات میں مشورہ کیا جاسکے

---

[1] صحیح بخاری، الاعتصام: ۷۳۵۷۔ [2] صحیح بخاری، الحیض: ۳۱۴۔ [3] فتح الباری، ص: ۴۰۵، ج۱۳۔
[4] ۲۲/الحج: ۳۰۔ [5] ۳/آل عمران: ۱۵۹۔

کتاب وسنت ہی دو ایسی چیزیں ہیں جن کا کوئی متبادل نہیں اور نہ ہی ان کی تازگی میں فرق آ سکتا ہے، ہمارے نزدیک جس طرح اللہ کی کتاب قرآن مجید کی بنیاد وحی ہے اسی طرح حدیث رسول اللہ ﷺ بھی اللہ کی وحی ہے، ان میں سے کسی ایک کا انکار کفر بواح ہے۔

☆ **منہج فتویٰ:** منہج فتویٰ سے مراد وہ انداز اور طریقہ ہے جو فتویٰ دیتے وقت اختیار کیا جاتا ہے جس کی وضاحت ہم سابقہ صفحات میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے کر آئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بھی فتویٰ دیتے وقت اپنی ذاتی رائے کو استعمال نہ کرتے بلکہ خاموش رہتے اور وحی الٰہی کا انتظار کرتے، اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ مفتی فتویٰ دیتے وقت فہم سلف کو ضرور پیش نظر رکھے اور سبیل المؤمنین کو نظر انداز نہ کرے اسے عقل وقیاس کی خاردار وادیوں میں مارا مارا پھرنے کی قطعاً اجازت نہیں بلکہ اسے قرآنی احکام پر پورا پورا عبور ہونا چاہیے اور ذخیرہ احادیث پر بھی اس کی گہری اور وسیع نظر ہو، علاوہ ازیں اسے مجتہدانہ بصیرت سے بھی مالا مال ہونا چاہیے تاکہ ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل قرآن وحدیث اور اس کے اشباہ ونظائر کے مطابق پیش کر سکے وہ کسی بھی حالت میں ان حقائق سے صرف نظر کر کے محض اقوال ائمہ اور آراء رجال کی روشنی میں فتویٰ نہ دے۔

ہم نے اپنے فتاویٰ ''اصحاب الحدیث'' میں اسی اسلوب کو اختیار کیا ہے اور اپنے فتاویٰ کی بنیاد قیل وقال اور آراء رجال پر رکھنے کے بجائے ہمیشہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو مرکز ومحور قرار دیا ہے، اس کے علاوہ ہم نے صحابہ کرام اور اسلاف امت کے فتاویٰ کو بھی نظر انداز نہیں کیا، دعا ہے کہ آئندہ بھی اللہ تعالیٰ ہمیں یہی انداز واسلوب اختیار کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

قارئین کرام! فتاویٰ اصحاب الحدیث کی تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ دراصل ہفت روزہ اہل حدیث (سال ۲۰۰۸ تا سال ۲۰۱۰) میں شائع ہونے والے فتاواجات کا مجموعہ ہے جسے جدید فقہی ترتیب سے شائع کیا جا رہا ہے، اس جلد میں دور حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر کچھ تبدیلیاں نظر آئیں گی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ ترجمہ کے ساتھ قرآنی آیات کا عربی متن لگا دیا گیا ہے۔

☆ تمام آیات واحادیث کے حوالے متن کے نیچے حاشیہ میں کر دیئے گئے ہیں۔

☆ ہر سوال پر ایک مختصر مگر جامع عنوان قائم کیا گیا ہے تاکہ سوال کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔ عنوان بندی میں برادر صغیر حافظ عبدالغفار السہیل اور دختر م عزیزہ حامدہ حماد نے میرے ساتھ خوب خوب تعاون کیا ہے، بلکہ تمام عنوانات ان کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنے ہاں اجر جزیل عطا فرمائے۔

دراصل اس جلد کی جمع وترتیب کے دوران غموم وہموم کا ہجوم دامنگیر رہا، پہلے والد گرامی ہم سے جدا ہوئے، پھر ۱۸ اگست ۲۰۱۰ میں عزیزہ اہلیہ نے داغ مفارقت دیا، اس کے بعد چھوٹی ہمشیرہ ۰۴ جنوری ۲۰۱۱ کو فوت ہو گئیں، پھر اسی سال ستمبر ۲۰۱۱ میں والدہ محترمہ کے انتقال سے ہم ان کی مخلصانہ دعاؤں سے محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان تمام مرحومین کو کروٹ کروٹ اپنی رحمت سے نوازے، الحمد للہ! تمام بچے اور بچیاں فرمانبردار اور اطاعت گزار ہیں، اہلیہ کی وفات کے بعد انہوں نے مجھے آرام وراحت پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، لیکن میرے حزن وملال کا مداوا ان کے پاس نہیں، پہلے یہ ہوتا تھا کہ اہلیہ کو پریشانیوں میں شریک کر کے

اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر لیتا تھا، ان کی وفات کے بعد میرے دکھ اور درد کو بانٹنے والا کوئی نہیں رہا، صرف إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھ کر اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں، واقعی اس کلمہ ترجیع میں تسلی، بشارت اور تنبیہ ہے ایسے حالات میں ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ ہی کامل نمونہ ہے، جب آپ کی وفات ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہم سے زیادہ پریشان تھے، لیکن ان حضرات نے پریشانی کے باوجود تسلیم ورضا کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ نظام زندگی میں ذرہ بھر بھی تعطل نہیں آنے دیا، ہمارے لیے اس واقعہ میں تسلی وصبر کا سامان موجود ہے، اے اللہ! ہم تیرے فیصلے کو دل کی گہرائی سے قبول کرتے ہیں اور وہی الفاظ کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک صاحبزادی سے فرمائے تھے:

((ان للہ ما اخذ و له ما اعطی وکل شیءٍ عندہٗ إلی اجل مسمیً فلتصبر و لتحتسب))

''اللہ تعالیٰ جو لیتا ہے یا دیتا ہے وہ اسی کا ہے اور ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے لہٰذا صبر کرو اور ثواب کے طلبگار رہو۔''

قارئین کرام! سے گزارش ہے کہ وہ مرحومین کے لیے مغفرت اور ہمارے لیے صبر جمیل کی دعا کریں فتاویٰ اصحاب الحدیث کی تیسری جلد کی طباعت کے سلسلہ میں مکتبہ اسلامیہ لاہور/فیصل آباد کے مدیر عزیز مکرم محمد سرور عاصم بہت بے چین رہے اور مکتبہ کے روح رواں عزیزم حافظ محمد عباد نے بھی انتھک محنت کا مظاہرہ کیا لیکن ایک ناگہانی حادثہ کی وجہ سے اس کی اشاعت میں قارئین کرام کو غیر معمولی انتظار کا سامنا کرنا پڑا جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں دراصل اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے، اگرچہ ہم اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ الحمد للہ! فتاویٰ اصحاب الحدیث کی چوتھی جلد بھی زیر ترتیب ہے، وہ جلد ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی سفارش نصیب فرمائے اور پھر ہمیں جنت فردوس میں اکٹھا کر دے (آمین یارب العالمین)

وصلی اللہ علی نبیہ محمد و آلہ و اصحابہ واتباعہ اجمعین

تاریخ تحریر
۱۵ ذوالحجہ: ۱۴۳۳
یکم نومبر ۲۰۱۲ بروز جمرات
موبائل: 0300-4178626

طالب الدعوات
ابو محمد عبدالستار الحماد
مرکز الدراسات الاسلامیۃ
سلطان کالونی میاں چنوں

اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر لیتا تھا، ان کی وفات کے بعد میرے دکھ اور درد کو بانٹنے والا کوئی نہیں رہا، صرف اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھ کر اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں، واقعی اس کلمہ ترجیع میں تسلی، بشارت اور تنبیہ ہے ایسے حالات میں ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ ہی کامل نمونہ ہے، جب آپ کی وفات ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہم سے زیادہ پریشان تھے، لیکن ان حضرات نے پریشانی کے باوجود تسلیم و رضا کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ نظام زندگی میں ذرہ بھر بھی تعطل نہیں آنے دیا، ہمارے لیے اس واقعہ میں تسلی و صبر کا سامان موجود ہے، اے اللہ! ہم تیرے فیصلے کو دل کی گہرائی سے قبول کرتے ہیں اور وہی الفاظ کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک صاحبزادی سے فرمائے تھے:

((ان للّٰه ما اخذ و له ما اعطي وكل شيءٍ عنده إلى اجل مسمىً فلتصبر و لتحتسب))

''اللہ تعالیٰ جو لیتا ہے یا دیتا ہے وہ اسی کا ہے اور ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے لہٰذا صبر کرو اور ثواب کے طلبگار رہو۔''

قارئین کرام! سے گزارش ہے کہ وہ مرحومین کے لیے مغفرت اور ہمارے لیے صبر جمیل کی دعا کریں فتاویٰ اصحاب الحدیث کی تیسری جلد کی طباعت کے سلسلہ میں مکتبہ اسلامیہ لاہور/فیصل آباد کے مدیر عزیز مکرم محمد سرور عاصم بہت بے چین رہے اور مکتبہ کے روح رواں عزیزم حافظ محمد عباد نے بھی انتھک محنت کا مظاہرہ کیا لیکن ایک ناگہانی حادثہ کی وجہ سے اس کی اشاعت میں قارئین کرام کو غیر معمولی انتظار کا سامنا کرنا پڑا جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں دراصل اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے، اگرچہ ہم اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ الحمد للہ! فتاویٰ اصحاب الحدیث کی چوتھی جلد بھی زیر ترتیب ہے، وہ جلد ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی سفارش نصیب فرمائے اور پھر ہمیں جنت فردوس میں اکٹھا کر دے (آمین یا رب العالمین)

وصل اللّٰه على نبيه محمد و آله و اصحابه واتباعه اجمعين

تاریخ تحریر	طالب الدعوات
۱۵ ذوالحجہ: ۱۴۳۳	ابو محمد عبد الستار الحماد
یکم نومبر ۲۰۱۲ بروز جمرات	مرکز الدراسات الاسلامیۃ
موبائل: 0300-4178626	سلطان کالونی میاں چنوں

توحید وعقیدہ

دعا سے تقدیر کا بدل جانا

سوال ایک حدیث میں ہے کہ تقدیر کو بندے کی دعا رد کر سکتی ہے اور نیکی کرنے سے عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ مشہور بات ہے کہ اللہ کی تقدیر اٹل ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

جواب ہماری یہ عادت ہے کہ ہم ہر اچھے برے کام کے لیے بھرپور کوشش کرتے ہیں، جب ہم کامیاب نہیں ہوتے تو اسے تقدیر کے کھاتہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز کا وقوع اسباب وذرائع سے متعلق ہے جیسا کہ بیج کے لیے طے شدہ امر ہے کہ اس نے اگنا ہوتا ہے لیکن اس کے لیے اسباب مہیا کرنا ہوں گے کہ اسے زمین میں کاشت کیا جائے اسے پانی بھی دیا جائے گا اور اس کے علاوہ اس کی نگرانی بھی کی جائے گی، اسباب ووسائل کو بروئے کار لانے کے بعد اس سے مقدر چیز حاصل ہو گی جبکہ سوال میں ذکر کردہ حدیث بھی اسی مفہوم کی تائید کرتی ہے کہ نیکی اور حسن سلوک عمر میں اضافہ کا باعث ہے اور دعا تقدیر کو رد کر دیتی ہے اور انسان گناہ کرنے کی بناء پر رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اور حسن سلوک عمر میں اضافہ کرنے کا سبب ہے۔ جب سبب حاصل ہو گا تو مسبب بھی موجود ہو گا، باقی رہا یہ اعتراض کہ دعا تقدیر کو کیسے رد کر سکتی ہے تو گزارش ہے کہ بیماری کا آنا بھی اللہ کی تقدیر ہے اور دعا کرنا بھی اللہ کی تقدیر ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مرض کو دور کرتا ہے، دنیا میں ہر چیز اللہ کی تقدیر سے متعلق ہے اور اللہ تعالیٰ اس نوشتۂ تقدیر میں کمی بیشی کرنے پر قادر ہے وہ اسے لکھنے کے بعد بے بس اور عاجز نہیں ہو گیا: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۖۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ۝۳۹ ﴾ [2]

''اللہ جو چاہے مٹا دے اور جو چاہے ثابت رکھے، لوح محفوظ اسی کے پاس ہے۔''

بہرحال اللہ تعالیٰ اسباب وذرائع اختیار کرنے سے تقدیر میں ردوبدل کرنے پر قادر ہے۔ حسن سلوک کرنے سے عمر میں برکت ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی عمر میں عملاً اضافہ ہو جاتا ہے یا اس کی عمر تو اتنی ہی رہتی ہے لیکن اس میں اللہ کی طرف سے برکت آ جاتی ہے کہ جو کام اس نے ایک سال میں کرنا ہوتا ہے وہ عمر میں برکت پڑنے کے بعد ایک ماہ میں ہو جاتا ہے۔

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۲۷۷، ج۵۔ [2] ۱۳/الرعد: ۳۹۔

بہر حال تقدیر کا موضوع ایسا سمندر ہے جس کی گہرائی کوئی بندہ بشر معلوم نہیں کر سکا اس لیے تقدیر کے معاملہ میں پرہیز اور خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ (واللہ اعلم)

قبر پر فی سبیل اللہ خیرات کرنا

سوال ہمارے ہاں ایک بزرگ کی قبر پر سالانہ میلہ لگتا ہے، وہاں دور، دور سے لوگ آتے ہیں، میرے والد وہاں باہر سے آنے والے لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کرتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ میں فی سبیل اللہ خیرات کرتا ہوں، کیا ایسے مقام پر خیرات وغیرہ کی جا سکتی ہے؟

جواب جس مقام پر غیر اللہ کے نام پر نذریں پوری کی جاتی ہوں یا منتیں مانی جاتی ہوں وہاں اللہ کے نام پر دینا بھی منع ہے جیسا کہ حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص نے مقام بوانہ میں اونٹ ذبح کرنے کی اجازت طلب کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت کیا۔ ''کیا وہاں زمانہ جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تھا جس کی پوجا کی جاتی تھی؟ اس نے جواب دیا کہ وہاں زمانہ جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت نہیں جس کی پوجا پاٹ کی جاتی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا سوال کیا: ''کیا وہاں زمانہ جاہلیت میں کوئی میلہ لگتا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ وہاں زمانہ جاہلیت میں کسی میلہ کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاؤ، اپنی نذر کو پورا کر لو اور اونٹ ذبح کر و البتہ ایسی نذر کو پورا نہیں کرنا چاہیے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایسی جگہ پر ذبح کرنا حرام ہے، جہاں زمانہ جاہلیت میں کسی بت کی تعظیم کی جاتی تھی یا وہاں اہل جاہلیت کا کوئی میلہ لگتا تھا لیکن جہاں عملی طور پر غیر اللہ سے مانگا جاتا ہو، وہاں غیر اللہ کی نذریں نیازیں چلتی ہوں اور غیر اللہ کے نام پر میلہ لگایا جاتا ہو، وہاں صدقہ خیرات اور ذبح کرنا بالاولیٰ ناجائز اور حرام ہے، اگرچہ ذبح کرنے والے اور صدقہ و خیرات دینے والے کا مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہی کیوں نہ ہو۔ (واللہ اعلم)

دعا کا مبدل تقدیر ہونا

سوال ہمارے مقدر میں جو لکھا ہے کہ وہ ہر صورت مل کر رہے گا، اور جو ہمارے مقدر میں نہیں لکھا گیا وہ ہمیں کسی صورت میں نہیں مل سکتا۔ ایسے حالات میں دعا کرنے کا کیا فائدہ ہے اور یہ کیا کردار ادا کرتی ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس الجھن کو حل کریں۔

جواب دین سلام کے ارکان و شعار کے متعلق اس قسم کے اعتراضات پہلے بھی ہوئے ہیں اور ہمارے اسلاف نے ان اعتراضات کے جوابات بھی دیئے ہیں، اس کے متعلق صحیح جواب یہ ہے کہ دنیا میں معاملات کا وقوع پذیر ہونا اسباب کے ساتھ معلق کیا گیا ہے جیسا کہ اگر کسی بیج کے متعلق یہ مقدر ہے کہ اس نے اگنا اور پھلنا پھولنا ہے تو اس کی یہ تقدیر اسباب و ذرائع کے بجالانے

---

[1] ابو داود، الایمان: ۳۳۱۳۔

سے معلق ہوگی، اسے زمین میں کاشت کیا جائے گا۔ پھر اسے پانی بھی دیا جائے گا، زمینی آفات سے اس کی نگرانی بھی کی جائے گی، اس کے بعد یہ امید رکھی جاسکتی ہے کہ یہ بیج اگے اور پھلے پھولے گا۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کا جواب اپنے مخصوص انداز میں دیا ہے کہ سوال میں بیان کردہ صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم ہر قسم کے اسباب وذرائع کو معطل کردیں اور انہیں بالکل عمل میں نہ لائیں کیونکہ اگر ہمارے مقدر میں سیر ہونا لکھا ہے تو ہو کر رہے گا۔ خواہ ہم کھانا کھائیں یا نہ کھائیں، اسی طرح اگر ہمارے مقدر میں اولاد ہے تو وہ ہو کر رہے گی خواہ ہم شادی کریں یا نہ کریں اور شادی کرنے کے بعد بیوی کے پاس جائیں یا نہ جائیں، کیا کوئی عقل مند آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے بلکہ دنیا میں اسے احمق کہا جائے گا، کیونکہ کسی چیز کا وقوع پذیر ہونا اسباب سے معلق ہے، وہ اسباب بھی تقدیر کا حصہ ہیں اور ان کی بجا آوری ضروری ہے، ہمارا رزق طے شدہ ہے لیکن اس کے لیے بھاگ دوڑ، محنت ومشقت اور ذرائع واسباب کو استعمال کرنا ضروری ہے، گھر بیٹھ رہنے سے وہ مقدر حاصل نہیں ہوگا چنانچہ اس بات کی وضاحت ایک حدیث میں بایں الفاظ ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمر میں کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے اضافہ ہوتا ہے۔ بری تقدیر کو دعا ٹال دیتی ہے اور آدمی بعض اوقات اپنے برے کردار کی وجہ سے رزق سے محروم کردیا جاتا ہے۔ [1]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اور حسن سلوک انسان کی عمر میں اضافہ کا سبب ہے، جب اسے عمل میں لایا جائے گا تو سبب یعنی عمر میں اضافہ ہوگا اور یہ دونوں باتیں یعنی نیک عمل کرنا اور عمر میں اضافہ ہونا تقدیر کا حصہ ہیں، اسی طرح کسی پریشانی یا بیماری میں مبتلا ہونا تقدیر کا حصہ ہے اور دعا یا دوا سے اس کا دور ہونا بھی اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے۔ چونکہ ہم اسباب وذرائع کو استعمال کرنے کے پابند ہیں۔ اس لیے ان کی بجا آوری بھی ضروری ہے۔ چنانچہ یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ فلاں آدمی فلاں گناہ کے ارتکاب سے رزق سے محروم ہوگا جب وہ گناہ کرے گا تو ضرور اس رزق سے محروم ہوگا، اگرچہ احیاطی تدابیر بعض اوقات کارگر ثابت نہیں ہوتیں۔ تاہم دعا ایک ایسی احتیاطی تدبیر ہے کہ یہ کسی صورت ضائع نہیں ہوتی جیسا کہ ایک حدیث میں واضح ارشاد ملتا ہے۔ [2]

اللہ کا بندے کی طرف چل کر آنا

سوال حدیث میں ہے کہ اگر میرا بندہ میری طرف ایک قدم آتا ہے تو میں دو قدم اس کی طرف آتا ہوں، اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ صفات باری تعالیٰ میں حقیقی معنی مراد لینا ہی سلف صالحین کا عقیدہ اور طرز عمل ہے، اس عقیدے کی روشنی میں حدیث مذکورہ کا حقیقی معنی کس تناظر میں لیا جائے گا؟

جواب اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ بیان کیا ہے، حدیث میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں اپنے بندے سے اس کے گمان کے مطابق برتاؤ کرتا ہوں، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ مجھے کسی مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجلس میں یاد کرتا

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۲۷۷، ج ۵- [2] مسند امام احمد، ص: ۲۳٤، ج ۵-

ہوں۔اگر وہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب آتا ہے تو میں اس سے دو ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں۔اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آ جاتا ہوں۔ [1] یہ حدیث اللہ تعالیٰ کی کئی ایک صفات پر مشتمل ہے اور اللہ کی صفات دو طرح کی ہیں۔ثبوتیہ اور سلبیہ۔

صفات ثبوتیہ: سے مراد وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ کے ذریعے اپنے لیے ثابت کی ہیں جیسے علم اور قدرت وغیرہ۔
صفات سلبیہ: سے مراد وہ صفات ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے خود یا رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ان کی نفی کی ہے جیسے نینداور تھکاوٹ وغیرہ۔پھر صفات ثبوتیہ کی دو اقسام ہیں۔

ذاتیہ اور فعلیہ۔ذاتیہ سے مراد وہ صفات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ متصف رہتا ہے جیسے صفتِ علو اور صفتِ عظمت وغیرہ۔ فعلیہ سے مراد وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وابستہ ہیں، اگر چاہے تو انہیں کرے اور اگر نہ چاہے تو نہ کرے جیسا کہ استواء علی العرش اور نزول الی سماء الدنیا۔

آخری قسم کی صفات کو اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے شایان شان ثابت کیا جائے اس میں تمثیل یا تکییف کا شائبہ نہیں ہونا چاہیے۔حدیث مذکور میں جو صفات ہیں وہ ثبوتیہ فعلیہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق ہیں۔شیخ محمد بن صالح عثیمین رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین اس قسم کی نصوص کو ان کے حقیقی اور ظاہری معنی پر ہی محمول کرتے ہیں اور ان صفات کو اللہ رب العزت کے شایان شان ثابت کرتے ہیں ان کے لیے کوئی تمثیل یا کیفیت کو متعین نہیں کرتے، اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کے قریب ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔وہ اپنے بندے کے جب چاہے جس طرح چاہے قریب ہو سکتا ہے، باوجود اس کے وہ بلند وبالا بھی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا آسمان دنیا کی طرف نزول اور اپنے عرش پر مستوی ہونا ثابت ہے۔ [2] شیخ عبداللہ غنیمان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے پر جود وکرم کو بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر بہت جلد متوجہ ہوتا ہے اور اس پر اپنا فضل وکرم کرنے میں جلدی کرتا ہے، باوجودیکہ اس کی عبادت اس کرم وفضل کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، وہ اپنے علاوہ ہر چیز سے بے پرواہ ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز اس کی محتاج ہے۔ [3] یہ دونوں بزرگ سرزمین عرب کے نامور علماء میں سے ہیں اور ان کی تمام زندگی درس وتدریس میں گزری ہے، موخر الذکر تو سعودی عرب میں ہمارے دوران تعلیم مضمون توحید کے استاذ تھے۔اللہ تعالیٰ ان پر کروٹ کروٹ اپنی رحمت فرمائے، اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے ہم نے اس حدیث کی وضاحت میں ان کی تشریحات کو ذکر کر دیا ہے۔(واللہ اعلم)

قطب وابدال کی شرعی حیثیت

سوال قطب وابدال کی شرعی طور پر کیا حیثیت ہے؟ کچھ اہل علم مشکوٰۃ المصابیح کے حوالے سے احادیث پیش کرتے ہیں، جن میں ابدال وغیرہ کا ذکر ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس کے متعلق ہماری راہنمائی کریں۔

---

[1] صحیح بخاری، التوحید: ۷۴۰۵۔ [2] القواعد المثلی، ص: ۷۰۔
[3] شرح کتاب التوحید، صحیح بخاری، ص: ۲۷۱، ج۱۔

جواب قطب وابدال کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ہمارے ہاں صوفیاء حضرات نے اس طرح کی باتیں لوگوں میں مشہور کر رکھی ہیں کہ فلاں شخص ابدال میں سے تھا، مشکوٰۃ المصابیح کی درج ذیل حدیث کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے:

حضرت شریح بن عبید کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اہل شام کا ذکر کیا گیا اور ان سے کہا گیا: اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ! ان پر لعنت کریں تو آپ نے فرمایا نہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: ''ابدال شام میں ہوں گے اور وہ چالیس افراد پر مشتمل ہوں گے، ان میں سے جب ایک آدمی فوت ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے کو لے آئے گا، ان کی وجہ سے بارش برستی ہے اور ان کے ذریعے دشمنوں سے بدلہ لیا جاتا ہے اور ان کی بنا پر اہل شام سے عذاب دور کیا جاتا ہے۔'' [1]

اس روایت کو صاحب مشکوٰۃ نے مسند امام احمد کے حوالہ سے ذکر کیا ہے، اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو مسند علی رضی اللہ عنہ میں بیان کیا ہے۔ [2]

لیکن یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس کے راوی حضرت شریح بن عبید کی ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے جیسا کہ حافظ احمد شاکر نے اس کے متعلق لکھا ہے۔ [3] اسی طرح امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک خلیفہ کی وفات کے وقت امت میں اختلاف رونما ہوگا تو اہل مدینہ سے ایک آدمی بھاگ کر مکہ مکرمہ آئے گا، لوگ اس کی مقام ابراہیم اور رکن یمانی کے درمیان بیعت کریں گے پھر جب لوگ یہ منظر دیکھیں گے تو اس کے پاس شام کے ابدال اور عراق کے گروہ آئیں گے اور اس کی بیعت کریں گے۔ [4]

لیکن یہ روایت بھی قابل حجت نہیں ہے کیونکہ اس روایت میں ابوقتادہ مدلس راوی ہے جس نے صالح ابی الخلیل سے عن کے صیغہ سے روایت بیان کی ہے پھر اس روایت میں صالح ابی الخلیل کے استاد ''صاحب لہ'' بھی مجہول ہے، ان علتوں کی وجہ سے یہ روایت بھی ناقابل اعتبار ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اس امت میں تیس ابدال ہوں گے۔ [5]

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد اسے منکر قرار دیا ہے چنانچہ اس کی سند میں حسن بن ذکوان نامی راوی ضعیف ہونے کی بنا پر یہ روایت ناقابل حجت ہے، حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کی جملہ روایات پر بایں الفاظ تبصرہ کیا ہے:

''بعض کتب میں ابدال، اقطاب، اغواث، نقباء، نجباء اور ورثاء سے متعلق احادیث ہیں، اس طرح کی تمام روایات باطل ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف باطل طور پر انہیں منسوب کیا گیا ہے۔'' [6]

بہرحال دنیا کا نظام بدلنے یا چلانے والے ابدال سراسر جھوٹ کا پلندا ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] مشکوٰۃ، ذکر اھل شام، حدیث نمبر: ٦٢٧٧۔
[2] مسند امام احمد، ص: ١١٢، ج١۔
[3] مسند امام احمد، ص: ١٧١، ج٢ تحقیق احمد شاکر۔
[4] ابو داود، المھدی: ٤٢٨٦۔
[5] مسند امام احمد، ص: ٣٢٢، ج٥۔
[6] المنار المنیف، ص: ١٣٦۔

''اتفاقاً ایسا ہوا'' کہنا

سوال ''اتفاقاً ایسا ہوا'' کیا اس قسم کے الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں کیونکہ بظاہر یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی صفت علم کے منافی معلوم ہوتے ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اگر کوئی چیز غیر شعوری اور غیر متوقع طور پر سامنے آجائے تو اس وقت ''اتفاقاً ایسا ہوا'' کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، انسان کے حوالے سے کسی چیز کا اتفاقاً پیش آجانا تو امر واقع ہے، ایسے حالات میں ''اتفاق'' کے الفاظ استعمال کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے، احادیث میں بکثرت اس طرح کے اتفاقات مروی ہیں جیسا کہ درج ذیل حدیث میں ایسا مروی ہے: ''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تا کہ آپ سے چکی پیسنے کی مشقت بیان کریں، کیونکہ آپ کو اطلاع ملی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غلام آئے ہیں لیکن اتفاق سے ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہ ہوسکی تو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا...... [1]

اس حدیث میں ایک اتفاق بیان ہوا ہے جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے پیش آیا لیکن اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ عالم الغیب ہے، اس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے، اس کے ہاں کوئی چیز اتفاق سے پیش نہیں آتی۔ البتہ انسان کو کوئی چیز کسی وعدہ یا پیشگی اطلاع کے بغیر اتفاق سے پیش آسکتی ہے، اس بنا پر انسان کے حوالے سے اتفاق کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع اور سوءِ ادبی ہے۔

---

[1] بخاری، النفقات: ٥٣٦١۔

رسالت وولایت

رسالت وولایت
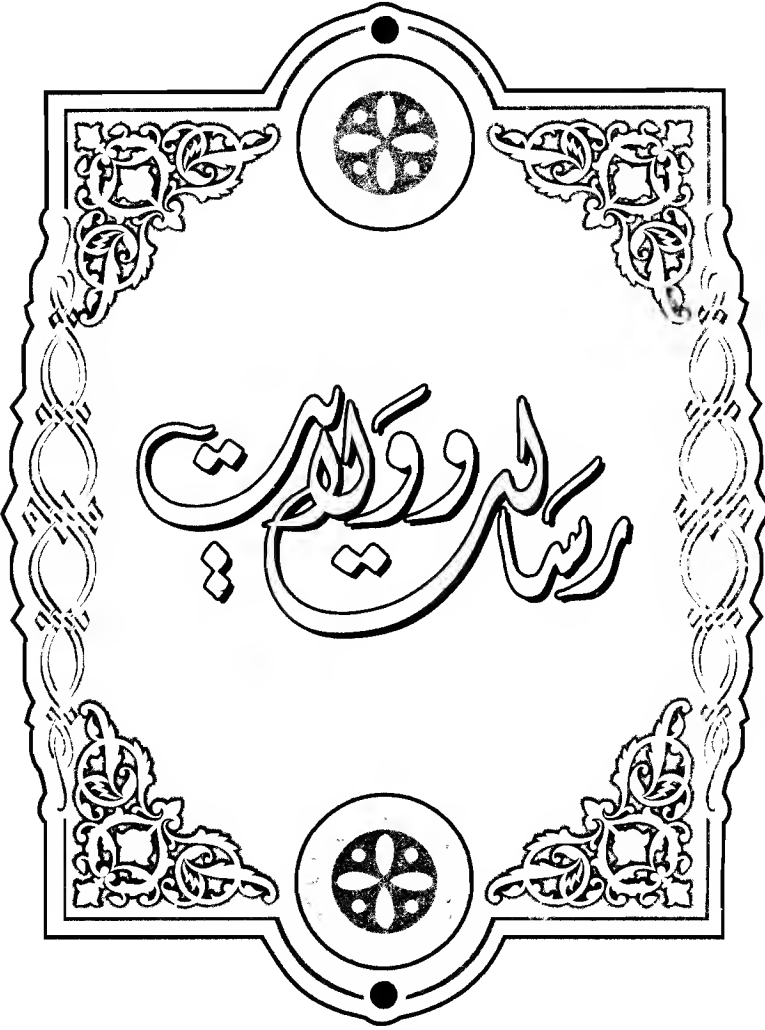
رسول اللہ ﷺ کی گستاخی پر امت کا احتجاج کرنا

سوال ڈنمارک وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ کے گستاخانہ خاکے شائع ہوئے ہیں، ردعمل کے طور پر دنیا بھر میں مسلمان ان توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت کے خلاف سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں اور عملاً احتجاج روز بروز بڑھتا جارہا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں ہمارے لیے کیا ہدایات ہیں اور ہمیں اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنا جزو ایمان ہے، علمائے اسلام دورِصحابہ سے لے کر آج تک اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے جس شخص کو پیار اور تعلق خاطر نہیں وہ سرے سے مومن ہی نہیں ہے اور آپ کی شان میں گستاخی کرنے والا آخرت میں سخت عذاب کا سامنا کرنے کے علاوہ اس دنیا میں بھی قابل گردن زنی ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادگرامی ہے: ''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب میری ذات اسے اس کے والدین، اولاد حتیٰ کہ تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجائے۔'' [1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ''رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنا ایمان کا حصہ ہے۔''

اس کے برعکس ہر وہ قول وعمل اور عقیدہ نواقض ایمان سے ہے جو رسالت اور صاحب رسالت ﷺ سے بغض اور ان کے متعلق طعن وتشنیع پر مشتمل ہو کیونکہ اس سے کلمۂ شہادت کے دوسرے جزو کا انکار لازم آتا ہے اور ایسا کرنے سے وہ گواہی کالعدم ہوجاتی ہے جس کے ذریعے انسان اسلام میں داخل ہوا تھا، ہمارے نزدیک اس انکار وتنقیص کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

☆ رسول اللہ ﷺ کی ذات مقررہ صفات کو ہدفِ تنقید بنانا۔

☆ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے کسی حصہ کا انکار یا اس پر طعن کرنا۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات کو ہدفِ تنقید بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی صداقت وامانت اور عفت وعصمت کے متعلق حرف گیری کرنا یا آپ کی ذات عالی صفات کے ساتھ کسی بھی پہلو سے استہزاء وتمسخر کرنا، یا آپ کو گالی دینا اور آپ کو برا بھلا کہنا، الغرض آپ کی شخصیت پر کسی بھی پہلو سے اعتراض کرنا اس میں شامل ہے۔ لیکن اہل مغرب نے یہودی لابی اور امریکی استعمار کے اشارہ پر اسلام اور اہل اسلام کے خلاف مذموم تہذیبی جنگ شروع کررکھی ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے تہذیب وشائستگی کی تمام حدود کو پامال کررکھا ہے، پہلے قرآن کریم کی بے حرمتی کرکے پوری امت مسلمہ کے جذبات کو مجروح کیا، اب رسول اللہ ﷺ کی شان میں

---

[1] بخاری، الایمان: ۱۵۔

گستاخی کرتے ہوئے مذموم خاکے اور کارٹون شائع کرنے کی شرمناک حرکت کر ڈالی ہے، ان توہین آمیز خاکوں میں کئی چیزیں ایسی ہیں جن سے مسلمانوں کا اشتعال میں آنا لابدی امر ہے، دنیا بھر کے مسلمانوں میں اس بارے میں جو اتفاق رائے سامنے آیا ہے، اس کی مثال ماضی قریب میں نہیں ملتی۔ پھر ان خاکوں کی مذمت کرنے والے مسلمان ہی نہیں بلکہ ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے بھی ان کے ہم آواز ہیں۔ حتیٰ کہ دین و مذہب سے بالا، آزاد خیال مگر سنجیدہ فکر کے لوگ بھی ان خاکوں کی مذمت کر رہے ہیں۔

کتاب و سنت کی رو سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی تصویر کشی کرنا یا ان کے مجسمے بنانا بذات خود خلاف شرع ہے۔ خواہ اس تصویر یا مجسمے میں اہانت یا رسوائی کا کوئی پہلو نہ بھی پایا جاتا ہو۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی مبارک صورتوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقار عطا فرمایا ہے اور شیطان کو بھی اس امر پر قدرت نہیں دی کہ وہ ان شخصیات کی صورت اختیار کر سکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''جو شخص خواب میں میری زیارت سے مشرف ہوا، اس نے مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت اختیار کرنے پر قادر نہیں۔'' [1]

قرآن و سنت کی روشنی میں توہین رسالت کا جرم معمولی نوعیت کا نہیں ہے کہ اس سے چشم پوشی کی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا۝﴾ [2]

''بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں، ان پر دنیا و آخرت میں اللہ کی طرف سے لعنت ہے اور قیامت کے دن ان کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کیا جائے گا۔''

غزوۂ تبوک کے سفر میں منافقین نے آپس میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا، کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع مل جاتی، جب آپ ان سے جواب طلبی فرماتے تو کہتے کہ ہم تو صرف سفر کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے ہنسی مذاق کر رہے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دل بہلانے کے لیے صرف ایسی باتیں ہی رہ گئی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و عالی صفات کو ملوث کیا جائے، کسی دوسری چیز سے تمہاری دل لگی نہیں ہوتی، قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ [3]

''اور اگر آپ ان سے دریافت کریں (کہ کیا تم ایسی باتیں کرتے ہو) تو کہیں گے ہم تو صرف مذاق اور دل لگی کر رہے تھے، آپ کہہ دیں کیا تمہاری ہنسی اور دل لگی اللہ کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہی ہوتی ہے؟ بہانے نہ بناؤ، تم واقعی ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔

اس نص صریح سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور دیگر شعائر اسلام کو اپنے مذاق کا موضوع بنانا بہت خطرناک عمل ہے، اس راستہ پر چل کر انسان براہِ راست کفر تک پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ کتب حدیث میں متعدد ایسے واقعات مروی ہیں کہ

---

[1] مسلم: ٢٢٦٦۔ [2] ٣٣/الاحزاب: ٥٧۔ [3] ٩/التوبة: ٦٦، ٦٥۔

رسول اللہ ﷺ کے متعلق گستاخی کے مرتکب کو فوراً جہنم واصل کر دیا گیا اور اسے کیفر کردار تک پہنچانے والے سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی گئی، اس سلسلہ میں چند واقعات حسب ذیل ہیں:

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی توہین کیا کرتی تھی، اسے ایک شخص نے موقع پا کر قتل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے خون کا بدلہ، قصاص یا دیت کسی بھی صورت میں نہیں دلوایا۔ [1]

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس واقعہ کی تفصیل بایں الفاظ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک نابینا شخص تھے، اس کی لونڈی رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتی تھی اور آپ کی ذات کے متعلق حرف گیری کرتی تھی، اس کا مالک نابینا شخص اسے منع کرتا اور سختی سے روکتا تھا لیکن وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہتی، ایک رات ایسا ہوا کہ وہ حسب عادت رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دینے لگی اور آپ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تو اس غیرت مند نابینا شخص نے گھر میں پڑی ہوئی کدال اٹھائی اور اسے اس گستاخ لونڈی کے پیٹ پر رکھ کر اوپر سے دباؤ ڈالا، جس سے اس کا پیٹ پھٹ گیا اور وہ مرگئی، صبح کے وقت جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: ''میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ رات جو واقعہ ہوا ہے، اس کا مرتکب سامنے آ جائے۔'' وہ نابینا شخص کھڑا ہوا اور ہانپتا کانپتا گرتا پڑتا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اسے قتل کیا ہے، اس قتل کی وجہ یہ تھی کہ یہ لونڈی آپ کو گالیاں دیتی تھی اور آپ کو برا بھلا کہتی تھی، میرے بار بار کہنے اور سمجھانے پر باز نہیں آتی تھی۔ اس کے بطن سے میرے موتیوں جیسے دو خوبصورت بیٹے بھی پیدا ہوئے ہیں، آج رات اس نے پھر وہی نازیبا حرکت کر ڈالی، مجھے غیرت آئی اور میں نے اسے قتل کر ڈالا۔ واقعہ سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سب گواہ رہو، اس گستاخ لونڈی کا قتل ضائع اور خون رائیگاں ہے، اس کا کوئی بدلہ نہیں دیا جائے گا۔'' [2]

☆ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی مؤقف تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی گستاخی کرنے والے کی سزا قتل ہے اور اس کا خون ضائع ہے۔ چنانچہ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم ایک دفعہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں تھے، کسی بات پر آپ کو ایک شخص کے متعلق غصہ آیا، پھر آپ کا غصہ زیادہ ہونے لگا، میں نے عرض کیا اگر آپ مجھے اجازت دیں تو اسے قتل کر دوں؟ جب میں نے اسے قتل کرنے کا عندیہ دیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجلس کو برخاست کر دیا، جب لوگ منتشر ہو گئے تو آپ نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ اس وقت تو نے کیا کہا تھا؟ جبکہ میرے ذہن سے یہ واقعہ محو ہو چکا تھا۔ ان کے یاد دلانے پر مجھے یاد آیا آپ نے فرمایا کہ واقعی تو نے اسے قتل کر دینا تھا؟ میں نے عرض کیا اگر آپ مجھے اجازت دیتے تو میں نے اسے ضرور قتل کر دینا تھا آپ اگر اب بھی مجھے حکم دیں تو اسے کیفر کردار تک پہنچا سکتا ہوں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ منصب صرف رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے کہ آپ ﷺ کے حق میں گستاخی کرنے والے کو قتل کر دیا جائے، آپ کے بعد کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ [3]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی گستاخی کرنا ایک ایسا جرم ہے کہ اس کے مرتکب کو قرار واقعی سزا دی جائے اور اسے فوراً کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ کعب بن اشرف رسول اللہ ﷺ کے

---

[1] سنن ابی داؤد، الحدود: ٤٣٦٢۔ [2] ابو داود، الحدود: ٦٣٦١۔ [3] نسائی: ٤٠٨٢۔

خلاف توہین آمیز اشعار کہتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کعب یہودی کو کون قتل کرے گا؟ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اس کام کو میں خود سرانجام دوں گا۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا جس کی تفصیل بخاری میں ہے۔ 1

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی روایات میں ہے کہ انہوں نے بھی اپنے ایک غلام کو قتل کرا دیا تھا کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف گستاخی کا ارتکاب کرتا تھا۔ 2

اسلام نے یہ اعزاز صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں کیا بلکہ ناموس رسالت کے اس تحفظ میں تمام انبیاء کرام کو بھی شامل کیا ہے، ایک طرف مسلمانوں کو ہر قوم کی مقدس شخصیات اور شعائر کے احترام کا درس دیا اور دوسری طرف تمام انبیاء کرام کا یہ حق بنا دیا کہ ان کی شان میں توہین کرنے والوں کو زندگی کے حق سے محروم کر دیا جائے، اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الصارم المسلول میں تفصیلی بحث کی ہے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ناموس رسالت کی حفاظت کا یہ حق دیگر انبیا علیہم السلام کو بھی ہے جو شخص بھی ان کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرے گا اس کو بھی شدید سزا کا سامان کرنا ہوگا، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی نبی کو گالی دی اسے قتل کیا جائے اور جس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دی تو اسے کوڑے مارے جائیں۔'' 3

پاکستان میں نافذ العمل توہین رسالت کی سزا تمام انبیاء علیہم السلام کی توہین کرنے والوں کے لیے عام ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

''جو کوئی عملاً زبانی یا تحریری طور پر یا بطور طعنہ زنی یا بہتان تراشی بالواسطہ یا بلاواسطہ، اشارۃً یا کنایۃً رسول اللہ ﷺ کی توہین یا تنقیص یا بے حرمتی کرے وہ سزائے موت کا مستوجب ہوگا اور اسے سزائے جرمانہ بھی دی جائے گی اگر وہی اعمال اور چیزیں دوسرے پیغمبروں کے متعلق کہیں جائیں تو وہ بھی اس سزا کا مستوجب ہوگا۔''

لیکن اس سلسلہ میں کسی عام انسان کو قتل کرنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اسے حکومت کے نوٹس میں لانا ہوگا اگر واقعی کسی نے بد دیانتی کی بناء پر کسی نبی کی توہین کی ہے تو اسے کیفر کردار تک پہنچانا حکومت کا کام ہے، ہر آدمی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ گستاخ رسول کو قتل کر دے کیونکہ اس سے انارکی اور فساد پھیلنے کا اندیشہ ہے۔

قادیانیوں سے تعلقات رکھنا

سوال ہمارا دین اسلام شروع ہی سے مختلف فتنوں کا شکار رہا ہے، ان سب فتنوں سے زیادہ خطرناک فتنہ قادیانیت ہے، قادیانی دن رات اہل اسلام کا ایمان لوٹنے میں مصروف ہیں، یہ لوگ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہیں، پوری دنیا میں دھوکہ دہی، دجل وفریب سے کام لے کر سادہ لوح مسلمانوں کو مرتد بنا رہے ہیں۔ ایسے گمراہ اور دین دشمن ٹولے کے متعلق آپ کا کیا موقف ہے؟ اور ان سے کس قسم کا سلوک کیا جائے؟ ان سے مکمل بائیکاٹ کرنے کی اسلام ہمیں اجازت دیتا ہے؟ امید ہے اس سلسلہ میں آپ ہماری ضرور راہنمائی فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو اور دین اسلام کی سربلندی کے لیے ہم سب کی خدمت کو ثمر آور کرے۔

---

1 المغازی: ٤٠٣٧۔ 2 مصنف عبدالرزاق، ص: ٣٠٧، ج٥۔ 3 الصارم المسلول، ص: ٩٢۔

جواب اللہ تعالیٰ نے حضرت انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا اور آخر الزمان رسول حضرت محمد ﷺ پر اس سلسلہ کو ختم کر دیا، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور نہ ہی وحی کا سلسلہ جاری ہوگا، چنانچہ ختم نبوت اور رسول اللہ ﷺ کے بعد وحی کے انقطاع کا مسئلہ ایسا ہے جس پر تمام امت کا اجماع ہو چکا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ [1]

''محمد (ﷺ) تم میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔''

خود رسول اللہ ﷺ نے مسئلہ ختم نبوت بہترین پیرایہ میں بیان فرمایا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اور دیگر انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے ایک مکان تعمیر کیا اور اسے نہایت خوبصورت بنایا، مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ لوگ چاروں طرف سے اس عمارت کو دیکھتے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ تم نے اس جگہ ایک اینٹ مزید کیوں نہ رکھ دی، چنانچہ میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔'' [2]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل کی قیادت حضرات انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ میں تھی، جب ایک نبی علیہ السلام فوت ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی آ جاتا مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، البتہ میرے بعد بکثرت خلفاء ہوں گے۔'' [3]

حدیث دجال میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔'' [4]

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تمہارا میرے لیے وہی درجہ ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہارون علیہ السلام کا تھا۔ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔'' [5]

ان احادیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے بعد ہر مدعی نبوت کافر اور دین سے خارج ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک دفعہ میں سویا ہوا تھا، میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن ہیں انہیں دیکھ کر میں بہت پریشان ہو گیا، خواب میں مجھے حکم دیا گیا کہ ان پر پھونک مارو، میں نے جب ان پر پھونک ماری تو دونوں رفو چکر ہو گئے، میں نے اس خواب کی تعبیر یہ کی کہ میرے بعد دو جھوٹے شخص پیغمبری کا دعویٰ کریں گے ان میں سے ایک اسود عنسی ہے اور دوسرا مسیلمہ کذاب۔'' [6]

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مسیلمہ کذاب مدینہ طیبہ آیا اور کہنے لگا: اگر محمد ﷺ اپنے بعد مجھے جانشین بنا دیں تو ان کی فرمانبرداری کرنے کو تیار ہوں، مسیلمہ کذاب اپنے ساتھ بہت سے لوگوں کو بھی لایا تھا، رسول اللہ ﷺ کے پاس اس وقت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ تھے۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، آپ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا: ''اگر تم مجھ سے یہ چھڑی بھی مانگو تو میں نہیں دوں گا، جانشینی تو دور کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ نے تیری تقدیر میں جو

---

[1] ۳۳/الاحزاب: ۴۰۔ [2] صحیح بخاری، المناقب: ۳۵۳۵۔ [3] صحیح بخاری، احادیث الانبیا: ۳۴۵۵۔
[4] مسند امام احمد، ص: ۳۳۸، ج۳۔ [5] ابن ماجه، السنة: ۱۲۱۔ [6] صحیح بخاری، المغازی، : ۴۳۷۹۔

لکھ دیا ہے تو اس سے نہیں بچ سکے گا اور اگر تو روگردانی کرے گا تو اللہ تجھے تباہ کر دے گا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ تو وہی دشمن ہے جس کا حال مجھے اللہ تعالیٰ نے خواب میں دکھایا ہے۔'' ❶

بہرحال رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق مسیلمہ کذاب حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔ ایک دوسرے مقام پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب میرے بعد تیس کذاب پیدا ہوں گے، سب کے سب اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کریں گے حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔'' ❷

ہمارے نزدیک مرزا غلام احمد قادیانی ایک جھوٹا مدعی نبوت ہے اور ان احادیث کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کے بعد جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے یا کسی مدعی نبوت کی تصدیق کرے وہ کافر اور دین اسلام سے خارج ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اجماع امت کی تکذیب کی ہے۔ واضح رہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی دعوت نبوت سے پہلے ختم نبوت کا قائل تھا اور نبوت کا دعویٰ کرنے والے کو کافر سمجھتا تھا، جیسا کہ اس نے لکھا ہے: ''بھلا نبی کریم ﷺ کے بعد نبی آئے تو کیسے آئے جب کہ آپ کی وفات کے بعد وحی بند ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا ہے۔'' ❸

ایک دوسرے مقام پر لکھتا: ''مجھے یہ بات زیبا نہیں کہ میں نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام سے خارج ہو جاؤں اور کافروں سے جا ملوں۔ ❹

مرزا قادیانی کی مصنوعی نبوت کے کئی ایک مراحل ہیں، سب سے پہلے اس نے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا، اس کے بعد مثیلِ مسیح اور پھر مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا، بلکہ بذریعہ کشف والہام اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کی کشمیر میں نشاندہی بھی کر دی۔ اس کے بعد کھل کر اپنی نبوت کا دعویٰ کیا اور باور کرایا کہ مجھ پر وحی آتی ہے اور (نعوذ باللہ) میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتا ہوں۔ جب اس پر علماء حقہ نے گرفت کی تو کہنے لگا میں کوئی مستقل نبی یا صاحب شریعت رسول نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے نبی ہوا ہوں اور آپ ہی کا ظل اور بروز ہوں یعنی میں ظلی اور بروزی نبی ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرزا قادیانی نے بتدریج نبوت کے مراحل طے کیے ہیں۔ پہلے مجدد، پھر مثیلِ مسیح اور پھر مسیح موعود، جب کام چلتا دیکھا تو نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اگر غور کیا جائے تو اس کی تدریجی نبوت ہی اس کے ابطال دعویٰ نبوت کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ سابقہ انبیا علیہم السلام میں سے کوئی نبی بھی بتدریج نبی نہیں بنایا، اس دعویٰ نبوت کی تردید کے لیے درج ذیل باتیں قابل غور ہیں۔

❶ اس نے دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے اسے ظلی نبوت کا درجہ حاصل ہوا ہے گویا اس کے نزدیک نبوت وھبی نہیں بلکہ کسبی ہے، جب کہ قرآن کریم نے اس نظریہ کی بھرپور تردید کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ ❺

''اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس سے لے۔''

---

❶ صحیح بخاری، المناقب: ٣٦٢٠۔ ❷ ابوداود، الفتن: ٢٥٢٤۔ ❸ حمامة البشری، ص: ٢٠۔
❹ حمامة البشری، ص: ٩٧۔ ❺ ٦/الانعام: ١٢٤۔

علاوہ ازیں اگر نبوت کسی چیز ہوتی تو اس کے سب سے زیادہ حقدار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع سے سرشار تھے۔

❷ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاعر نہ تھے اور نہ ہی شاعری آپ کے شایان شان تھی لیکن مرزا قادیانی شاعر تھا اس نے اردو، عربی اور فارسی میں بہت سے اشعار اور قصیدے لکھے۔ اگر مرزا قادیانی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظل اور بروز ہے تو آپ تو شاعر نہ تھے یہ عکس میں شاعری کہاں سے آ گئی؟ اس کا مطلب ہے مرزا قادیانی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس قطعاً نہیں ہے۔

❸ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں ہے کہ آپ فحش گو اور بدزبان نہیں تھے جبکہ مرزا قادیانی انتہائی بدزبان اور فحش گو تھا بلکہ اس نے نہ صرف اپنے مخالفین کو ولد الزنا اور ولد الحرام کہا ہے بلکہ اس نے آئینہ کمالات میں لکھا ہے ''جن لوگوں نے میری تصدیق نہیں کی وہ سب کنجریوں کی اولاد ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخالفین کے حق میں قطعاً ایسی زبان استعمال نہیں کی ہے، اس بناء پر مرزا قادیانی قطعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس نہیں ہے۔

❹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں جہاد کیا اور سترہ غزوات میں خود شریک ہوئے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا، لیکن مرزا قادیانی نے جہاد کی مخالفت کا فتویٰ جاری کیا، کیا ایسا شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو مٹانے کے لیے دن رات ایک کیا۔ ہمارے نزدیک مرزا قادیانی انگریز کا خود کاشتہ پودا تھا، جس نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالی اور جہاد کو حرام قرار دیا بلکہ اس نے دیگر تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا، یہی وجہ ہے بانی پاکستان محمد علی جناح جب فوت ہوئے تو مشہور قادیانی ظفر اللہ خاں نے ان کے جنازہ میں شرکت نہ کی۔ اس کے جھوٹا ہونے کے لیے درج ذیل دو واقعات قابل غور ہیں۔

① مرزا قادیانی نے اپنی زندگی میں پیشین گوئی کی تھی کہ اس کا نکاح محمدی بیگم سے ہو گا، لیکن ہوا یوں کہ محمدی بیگم کے سرپرست جو مرزا قادیانی کی برادری سے تھے، انہوں نے رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا اور محمدی بیگم کا نکاح کسی دوسری جگہ کر دیا اور مرزا قادیانی اس سے نکاح کی حسرت دل میں لیے ہوئے اگلے جہاں روانہ ہوا۔

② مرزا قادیانی نے مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم سے مباہلہ کیا کہ اگر میں جھوٹا اور مفتری ہوں تو میں ثناء اللہ کی زندگی میں ہلاک ہو جاؤں، چنانچہ وہ اس مباہلہ کے تیرہ ماہ بعد ہیضہ کی بیماری سے لاہور میں مرا جب کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ اللہ کے فضل و کرم سے مرزا قادیانی کی وفات کے چالیس سال بعد تک زندہ رہے اور مارچ 1948ء میں سرگودھا میں وفات پائی۔ یہی وہ حقائق تھے جن کی بناء پر حکومت پاکستان نے 1974ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔

نعلین مبارک کی شرعی حیثیت

سوال رضا ورائٹی ہاؤس لاہور کی طرف سے ایک کارڈ شائع کیا گیا ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین کی ۶ عدد

تصاویر ہیں، کیا یہ واقعی رسول اللہ ﷺ کے نعلین کی تصاویر ہیں؟ ان کے نیچے کچھ فضائل درج کیے گئے ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ان تصاویر کے اوپر اور نیچے "ﷺ" کے الفاظ درج ہیں، کیا یہ درود کی بے ادبی اور گستاخی نہیں ہے؟ کیا ایسے کارڈ پر کوئی دعوت نامہ بنوا کر تقسیم کرنا اور اس کارڈ کو عام کرنا درست ہے؟ ایک عالم دین نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے اور وہ اسے کار ثواب خیال کرتے ہیں، قرآن وحدیث کے مطابق اس کی حیثیت واضح کریں۔

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: "رسول اللہ ﷺ کی زرہ، عصاء، پیالہ، انگوٹھی اور ان تمام چیزوں کا بیان جنہیں آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفا رضی اللہ عنہم نے استعمال کیا لیکن ان کی تقسیم منقول نہیں، اسی طرح آپ کے موئے مبارک، نعلین اور برتنوں کا حال ہے جن سے آپ کی وفات کے بعد صحابہ اور غیر صحابہ برکت حاصل کرتے رہے ہیں۔" [1]

اس کے بعد آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بالوں کے بغیر چمڑے کی دو پرانی جوتیاں پیش کیں جن پر دو پٹیاں تھیں پھر فرمایا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے پاپوش مبارک ہیں۔ [2]

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں جوتے کی بناوٹ موجودہ دور کی ہوائی چپل سے ملتی جلتی تھی اس میں چمڑے کا ایک ٹکڑا انگلیوں کے درمیان ہوتا تھا، اس کا ایک سرا جوتی کے تلے میں اور دوسرا سرا زمام سے بندھا ہوتا تھا، اس زمام کو قبال بھی کہتے ہیں، ایک جوتے میں دو پٹیاں (قبال) ہوتیں اور ہر قبال چمڑے کے دو تسموں پر مشتمل تھا، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے جوتے کی دو پٹیاں تھیں جن کے تسمے دہرے ہوتے تھے۔ [3]

اس قسم کے جوتے میں پاؤں کا اکثر حصہ کھلا رہتا ہے چنانچہ احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ موزوں یا جرابوں پر مسح کرتے وقت اپنے پاؤں جوتوں سے نہیں نکالتے تھے بلکہ جوتوں سمیت مسح کر لیتے تھے۔ [4] بلکہ جوتے اتارے بغیر پاؤں بھی دھو لیتے تھے۔ [5]

ان احادیث سے معلوم ہوا ہے کہ عام طور پر آپ کا جوتا ہمارے ہاں ہوائی چپل کی طرح ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی نبوت ۲۳ سال پر محیط ہے، اس دوران آپ نے کئی جوتے استعمال کیے ہوں گے، چنانچہ احادیث میں مختلف جوتوں کی تفصیل ملتی ہے، لیکن جسے تاریخی حیثیت حاصل ہے وہ یہی ہے جو ہوائی چپل کی طرح تھا چنانچہ حضرت قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کے نعل مبارک کیسے تھے تو انہوں نے ایک پرانا جوتا نکال کر دکھایا جس کے اوپر دو پٹیاں تھیں اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے یہ جوتے ہیں۔ [6] بعض روایات میں ہے کہ وہ گائے کے چمڑے کے تھے اور انہیں پیوند لگا ہوا تھا۔ [7] ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں دوران نماز اتار دیا، سلام پھیرنے کے بعد فرمایا کہ مجھے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے

---

[1] کتاب فرض الخمس، باب نمبر ٥۔ [2] صحیح بخاری، فرض الخمس: ٣١٠٧۔
[3] ابن ماجه، اللباس: ٣٦١٤۔ [4] سنن ابن ماجه، الطهارة: ٥٥٩۔ [5] صحیح بخاری، الوضو: ١٦٦۔
[6] صحیح بخاری، اللباس: ٥٨٥٨۔ [7] مسند امام احمد، ص:٦، ج٥۔

دوران نماز بتایا کہ انہیں گندگی لگی ہوئی ہے لہٰذا میں نے انہیں اتار دیا۔ [1]

بہرحال یہ نعلین سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے پاس تھے اور انہیں بطور وراثت تقسیم نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے پاس ہی رہنے دیا گیا، حضرت انس رضی اللہ عنہ عمر کے آخری حصہ میں دمشق چلے گئے تھے، وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب پاپوش مبارک نویں ہجری کے آغاز میں فتنہ تیمور لنگ کے وقت ضائع ہوگئیں، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپ کی ذاتی اشیاء بہت کم تعداد میں موجود تھیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عنوان میں جن ذاتی اشیاء کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں زرہ، عصا، تلوار، پیالہ، انگوٹھی، موئے مبارک، نعلین اور چند ایک برتن، پھر جو احادیث اس عنوان کے تحت ذکر کی ہیں ان میں صرف پانچ چیزوں کا ذکر ہے پہلی میں انگوٹھی دوسری میں نعلین، تیسری میں چادر چوتھی میں پیالہ، پانچویں میں تلوار، باقی اشیاء یعنی زرہ، موئے مبارک، چھڑی اور عصا کے متعلق دوسرے مقامات پر احادیث ذکر کی ہیں، ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام استعمال کردہ ذاتی اشیاء اور آثار شریفہ بابرکت ہیں اور ان سے برکت حال کرنا شرعاً جائز ہے لیکن اس تبرک کے لیے دو شرائط ہیں:

تبرک لینے والا شرعی عقیدہ اور اچھے کردار کا حامل ہو، جو شخص عمل اور عقیدہ کے اعتبار سے اچھا مسلمان نہیں اسے اللہ تعالیٰ اس قسم کے تبرکات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔

جو شخص تبرک حاصل کرنا چاہتا ہو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی آثار میں سے کوئی شے حاصل ہو اور پھر وہ اسے استعمال بھی کرے محض دیکھ لینے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا، لیکن ہم یہ بات بھی علی وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے آثار شریفہ اور تبرکات معدوم ہوگئے یا جنگوں اور فتنوں کی نذر ہو کر ضائع ہوگئے جیسا کہ درج ذیل واقعات سے معلوم ہوا ہے۔

(الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوا رکھی تھی، جسے آپ پہنتے تھے، آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے استعمال کیا، ان کے بعد حضرت عثمان کے پاس رہی بالآخر بئر اریس میں گر گئی اور تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکی۔ [2]

(ب) عباسی دور کے آخر میں جب تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رداء مبارک اور چھڑی جس سے آپ کھجلی کیا کرتے تھے، ہنگاموں میں ضائع ہوگیں، یہ سن 656ء کے واقعات ہیں۔

(ج) دمشق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب پاپوش مبارک بھی نویں ہجری کے آغاز میں فتنہ تیمور لنگ کے وقت ضائع ہو گئی جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

(د) آپ کے آثار شریفہ کے فقدان کی ایک وجہ یہ تھی کہ جس خوش قسمت انسان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نشانی تھی اس نے وصیت کر دی کہ اسے قبر میں اس کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عورت نے اپنے ہاتھ سے چادر تیار کی اور آپ کو بطور تحفہ پیش کی۔ آپ نے اسے قبول کرتے ہوئے زیب تن فرمایا، لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس خواہش کے پیش نظر کہ وہ آپ کا کفن ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چادر مانگ لی۔ بالآخر وہ چادر ان کا کفن

---

[1] مستدرك حاكم، ص: ٢٦٠، ج١۔ [2] صحيح بخاري، اللباس: ٥٨٧٩۔

بنی۔ ❶

اس طرح رسول اللہ ﷺ کا ایک قمیص رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو پہنایا گیا، جسے بطور کفن اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ ❷

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس چند موئے مبارک تھے، آپ نے ان کے متعلق وصیت کر دی تھی کہ انہیں قبر میں ان کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ❸

ان حقائق کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ اب رسول اللہ ﷺ کے کپڑوں، بالوں اور نعلین میں سے کچھ باقی نہیں ہے اور نہ ہی کسی کے بس میں ہے کہ وہ قطعی اور یقینی طور پر یہ ثابت کر سکے کہ فلاں چیز واقعی رسول اللہ ﷺ کی استعمال کردہ ہے پھر جب صورت حال یہ ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ دور حاضر میں رسول اللہ ﷺ کے نعلین کی تصاویر کہاں سے برآمد کی گئی ہیں؟ یقیناً رسول اللہ ﷺ کی تمام استعمال کردہ ذاتی اشیاء بابرکت ہیں اور ان سے برکت حاصل کرنا بہت بڑی خوش قسمتی اور باعث عزت ہے لیکن لوگ جن اشیاء کی تصاویر کے کارڈ لیے پھرتے ہیں اور ان کی اشاعت بابرکت خیال کرتے ہیں، پھر ان تصاویر کو اپنے سینہ اور پگڑی پر آویزاں کرتے ہیں، ان تصاویر کے متعلق لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ اسے گھر، دوکان یا دفتر میں رکھنے سے ہر قسم کی مصیبت اور بلا ٹل جاتی ہے، تنگ دست کی تنگ دستی اور ضرورت مند کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ یہ سب جذباتی باتیں خلاف شریعت ہیں، تصویر رکھ کر اس کا بوسہ لیا جائے تاکہ مکہ مکرمہ جانے کی ضرورت ہی نہ رہے، ہمیں سوال کے ہمراہ جو کارڈ موصول ہوا ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کی نعلین مبارکین کے چھ عدد تصاویر ہیں، اس کا عنوان یہ ہے "نقش نعلین مبارک سلطان دو جہاں ﷺ"۔

پھر اس نقش نعل کے متعلق لکھا ہے کہ اسے اپنے پاس رکھنے والے کو مندرجہ ذیل برکات حاصل ہوں گی۔

❶ سرکار مدینہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوگی۔ ❷ اس کو اپنے پاس رکھنے سے شیطان کے شر سے حفاظت ہوگی۔

❸ اس کو آنکھوں پر رکھنے سے امراض چشم سے نجات حاصل ہوگی۔ ❹ گنبد خضراء کی حاضری نصیب ہوگی۔

❺ اس کو اپنے پاس رکھنے سے ظالموں کے ظلم سے نجات حاصل ہوگی۔ ❻ اس کے واسطہ سے دعا مانگی جائے تو پوری ہوگی۔

❼ ہر قسم کے جادو ٹونے سے حفاظت ہوگی۔ ❽ اس کو اپنے پاس رکھنے سے ہر حاسد کے حسد و نظر بد سے حفاظت ہوگی۔

❾ جس کشتی میں ہو وہ نہ ڈوبے اور جس گھر میں ہو چوری سے محفوظ رہے۔

ہمارے نزدیک نقش نعلین کے مذکورہ فضائل و مناقب خود ساختہ اور بناوٹی ہیں، احادیث میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا، حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نعلین کے نگران تھے، ان سے کچھ بھی منقول نہیں ہے، بلکہ ہمارے نزدیک یہ تمام نقش ہی جعلی اور بناوٹی ہیں، خاص طور پر درمیان میں بڑا جوتا جو دور حاضر کی سوفٹی کی شکل پر تیار کیا گیا ہے، اس کے بناوٹی ہونے میں تو کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ کے پاپوش کی تصویر بنانے میں چنداں حرج نہیں، اگر کوئی محبت کے پیش نظر ایسا کرتا ہے تو اس کی گنجائش

---

❶ صحیح بخاری، الجنائز: ۱۲۷۷۔ ❷ صحیح بخاری، الجنائز: ۱۲۷۰۔

❸ سیر أعلام النبلاء، ص: ۳۳۷، ج ۱۱۔

ہے بشرطیکہ پاپوش کی اصلیت اور حقیقت سے واقف ہو، لیکن اس نقش سے برکت حاصل کرنا اور اسے باعث فضیلت قرار دینا کسی صورت میں بھی صحیح نہیں ہے جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر آئے ہیں، البتہ اصلی پاپوش مبارک اگر کہیں موجود ہے تو اس میں خیر و برکت کا پہلو بدرجہ اتم موجود ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کوئی کمی نہیں آسکتی جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے جو انہیں فضل بن ربیع کے کسی لڑکے نے عنایت فرمائے تھے۔ آپ بالوں کو بوسہ دیتے، آنکھوں پر لگاتے اور پانی میں بھگو کر شفا کے طور پر اس پانی کو نوش کرتے، جن دنوں آپ پر آزمائش آئی اس وقت وہ آپ کی آستین میں رکھے ہوتے تھے، بعض لوگوں نے آپ کی آستین سے موئے مبارک نکالنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ناکام رہے۔ [1]

آخر میں ہم اس امر کی وضاحت کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اگرچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ کے آثار شریفہ سے تبرک حاصل کیا اور آپ کے لعاب دہن کو اپنے چہروں اور جسموں پر ملا۔ آپ نے انہیں منع نہیں فرمایا ایسا کرنا جنگی حالت کے پیش نظر انتہائی ضروری تھا، مقصد یہ تھا کہ قریش کو ڈرایا جائے اور ان کے سامنے اس اس بات کا اظہار کیا جائے کہ مسلمانوں کا اپنے رہبر و رہنما سے تعلق کس قدر مضبوط ہے؟ انہیں اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر والہانہ عقیدت و محبت ہے؟ وہ آپ کی خدمت میں کس قدر فنا ہیں اور وہ کس کس انداز سے آپ کی تعظیم بجا لاتے ہیں؟ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے چھپایا جا سکتا ہے کہ اس صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے حکیمانہ انداز میں اور لطیف اسلوب کے ساتھ مسلمانوں کی توجہ اعمال صالحہ کی طرف مبذول کرنے کی کوشش فرمائی جو اس قسم کے تبرکات کو اختیار کرنے سے کہیں بہتر ہیں، مندرجہ ذیل حدیث اس سلسلہ میں ہماری مکمل رہنمائی کرتی ہے۔

ابو قراد سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن وضو کیا، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے وضو کے پانی کو اپنے جسموں پر ملنا شروع کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ ''تم ایسا کیوں کرتے ہو۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے پیش نظر ایسا کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''جسے یہ بات پسند ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے یا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے محبت کرے تو اسے چاہیے کہ بات کرتے ہوئے سچ بولے، اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اسے ادا کرے اور اپنے پڑوسیوں سے حسن سلوک کا مظاہرہ کرے۔'' [2]

مختصر یہ کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل تبرک یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں آپ کے ذریعے اللہ کی طرف سے ملا ہے اس پر عمل کیا جائے اور آپ کی صورت و سیرت کی اتباع کی جائے تو اس دنیا و آخرت کی خیر و برکات سے ہم مشرف ہوں گے، اب ہم سوالات کے مختصر جوابات دیتے ہیں۔

1. کارڈ پر شائع کردہ تصاویر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاپوش مبارک کی نہیں ہیں اور نہ ہی ان سے برکت حاصل کرنا جائز ہے۔
2. اس میں جو فضائل و مناقب درج کیے گئے ہیں وہ حدیث کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہیں، بلکہ یہ خود ساختہ ہیں، ان سے

---

[1] سیر اعلام النبلاء، ص: ۲۵۹، ج ۱۱۔

[2] الاحادیث الصحیحہ، رقم: ۲۹۹۸۔

عقیدہ کی خرابی لازم آتی ہے۔

❸ تصاویر کے اوپر نیچے ﷺ نہیں لکھا گیا بلکہ ''سلطان دو جہاں'' کے ساتھ ﷺ لکھا گیا ہے، کوئی بھی صاحب شعور جوتوں کے اوپر یا نیچے ﷺ لکھنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔

❹ ایسے کارڈ پر دعوت نامہ بنا کر تقسیم کرنا درست نہیں ہے اور نہ ہی اسے عام کرنا جائز ہے کیونکہ ایسا کرنے سے بدعات کی اشاعت ہوتی ہے۔

❺ جس عالم دین نے ثواب سمجھ کر اس کی اشاعت کی ہے، اس کا یہ اقدام انتہائی محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

گستاخ رسول پر ﷺ لکھنا

سوال ایک اشتہار میری نظر سے گزرا اس کی عبارت میں ''گستاخ رسول ﷺ'' لکھا ہوا تھا حالانکہ ﷺ کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے لیے ہیں لیکن اس مقام پر ہر گستاخ رسول کے ساتھ معلوم ہوتے ہیں، ہم کئی جگہ محمد کا لفظ استعمال کرتے ہیں مثلاً محمد علی وغیرہ تو اس کے ساتھ ﷺ کے الفاظ استعمال نہیں کرتے کیونکہ یہاں محمد سے مراد رسول ﷺ کی ذات گرامی نہیں بلکہ کوئی شخصیت مراد ہے تو پھر گستاخ رسول کے ساتھ ﷺ لکھنا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اسلام کی بنیادی تعلیمات میں رسول اللہ ﷺ سے محبت کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے اور آپ سے بغض و عداوت کو حرام کہا گیا ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ''رسول اللہ ﷺ کی محبت جزو ایمان ہے۔'' پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی ایمان دار نہیں ہوسکتا تا آنکہ میں اسے اس کے والدین اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔'' [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک میری شخصیت اسے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو۔'' [2]

ان احادیث کے پیش نظر ایک مسلمان رسول اللہ ﷺ کی گستاخی کا تصور بھی نہیں کرسکتا، بلکہ آپ کی محبت ہر مسلمان کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح جاری و ساری ہے، حقیقی مسلمان کسی صورت میں بھی رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کرسکتا چہ جائیکہ وہ خود اس کا مرتکب ہو، صورت مسئولہ میں غلط فہمی کی بنا پر ﷺ کے لاحقہ کو ''گستاخ'' کے ساتھ ملا دیا گیا ہے حالانکہ ﷺ کا تعلق گستاخ سے نہیں بلکہ رسول سے ہے گویا عبارت اس طرح ہے ''رسول اللہ ﷺ کا گستاخ'' اس سلسلہ میں جو مثال دی گئی ہے وہ اس پر منطبق نہیں ہوتی کیونکہ لفظ ''محمد علی'' میں ایک شخص کا نام ہے جو یقیناً رسول نہیں، اس لیے اس کے ساتھ ﷺ کی بھی ضرورت نہیں جبکہ گستاخ رسول میں رسول اللہ ﷺ ہیں، اس لیے لاحقہ کے طور پر اس کے بعد ﷺ کا لفظ لکھا جاتا ہے۔ اس انداز میں کوئی گستاخی والی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی بے ادبی کا پہلو پایا جاتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، الایمان: ١٤۔ [2] صحیح بخاری، الایمان: ١٤۔

مساجد و اوقاف

مساجد و اوقاف

مسجد کے غسل خانوں کی چھت پر رہائش رکھنا

سوال ہماری مسجد کے وضوخانہ اور طہارت خانوں کی چھت پر ایک کمرہ ہے، میں اس مسجد کا خطیب ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھوں اور رہائش کے لیے اس کمرے کو استعمال کروں جس کی سیڑھیاں بھی الگ ہیں، اس کا مسجد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، شرعی طور پر مجھے آپ کی رہنمائی درکار ہے۔

جواب مسجد کے تقدس کے پیش نظر حائضہ عورت کو مسجد میں آنے جانے کی ممانعت ہے، مسجد کی چھت چونکہ اس کا حصہ ہوتی ہے، اس لیے بیوی بچوں کی رہائش کے لیے چھت وغیرہ کو بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے: ''بلاشبہ میں حائضہ اور جنبی کے لیے مسجد میں داخل ہونے کو جائز قرار نہیں دیتا۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت کا مسجد میں داخلہ ممنوع ہے۔ جب داخلہ ممنوع ہے تو مستقل قیام کیسے درست ہوسکتا ہے؟ ہاں اگر مسجد کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ ہو تو ان کے لیے گزرنا جائز ہے، صورت مسئولہ میں جو بیان ہوا ہے کہ وہ کمرہ وضوخانہ اور طہارت خانوں کے اوپر ہے، اس جگہ کو مسجد کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا لہٰذا ایسے کمرہ میں بیوی بچوں کو رہائش اختیار کرنے کی گنجائش موجود ہے، لہٰذا اس قسم کے کمرہ میں رہائش رکھی جاسکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد کا سامان غریبوں کو دینا

سوال ہماری مسجد کو کسی صاحب ثروت نے ازسرنو تعمیر کر دیا ہے، اس کا پہلا سامان مثلاً ٹی آر اور گاڈر وغیرہ فالتو پڑے ہیں، کیا کسی محتاج یا غریب کو دیئے جاسکتے ہیں تاکہ وہ اپنے مکان کی تعمیر میں انہیں استعمال کرے؟ کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ درکار ہے۔

جواب اگر مسجد ضرورت مند ہے تو انہیں فروخت کر کے مسجد کی ضروریات کو پورا کیا جائے اور اگر مسجد کو کسی قسم کی ضرورت نہیں اور وہ سامان فالتو پڑا ہے تو اسے کسی غریب ضرورت مند کو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے تاکہ وہ اسے اپنے استعمال میں لاسکے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تیری قوم عہد جاہلیت یا کفر سے نئی نئی اسلام میں نہ

---

[1] بیہقی، ص: ٤٤٢، ج ٢۔

آئی ہوتی تو میں کعبہ کا خزانہ نکال کر اسے اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتا۔'' ❶

جب کعبہ کے فاضل مال کا یہ حکم ہے تو باقی مساجد کے فالتو مال کا بالاولیٰ یہی حکم ہے اور یہ حکم قیامت تک باقی رہے گا کہ اگر مساجد کے غیر ضروری سامان کو مساجد کے علاوہ دیگر مصارف مثلاً غرباء و مساکین میں صرف کرنے سے کسی فتنہ کا اندیشہ ہو تو اسے کسی بھی دوسرے مصرف میں خرچ نہیں کرنا چاہیے لیکن اگر کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پھر افضل ہے کہ ایسا سامان جو فالتو ہے اور مسجد کے کسی مصرف میں نہیں تو اسے محتاجوں اور مصلحت کے کاموں میں صرف کر دیا جائے، اسے بلاوجہ ایک جگہ پر رو کے رکھنا جائز نہیں، بلکہ ایسا کرنا اس کے ضیاع کے مترادف ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد میں نماز کے بعد لیٹنا یا سونا

سوال گرمی کے دنوں میں نمازی حضرات ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد میں سو جاتے ہیں، کیا مسجد میں لیٹنا یا سونا، اس کے آداب کے خلاف نہیں ہے، قرآن و حدیث کی میں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب مسجدیں اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں، ان میں گپیں ہانکنا، فضول کام کرنا اور عادت کے طور پر سونا جائز نہیں ہے۔ مگر کبھی کبھار ضرورت پڑنے پر لیٹنے میں چنداں حرج نہیں ہے جیسا کہ حضرت عباد بن تمیم رضی اللہ عنہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر چت لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ ❷ اسی طرح وہ صحابہ کرام یعنی اصحاب صفہ جن کا گھر بار نہیں ہوتا تھا وہ مسجد میں سوتے تھے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ مسجد میں سو جایا کرتے تھے۔ ❸ ایک دوسری روایت میں صحابہ کرام کا بیان ہے کہ ہم زمانہ نبوت میں مسجد کے اندر سوتے اور اس میں قیلولہ کرتے تھے جب کہ ہم نوجوان ہوتے تھے۔ ❹

بہر حال مسجد میں بوقت ضرورت لیٹنا اور سونا جائز ہے لیکن اسے عادت کے طور پر اختیار کرنا محل نظر ہے کیونکہ اس عمل سے مسجد کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد کی جمع شدہ رقم سے قرض حسنہ دینا

سوال مسجد کا خازن مسجد کی جمع شدہ رقم سے ضرورت مند حضرات کو قرض حسنہ دے دیتا ہے نیز وہ اس رقم سے اپنا کاروبار بھی کرتا ہے، حاصل شدہ منافع کا نصف مسجد فنڈ میں جمع کر دیتا ہے اور نصف خود رکھ لیتا ہے، کیا یہ طرز عمل شریعت کی رو سے درست ہے؟

جواب مسجد کی جمع شدہ رقم امانت ہے، اسے مسجد کے مصارف میں ہی استعمال کرنا چاہیے، اسے اپنے ذاتی مصرف میں لانا یا کسی ضرورت مند کو بطور قرضِ حسنہ دینا جائز نہیں ہے، ہاں اگر کچھ رقم مسجد کی وقتی ضروریات سے زائد ہو اور انتظامیہ اس امر کی

---

❶ صحیح مسلم، الحج: ۱۳۳۳۔ ❷ صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۴۷۵۔
❸ صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۴۴۰۔ ❹ مسند امام احمد، ص: ۱۲، ج ۲۔

خازن کو اجازت دے کہ تم کسی ضرورت مند کو بطور قرض دے سکتے ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ جب مسجد کو رقم کی ضرورت ہو تو قرض لینے والا حیل و حجت سے کام نہ لے بلکہ اسے واپس کر دے تا کہ مسجد کے کام میں رکاوٹ نہ بنے، اسی طرح اگر مسجد کے فالتو فنڈ کو تجارت میں لگانا ہے تو بھی انتظامیہ کے فیصلے کے مطابق اسے تجارت میں لگایا جا سکتا ہے بشرطیکہ شرح منافع پہلے سے طے کر لی جائے، صورت مسئولہ میں اگر خازن انتظامیہ کی اجازت کے بغیر ایسا کرتا ہے تو قطعاً جائز نہیں اور اگر مسجد کی انتظامیہ نے اسے اجازت دے رکھی ہے تو مسجد کے فالتو چندے کو ذکر کردہ مصارف میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد سے متصل حجرہ نما کمرہ امام و خطیب کو دینا

سوال ہماری مسجد سے متصل ایک حجرہ نما کمرہ ہے جو ڈبل سٹوری پر مشتمل ہے جب کہ اس کا اور مسجد کا صحن مشترک ہے باہر سے مسجد ہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے، وہ حجرہ صرف جمعہ کے دن عورتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس حجرہ کو مسجد کی آبادکاری کے لیے امام و خطیب کے لیے بطور رہائش استعمال کیا جا سکتا ہے؟

جواب مساجد، اللہ کی عبادت، تلاوت قرآن، ذکر الٰہی اور نماز کی ادائیگی کے لیے بنائی جاتی ہیں، لہٰذا ان میں ہر وہ کام جائز ہے جو مذکورہ مقاصد کی ادائیگی میں رکاوٹ کا باعث نہ ہو اور ہر وہ کام منع ہے جو ان کے منافی ہو، اللہ تعالیٰ نے مساجد کو صاف ستھرا، پاک رکھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں محلوں میں مساجد بنانے، ان کی بناوٹ کی اصلاح کرنے اور انہیں پاکیزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے۔ [1]

مذکورہ بالا امور کے پیش نظر مسجد میں اہل و عیال کے بغیر تنہا رہائش رکھنے میں چنداں حرج نہیں جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ وہ نوجوان، غیر شادی شدہ تھے اور مسجد میں سو جایا کرتے تھے۔ [2] نیز ان کا بیان ہے کہ ہم زمانہ نبوت میں مسجد میں سوتے اور اسی میں قیلولہ کرتے جب کہ ہم نوجوان تھے۔ [3]

امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے، ''عورت کا مسجد میں سونا'' پھر ایک بے سہارا عورت کے متعلق حدیث پیش کی ہے جس کا خیمہ مسجد میں تھا۔ [4] لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ کسی قسم کے فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ اہل و عیال کے سمیت مسجد میں رہائش رکھنا مسجد کے تقدس کے خلاف ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ البتہ مسجد سے ملحقہ کمرے کے احکام مسجد جیسے نہیں ہیں، اسے امام و خطیب کی رہائش کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، رہائش خواہ سنگل ہو یا اپنے اہل و عیال کے سمیت، اس کے اوپر یا نیچے امام و خطیب کی رہائش تعمیر ہو سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

کسی مرزائی کو مسجد میں لانا

سوال کیا کسی مرزائی کو وعظ و نصیحت سنانے کے لیے مسجد میں لایا جا سکتا ہے، اسی طرح جمعۃ المبارک کے دن اسے

---

[1] ابو داؤد، الصلوٰۃ: ٤٥٦۔ [2] صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ٤٤٠۔

[3] مسند امام احمد، ص: ١٢، ج٢۔ [4] صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ٤٣٩۔

خطبہ سنانے کے لیے مسجد میں لانا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے جبکہ اس سے مقصود اسے راہ راست پر لانا ہے؟

جواب کسی بھی غیر مسلم کو وعظ و نصیحت کے لیے مسجد میں آنے کی دعوت دی جا سکتی ہے، ممکن ہے کہ اس طرح اسے توبہ اور قبولِ اسلام کی توفیق مل جائے، قرآن کریم میں اس کا واضح اشارہ موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ﴾ [1]

''اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دو تا آنکہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اپنی جائے امن تک پہنچا دو۔''

اس مقام پر مشرک کو پناہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کی باتیں سن لے اور اسے اسلام کو سمجھنے کا موقع مل جائے، اسی طرح اگر مرزائی مسجد میں آنے کی خواہش رکھتا ہے تو اسے موقع دینا چاہیے، اور موقع کی مناسبت سے ایسا درس یا خطبہ دیا جائے جس سے وہ مطمئن ہو سکے، جس آیت کریمہ میں مشرکین کو پلید کہا گیا ہے وہ عقائد و اعمال کی نجاست کی وجہ سے انہیں نجس قرار دیا گیا ہے، ویسے بھی وہاں مسجد حرام میں داخلے کی پابندی کا ذکر ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''مشرک انسان کا مسجد میں داخل ہونا۔'' [2]

پھر انہوں نے اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث پیش کی ہے، جسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سا دستہ نجد کی طرف روانہ فرمایا وہ لوگ قبیلہ بنو حنیفہ کا ایک آدمی پکڑ لائے جسے ثمامہ بن اثال کہا جاتا تھا، اسے مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ [3]

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کو بھی مسجد میں ٹھہرایا تھا، نیز ایک مرتبہ وفد ثقیف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور وہ لوگ مشرک تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد نبوی میں ہی ٹھہرایا تھا۔ [4] بہر حال اگر وعظ و نصیحت اور تبلیغ مقصود ہو تو مرزائی کو خطبہ جمعہ سننے کی دعوت دی جا سکتی ہے، اور اس کا مسجد میں آنا اور خطبہ جمعہ سننا قابل مواخذہ نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

نئی مسجد کی موجودگی میں پہلی مسجد کی جگہ فروخت کرنا

سوال ہم نے اپنی سہولت کے لیے تقریباً ۴ مرلہ پر مشتمل ایک گھریلو مسجد تعمیر کی۔ کچھ عرصہ بعد اس میں جمعہ اور جماعت کا اہتمام کر دیا گیا۔ پھر آبادی کی ضرورت کے پیش نظر اس کے قریب ایک دوسری مسجد ۵۰ مرلہ پر مشتمل تعمیر کی گئی، پہلی مسجد میں بچیوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری کر دیا، جب وہ تعلیم و تدریس کے لیے ناکافی ہوئی تو بڑی مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بنا دیا گیا، اب پہلی مسجد فارغ ہے، اس کا کیا مصرف ہونا چاہیے، کیا اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کسی دوسری مسجد پر لگائی جا سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کے مطابق فتویٰ دیں؟

---

[1] ۹/التوبۃ: ٦۔ [2] صحیح بخاری، الصلوٰۃ، باب: ۸۲۔ [3] صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ٤٦٩۔

[4] مسند امام احمد، ص: ۳٤۳، ج٦۔

جواب مساجد کی کئی ایک اقسام ہیں، ہر قسم کے متعلق شرعی حکم بھی الگ ہے، رسول اللہ ﷺ کے لیے تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا گیا ہے۔ جہاں کہیں دوران سفر نماز کا وقت آ جائے وہیں نماز پڑھ لی جائے۔ [1] تمام روئے زمین کو حکمی طور پر مسجد قرار دیا گیا ہے، اس کے وہ احکام نہیں ہیں جو عام مساجد کے ہوتے ہیں، ایک مسجد وہ ہوتی ہے جو گھر کے کسی کونے کو یا زرعی زمین کے کسی خطہ کو سہولت کے پیش نظر مسجد قرار دے لیا جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے ایک کونے کو مسجد قرار دیا تھا اور رسول اللہ ﷺ سے گزارش کی تھی کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں اور وہاں ایک مرتبہ نماز پڑھیں تاکہ ہم اسے مسجد قرار دیں۔ [2] اس قسم کی مساجد کو گھر یا زمین کا مالک جب چاہے ختم کر سکتا ہے اور اسے اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔ تیسری قسم ان مساجد کی ہے جن میں اذان و جماعت اور جمعہ کا اہتمام ہو اور اس کی زمین باقاعدہ وقف ہو۔ صورت مسئولہ میں اسی قسم کی مساجد کا ذکر ہے کہ جب وہ کسی وجہ سے بے آباد ہو جائیں تو ایسی مساجد کے سامان اور جگہ کو کس مصرف میں خرچ کیا جائے، حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مساجد کو بلاوجہ دوسری جگہ منتقل نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں اگر پہلی مسجد بے آباد ہو جائے یا اس سے وہ مقاصد پورے نہ ہو رہے ہوں جو تعمیر مسجد کے پیش نظر ہوتے ہیں تو ایسے حالات میں ایک مسجد کو دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے، اس صورت میں پہلی مسجد کے ساز و سامان کو دوسری مسجد میں استعمال کیا جا سکتا ہے نیز بے آباد مسجد کی زمین کو فروخت کر کے اس کی قیمت کسی دوسری مسجد میں خرچ کی جا سکتی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی ایک پرانی مسجد کو دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا اور پہلی مسجد کی جگہ کھجور منڈی بنا دی تھی۔ کیونکہ پہلے بیت المال محفوظ جگہ پر نہیں تھا، اس کی حفاظت مقصود تھی اور اسے دوسری مسجد کے قبلہ طرف بنایا تاکہ آنے جانے والے نمازی اس پر نظر رکھیں۔ [3]

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں جب کوئی مسجد بے آباد ہو جائے تو اس کے سامان کو دوسری مسجد میں استعمال کیا جا سکتا ہے، نیز اس کی زمین فروخت کر کے اس کی قیمت بھی دوسری مسجد میں صرف کی جا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد کے نیچے مارکیٹ یا ہسپتال

سوال ایک مسجد میں عرصہ دراز سے جماعت اور نماز کا اہتمام جاری ہے، اب اس کی شکستہ حالی کی وجہ سے اسے منہدم کر کے از سر نو تعمیر کرنا ضروری ہو چکا ہے، کیا نیچے مارکیٹ یا ہسپتال تعمیر ہو سکتا ہے جب کہ حاصل ہونے والی مالی منفعت بھی مسجد کے لیے مختص ہوگی، قریبی فرصت میں اس کی وضاحت کر دیں؟

جواب ایک مسجد جس میں نماز باجماعت اور جمعہ وغیرہ کا اہتمام ہو چکا ہو، بلاوجہ اس کی حیثیت ختم کرنا جائز نہیں ہے ہاں اگر مسجد بے آباد ہو جائے یا اس سے وہ مقاصد پورے نہ ہو رہے ہوں جو تعمیر کے وقت پیش نظر ہوتے ہیں تو ایسے حالات میں اس کی حیثیت کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ صورت مسئولہ میں مسجد شکستہ حال ہو چکی ہے، اس لیے اسے منہدم کر کے اس کی تعمیر نو کرنا

---

[1] صحیح بخاری، تیمم: ۳۳۵۔ [2] صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۴۲۵۔

[3] مجموع الفتاویٰ، ص: ۲۱۶، ج۳۱۔

ضروری ہو چکا ہے اگر اہل مسجد انتظام چلانے کی ہمت نہ رکھتے ہوں تو اس کے نیچے مارکیٹ یا ہسپتال بنانے میں چنداں حرج نہیں ہے بشرطیکہ اس سے حاصل ہونے والی منفعت مسجد کے لیے ہی مختص ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی ایک پرانی مسجد کو دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا اور پہلی مسجد کی جگہ کھجور مارکیٹ بنا دی تھی، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مجموعہ الفتاویٰ میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ [1]

اگر مسجد کے نیچے مارکیٹ بنانا ہو تو درج ذیل شرائط کا اہتمام کیا جائے۔

☆ کرایہ دار حضرات ایسا کاروبار نہ کریں جو مسجد کے تقدس کے منافی ہو۔

☆ کرایہ دار کسی دوسرے کو پگڑی پر دوکان دینے کے مجاز نہیں ہوں گے۔

☆ کرایہ دار حضرات کو کسی قسم کی تنظیم سازی کی کسی صورت میں اجازت نہ دی جائے۔

☆ مسجد کی دوکانوں کا کرایہ محل وقوع کے مطابق ہو، اسے خیرات خیال کر کے تقسیم نہ کیا جائے۔

☆ مسجد کی دوکانوں کے متعلق وہی شرائط لاگو ہوں جو دوسری دوکانوں کے لیے ہوتی ہیں۔

بہرحال مارکیٹ بناتے وقت اس کے تقدس، مقاصد اور مفادات کو ضرور پیش نظر رکھا جائے، بصورت دیگر مسجد کے نیچے مارکیٹ وغیرہ بنانے سے گریز کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ مسجد اللہ کا گھر ہے، وہ خود اس کا انتظام چلانے کے لیے اسباب و ذرائع پیدا فرمائے گا۔ اہل مسجد کے اخلاص کے پیش نظر اللہ تعالیٰ مسجد کے مفادات کا تحفظ کرے گا، اس کے نیچے مارکیٹ بنا کر ''مزعومہ مفادات'' سے گریز کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] مجموع الفتاویٰ، ص: ۲۶۵، ج ۳۱۔
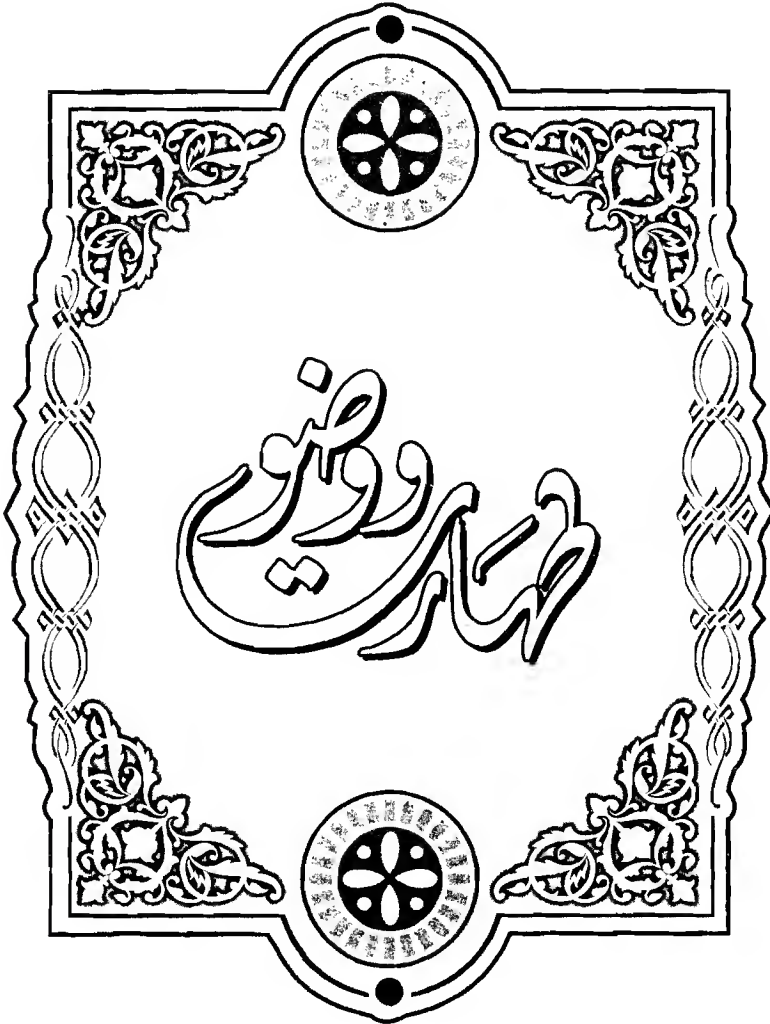
طہارت و وضو

طہارت و وضو

طہارت کے لیے صرف ڈھیلے استعمال کرنا

سوال ایک آدمی نے قضائے حاجت کے بعد صرف ڈھیلے استعمال کئے پانی سے استنجا نہیں کیا، اس کے بعد وضو کر کے جماعت کرادی، کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں فتوی دیں۔

جواب واضح رہے کہ امامت کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے، امام کو چاہیے کہ وہ اپنے مقتدیوں کے سامنے قطعاً کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے ان کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوسکتا ہو، چونکہ امام مقتدیوں کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے امام کے لیے بہترین اخلاق اور مثالی کردار کا حامل ہونا ضروری ہے بلاشبہ قضائے حاجت کے بعد صرف ڈھیلے استعمال کرنے سے طہارت مکمل ہوجاتی ہے، اگر ایسا کرنے کے بعد باوضو ہو کر نماز پڑھاتا ہے تو اس کی نماز میں کوئی نقص نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جب تم میں سے کوئی قضائے حاجت کے لیے جائے تو طہارت کے لیے تین پتھر ساتھ لے جائے، فراغت کے بعد انہیں استعمال کرنا طہارت کے لیے کافی ہے۔ [1]

تاہم بہتر ہے کہ پانی سے استنجا کیا جائے کیونکہ پانی سے طہارت اور صفائی اچھی طرح ہوجاتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

> ''عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے خاوندوں کو پانی سے استنجا کرنے کی تلقین کریں کیونکہ ایسے معاملات میں مجھے گفتگو کرنے سے شرم آتی ہے رسول اللہ ﷺ ایسا کرتے تھے یعنی وہ پانی سے استنجا کرتے تھے۔'' [2]

اگر ڈھیلے اور پانی دونوں میسر ہوں اور ڈھیلے استعمال کرنے کے بعد پانی سے استنجا کیا جائے تو بہت بڑی فضیلت ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اہل قباء کی طہارت کے متعلق فضیلت بیان فرمائی ہے۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے بتایا کہ ہم ڈھیلے استعمال کرنے کے بعد پانی استعمال کرتے ہیں بہرحال امام کو چاہیے کہ وہ ایسی باتوں کا خیال رکھے اور مقتدیوں کو بھی چاہیے کہ وہ ایسی باتوں کو فتنہ وفساد کا ذریعہ نہ بنائیں، اگر مسئلے کا علم نہ ہو تو کسی اہل علم کی طرف رجوع کریں۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ابو داؤد، کتاب الطھارۃ:٤٠۔

[2] نسائی، کتاب الطھارۃ:٤٦۔

نماز میں وساوس آنا

سوال میں ایک ذہنی مریض ہوں، مجھے دوران نماز وہم پڑ جاتا ہے کہ میرا وضو ٹوٹ گیا ہے، کیا وہم کی وجہ سے دوبارہ وضو کرنا پڑتا ہے؟

جواب وضو کرنے کے بعد جب تک وضو ٹوٹنے کا یقین نہ ہو جائے دوبارہ وضو نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں ہوا کی حرکت محسوس کرے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ پیٹ سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہیں تو ایسی صورت میں وہ وضو کے لیے مسجد سے باہر نہ جائے تا آنکہ وہ آواز سن لے یا بو محسوس کرے۔'' [1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محض شک یا وہم پڑنے سے دوبارہ وضو نہیں کرنا چاہیے حتیٰ کہ انسان کو اس کے متعلق یقین نہ ہو جائے۔ محدثین نے اس حدیث سے ایک عظیم قاعدہ اخذ کیا ہے کہ ہر چیز اپنے اصل پر باقی رہتی ہے تاوقتیکہ اس کے خلاف یقین اور وثوق نہ ہو جائے۔ محض شک تردد اور وہم کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس بنا پر صورت مسئولہ کے متعلق ہمارا رجحان یہ ہے کہ دوران نماز محض وہم پڑنے سے کہ میرا وضو ٹوٹ گیا ہے، وضو نہیں ٹوٹتا، جب تک وضو ٹوٹنے کا یقین نہ ہو جائے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

تلاوت کے لیے وضو کرنا

سوال قرآن مجید کی تلاوت وضو کے بغیر ہو سکتی ہے یا نہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب بہتر ہے کہ انسان باوضو ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرے تاہم وضو کے بغیر بھی تلاوت کرنا درست ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ ذکر کیا ہے ''بے وضو ہونے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرنا۔'' [2]

اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے تھے، جب بیدار ہوئے تو اپنے ہاتھ سے آنکھوں کو صاف کیا اور نیند کے اثرات دور کیے، پھر سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات تلاوت فرمائیں، اس کے بعد ایک لٹکے ہوئے مشکیزے کی طرف بڑھے، اس سے وضو کیا، پھر نماز تہجد شروع کی۔ [3] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان بے وضو ہونے کے بعد بھی قرآن مجید کی تلاوت کر سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

شرمگاہ کو چھونے سے وضو کا ٹوٹنا

سوال وضو کرنے کے بعد اگر آدمی اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگائے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے نیز کیا عورت کے لیے بھی یہی حکم ہے؟

جواب اگر آدمی نے وضو کیا ہے تو اس کے بعد اس کا ہاتھ شرمگاہ کو لگ جاتا ہے تو اس سے وضو برقرار نہیں رہے گا بلکہ اسے

---

[1] صحیح مسلم، الحیض: ۳۶۲۔ [2] بخاری، الوضوء، باب نمبر ۳۶۔
[3] صحیح بخاری، الوضوء: ۱۸۳۔

نیا وضو کرنا ہوگا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنی شرمگاہ کو چھوا اسے چاہیے کہ وضو کرے۔ [1] ناقض وضو کے اس حکم میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو کوئی مرد اپنی شرمگاہ کو چھوئے اسے چاہیے کہ وضو کرے اور جو کوئی عورت اپنی شرمگاہ کو چھوئے وہ بھی وضو کرے۔ [2] لغت کے اعتبار سے لفظ فرج قُبل اور دُبر دونوں کو شامل ہے البتہ ایک دوسری حدیث بظاہر اس کے معارض معلوم ہوتی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ایسے شخص کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جس نے وضو کرنے کے بعد اپنی شرمگاہ کو چھو لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ تو صرف اس کے جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔'' [3]

محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے ان دو احادیث کے درمیان تطبیق بایں طور پر بیان کی ہے کہ شرمگاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ ہاتھ اور شرمگاہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو بلکہ براہ راست چھوا جائے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنی شرمگاہ کو کسی پردے کے بغیر چھوئے تو اس پر وضو واجب ہے۔'' [4] بہر حال وضو کے بعد اگر کوئی مرد یا عورت کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر شرمگاہ کو چھوئے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ہاں اگر درمیان میں کوئی پردہ حائل ہو تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (واللہ اعلم)

جمی ہوئی مٹی سے تیمم کرنا

سوال: بارش کی وجہ سے اگر زمین کی مٹی جم گئی ہو وہاں غبار وغیرہ نہ ہو تو کیا اس پر تیمم کیا جا سکتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب: تیمم کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ [5]

''اگر تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم کے لیے مٹی کا ہونا شرط ہے، اس پر غبار ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ جب بھی مٹی پر ہاتھ مار کر تیمم کر لیا جائے تو یہ کافی ہے۔ لہٰذا جب کسی زمین پر بارش پڑنے کی وجہ سے اس کی مٹی جم گئی ہو تو انسان کو چاہیے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مار کر دونوں ہاتھوں اور چہرے کا مسح کر لے، اس صورت میں تیمم صحیح ہے اگر دیوار پاک مٹی سے بنی ہوئی ہے تو اس کے ساتھ تیمم کرنا جائز ہے ہاں اگر دیوار پر لکڑی کا کام ہوا ہے یا اس پر ٹائل لگی ہے تو غبار ہونے کی صورت میں تیمم کیا جا سکتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے وہ زمین پر تیمم کر رہا ہے کیونکہ غبار مٹی کے مادے سے ہے اور اگر غبار نہ ہو تو اس پر تیمم جائز نہیں کیونکہ وہ مٹی سے تیمم نہیں کر رہا، اسی طرح اگر فرش وغیرہ پر غبار ہو تو اس پر ہاتھ مار کر تیمم کیا جا سکتا ہے اور اگر اس پر غبار نہ ہو تو

---

[1] ابو داود، الطهارة: ۱۸۱۔ [2] مسند امام احمد ص ۲۲۳ ج ۲۔ [3] ابن ماجه، الطهارة: ۴۸۳۔

[4] مسند امام احمد، ص: ۳۳۳ ج ۲۔ [5] ۵/المائدة: ۶۔

اس پر تیمم نہیں ہوسکتا، بہر حال بارش کی وجہ سے جمی ہوئی مٹی پر تیمم ہوسکتا ہے اگر چہ اس پر غبار نہ ہو لیکن لکڑی اور فرش وغیرہ پر اگر غبار ہو تو تیمم جائز ہے بصورت دیگر اس سے تیمم نہیں کرنا چاہیے۔

بچے کا پیشاب کپڑوں کو لگ جائے تو؟

سوال چھوٹے بچے کا پیشاب اگر کپڑوں کو لگ جائے تو کیا اسے دھونا چاہیے یا اس پر پانی بہا دیا جائے؟ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب پیشاب پلید ہے، اسے دھونا چاہیے، البتہ بچے کے پیشاب میں شریعت نے کچھ نرمی کی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: لڑکی کے پیشاب سے آلودہ کپڑا دھویا جائے۔ البتہ لڑکے کے پیشاب سے آلودہ کپڑے پر چھینٹے مارے جائیں گے۔ [1]

لیکن یہ اس وقت ہے جب بچہ دودھ پیتا ہو جیسا کہ ایک روایت میں اس کی وضاحت ہے۔ چنانچہ حضرت ام قیس بنت محصن رضی اللہ عنہا اپنے چھوٹے بچے کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آئیں جو ابھی دودھ پیتا تھا، اس بچے نے آپ ﷺ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا، اس پر چھینٹے مارے لیکن اسے دھویا نہیں۔ [2]

البتہ اگر لڑکی کسی کپڑے پر پیشاب کر دے تو اسے دھونا چاہیے وہ صرف چھینٹے مارنے سے پاک نہیں ہوگا کیونکہ پیشاب ناپاک ہے خواہ بچی کا ہو یا بچے کا، البتہ بچے کے پیشاب کے لیے شریعت نے کچھ نرمی رکھی ہے کہ اسے دھونے کے بجائے کپڑے پر صرف چھینٹے مار دیے جائیں۔ صورت مسئولہ میں اگر کسی لڑکی کا پیشاب لگا ہے تو اسے دھو لیا جائے اور اگر شیر خوار بچے کا پیشاب ہے تو اس پر ویسے ہی پانی بہا دیا جائے، اسے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

جرابوں یا موزوں پر مسح کرنا؟

سوال جرابوں یا موزوں پر مسح کب کیا جاسکتا ہے، اس کا کیا طریقہ ہے، نیز مسح کرنے کی اجازت کس حد تک ہے؟ تفصیل سے راہنمائی کریں۔

جواب جرابوں یا موزوں پر مسح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں باوضو ہو کر پہنا جائے پھر جب وضو ٹوٹے گا تو تازہ وضو سے اس کی مدت شروع ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''ان موزوں کو چھوڑ دو کیونکہ جب یہ موزے پہنے تھے تو میں وضو سے تھا۔'' [3]

جرابوں اور موزوں کے اوپر والے حصے پر مسح کرنا چاہیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر دین کا دارومدار رائے اور عقل پر ہوتا تو پھر موزوں کی نچلی سطح پر مسح کرنا زیادہ قرین قیاس تھا، نہ کہ اوپر والی سطح پر جبکہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو

---

[1] ابو داود، الطهارة: ٣٧٦۔ [2] مستدرك حاكم، ص: ١٦٦ ج ١-

[3] صحيح بخاري، الوضوء: ٢٠٦۔

موزوں کے بالائی حصہ پر مسح کرتے دیکھا ہے۔ ❶

مسح کی کیفیت کے متعلق کوئی صحیح حدیث ہماری نظر سے نہیں گزری، لہٰذا اتنے حصہ کا مس کرنا جسے لغت اور عرف میں مسح کہا جا سکتا ہے کفایت کر جائے گا۔ انگلیوں کو تر کر کے اوپر کی جانب خط کھینچ لیا جائے۔ اس کی مدت مقیم کے لیے ایک دن ایک رات اور مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: ''مسافر کے لیے تین رات اور تین دن اور مقیم کے لیے ایک دن اور رات مسح کی مدت ہے۔'' ❷ اس دوران اگر جنابت یا احتلام ہو جائے تو انہیں اتارنا ضروری ہے۔ (یعنی پاؤں پر مسح کے بجائے ان کو دھویا جائے گا)۔ ❸

باریک جرابوں پر مسح

سوال جرابوں پر مسح کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے، کیا ان کے لیے موٹا یا باریک ہونے کی شرط ہے یا نہیں؟ سردی کے موسم میں اکثر لوگ جرابوں پر مسح کرتے ہیں لیکن کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ موجودہ جرابوں پر مسح جائز نہیں ہے۔ ہم لوگ بہت فکر مند ہیں کہ ہماری وہ نمازیں جو ہم نے جرابوں پر مسح کر کے ادا کی ہیں، وہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں۔ براہ کرم اس کی وضاحت کر دیں۔

جواب دین اسلام کی بنیاد سہولت پر ہے اور شریعت کے تمام احکام میں اس قدر سہولت رکھی گئی ہے کہ مزید رعایت کا تصور نہیں ہو سکتا، اس لیے دین اسلام رحمت اور دلوں کی تسکین کا باعث ہے سخت سردی کے دنوں میں جرابوں پر مسح کی سہولت بھی اسی نوعیت کی ہے، جرابوں پر مسح کے متعلق چند ایک احادیث کتب حدیث میں مروی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ کسی مہم کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا، جنہیں سردی سے بہت تکلیف ہوئی، جب وہ واپس آئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے سخت سردی کی شکایت کی، آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ ایسے حالات میں پگڑی اور جرابوں پر مسح کر لیا کریں۔ ❹

اس حدیث کے پیش نظر سردی کے موسم میں جرابوں پر مسح کی رخصت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا تو جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔ ❺

اس حدیث کے پیش نظر متعدد صحابہ کرام جرابوں اور جوتوں پر مسح کرنے کے قائل اور فاعل ہیں، علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام نے جرابوں پر مسح کیا ہے اور ان کے زمانہ میں کوئی بھی ان کا مخالف ظاہر نہیں ہوا، لہٰذا یہ اجماع کی مانند ہی ہے۔ ❻

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور جرابوں نیز جوتوں پر مسح کیا۔ ❼

اس کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری حدیث مروی ہے جو صریح الدلالۃ اور صحیح الاسناد ہے، حضرت ازرق بن قیس کہتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بے وضو ہوئے تو انہوں نے اپنا چہرہ اور ہاتھ دھوئے، پھر انہوں نے اونی

---

❶ بیهقی، ص: ۲۹۲، ج۱- ❷ صحیح مسلم، الطهارة: ٦٧٦_ ❸ مسند امام احمد، ص: ۲۳۹، ج٤_

❹ مسند امام احمد، ص: ۲۷۵، ج۲- ❺ مسند امام احمد، ص: ۲۵۲، ج٤_

❻ المغنی، ص: ۳۷٤، ج۱_ ❼ ابن ماجه، الطهارة: ٥٦٠_

جرابوں پر مسح کیا، میں نے کہا ان پر مسح کرنا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں'' یہ بھی موزے ہیں، لیکن یہ چمڑے کے بجائے اون کے ہیں۔ ❶

بہر حال ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ جرابوں پر مسح جائز ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

پیشاب آلود کپڑے دھو کر غسل کرنا

سوال شیر خوار لڑکے کے پیشاب آلود کپڑے دھونے سے کیا غسل کرنا ضروری ہے؟ براے مہربانی وضاحت کر دیں۔

جواب شیر خوار لڑکے کا پیشاب بلاشبہ نجس ہے، البتہ کپڑوں کو لگ جانے سے انہیں دھونا ضروری نہیں ہے، صرف چھینٹے مار لینا ہی کافی ہے، البتہ بچی کے پیشاب لگنے سے کپڑا دھونا چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک بچہ لایا گیا اس نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا تو آپ ﷺ نے پانی منگوا کر اس پر چھینٹے مارے اور اسے دھویا نہیں۔ ❷

ایک حدیث میں ہے کہ بچے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جائیں اور بچی کے پیشاب کو دھویا جائے۔ ❸ لیکن اگر پیشاب آلود کپڑے دھونے پڑیں تو اس سے غسل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ ان اسباب سے نہیں جن سے غسل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

دوران نماز سلسل البول ہونا

سوال میری عمر تقریباً ۲۶ سال ہے، مجھے پیشاب کے بعد قطرے آنے کا مرض لاحق ہے، نماز کا باقاعدہ اہتمام کرتا ہوں مگر ان ناپاک قطروں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ قرآن و حدیث کے مطابق مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب شریعت مطہرہ کی بنیاد آسانی اور رفع حرج پر ہے، اگر کسی کو مسلسل پیشاب کے قطرے آتے ہیں یا اس کی ہوا خارج ہوتی رہتی ہے تو اس کے لیے شرعی حکم یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرے اور اس وضو سے موجودہ نماز اور اس کے متعلقات ادا کرے۔ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا اس کی طہارت ہے، اس کی نظیر استحاضہ والی عورت ہے جسے مسلسل خون آتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایسی عورت کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کر کے اسے پڑھ لے چنانچہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ مجھے مسلسل خون آتا اور میں پاک نہیں ہوتی ہوں ایسی حالت مجھے نماز ترک کرنے کی اجازت ہے؟ آپ نے فرمایا: خون حیض کے وقت نماز چھوڑنے کی اجازت ہے اور اس کی شناخت ہو جاتی ہے جب خون حیض کے علاوہ اور خون ہو تو وضو کر کے نماز ادا کرتی رہو۔ ❹

ایسے حالات میں نماز پڑھنے کا حکم ہے اگرچہ دوران نماز قطرے آتے رہیں اور ہوا وغیرہ بھی خارج ہوتی رہے، نماز چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے البتہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنے کا حکم ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ الکنیٰ والاسماء، ص: ۱۸۱، ج ۱۔ ❷ صحیح بخاری، الوضوء: ۲۲۳۔
❸ ابن ماجه، الطهارة: ۵۲۲۔ ❹ ابو داؤد، الطهارة: ۲۸۶۔

بیماری کی وجہ سے پیشاب نکلنا

سوال میرا مثانہ کمزور ہے، معمولی سی کھانسی یا چھینک آنے سے پیشاب نکل جاتا ہے، ایسے حالات میں میرے لیے کیا حکم ہے، بار بار کپڑوں کو تبدیل کرنا بہت مشکل ہے؟ اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ پیشاب نجس اور پلید ہے اور جس کپڑے کو لگ جائے اسے دھونا ضروری ہے اس قسم کی بیماری کے دوران ایک الگ کپڑا (لنگوٹ، جانگیہ، انڈر رویئر) استعمال کیا جاسکتا ہے، نماز کی ادائیگی کے وقت اسے اتار لیا جائے اور طہارت حاصل کر کے نماز پڑھ لی جائے، اور اگر دوران نماز یہ عمل جاری رہتا ہے تو ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [1]

''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

ایسے حالات میں وہ اپنی نماز کو جاری رکھے اور ایک دفعہ وضو کرنے کے بعد ایک نماز سنتوں سمیت ادا کی جاسکتی ہے، دوسری نماز کے لیے تازہ وضو کرنا ہوگا، بعض لوگوں کو پیشاب کے قطرے آتے رہتے ہیں، یا ہوا خارج ہوتی رہتی ہے، ان کا بھی یہی حکم ہے، اگر ایام کے بعد عورتوں کا خون جاری ہے تو ان کا بھی یہی حکم ہے۔ بہر حال صورت مسئولہ میں شریعت کا یہ حکم ہے کہ وہ پیشاب آلود کپڑے کو پاک کرے اور پاکیزہ کپڑوں میں نماز ادا کرے اور اگر دوران نماز بیماری کی وجہ سے پیشاب آجائے تو اپنی نماز کو جاری رکھے، نماز پڑھنے کی حد تک وضو برقرار رہے گا، اس کے بعد دوسری نماز کے لیے کپڑے تبدیل کر کے از سرنو وضو کیا جائے تو پھر نماز ادا کی جائے۔ (واللہ اعلم)

دوران وضو باتیں کرنا

سوال کچھ لوگ وضو کی جگہ پر بیٹھے ہوئے دوران وضو باتیں کرتے رہتے ہیں، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟ کیا وضو خاموشی سے کرنا چاہیے؟

جواب وضو کے دوران، گپیں لگانے اور دنیوی گفتگو کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے، اسے کسی صورت میں مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ بہت ضروری یا وضو سے متعلق گفتگو کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کر رہے تھے، میں ان کے موزے اتارنے کے لیے جھکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''انہیں چھوڑ دو، میں نے جب انہیں پہنا تھا تو میں اس وقت وضو کی حالت میں تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مسح کر لیا۔'' [2]

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرمائی تو آپ کا وضو ابھی مکمل نہیں ہوا تھا بلکہ دوران وضو ہی آپ نے گفتگو فرمائی، اس سے ثابت ہوا کہ دوران وضو گفتگو جائز اور درست ہے، لیکن وضو کرتے وقت دنیاوی باتیں کرنا، فضول گپیں ہانکنا اچھا کام نہیں ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

---

[1] ۲/البقرہ:۲۸۶۔ [2] صحیح بخاری، الوضوء:۲۰۶۔

شک کی بنا پر دوبارہ وضو کرنا

سوال بعض اوقات دورانِ نماز وضوٹوٹنے کا شک پڑ جاتا ہے، ایسی حالت میں نماز ختم کر کے دوبارہ وضو کرنا چاہیے یا اپنی نماز کو جاری رکھا جائے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کر دیں۔

جواب جب طہارت کے متعلق یقین ہو تو صرف شک کی وجہ سے عدم طہارت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ہے تاوقتیکہ وضو ٹوٹنے کا یقین نہ ہو جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس شخص کے متعلق سوال کیا گیا جو دوران نماز اپنے پیٹ میں کچھ محسوس کرتا ہے، آیا اس کا وضو باقی ہے یا نہیں تو آپ نے فرمایا: ''وہ نماز سے نہ نکلے یہاں تک کہ خروج ریح کی آواز سنے یا بدبو پائے۔'' [1]
اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ طہارت حاصل کرنے کے بعد اصل طہارت اور پاکیزگی ہے تاوقتیکہ اس کا بے وضو ہونا یقینی طور پر ثابت نہ ہو جائے۔ شک کی صورت میں اس کی طہارت زائل نہیں ہوگی بلکہ باقی اور برقرار رہے گی لہٰذا محض شک پڑنے سے نماز ختم نہ کی جائے بلکہ اس صورت میں اس کا نماز میں مصروف رہنا صحیح اور درست ہے، ہاں اگر اس کا بے وضو ہونا یقینی طور پر ثابت ہو جائے تو نماز ختم کر کے دوبارہ وضو کرے، رسول اللہ ﷺ نے یقینی طور پر بے وضو ہونے کی دو علامتیں بیان کی ہیں: نکلنے والی ہوا کی آواز سنے یا اس کی بدبو پائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے بغیر بھی بے وضو ہونے کا یقین ہو جائے تو بھی اسے دوبارہ وضو کرنا ہوگا، یقین ہو جانے کے بعد ہوا کی آواز یا اس کی بدبو کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

حیض آلود کپڑے دھونا

سوال حیض آلود کپڑے دھوتے وقت اگر ان کے چھینٹے بدن یا دوسرے کپڑوں پر پڑ جائیں تو شرعی اعتبار سے اس کا کیا حکم ہے، کیا غسل کرنا ہوگا اور ان کپڑوں کو دھونا ہوگا، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب حیض کا خون نجس اور پلید ہے، لہٰذا جس کپڑے کو یہ خون لگ جائے اسے دھونا ضروری ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تم میں سے کسی عورت کے کپڑے کو حیض کا خون لگ جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کپڑے کو ملے پھر اس کو اچھی طرح دھوئے، اس کے بعد اسے پہن کر نماز پڑھ لے۔'' [2]
چونکہ یہ خون نجس ہے اور اس پر جو پانی بہایا جائے گا اگر اس کے چھینٹے دوسرے کپڑوں پر پڑتے ہیں تو انہیں بھی دھونا ضروری ہے، عقل مند عورتیں غسل فرض سے پہلے ان کپڑوں کو بہت احتیاط سے دھو لیتی ہیں، اس کے بعد غسل کر لیتی ہیں، لیکن اگر کوئی فرض غسل کے بعد ان کپڑوں کو دھوتی ہے اور اس کے چھینٹے دوسرے کپڑوں اور بدن پر پڑتے ہیں تو اسے دوسرے کپڑوں کو دھونا ہوگا اور غسل بھی کرنا ہوگا، احتیاط کا یہی تقاضا ہے۔ (واللہ اعلم)

خون نفاس کی مدت

سوال خونِ نفاس کی مدت کتنی ہے اور اگر وقفے وقفے سے خون آئے تو شرعی طور پر اس کا کیا حکم ہے؟

---

[1] صحیح بخاری، الوضوء: ۱۳۷۔ [2] صحیح بخاری، الحیض: ۳۰۷۔

جواب زچگی کے بعد جو خون آتا ہے اسے نفاس کہا جاتا ہے، اس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد رسالت میں نفاس والی عورتیں چالیس دن عدت گزارتی تھیں۔ [1]

اگر اس سے پہلے طہارت ہو جائے یعنی خون رک جائے تو زچہ کو چاہیے کہ وہ غسل کر کے نماز وروزہ شروع کر دے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاس والی خواتین کے لیے چالیس دن کی مدت مقرر کی اگر وہ اس سے قبل طہارت حاصل کر لیں تو الگ بات ہے۔ [2]

اس سند کے متعلق محدثین نے کچھ کلام کیا ہے تاہم حافظ بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [3] اگر نفاس والی عورت چالیس دنوں سے پہلے پاک ہو جائے لیکن کچھ دنوں بعد چالیس دنوں کے اندر اسے دوبارہ خون شروع ہو جائے تو اس کے متعلق یہ حکم ہے کہ چالیس دنوں کے اندر تو اسے نفاس ہی سمجھا جائے گا اور اگر چالیس دنوں کے بعد خون جاری ہوتا ہے تو وہ استحاضہ کے حکم میں ہے، اگر کسی عورت کو چالیس دن کے بعد تک خون آتا ہے تو اس میں کچھ تفصیل ہے، اگر عورت کی عادت پہلے سے ہی چالیس دن سے زائد کی ہے تو وہ اپنی عادت کے مطابق عمل کرے اور اگر پہلے سے اس کی عادت نہیں بلکہ ہنگامی طور پر ایسا ہوا ہے ہمارا رجحان یہ ہے کہ وہ چالیس دن پورے کرنے کے بعد غسل کر کے نماز اور روزہ شروع کر دے۔ کیونکہ وہ اس صورت میں مستحاضہ کے حکم میں ہے، اس قسم کا خون عبادات کی ادائیگی میں رکاوٹ کا باعث نہیں ہے۔ واضح رہے کہ کچھ عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ انہیں وضع حمل کے بعد خون آتا ہی نہیں۔ ایسی عورت کو انتظار کی ضرورت نہیں، وہ زچگی کے بعد غسل کر کے نماز وروزہ شروع کر دے اگرچہ ایسی عورتیں بہت کم ہوتی ہیں، بہر حال انہیں چالیس دن تک انتظار کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

بیوی سے دل لگی اور بوس و کنار سے غسل کا وجوب

سوال کیا بیوی سے دل لگی اور بوس و کنار کرنے سے غسل واجب ہو جاتا ہے؟ کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں، تفصیل سے بیان کریں۔

جواب مرد کا اپنی بیوی سے دل لگی کرنا اور اس سے بوس و کنار کرنا یہ غسل کے اسباب سے نہیں ہے۔ ہاں اگر اس دوران انزال ہو جائے تو غسل واجب ہوگا، یہ حکم اس صورت میں ہے جب محض دل لگی اور بوس و کنار کی حد تک خوش طبعی کی جائے۔ اگر جماع کی صورت ہے تو اس میں مرد اور عورت دونوں پر غسل واجب ہے خواہ انزال نہ بھی ہو، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب آدمی عورت کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھ جائے اور اس کے ساتھ جماع کی کوشش کرے تو اس سے غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ اسے انزال نہ ہو۔'' [4] جماع کے علاوہ دیگر لطف اندوزی کی تمام صورتوں میں اس وقت غسل واجب ہو جاتا ہے جب انزال ہو، البتہ جماع کے لیے انزال کا ہونا ضروری نہیں، ہمارے اکثر مردوں اور عورتوں کو معلوم نہیں، ان کے ہاں ایسی صورت میں اس وقت غسل واجب ہوتا ہے جب انزال ہو، بصورت دیگر وہ غسل کو ضروری

---

[1] مسند امام احمد، ص: ٣٠٤، ج٦۔ [2] بیهقی، ص: ٣٤٣، ج١۔

[3] ابن ماجه، الطهارة: ٦٤٩۔ [4] صحیح البخاری، الغسل: ٢٩١۔

خیال نہیں کرتے حالانکہ یہ طرز عمل کتاب و سنت کے خلاف ہے۔(واللہ اعلم)

غسل جنابت کے لیے پانی نہ ملنا

سوال اگر کوئی انسان حالتِ جنابت میں ہو اور اسے پانی دستیاب نہ ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے، کیا ایسی حالت میں تیمم کر کے نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب جب انسان جنبی ہو تو اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ [1]

''اگر تمہیں جنابت لاحق ہو تو غسل کر کے پاک ہو جایا کرو۔''

اگر پانی دستیاب نہ ہو یا اس کے استعمال سے کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو تیمم سے کام چلایا جا سکتا ہے، قرآن کریم میں اس کی صراحت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ [2]

''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضاء حاجت سے فارغ ہوا ہو یا تم اپنی عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح کر لو یعنی تیمم کر لو۔''

تیمم کرنے سے انسان جنابت سے پاک ہو جاتا ہے اور اس وقت تک پاک رہے گا۔ جب تک اسے پانی نہیں ملتا اور جب اسے پانی مل جائے گا تو اس پر غسل کرنا ضروری ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو الگ تھلگ دیکھا جس نے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز ادا نہیں کی تھی، رسول اللہ ﷺ نے اس سے دریافت کیا: ''تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی؟'' اس نے عرض کیا میں جنابت کی حالت میں ہوں اور یہاں پانی موجود نہیں ہے تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا: ''مٹی کو استعمال کر لو، تمہارے لیے کافی ہے۔'' اس کے بعد پانی مل گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے پانی دیتے ہوئے فرمایا: ''جاؤ اور اسے اپنے اوپر ڈال لو۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تیمم کرنے والے کو جب پانی مل جائے تو اس کے لیے پانی سے طہارت حاصل کرنا ضروری ہے خواہ اس نے جنابت کی وجہ سے تیمم کیا ہو، جنابت سے تیمم کرنے والا اس وقت تک پاک ہے جب تک وہ دوبارہ جنبی نہیں ہوتا یا اسے پانی نہیں ملتا، اگر اسے پانی مل جائے تو اس وقت پانی سے طہارت حاصل کرنا ضروری ہے اور تیمم سے جو عبادات کی ہیں انہیں دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اونٹ کے گوشت سے وضو کرنا

سوال کیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، قرآن و حدیث کے مطابق جواب دیں۔

---

[1] ٥/المائدۃ: ٦۔ [2] ٥/المائدۃ: ٦۔ [3] صحیح بخاری، التیمم: ٣٤٤۔

جواب اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے، اس کے بعد حقیقی وضو کرنا ہوگا، حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے سوال کیا، آیا میں اونٹ کے گوشت سے وضو کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اونٹ کے گوشت سے وضو کرو۔ [1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہیے، وہ گوشت جسم کے کسی حصے یا عضو کا ہو، ناقض وضو ہے، اس کے علاوہ کسی بھی حلال جانور کا گوشت ناقض وضو نہیں۔ (واللہ اعلم)

غسل جنابت کرتے وقت سر کا مسح کرنا

سوال غسل جنابت کرتے وقت سر کا مسح کرنا چاہیے یا اس کی ضرورت نہیں، قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل جنابت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آپ نے اس طرح وضو کیا جس طرح نماز کے لیے وضو کرتے تھے۔ [2] اس حدیث کے عموم کا تقاضا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل جنابت کے دوران وضو کرتے ہوئے سر کا مسح بھی کرتے تھے البتہ پاؤں کے متعلق صراحت ہے کہ آپ فراغت کے بعد دوسری جگہ ہٹ کر وہاں پاؤں دھوتے تھے۔ [3]

البتہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ’’غسل جنابت میں وضو کرتے وقت مسح ترک کرنا‘‘ پھر انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل جنابت کا بیان ہے۔ اس حدیث میں صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا مسح نہیں کیا بلکہ سارے جسم پر پانی بہالیا۔ [4]

اس حدیث میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل جنابت کرتے وقت جو وضو کرتے تھے اس میں مسح نہیں کرتے تھے، محدثین کرام نے ان احادیث میں تطبیق کی دو صورتیں کی ہیں:

① پہلی حدیث کے عموم سے سر کے مسح کو خاص کرلیا جائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل جنابت میں نماز جیسا وضو کرتے البتہ اس میں سر کا مسح نہیں کرتے تھے، اس کے بجائے سر پر پانی بہالیتے۔

② بیان جواز کے لیے کبھی غسل جنابت میں وضو کرتے ہوئے مسح کر لیتے اور بعض اوقات اسے ترک بھی کر دیتے۔ [5]

ہمارے رجحان کے مطابق پہلی توجیہ میں زیادہ وزن معلوم ہوتا ہے کیونکہ جب سر کو دھونا ہے تو مسح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے پھر راوی نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سنن نسائی کے حوالے سے بیان ہو چکی ہے۔ (واللہ اعلم)

باریک جرابوں پر مسح کرنا

سوال باریک جرابوں پر مسح کرنے کے متعلق شریعت کیا حکم دیتی ہے، قرآن وحدیث میں مسح کے متعلق کیا شرائط ہیں

---

[1] صحیح مسلم، الحیض: ٣٦٠۔ [2] بخاری، الغسل: ٢٤٩۔ [3] بخاری، الغسل: ٢٥٧۔

[4] سنن نسائی، الغسل: ٤٢٢۔ [5] سنن نسائی مع التعلیقات السلفیہ، ص: ٤٧ ج ١۔

کہ وہ جرابیں کس طرح کی ہوں؟

جواب عام طور پر جرابوں کے دو فائدے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ وہ سردی وغیرہ سے بچاؤ کا کام دیں اور دوسرے یہ کہ گرد وغبار سے پاؤں کو محفوظ رکھیں، جب تک جراب اس طرح کے دو فائدے دیتی ہے تو اس پر مسح کیا جا سکتا ہے۔ اگر جراب اس قدر پھٹی ہوئی ہے کہ اسے پہن کر نہ سردی کا بچاؤ ہوتا ہے اور نہ ہی گرد وغبار سے پاؤں محفوظ رہتا ہے تو ایسی جراب پر مسح نہیں کرنا چاہیے، اس کے موٹے ہونے کے متعلق فقہ کی کتابوں میں جو معیار قائم کیا گیا ہے وہ ایجاد شدہ اور خود ساختہ ہے، قرآن وحدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جرابوں پر مسح کرنا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا تو اپنے جوتوں اور جرابوں پر مسح کیا۔ [1]

کبار صحابہ جیسے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے جرابوں پر مسح کرنا احادیث سے ثابت ہے، جب یہ عمل رسول اللہ ﷺ اور بلند مرتبہ صحابہ کرام سے ثابت ہے تو پھر جرابوں پر مسح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ واضح رہے کہ مقیم آدمی کے لیے ایک دن اور ایک رات جب کہ مسافر انسان کے لیے تین دن اور تین رات تک مسح کرنے کی اجازت ہے، اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد جرابوں کو پہنا جائے اور جب وضو ٹوٹ جائے تو مسح کی مدت کا آغاز ہو جاتا ہے یعنی وضو کرنے کے بعد پاؤں دھونے کے بجائے ان پر مسح کر لیا جائے۔ (واللہ اعلم)

حیض کی حالت میں بیوی کے پاس جانا

سوال اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس حیض کی حالت میں جائے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟ وہ شخص متعدد مرتبہ یہ کام کر چکا ہے، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کیا حکم ہے؟

جواب حالت حیض میں بیوی کے پاس جانا شرعاً ممنوع ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ﴾ [2]

”لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ وہ ایک گندگی ہے، لہٰذا حیض کے دوران عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔“

”الگ رہو“ اور ”قریب نہ جاؤ“ ان سے مراد مجامعت کی ممانعت ہے، اگر کوئی اس حالت میں اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے تو وہ شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس کی تلافی کفارہ ادا کرنے سے ہو سکتی ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اپنی بیوی سے حیض کی حالت میں مجامعت کرتا ہے اسے ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرنا چاہیے۔“ [3]

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح روایت ایسے ہی ہے کہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے یعنی اس میں اختیار دیا گیا

---

[1] ابو داود، الطھارۃ: ۱۵۹۔ [2] ۲/البقرہ: ۲۲۲۔ [3] ابو داود، الطھارۃ: ۲٦٤۔

ہے کہ ایک دینار دے یا نصف دینار دے، ممکن ہے کہ یہ اختیار کفارہ دینے والے کی مالی استطاعت کی وجہ سے ہو یعنی صاحب حیثیت ایک دینار اور کم حیثیت والا نصف دینار صدقہ کرے، اگرچہ بعض روایات میں اس کی تفصیل ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کے پاس خون حیض کے ابتدائی دنوں میں آئے تو ایک دینار دے اور اگر خون رُک جانے کے ایام میں آئے تو نصف دینار دے۔ [1]

لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے، البتہ پہلی حدیث صحیح ہے جسے علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صحیح کہا ہے۔ [2] واضح رہے کہ دینار سے مراد کویتی سکہ نہیں ہے بلکہ شرعی دینار سونے کا وہ سکہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں رائج تھا، جس کا وزن چار ماشہ چار رتی ہے، جدید اعشاری نظام کے مطابق دینار کا وزن ۴ گرام ۳۷۴ ملی گرام ہے، خاوند جتنی مرتبہ بھی اس حالت میں اپنی بیوی کے پاس گیا ہے اسے اتنی مرتبہ یہ صدقہ کرنا ہوگا تا کہ اس گناہ کی تلافی ہو جائے قرآن کریم میں ہے:

﴿ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ [3]

''نیکیاں، گناہوں کا ازالہ کر دیتی ہیں۔''

نیک سیرت بیوی کو چاہیے کہ وہ ایسے موقع پر خاوند کو یاد دہانی کرائے اور اسے ''مالی صدقہ'' سے آگاہ کر دے، ممکن ہے کہ یاد دہانی کرانے سے وہ باز رہے اور یہ اقدام نہ کرے۔ (واللہ اعلم)

پھٹی جراب پر مسح کرنا

سوال سردی کے موسم میں مجھے پاؤں دھونے سے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اس لیے میں وضو کر کے جرابیں پہن لیتی ہوں پھر سارا دن ان پر مسح کرتی رہتی ہوں، مجھے کسی نے کہا ہے کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز نہیں کیونکہ جرابوں پر اس وقت مسح کیا جا سکتا ہے جب ان سے پانی اندر نہ جائے یعنی موزے کی طرح ہوں، اس لیے موجودہ قسم کی جرابوں پر مسح جائز نہیں اس کے متعلق وضاحت کریں نیز بتائیں کہ جرابیں کس قدر پھٹی ہوں تو ان پر مسح ناجائز ہوتا ہے برائے مہربانی ان سوالوں کا جواب جلدی دیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ میں وضو اور تیمم کے بیان کے بعد فرمایا ہے:

﴿ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ ﴾ [4]

''اللہ تعالیٰ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مجبوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمیں آسانیاں عطا کرتا ہے مثلاً جس مریض کو پانی کے استعمال سے تکلیف کا یا تکلیف کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو تو وہ وضو یا غسل کی ضرورت کے وقت تیمم کر سکتا ہے۔ یا ایسا مسافر جسے وضو یا غسل کے لیے پانی نہ مل رہا ہو اس کے لیے بھی یہی رعایت ہے۔ اس طرح سردی کے موسم میں اگر کسی کو پاؤں دھونے میں تکلیف ہے تو موزوں یا جرابوں پر مسح کر سکتا ہے، جرابوں پر مسح کرنے کی سہولت کئی ایک احادیث سے مروی ہے، لغوی اعتبار سے جراب، چمڑے، اون اور سوت کی بھی ہوتی ہے یعنی ہر وہ چیز جسے پاؤں کو سردی اور گرد و غبار سے حفاظت کے لیے پہنا جائے خواہ وہ

---

[1] ابو داود، الطهارة: ٢٦٥۔ [2] ارواء الغليل، ص: ٢١٨، ج ١۔

[3] ١١/هود: ١١٤۔ [4] ٥/المائدة: ٦۔

چمڑے یا اون یا سوت سے بنی ہوا سے جراب کہتے ہیں اور اس پر مسح کیا جا سکتا ہے۔ ان کے لیے درج ذیل شرائط کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے۔

❶ وہ اتنی موٹی اور مضبوط ہوں کہ انہیں پہن کر اگر تین چار میل چلا جائے تو وہ نہ پھٹیں۔

❷ اس پر پانی کے قطرے ڈالے جائیں تو ان سے پاؤں گیلا نہ ہو۔

❸ وہ گھسی پھٹی اور پرانی نہ ہوں۔

اس قسم کی غیر معقول شرائط کتاب وسنت میں موجود نہیں ہیں، خواہ مخواہ تکلفات میں پڑنا بنی اسرائیل کا شیوہ ہے، ہمیں ان سے احتراز کرنا چاہیے اب اس سلسلہ میں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

① حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو اپنی جرابوں اور جوتیوں پر مسح کیا۔ [1] اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ ''جوتیوں پر مسح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جوتیوں کے تسموں پر مسح کیا جو پاؤں کے ظاہری حصے پر ہوتے ہیں، اس کے نچلے اور پچھلے حصے پر مسح کرنا سلف سے ثابت نہیں۔'' [2]

② حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو اپنی جرابوں اور جوتیوں پر مسح کیا۔ [3]

③ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عملی طور پر مسح کرنے کے متعلق روایات ہیں بلکہ آپ کا امر بھی ثابت ہے جیسا کہ درج ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کسی مہم کے لیے ایک فوجی دستہ روانہ کیا، دورانِ سفر انہیں سردی لگی تو واپس آ کر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس امر کی شکایت کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عماموں اور تساخین پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ [4] تساخین کے متعلق امام ابن ارسلان فرماتے ہیں: ''جو چیز پاؤں کو گرمی پہنچائے خواہ وہ چمڑے کے موزے یا جرابیں ہوں انہیں تساخین کہا جاتا ہے۔ [5]

اس حدیث سے معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے پاؤں کو سردی سے بچایا جا سکتا ہے اس پر مسح کرنا جائز ہے۔ امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''چونکہ صحابہ کرام نے جرابوں پر مسح کیا اور دور صحابہ میں کسی سے ان کی مخالفت منقول نہیں، لہٰذا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔ [6] آخر میں ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ کا عمل پیش کرتے ہیں جو اس مسئلہ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔

ازرق بن قیس رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ ایک دفعہ بے وضو ہوئے تو انہوں نے وضو کے لیے اپنا منہ اور ہاتھ دھوئے اور اون کی جرابوں پر مسح کیا، اس نے عرض کیا آپ ان پر مسح کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا،

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۲۵۲، ج۳۔ [2] مغنی، ص: ۱۸۲، ج۱۔ [3] ابن ماجه، الطهارة: ۵۶۰۔
[4] مسند امام احمد، ص: ۲۷۷، ج۵۔ [5] عون المعبود، ص: ۵۶، ج۱۔ [6] مغنی ص: ۱۵۱، ج۱۔

اس میں تعجب کی کونسی بات ہے، یہ بھی موزے ہیں لیکن چمڑے کے بجائے اون کے ہیں۔ [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جراب پر مسح کرنے کے لیے کسی قسم کے قیاس کا سہارا نہیں لیا بلکہ انہوں نے فرمایا ہے کہ لفظ جوربین لغوی معنی کے اعتبار سے خفین کے مدلول میں داخل ہے اور خفین پر مسح کرنے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے لہٰذا جرابوں پر مسح کرنے میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

غسل جنابت کا طریقہ

سوال جنابت کی حالت میں کن کن چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے، نیز غسل جنابت کا کیا طریقہ ہے، قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب جنبی آدمی کسی قسم کی نماز نہیں پڑھ سکتا، خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل، اسے غسل کرنے کے بعد نماز پڑھنا ہوگی۔ جنبی آدمی بیت اللہ کا طواف بھی نہیں کرسکتا، جب تک وہ پاک نہ ہوجائے کیونکہ بیت اللہ کا طواف کرنا گویا مسجد میں ٹھہرنا ہے جس کی جنبی کو اجازت نہیں ہے، جنبی آدمی کو چاہیے کہ وہ قرآن کریم کو ہاتھ نہ لگائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''قرآن کریم کو پاک آدمی ہی ہاتھ لگائے۔'' [2]

اسی طرح جب تک وہ غسل نہ کرے، اسے قرآن مجید کی تلاوت بھی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو قرآن مجید پڑھایا کرتے تھے بشرطیکہ وہ جنبی نہ ہوتے۔ غسل جنابت کرنے کا مکمل طریقہ مندرجہ ذیل ہے:

☆ غسل جنابت سے پہلے اپنے ہاتھ دھوئے پھر شرمگاہ کی آلودگی کو پاک صاف کرے۔

☆ اس کے بعد وضو کرے جس طرح نماز کے لیے وضو کیا جاتا ہے۔

☆ اپنے سر کو پانی کے ساتھ اس طرح دھوئے کہ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچ جائے۔

☆ پھر اپنے سارے جسم پر پانی بہالے۔

اس طرح غسل کرنے کا یہ کامل طریقہ ہے، البتہ سارے بدن پر پانی بہانے، کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈال کر اسے صاف کرنے سے بھی طہارت حاصل ہوجائے گی، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر نہانے کی حاجت ہوتو نہا کر پاک ہوجایا کرو۔'' [3]

غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ضروری ہے، اس کے بغیر غسل صحیح نہیں ہوگا کیونکہ غسل کا حکم سارے بدن کے لیے ہے، ناک اور منہ کا اندرونی حصہ بھی بدن کا وہ حصہ ہے جس کا پاک کرنا واجب ہے۔ (واللہ اعلم)

وضو کے بعد چادر کا ٹخنوں سے نیچے آجانا

سوال کیا وضو کے بعد کسی کی چادر یا شلوار ٹخنوں سے نیچے ہوجائے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی نماز قبول نہیں ہوتی؟ کچھ حضرات اس کے متعلق ایک حدیث بھی بیان کرتے ہیں، اس کی حیثیت سے آگاہ فرمائیں۔

---

[1] الکنی والاسماء للدولابی، ص: ۱۸۱، ج۱۔ [2] سنن دارمی، الطلاق: ۲۲٦٦۔ [3] ٥/المائدۃ: ٦۔

جواب ٹخنوں کے نیچے کپڑا لٹکانا سنگین جرم ہے، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو قیامت کے دن نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا، سخت جرم ہونے کے باوجود کسی بھی محدث یا فقیہ نے اسے نواقض وضو و مفسدِ نماز قرار نہیں دیا لہٰذا ٹخنوں سے نیچے شلوار یا چادر لٹکانے والے کا وضو اور نماز تو قائم رہے گی البتہ اس ممنوعہ فعل کے ارتکاب کی وجہ سے وہ سزا کا مستوجب ضرور ہوگا۔ اس کے متعلق جو حدیث بیان کی جاتی ہے وہ حسب ذیل ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے لٹکاتے ہوئے نماز پڑھ رہا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''جاؤ وضو کر کے آؤ۔'' وہ گیا اور وضو کر کے دوبارہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اسے وضو کرنے کا حکم دیا، حاضرین میں سے ایک آدمی نے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اپنا تہبند ٹخنوں کے نیچے لٹکاتے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا بے شک اللہ تعالیٰ ٹخنوں سے نیچے تہبند لٹکانے والے شخص کی نماز قبول نہیں کرتا۔'' [1]

لیکن اس کی سند میں ابو جعفر نامی ایک راوی مجہول ہے جیسا کہ امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے۔ [2] علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہتے ہیں۔ [3]

محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس نے مذکورہ حدیث کی سند کو صحیح کہا اسے وہم ہوا ہے۔ [4] اور آپ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [5] اس بنا پر ہمارا رجحان ہے کہ وضو کرنے کے بعد اگر کوئی اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے کرتا ہے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، اگرچہ وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے۔

بیماری کی وجہ سے طہارت نہ ہو سکنا

سوال اگر کوئی بیمار ہو اور طہارت حاصل کرنے سے معذور ہو تو کیا وہ حصولِ طہارت کے لیے نماز کو مؤخر کر دے یا اسی حالت میں نماز بروقت پڑھ لے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

جواب مریض کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ طہارت سے معذوری کی وجہ سے نماز کو وقت سے مؤخر کرے بلکہ اسے چاہیے کہ اپنی نیت کے مطابق جس قدر طہارت حاصل کر سکتا ہے، اسے پورا کر کے نماز بروقت ادا کرے خواہ اس کے بدن، کپڑے یا جگہ پر نجاست لگی ہو جسے وہ دور نہیں کر سکتا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ [6]

''جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو، اس کے احکام سنو اور ان کی اطاعت کرو۔''

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس کی بجا آوری کرو۔'' [7]

---

[1] ابو داود، الصلوٰۃ: ٦٣٨۔ [2] مختصر سنن ابی داود، ص: ٣٢٤، ج١۔ [3] نیل الاوطار، ص: ٥٩٩، ج٩۔
[4] مشکوٰۃ المصابیح حدیث نمبر ٧٦۔ [5] ضعیف ابو داود، الصلوٰۃ: ١٢٤۔
[6] ٦٤/التغابن: ١٦۔ [7] صحیح بخاری، الاعتصام: ٧٢٨٨۔

اس بنیادی قاعدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے معذور لوگوں سے ان کے عذر کے مطابق عبادات میں تخفیف کر دی ہے تاکہ وہ حرج اور مشقت میں پڑے بغیر اللہ کی عبادت کو بجالائیں، اس سلسلہ میں کچھ شرعی ہدایات حسب ذیل ہیں:

① مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرے خواہ وہ وضو کی شکل میں ہو یا غسل کرنے کی صورت میں، اگر پانی سے طہارت کرنے سے عاجز ہو یا پانی کے استعمال سے مرض میں اضافے کا اندیشہ ہو تو وہ تیمم کرے، اگر وہ وضو یا تیمم نہ کر سکتا ہو تو کوئی بھی دوسرا شخص اسے وضو یا تیمم کرا سکتا ہے۔

② اگر کسی جگہ زخم ہو تو وہاں مسح بھی کیا جا سکتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ مریض اپنے ہاتھ کو پانی سے تر کرے اور اس گیلے ہاتھ کو زخم پر پھیر دے اگر ایسا کرنا نقصان دہ ہو تو اس زخم پر بھی تیمم کرے، اگر زخم پر پٹی بندھی ہے تو اسے دھونے کے بجائے پانی کے ساتھ مسح کر لیا جائے وہاں تیمم کی ضرورت نہیں کیونکہ عضو کو دھونے کے بجائے وہاں مسح کیا جا سکتا ہے۔

وضو کے بعد انگشت شہادت اٹھا کر آسمان کی طرف منہ کر کے دعا پڑھنا

سوال اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ وضو سے فراغت کے بعد آسمان کی طرف منہ کر کے اپنی انگلی اٹھاتے ہیں پھر وضو کی دعا پڑھتے ہیں، کیا ایسا کرنا کتاب وسنت سے ثابت ہے؟ تفصیل سے جواب دیں۔

جواب وضو سے فراغت کے بعد درج ذیل دعا پڑھنے کی بہت فضیلت ہے۔ **اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله** حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مکمل وضو کرنے کے بعد یہ کلمات پڑھے گا، اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جائیں گے، وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔ [1]

ایک روایت میں یہ دعا پڑھنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ **((اللهم اجعلنى من التوابين واجعلنى من المتطهرين))** [2]
لیکن صحیح حدیث سے وضو سے فراغت کے بعد آسمان کی طرف نظر کرنا اور انگلی اٹھانا ثابت نہیں ہے، اس لیے ہمارے رجحان کے مطابق ایسا کرنا بدعت ہے، البتہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں وضو کے بعد آسمان کی طرف نظر اٹھانے کا ذکر ملتا ہے۔ [3] لیکن ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [4] اس بنا پر وضو سے فراغت کے بعد آسمان کی طرف نظر اٹھائے بغیر مذکورہ دعائیں بھی پڑھی جائیں۔ آسمان کی طرف نظر کرنا اور انگلی اٹھا کر مذکورہ دعائیں پڑھنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

گردن پر مسح کرنا

سوال دورانِ وضو گردن پر مسح کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے، کیا اس کے متعلق کوئی حدیث آئی ہے اور اگر آئی تو اس کی

---

[1] صحیح مسلم، الطهارة: ٢٣٤۔
[2] جامع ترمذی، الطهارة: ٥٥۔
[3] مسند امام احمد، ص: ١٥٠، ج٤۔لی۔
[4] تلخیص الحبیر: ١٧١ ج١۔

کیا حیثیت ہے؟

جواب وضو کرتے وقت گردن کا مسح کرنے کے متعلق کوئی صحیح حدیث کتب حدیث میں مروی نہیں ہے، جن احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے وضو کا بیان ہوا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ گردن کا مسح نہیں کرتے تھے، البتہ بعض ضعیف احادیث میں گردن کے مسح کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً:

① حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی گردن کا مسح کیا تھا۔ [1]

اس روایت میں محمد بن حجر، سعید بن عبدالجبار اور ام عبدالجبار تینوں راوی ضعیف ہیں۔

② ایک حدیث میں ہے کہ گردن کا مسح کرنا طوق سے امان کا باعث ہے۔ امام ابن صلاح رحمہ اللہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ خبر رسول اللہ ﷺ سے معروف نہیں ہے البتہ بعض اسلاف نے اس کا ذکر کیا ہے۔ [2]

امام نووی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں: یہ موضوع ہے اور رسول اللہ ﷺ کا کلام نہیں۔

بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق دوران وضو گردن کا مسح صحیح احادیث سے ثابت نہیں ہے خاص طور پر الٹے ہاتھوں سے گردن پر مسح کرنا تو اس کے متعلق تو کوئی ضعیف حدیث بھی مروی نہیں ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

مستحاضہ کی نماز

سوال مجھے اپنے مخصوص ایام میں سرخ رنگ کا خون آتا ہے اور ہفتہ بھر جاری رہتا ہے، کبھی کبھار یہ خون عادت کے ایام سے بڑھ جاتا ہے، میں ہفتہ بھر نماز ادا نہیں کرتی۔ جب عادت کے ایام سے بڑھ جاتا ہے تو غسل کر کے نماز پڑھ لیتی ہوں کیا میرا یہ عمل صحیح ہے یا جب تک خون جاری رہے نماز نہ پڑھوں؟

جواب ایام کے علاوہ جو خون آتا ہے اسے استحاضہ کہا جاتا ہے اس کی حسب ذیل دو صورتیں ہیں:

① عورت کو ہمیشہ خون آتا رہے اور وہ کسی دن بھی بند نہ ہو جیسا کہ حضرت فاطمہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے کہا تھا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے استحاضہ آتا ہے اور میں کبھی پاک نہیں ہوتی ہوں۔ [3]

② عورت کو ہمیشہ خون نہ آئے بلکہ ایام کے علاوہ دوسرے کچھ دنوں میں بھی آتا ہو اور کبھی منقطع بھی ہو جاتا ہو جیسا کہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے کہا تھا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے بکثرت بڑی شدت سے خون آتا ہے۔ [4]

پھر حیض اور استحاضہ میں حسب ذیل تین طریقوں سے شناخت ہو سکتی ہے۔

(الف) **عادت:** عورتوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایام کب شروع ہوتے ہیں اور کب انتہا کو پہنچتے ہیں اس طرح کی عورت کو معتادہ کہا جاتا ہے، ایام حیض کے علاوہ دوسرے دن استحاضہ کے شمار ہوں گے۔

(ب) **تمییز:** اگر عادت پختہ نہ ہو تو ایام حیض کی پہچان تمیز سے ہو سکتی ہے اور اس کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔

---

[1] كشف الاستار، ص: ١٤٠، ج١۔ [2] نيل الاوطار، ص: ٢٠٣، ج١۔

[3] صحيح بخاری، الحيض: ٣٠٦۔ [4] ابو داود، الطهارة: ٢٨٧۔

① خون سیاہی مائل ہو۔

② وہ گاڑھا ہو۔

③ اس کی بُو نا گوار ہو، اس قسم کی عورت کو ممیزہ کہا جاتا ہے، تمیز کے بعد دوسرے دن استحاضہ کے شمار ہوں گے۔

(ج) **تحری:** اگر ایام حیض یاد نہیں یا تمیز بھی نہیں ہو سکتی تو ایسی عورت کو اپنے ذہن پر زور ڈال کر تحری (سوچ و بچار) کرنا چاہیے، اگر کسی ایک جانب گمان غالب ہو جائے تو اس کے مطابق عمل کرے ایسی عورت کو متحیرہ راشدہ کہا جاتا ہے، اگر تحری سے کچھ فائدہ نہ ہو تو ایسی عورت کو متحیرہ ضالہ کہتے ہیں، اس قسم کی عورت کو چاہیے کہ وہ اپنی ہم عمر اور جسمانی صحت کے لحاظ سے ملتی جلتی عورتوں کی عادت کے مطابق عمل کرے۔ عام عورتیں چھ یا سات دن تک ایام میں مبتلا رہتی ہیں اس کے بعد استحاضہ کے ایام شمار ہوں گے۔

استحاضہ کے متعلق عرب کے نامور عالم دین محمد صالح العثیمین رحمہ اللہ نے بڑی بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں جسے ہم بیان کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مستحاضہ کی تین حالتیں ممکن ہیں۔

① اسے اپنے ایامِ حیض معلوم ہوں، اس صورت میں جتنے ایام حیض کے لیے مخصوص ہوں گے ان پر احکام حیض اور باقی دنوں پر استحاضہ کے احکام جاری ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ فاطمہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے ہمیشہ استحاضہ آتا ہے جس سے مجھے کبھی پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی، کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ نے فرمایا: یہ خون ایک رگ سے آتا ہے، اپنے ایام حیض کی مقدار نماز ترک کر دے پھر غسل کر کے نماز شروع کر دو۔ [1] اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام حبیبہ بنت جحش رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ جتنے دن تجھے حیض روکے رکھے اتنے دن نماز ترک کر دے پھر غسل کرو اور نماز پڑھنا شروع کر دو۔ [2] اس بنا پر مستحاضہ کو چاہیے کہ وہ اپنے مقررہ ایام میں نماز ترک کر دے اور بقیہ ایام میں غسل کر کے نماز شروع کر دے اگر بقیہ ایام میں خون جاری رہتا ہے تو اس کی پروا نہ کرے۔

② عورت کو اپنے ایام حیض معلوم نہیں ہیں۔ جب سے حیض آنا شروع ہوا خون جاری رہا، کبھی بند نہیں ہوا تو ایسی عورت کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ خون حیض کی رنگت (سیاہ)، گاڑھے پن اور ناگوار ہوا سے تمیز کرے مثلاً ایک عورت کو جب حیض شروع ہوا تو اس نے ابتدائی دس دنوں میں اس کی رنگت سیاہ دیکھی یا وہ گاڑھا تھا یا اس کی بو ناگوار تھی تو ابتدا کے دس دن حیض کے شمار کر کے بقیہ ایام میں وہ غسل کر کے نماز پڑھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ بنت جحش رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ حیض کا خون سیاہ رنگ کا ہوتا ہے، سیاہ خون آنے تک تم نماز نہ پڑھو پھر بقیہ ایام میں وضو کر کے نماز شروع کر دو کیونکہ اس کے بعد آنے والا خون حیض نہیں بلکہ استحاضہ ہے۔ [3]

③ عورت کے دن مقرر نہ ہوں اور نہ ہی وہ تمیز کر سکتی ہو مثلاً جب اسے حیض آنا شروع ہوا تو وہ ایک ہی صفت پر رہا یا کبھی سیاہ، پھر سرخ سیاہ آتا رہا۔ جس سے حیض کی پہچان نہ ہو سکے تو وہ اپنی عمر اور جسمانی صحت کے لحاظ سے ملتی جلتی عام عورتوں کی عادت کے

---

[1] صحیح بخاری، الحیض: ٣٠٦۔ [2] ابو داود، الطهارة: ٢٧٩۔

[3] ابو داود، الطهارة: ٢٨٦۔

مطابق عمل کرے یعنی وہ ہر مہینے چھ یا سات دن حیض کے شمار کر کے بقیہ ایام میں استحاضہ کے مطابق عمل کرے جیسا کہ حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے بکثرت، شدت سے خون آتا ہے، کیا میں نماز روزہ ترک کر دوں، آپ نے فرمایا تم روئی استعمال کرو، اس سے خون رک جائے گا، عرض کیا خون اس سے بھی زیادہ ہے، وہ روئی وغیرہ کے استعمال سے بند نہیں ہوتا، آپ نے فرمایا یہ رکضہ شیطانی ہے تو اللہ کے علم کے مطابق چھ یا سات دن تک نماز ترک کر دے پھر غسل کر کے تئیس یا چوبیس دن نماز پڑھو اور روزہ رکھو۔ [1]

واضح رہے کہ چھ یا سات دن اکثر عورتوں کی عادت کے مطابق ہیں، وہ اس کے مطابق اپنے معمولات کو اختیار کرے صورت مسئولہ میں سائلہ کو اپنے ایام کا علم ہے، اس صورت میں اپنے مخصوص ایام میں نماز ترک کر دے اور باقی ایام میں استحاضہ کے مطابق عمل کرے یعنی غسل کر کے نماز شروع کر دے، اس کا یہ عمل قرآن وسنت کے مطابق ہے کہ وہ مخصوص ایام کے علاوہ غسل کر کے نماز پڑھتی رہے، خون جاری رہنے تک نماز ترک کر دینا قرآن وسنت کے مطابق نہیں ہے، ہم نے اس سوال کا جواب تفصیل سے دیا ہے تا کہ خواتین اس کے مطابق اپنے معمولات درست کریں۔

قبلہ رخ لیٹرین بنانا

سوال ہم نے ایک مکان خریدا ہے لیکن اس کی لیٹرین قبلہ رخ ہے۔ ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ اسے فی الحال درست کر لیں، ایسے حالات میں لیٹرین استعمال کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ہماری مالی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جواب دیں۔

جواب قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنے کے متعلق دو موقف ہیں۔

1. قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ کی جائے، خواہ انسان آبادی میں ہو یا صحراء میں بہر صورت منع ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قضاء حاجت کے وقت قبلہ رخ مت بیٹھو اور نہ ہی اس کی طرف پشت کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی جانب پھر جاؤ۔'' [2]

واضح رہے کہ مدینہ طیبہ مکہ کے جنوب کی جانب ہے، اس لیے مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرنے کی اجازت ہے ہمارے ہاں قبلہ مغرب کی جانب ہے اس لیے ہمیں شمال یا جنوب کی طرف منہ کرنا ہوگا اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مطلق طور پر قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آبادی یا صحراء میں قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم جب شام کے علاقہ میں آئے تو وہاں ہم نے ایسے بیت الخلاء دیکھے جو کعبہ کی جانب بنے ہوئے تھے تو ہم کعبہ سے انحراف کی کوشش کرتے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے تھے۔ (حوالہ مذکور) اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر ممکن ہوتا اپنا رخ دوسری طرف کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے کہ جس قدر ہم سے ممکن تھا ہم نے کعبہ سے انحراف کی کوشش کی ہے اور جو ہمارے بس

---

[1] سنن ابی داود، الطهارة: ۲۸۷۔ [2] صحیح بخاری، الصلوٰة: ۳۹۴۔

میں نہ تھا اس کی ہم اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے تھے۔

اس سلسلہ میں دوسرا موقف یہ ہے کہ قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ کرنے کی پابندی صحراء میں ہے۔آبادی یعنی عمارت میں نہیں ہے۔چنانچہ مروان اصفر بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا انہوں نے قبلہ کی طرف اپنی سواری بٹھائی پھر اس کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے لگے۔میں نے ان سے کہا اے ابوعبدالرحمن رضی اللہ عنہ! کیا اس سے منع نہیں کیا گیا؟ انہوں نے فرمایا کیوں نہیں، اس عمل سے صرف فضاء میں منع کیا گیا ہے اور جب تمہارے اور قبلہ کے درمیان کوئی اوٹ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [1]

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی پیش کیا جاتا ہے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ہی بیان ہے کہ میں ایک دن حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی چھت پر چڑھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شام کی طرف منہ اور کعبہ کی طرف پشت کر کے قضاء حاجت کرتے ہوئے دیکھا۔ [2]

اگرچہ ان احادیث کے پیش نظر علماء کی ایک جماعت کا یہی موقف ہے کہ قضائے حاجت کے وقت قبلہ رخ ہونا صرف صحراء میں منع ہے۔آبادی یا عمارتوں میں یہ پابندی ضروری نہیں ہے۔لیکن ہمارے رجحان کے مطابق ایسا کرنا مطلق طور پر منع ہے، یعنی آبادی اور صحراء میں اس امر کی پابندی کی جائے کہ قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ ہونے پائے، بیت اللہ کی تقدیس اور تعظیم کا یہی تقاضا ہے نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل امت کو دیئے ہوئے حکم خاص کے مخالف نہیں ہے۔صورت مسؤلہ میں چونکہ مالی حالت اس قسم کی ہے کہ لیٹرین کو صحیح کرنے سے رکاوٹ کا باعث ہے۔اس لیے ایسے حالات میں سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے معمول کو اختیار کیا جا سکتا ہے کہ قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنے سے احترام کیا جائے، اور اس سے پھرنے کی کوشش کی جائے، لیکن اگر پوری طرح اس سے انحراف نہ ہو سکے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے، جب مالی طور پر حالات سازگار ہو جائیں تو اس قسم کی لیٹرین کا رخ تبدیل کر دیا جائے' اگرچہ بعض علماء کے نزدیک عمارتوں میں گنجائش ہے تاہم بہتر ہے کہ عمارتوں میں بھی اس سے اجتناب کیا جائے تا کہ بیت اللہ کی عظمت برقرار رہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ابوداود، الطھارۃ:۱۱۔ [2] صحیح بخاری، الوضوء: ۱۴۵۔

اذان ونماز

اذان ونماز

ننگے سر نماز پڑھنا

سوال ہمارے ہاں بوڑھے تو کیا اکثر نوجوان بھی ننگے سر نماز پڑھتے ہیں، کیا ایسا کرنا کوئی سنت ہے یا سینہ زوری کے طور پر اسے اختیار کیا گیا ہے؟ ہم نے عرب کو دیکھا ہے کہ وہ عام حالات میں بھی کوئی خال خال ہی ننگے سر نظر آتا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کے متعلق وضاحت کریں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

جواب ننگے سر نماز پڑھنے کے جواز میں کوئی شک نہیں، لیکن اسے مستحب قرار دینا سینہ زوری ہے، ہمارے ہاں خواہ مخواہ بعض لوگوں نے ننگے سر نماز پڑھنے کو وجہ نزاع بنالیا ہے۔ دراصل اس سلسلہ میں لوگ افراط وتفریط کا شکار ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ننگے سر نماز ہوتی ہی نہیں، جبکہ کچھ لوگ ردعمل کے طور پر اس انتہاء کو پہنچ گئے ہیں کہ اس مسئلہ کو محض جواز کی حد تک محدود رکھنے کے بجائے انہوں نے اسے ایک پسندیدہ عمل قرار دے کر اپنا شعار بنالیا ہے اور وہ اپنے پاس رومال یا ٹوپی ہوتے ہوئے بھی محض ضد اور ہٹ دھرمی سے ننگے سر ہی نماز پڑھتے ہیں، حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [1]

''اے بنی آدم! جب تم کسی مسجد میں جاؤ تو آراستہ ہوکر جاؤ۔''

مسجد میں جانے سے مراد نماز کے لیے جانا ہے اور دوران نماز لباس زیب تن کرنا ہے، آیت کریمہ میں زینت سے مراد اعلیٰ قسم کا لباس نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ نماز کے لیے جسم کے اس حصہ کو ضرور ڈھانپنا چاہیے جس کا کھلا رہنا معیوب ہے، چونکہ لباس والا جسم ننگے جسم کے مقابلہ میں مزین نظر آتا ہے اس لیے اسے زینت سے تعبیر کیا گیا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کریمہ سے یہی مسئلہ ثابت کیا ہے۔ چنانچہ شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو پیش کرکے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آیت کریمہ میں اخذ زینت سے مراد لباس زیب تن کرنا ہے، اس کی زیبائش وآرائش قطعاً مراد نہیں ہے۔ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول سر ڈھانپنے کا تھا جیسا کہ درج ذیل روایات سے معلوم ہوتا ہے:

---

[1] ۷/الاعراف:۳۱۔ [2] فتح الباری، ص:۶۰۴، ج۱۔

☆ حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا انہوں نے اپنی پگڑی اور موزوں پر مسح کیا۔ ❶

☆ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر سے پہلے قضاء حاجت کے لیے باہر تشریف لے گئے، واپسی پر آپ نے وضو کیا تو اپنی پیشانی، عمامہ اور موزوں پر مسح فرمایا۔ ❷

☆ حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطبہ دیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔ ❸

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ پگڑی باندھ رکھی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم احرام کے بغیر تھے۔ ❹

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ سر کو ننگا رکھنا نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں عمامہ لباس میں شامل تھا اور پگڑی کے ذریعے سر مبارک کو ڈھانپنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا، اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی معمول تھا جیسا کہ درج ذیل واقعات وآثار سے معلوم ہوتا ہے:

☆ حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے سر پر پگڑی باندھتے تھے اور اس کے سرے کو دونوں کندھوں کے درمیان لٹکا لیتے تھے، عبید اللہ بن عمر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی عمامہ باندھتے تھے اور اس کے سرے اپنے کندھوں کے درمیان لٹکا لیتے تھے۔ ❺

☆ سیدنا ہشام رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے وہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب سجدہ کرتے تو ان کے ہاتھ کپڑوں میں ہوتے اور ان میں ہر ایک اپنے عمامہ پر سجدہ کرتا تھا۔ ❻

ان احادیث سے کم از کم یہ تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے متعلق ہمارے اسلاف کا معمول کیا تھا؟ سلف صالحین کے ہاں ننگے سر رہنا اور گھومتے پھرنا کوئی عادت نہیں ہے بلکہ یہ مغربی عادات سے ہے جو مسلمانوں میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر سرایت کر چکی ہے جیسا کہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صراحت کی ہے۔ ❼

ننگے سر رہنے کو معمول بنانے کو ایام حج پر قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دوران حج ننگے سر رہنا حج کا شعار ہے جس میں اور کوئی عبادت شریک نہیں ہے، اگر یہ قیاس صحیح ہوتا تو دوران نماز سر ننگا رکھنا بھی حج کی طرح فرض ہوتا، اس سلسلہ میں دو احادیث پیش کی جاتی ہیں جن کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے تا کہ مسئلہ کی حیثیت معلوم ہو جائے۔

(الف) ابن عساکر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات اپنی ٹوپی اتار کر اپنے

---

❶ صحیح بخاری، الوضوء: ۲۰۵۔ ❷ صحیح مسلم، الطهارة: ۶۳۳۔ ❸ صحیح مسلم، الحج: ۳۳۱۱۔
❹ مسند امام احمد، ص: ۲۶۳، ج ۳۔ ❺ مصنف ابن ابی شیبه، ص: ۴۷، ج ۱۔
❻ مصنف ابن ابی شیبه، ص: ۷۹۸، ج ۱۔ ❼ تمام المنه، ص: ۱۶۴۔

سامنے بطور سترہ رکھ لیتے تھے' علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس کے ضعف کے لیے یہی کافی ہے کہ اس روایت کو بیان کرنے میں ابن عساکر متفرد ہے۔ ویسے انہوں نے سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ نمبر ۲۵۳۸ میں اس کی خوب وضاحت کی ہے، اگر یہ صحیح بھی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سترہ کے لیے استعمال کرتے تھے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سترہ بنانے کے لیے اور کوئی چیز نہ ملتی تھی اور سترہ ضروری ہے اور سر کا ڈھانپنا ضروری نہیں بلکہ افضل اور بہتر ہے۔ ہمارے نزدیک اس مسئلہ کے متعلق محتاط موقف یہ ہے کہ دوران نماز سر ننگا رکھنے کو معمول بنانا ناپسندیدہ عمل ہے۔ [1]

(ب) محمد بن منکدر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے ایک تہبند میں نماز پڑھی جسے انہوں نے اپنی گدی پر باندھا تھا اور ان کے باقی کپڑے لکڑی پر رکھے تھے، کسی نے ان سے کہا تم اپنے کپڑے ہوتے ہوئے ایک تہبند میں نماز پڑھتے ہو تو انہوں نے جواب دیا تاکہ تیرے جیسا بے وقوف اور جاہل مجھے دیکھ لے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم لوگوں میں سے کس کے پاس دو کپڑے ہوتے تھے۔ [2]

اس حدیث کے متعلق ہماری درج ذیل گزارشات ہیں:

(الف) اس حدیث میں سر کے متعلق کوئی وضاحت نہیں ہے آیا سر پر کوئی چیز تھی یا نہیں۔ سر کے متعلق دوسری احادیث کی طرف رجوع کرنا ہوگا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول بیان ہوا ہے جس کی ہم پہلے وضاحت کر آئے ہیں۔

(ب) اگر تسلیم کر لیا جائے کہ سر پر واقعی کوئی چیز نہ تھی تو یہ ایک اضطراری حالت ہو سکتی ہے جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں واقعی کپڑوں کی قلت تھی لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وسعت دی گئی تو انہوں نے عمامے اور ٹوپیوں کا استعمال کیا۔

(ج) حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کپڑے پاس ہوتے ہوئے صرف ایک کپڑے میں نماز ادا کی، ان کا یہ معمول روزمرہ کا نہیں تھا جیسا کہ ہمارے ہاں دیکھنے میں آتا ہے اگر روزانہ ایسا ہوتا تو سائل کو سوال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

(د) حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ کام عمداً اس لیے کیا، تاکہ ناواقف لوگوں پر واضح ہو جائے کہ صرف ایک کپڑے میں بھی نماز جائز ہے اگرچہ سر ننگا ہی رہے۔

(ھ) جو حضرات اس حدیث کے پیش نظر ننگے سر نماز پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس حدیث پر عمل نہیں کرتا کہ ایک کپڑا پہن کر نماز ادا کرتا ہو جبکہ آج یہ بات ممکن نہیں ہے تو پھر اس پر اصرار کرنا چہ معنی دارد، یہ نزلہ صرف ٹوپی یا رومال پر ہی کیوں گرتا ہے؟ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ گھر سے قمیص، شلوار، کوٹ وغیرہ پہن کر آتے ہیں اور مسجد میں داخل ہونے کے بعد صرف پگڑی، ٹوپی یا رومال اتار کر نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں کہ ننگے سر عبادت کرنا عیسائیوں کا شعار ہے، اس لیے ہمیں ان کی مخالفت کا حکم ہے، ہمارے

---

[1] تمام المنہ، ص: ۱٦٤۔ [2] صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۳۵۲۔

نزدیک اسے معمول بنالینا پسندیدہ عمل نہیں ہے۔ ❶

ان تصریحات کا حاصل یہ ہے جواز کی حد تک ننگے سر نماز ادا کرنے میں نہ کوئی کلام ہے اور نہ قباحت، لیکن اگر کوئی عمامہ، ٹوپی یا رومال وغیرہ موجود ہو تو اسے استعمال کرنا افضل ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول تھا کیونکہ سر ڈھانپنا بھی زینت کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا ننگے سر نماز پڑھنے کو شعار اور معمول نہ بنایا جائے۔ ہاں کپڑوں کی موجودگی میں بھی کبھی کبھار کسی ضرورت یا مصلحت کی غرض سے ننگے سر نماز ادا کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہمیں اس سے بھی اختلاف ہے کہ اس سلسلہ میں مسجد میں ٹوپیاں رکھنے کا رواج جاری کیا جائے جن پر سارا سال مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں اور پھر انہی گندی، میلی کچیلی اور پھٹی ہوئی ٹوپیوں کو نماز کے لیے استعمال کیا جائے، ہمارے نزدیک یہ کام بھی مستحسن نہیں ہے۔ ہر نمازی اس کا اہتمام خود کرے۔ (واللہ اعلم)

تشہد میں وضو کا ٹوٹ جانا

سوال ایک آدمی تشہد میں بیٹھتا ہے، اس نے التحیات، درود شریف اور دعائیں وغیرہ پڑھ لی ہیں، لیکن سلام پھیرنے سے پہلے وہ بے وضو ہو گیا تو کیا اس کی نماز باطل ہے یا مکمل ہو جائے گی؟

جواب جب مسلمان نماز میں داخل ہوتا ہے تو تکبیر تحریمہ ''اللہ اکبر'' کہتا ہے، اس کے بعد نماز کے منافی حرکت کرنا منع ہو جاتا ہے اور کوئی بھی بات چیت کرنا حرام ہو جاتا ہے، پھر سلام سے ہی یہ پابندی ختم ہوتی ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''نماز کے منافی حرکات کو حرام کرنے والی تکبیر تحریمہ ہے اور اس کی پابندی کو ختم کرنا سلام پھیرنا ہے۔'' ❷

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو صرف سلام کے ساتھ ہی ختم کیا جا سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا یہی معمول عمر بھر رہا جیسا کہ ایک حدیث میں صراحت ہے: ''رسول اللہ ﷺ سلام کے ساتھ نماز ختم کرتے تھے۔'' ❸

جمہور اہل علم کا یہی موقف ہے کہ نماز کو سلام کے ساتھ ہی ختم کیا جا سکتا ہے لیکن اہل کوفہ کا موقف ہے کہ نماز سے فراغت کے لیے سلام پھیرنا ضروری نہیں بلکہ نماز کے منافی کوئی بھی کام کرنے سے نماز کو ختم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ موقف صحیح احادیث کے خلاف ہے، صورت مسؤلہ میں اگر کسی نے التحیات، درود اور ادعیہ مسنونہ پڑھ لی ہیں لیکن سلام پھیرنے سے قبل وہ بے وضو ہو گیا ہے تو اس کی نماز باطل ہے خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل، بہر حال نماز کی تکمیل سلام پھیرنے سے ہوگی، اس کے بغیر نماز ادھوری ہے۔ (واللہ اعلم)

آخری تشہد میں ''رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ'' پڑھنا

سوال آخری تشہد میں عام طور پر ''رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ'' پڑھا جاتا ہے، کیا یہ دعا پڑھنا مسنون عمل ہے، کتاب وسنت کا حوالہ ضرور دیں؟

جواب جب کوئی نمازی آخری تشہد میں بیٹھا ہو تو التحیات اور درود پڑھنے کے بعد حسب منشا کوئی بھی دعا پڑھ سکتا ہے اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ دعائیں مروی ہیں جو رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے اور پڑھنے کی تلقین کرتے

---

❶ اصل صفة الصلوٰة، ص:١٦٦، ج١۔ ❷ ابو داود، الصلوٰة:٦١٨۔ ❸ صحیح مسلم، الصلوٰة:٤٩٨۔

تھے، تاہم رسول اللہ ﷺ سے مروی ایک حدیث کے پیش نظر کوئی بھی پسندیدہ دعا پڑھی جا سکتی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تشہد اور درود کے بعد نمازی کو دعا کا انتخاب کرنا چاہیے جو اسے سب سے زیادہ اچھی معلوم ہو۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ''رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ'' اور ''ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ'' اور اس طرح کی دیگر قرآنی دعائیں تشہد کے بعد پڑھی جا سکتی ہیں اور یہ جائز ہیں، اگرچہ مسنون نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

نماز میں امام کو لقمہ دینا

سوال فرض یا نفل نماز میں قراءت کے وقت بھولنے پر امام کو لقمہ دینے کی کیا دلیل ہے؟ قرآن و حدیث سے وضاحت کریں۔

جواب فرض یا نفل نماز میں قراءت کے وقت بھولنے پر امام کو لقمہ دے دیا جائے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی بلکہ ایسا کرنا جائز ہے جیسا کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ نماز میں قراءت فرما رہے تھے، آپ نے ایک آیت کو چھوڑ دیا، ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے دوران قراءت ایک آیت چھوڑ دی تھی تو آپ فرمایا: ''تم نے وہ آیت مجھے یاد کیوں نہ کرائی، یعنی نماز میں بتلایا کیوں نہیں۔'' [2]

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی تو آپ پر قراءت خلط ملط ہوگئی، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی ہے؟'' انہوں نے عرض کیا کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا: ''پھر تمہیں کس بات نے (غلطی بتانے سے) روکے رکھا؟'' [3]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھتے ہوئے اگر امام بھول جائے تو اسے لقمہ دیا جا سکتا ہے چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم عہد رسالت میں اپنے امام کو لقمہ دیا کرتے تھے اور اسے حرج خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ [4] اس سلسلہ میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ نماز میں امام کو لقمہ نہ دیا کرو۔ [5] لیکن یہ حدیث ضعیف ہے، اسے دورانِ نماز لقمہ نہ دینے کے بارے میں بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

مسجد میں دوسری جماعت کا جواز

سوال ہمارے ہاں عام طور پر دینی جلسوں میں دیکھا جاتا ہے کہ نماز با جماعت ادا ہو رہی ہوتی ہے تو کچھ حضرات اپنے کام میں یا فضول باتوں میں مصروف رہتے ہیں، جب جماعت ہو جاتی ہے تو وہ اپنی جماعت کراتے ہیں، اسی طرح مسجد میں متعدد جماعتیں ہوتی ہیں، ایسی جماعتوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا ایک مسجد میں ''اصل جماعت'' کے بعد دوسری جماعت کی گنجائش

---

[1] صحیح بخاری، الاذان: ۸۳۱۔ [2] بیہقی، ص: ۲۱۱، ج۳۔ [3] ابوداود، الصلوٰۃ: ۹۰۷۔
[4] مستدرک حاکم، ص: ۲۷۶ ج ۱۔ [5] ابوداود، الصلوٰۃ: ۹۰۸۔

ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

جواب اگر چند حضرات کسی عارضہ کی وجہ سے اصل جماعت میں شریک نہ ہو سکے ہوں بلکہ وہ تاخیر سے مسجد میں آئیں جب کہ لوگ نماز پڑھ چکے ہوں تو بلاشبہ اگر وہ جماعت سے نماز ادا کر لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ جس صورت حال کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے اسے مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ ایسا کرنا جماعتی استحکام اور اجتماعیت کو توڑنے کے مترادف ہے، اہل علم حضرات کو اس رویے پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ اصل مسئلہ کی وضاحت حسب ذیل ہے۔

ایک ہی مسجد میں فرض نماز کی دوسری جماعت جائز اور درست ہے جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کیا کوئی شخص ہے جو اس پر صدقہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ نماز ادا کرے۔ [1]

امام حاکم اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مساجد میں دومرتبہ جماعت کی دلیل ہے۔ [2]

ہمارے رجحان کے مطابق ایک مسجد میں دوسری جماعت جائز ہے جیسا کہ درج بالا حدیث سے معلوم ہوتا ہے البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے عمل کی وجہ سے اس میں کچھ کراہت معلوم ہوتی ہے جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ایک مرتبہ ایسی مسجد میں آئے جس میں نماز ادا کی جاچکی تھی، آپ اپنے گھر گئے وہاں اہل خانہ کو جمع کیا اور ان کے ساتھ نماز باجماعت ادا فرمائی۔ [3]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک دفعہ مسجد میں آئے تو نماز ادا ہو چکی تھی، آپ اپنے گھر واپس آئے اور اپنے شاگردوں حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت اسود رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ نماز باجماعت ادا کی۔ [4]

بہر حال صورت مسئولہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اسے کوئی بھی صاحب بصیرت اہل علم مستحسن قرار نہیں دے گا۔ (واللہ اعلم)۔

امام مقتدی حضرات کا خیال رکھے

سوال ایک امام نماز عشاء کی پہلی دو رکعات میں نصف پارہ کے قریب قراءت کرتا ہے اور مقتدی حضرات کے بڑھاپے یا ان کی بیماری کا خیال نہیں رکھتا، سلام پھیرنے کے بعد اگر مقتدی احتجاج کرتے ہیں تو انہیں ڈانٹ دیتا ہے اور منبر پر بیٹھ کر مقتدی حضرات کی کردارکشی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں امام ہوں، میری مرضی، میں جس طرح چاہوں قراءت کروں، ایسے امام کے بارے میں قرآن وحدیث کا کیا فیصلہ ہے؟

جواب امام کو چاہیے کہ وہ مقتدیوں کا خیال رکھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ نماز کو لمبا کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے پیچھے بچے کے رونے کی آواز سن کر نماز کو مختصر کر دیتے کیونکہ اس کے رونے سے ماں کی پریشانی کو آپ جانتے تھے۔ [5]

---

[1] ابو داود، الصلوٰۃ:۵۷٤۔ [2] مستدرك حاکم، ص:۲۰۹، ج ا۔

[3] مجمع الزوائد، ص:٤۵، ج ۲۔ [4] مصنف عبدالرزاق، ص:٤۰۹، ج ۲۔ [5] صحیح بخاری، الاذان:۷۰۵۔

بلکہ اس سلسلہ میں آپ کی واضح ہدایات ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کرائے تو اسے تخفیف کرنی چاہیے کیونکہ مقتدیوں میں بچے، بوڑھے، کمزور اور حاجت مند لوگ بھی ہوتے ہیں ہاں جب تنہا نماز پڑھے تو پھر جس طرح چاہے نماز پڑھے۔ ❶

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک شخص نے آپ سے شکایت کی کہ میں صبح کی نماز سے دانستہ پیچھے رہتا ہوں کیونکہ ہمارے امام بہت لمبی قراءت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے اور آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا: ''تم میں سے کچھ لوگ نفرت پیدا کرتے ہیں، جو شخص دوسروں کی امامت کرائے اسے چاہیے تخفیف سے کام لے کیونکہ لوگوں میں ناتواں، بوڑھے اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔'' ❷

تخفیف کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خشوع اور خضوع کے بغیر، اطمینان اور اعتدال کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے جلد از جلد نماز کو سمیٹ لیا جائے، بلکہ امام کو چاہیے کہ وہ قراءت میں تخفیف کرے اور رکوع وسجود کو پورا کرے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ''امام کو قیام میں تخفیف کرنی چاہیے البتہ رکوع وسجود کو پورا کرنا چاہیے۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس شخص نے رکوع وسجود میں اپنی کمر سیدھی نہ کی، اس کی نماز کفایت نہیں کرے گی۔'' ❸

اس حدیث کے پیش نظر نماز میں مختصر قراءت اور مختصر اذکار سے طوالت کو کم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی ادائیگی میں مکمل خشوع وخضوع اور اطمینان واعتدال ہونا چاہیے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز کو مختصر مگر مکمل پڑھا کرتے تھے۔ ❹

صورت مسئولہ میں مقتدی حضرات کے ساتھ امام کا رویہ مستحسن نہیں ہے، اسے چاہیے کہ اس پر نظر ثانی کرے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو طویل نماز پڑھانے سے بایں الفاظ روکا:

''اے معاذ رضی اللہ عنہ! کیا تو نمازیوں کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔'' ❺

ان احادیث کی روشنی میں امام صاحب کو چاہیے کہ وہ فرض نماز کی جماعت کراتے ہوئے مختصر قراءت کرے، جسے مقتدی حضرات برداشت کرسکتے ہوں البتہ نفل نماز میں اپنا شوق پورا کرلیا جائے۔ (واللہ اعلم)

دوران نماز حیض کا آجانا

سوال نماز کا وقت شروع ہوجانے کے بعد اگر عورت کو حیض آجائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے، آیا وہ اس نماز کی قضاء ادا کرے گی؟

جواب اگر نماز کا وقت ہوگیا تھا، اس کے بعد عورت کو حیض جاری ہوا تو وہ حیض سے پاک ہونے کے بعد اس نماز کی قضاء دے گی جس کا وقت شروع ہوچکا تھا لیکن دوران حیض رہ جانے والی نماز کی قضاء نہیں دے گی جیسا کہ ایک حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ بات نہیں ہے، کہ حالت حیض میں وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ ہی روزہ رکھتی ہے۔'' ❻

---

❶ بخاری، الاذان:۷۰۳۔ ❷ صحیح بخاری، الاذان:۷۰۲۔ ❸ مسند امام احمد، ص:۱۱۲، ج ٤۔
❹ صحیح بخاری، الاذان:۷۰۲۔ ❺ صحیح بخاری، الاذان:۷۰۵۔ ❻ صحیح بخاری، الحیض:۳۰٤۔

اہل علم کا اس امر پر اجماع ہے کہ عورت اس نماز کی قضاء نہیں دے گی جو مدت حیض میں فوت ہوئی ہو، یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر اس وقت عورت پاک ہو جب نماز کی ایک رکعت یا اس سے زیادہ کی تعداد ادا کرنے کا وقت باقی تھا تو اسے یہ نماز بھی ادا کرنا ہوگی کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالی اس نے عصر کو پالیا۔'' [1]

اس حدیث کی بناء پر جب کوئی عورت غروب آفتاب یا طلوع آفتاب سے پہلے پاک ہو اور سورج کے غروب یا طلوع ہونے میں اتنا وقت باقی ہو کہ ایک رکعت پڑھ سکتی ہو تو پہلی صورت میں نماز عصر اور دوسری صورت میں نماز فجر پڑھنا ہوگی، الغرض صورت مسئولہ میں اگر نماز کا وقت شروع ہونے کے بعد اسے حیض جاری ہو تو اسے وہ نماز ادا کرنا ہوگی جس کا وقت شروع ہو چکا تھا اور وقت آنے کی بناء پر اس کے ذمے واجب الاداء تھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴾ [2]

''بے شک نماز کا اہل ایمان پر وقت مقررہ میں ادا کرنا فرض ہے۔''

لہٰذا اس قسم کی فوت شدہ نماز کو طہارت کے بعد ادا کرنا ہوگا کیونکہ وہ نماز حالت طہارت میں اس کے ذمے عائد ہو چکی تھی۔ (واللہ اعلم)

گھر میں میاں بیوی کا فرض نماز ادا کرنا

سوال کیا گھر میں میاں بیوی دونوں فرض نماز کی جماعت کرا سکتے ہیں؟ اگر کرا سکتے ہیں تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

جواب مرد حضرات کے لیے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے، بلاوجہ ان کا گھر میں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے، اگر کسی معقول عذر کی وجہ سے گھر میں نماز ادا کرنا ضروری ہو تو بیوی خاوند دونوں جماعت کرا سکتے ہیں، اس کی صورت یہ ہوگی کہ خاوند جماعت کرائے اور بیوی اس کے برابر کھڑا ہونے کے بجائے پیچھے کھڑی ہوگی، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے گھر ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے جماعت کرائی تو میں اور بچہ آپ کے پیچھے اور ہماری والدہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اکیلی ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں۔ [3]

عورت کسی صورت میں مرد کی جماعت نہیں کرائے گی خواہ وہ عالمہ فاضلہ ہی کیوں نہ ہو۔

بلاعذر نمازیں جمع کرنا

سوال ہمارے گاؤں میں درج ذیل وجوہات کی بنا پر مسلسل تین تین دن تک مغرب وعشاء کی نمازیں جمع کی جاتی ہیں: (الف) ہلکی ہلکی بونداباندی ہو رہی ہو۔ (ب) موسم خراب یا ابر آلود ہو۔ (ج) ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو۔ اس سلسلہ میں صحیح مسلم کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر عذر کے نمازیں جمع کی تھیں، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں کہ ایسے

---

[1] صحیح مسلم، المساجد: ٦٠٨۔ [2] ٤/النساء: ١٠٣۔ [3] صحیح بخاری، الاذان: ٧٢٧۔

حالات میں نمازیں جمع کرنے کا جواز ہے؟ کیا صحیح مسلم میں اس طرح کی کوئی روایت موجود ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔

جواب ہرنماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا ضروری ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا﴾ [1]

''اہل ایمان پر نماز اس کے مقررہ اوقات پر فرض کی گئی ہے۔''

اس لیے کسی نماز کے وقت میں بلا عذر جمع کرنا درست نہیں ہے بلکہ بعض روایات میں ہے کہ بلا عذر نمازوں کو جمع کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ [2]

اگرچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے کہ یہ روایت ابوعلی حسین بن قیس الوھبی کی وجہ سے سخت ضعیف ہے البتہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بلا وجہ نمازوں کو جمع کرتا ہے وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ [3]

سوال میں صحیح مسلم کے حوالہ سے نمازوں کو بلا عذر جمع کرنے کی روایت محض ظن وتخمین پر مبنی ہے، صحیح مسلم میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں کو بلا عذر جمع کیا تھا بلکہ صحیح مسلم کی روایات حسب ذیل ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو کسی قسم کے خوف یا سفر کے بغیر جمع کر کے ادا کیا۔ [4]

ایک روایت کے مطابق مدینہ طیبہ میں خوف کے بغیر جمع کرنے کا ذکر ہے، راوی نے اس کی وجہ دریافت کی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ امت کو کسی قسم کی مشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے، ایک روایت میں خوف اور بارش کے بغیر جمع کرنے کا ذکر ہے، یہ تمام روایات مسلم میں حدیث نمبر ۷۰۵ کے تحت مذکور ہیں، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت میں ''علۃ'' یعنی بیماری کے الفاظ کا اضافہ ہے۔ [5]

البتہ بلا عذر کے الفاظ کسی روایت میں نہیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ میں نمازوں کا جمع کرنا بھی کسی سبب کی وجہ سے تھا جس کی وضاحت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں ایک دن عصر کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے وعظ پر مشتمل خطبہ دیا تا آنکہ سورج غروب ہو گیا اور ستارے چمکنے لگے، لوگوں نے ''الصلوٰۃ الصلوٰۃ؟ کہنا شروع کر دیا پھر بنو تمیم کا ایک آدمی آیا، اس نے بھی بلا دھڑک ''الصلوٰۃ الصلوٰۃ'' کی آواز بلند کی تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا افسوس ہے تو مجھے سنت کی تعلیم دیتا ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے مدینہ طیبہ میں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو جمع کیا تھا۔

عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میرے دل میں کھٹکا سا پیدا ہوا۔ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مؤقف کی تصدیق کی۔ [6]

اس تفصیلی روایت میں واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی ایک معقول عذر کی بناء پر مغرب وعشاء کو جمع کیا تھا وہ یہ کہ آپ کسی اہم موضوع پر تقریر کر رہے تھے، اگر درمیان میں مغرب کی نماز پڑھی جاتی تو تسلسل کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے کچھ باتیں

---

[1] ٤/النساء:١٠٣۔ [2] ترمذی، ابواب الصلوٰۃ:١٨٨۔ [3] بیھقی، ص:١٦٩، ج٣۔

[4] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:٧٠٥۔ [5] طحاوی:٩٦، ج١۔ [6] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:٧٠٥۔

ذہن سے محو ہو جاتیں اور شاید کچھ لوگ بھی نماز کے بعد چلے جاتے اور پورا وعظ سننے سے محروم رہتے، اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نماز مغرب کو نماز عشاء کے ساتھ جمع کر کے پڑھا پھر آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل کا حوالہ دیا کہ آپ نے بھی ایسے حالات میں دو نمازوں کو جمع کیا تھا۔ سابقہ احادیث میں چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو نمازوں کو جمع کرنے کا سبب بن سکتے ہیں:

① سفر ② خوف ③ بارش ④ بیماری

ان اسباب کے علاوہ میدان عرفہ اور مزدلفہ میں بھی جمع کرنا مناسک حج میں سے ہے۔ مستحاضہ عورت کو بھی دو نمازیں جمع کر کے ادا کرنے کی اجازت ہے۔ جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت مروی ہے، ابن قدامہ لکھتے ہیں: ''سفر کے علاوہ بارش، بیماری یا کسی اہم ضرورت کے پیش نظر بھی نمازیں جمع کی جاسکتی ہیں اگر جمع تقدیم میں پہلی نماز کے وقت دوسری نماز ادا کر لی جائے تو سفر یا بارش کا عذر ختم ہونے کے بعد دوسری نماز کا وقت باقی ہو تو ادا شدہ نماز کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' [1]

دراصل ہم اس سلسلہ میں بہت افراط وتفریط کا شکار ہیں، کچھ اہل علم کا خیال ہے کہ بارش، نمازوں کا جمع کرنے کا سبب نہیں ہے خواہ کتنی موسلا دھار ہی کیوں نہ ہو اور لوگوں کو آنے جانے میں دقت ہی کا کیوں نہ سامنا کرنا پڑے حالانکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایات میں خوف، بارش، بیماری اور سفر وغیرہ جمع کے اسباب کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ [2]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب امراء وقت بارش کی وجہ سے مغرب وعشاء کی نمازیں جمع کر کے ادا کرتے تو آپ بھی ان کے ہمراہ جمع کر لیتے تھے۔ [3]

حضرت عروہ بن زبیر، سعید بن مسیب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم سے بارش کی بناء پر نمازوں کو جمع کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ [4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ بارش کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنے کا طریقہ رائج تھا۔ جبکہ کچھ لوگ اس قدر تفریط میں مبتلا ہیں کہ معمولی بوندا باندی یا تیز ہوا کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنے کے عادی ہیں، جیسا کہ سوال میں جمع کرنے کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ کاروباری حضرات کا معمول ہے کہ وہ سستی یا کاروباری مصروفیات کی بناء پر نمازوں کو جمع کرنے کا معمول بنا لیتے ہیں، بہر حال اس سلسلہ میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے کہ سفر کے علاوہ شدید بارش، سخت آندھی، انتہائی سردی یا ژالہ باری کے وقت نمازوں کو جمع کیا جاسکتا ہے۔

جنگی حالات اور ہنگامی اوقات میں بھی نمازوں کو جمع کرنے کا جواز ہے، لیکن کاروباری مصروفیات، سستی، ہلکی پھلکی بوندا باندی، موسم کی خرابی، ابر آلودگی یا ٹھنڈی ہوا وغیرہ کے وقت نمازوں کو جمع کرنا محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

سجدہ شکر کے لیے باوضو ہونا

سوال خوشی ومسرت کے حصول یا مصیبت وتکلیف سے نجات پر سجدہ شکر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کے لیے

---

[1] مغنی، ص: ۲۸۱، ج ۲۔ [2] ارواء الغلیل، ص: ۴۰، ج۔

[3] موطا امام مالك، قصر الصلوٰة، باب الجمع بين الصلوٰتين۔ [4] بيهقى، ص: ۱۶۸، ج ۳۔

باوضوء ہونا ضروری ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب ارشاد فرمادیں؟

جواب کسی بھی نعمت کے حصول یا مصیبت سے چھٹکارے کے موقع پر سجدہ شکر مشروع ہے، رسول اللہ ﷺ سے خوشی ومسرت کے موقع پر سجدہ شکر کرنا ثابت ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی خوشخبری ملتی تو آپ اللہ کے حضور سجدہ میں گر جاتے۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کی طرف روانہ فرمایا کہ وہاں اہل کتاب کو توحید کی دعوت دی جائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں تبلیغ کی۔ جس کے نتیجہ میں وہ مسلمان ہو گئے پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ان کے مسلمان ہونے کی اطلاع بھیجی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کا مکتوب پڑھا تو اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدے میں گر گئے۔ [2]

اسی طرح حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا اور دیر تک سجدے کی حالت میں رہے پھر آپ نے اپنا سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے بشارت دی تو میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو گیا۔ [3]

یہ سجدہ اس طرح ہے جس طرح نماز کے علاوہ سجدہ تلاوت ہوتا ہے، اس کے لیے نماز کی شرائط نہیں ہیں، اسے وضو کے بغیر بھی ادا کیا جا سکتا ہے، تاہم بہتر ہے کہ اسے باوضو ادا کیا جائے، سجدہ شکر ادا کرتے وقت اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں جانا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے سجدہ کی کیفیت اسی طرح ہے کہ آپ سجدہ کو جاتے اور سر اٹھاتے وقت اللہ اکبر کہتے تھے، اگرچہ اس میں سجدہ شکر کی صراحت نہیں تاہم سجدہ کو ادا کرنے کا یہی طریقہ منقول ہے، ہاں البتہ اس کے لیے سلام پھیرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ دوران سجدہ، سجدہ کی دعا پڑھے اور اللہ کی تسبیح وکبریائی کو بجالائے۔ بہرحال سجدہ شکر مشروع ہے اور اس کے لیے طہارت شرط نہیں اور نہ ہی اختتام پر سلام پھیرنے کی ضرورت ہے۔

فرض نماز کے بعد سنتوں کی ادائیگی کے لیے جگہ تبدیل کرنا

سوال فرض نماز ادا کرنے کے بعد سنتوں کی ادائیگی کے لیے جگہ تبدیل کرنا ضروری ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کر دیں۔

جواب فرض نماز ادا کرنے کے بعد فوراً وہاں سنت ادا کرنا خلافت شریعت ہے، اس لیے بہتر ہے کہ درمیان میں کسی سے گفتگو کر لی جائے یا اس جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ سنت ادا کی جائیں، ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ ملانا صحیح نہیں ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ''ہم ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ نہ ملائیں تا آنکہ بات کر لیں یا دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔'' [4]

اس حدیث سے اہل علم نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ فرض اور سنتوں میں کلام یا نقل مکانی کے ذریعے فاصلہ ہونا چاہیے، اس لیے

---

[1] ابوداود، الجهاد: ٢٧٧٤۔ [2] بیهقی، ص: ٦٩، ج ٢۔ [3] مسند امام احمد، ص: ١٩١، ج ١۔

[4] صحیح مسلم، الجمعه: ٨٨٣۔

ہمارا رجحان ہے کہ فرض نماز کے فوراً بعد اس جگہ سنت ادا نہ کی جائیں بلکہ کسی دوسرے نمازی سے گفتگو کر لی جائے یا اپنی جگہ بدل لی جائے۔ (واللہ اعلم)

نماز قصر کے لیے کتنی مسافت ہو؟

سوال تعلیم الاسلام نامی کتاب میں لکھا ہے کہ اڑتالیس میل سے کم مسافت پر نماز قصر پڑھنا جائز نہیں ہے، جبکہ اہل حدیث حضرات نو میل مسافت پر قصر کر لینے کے قائل ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب اس موقف کی بنیاد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اہل مکہ! چار برید یعنی اڑتالیس میل سے کم مسافت پر قصر نہ کرو اور چار برید مکہ سے عسفان تک کا فاصلہ ہے۔ [1]

اس حدیث سے ثابت کیا گیا ہے کہ اڑتالیس میل سے کم مسافت پر قصر کرنا جائز نہیں ہے لیکن مذکورہ حدیث کو محققین نے مرفوع نہیں بلکہ موقوف یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول قرار دیا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ [2]

نیز اس کی سند میں ایک راوی عبدالوہاب بن مجاہد کو متروک قرار دیا گیا ہے۔ [3]

اس بناء پر یہ روایت قابل حجت نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ اگر کسی نے کم از کم نو میل کی مسافت پر کہیں جانا ہو تو اپنے شہر یا گاؤں کی حدود سے باہر نکل کر نماز قصر ادا کر سکتا ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تین میل یا تین فرسخ سفر کے لیے نکلتے تو دو رکعت نماز ادا کرتے۔ [4]

اس روایت میں راوئ حدیث شعبہ کو شک ہوا ہے تاہم علماء نے تین فرسخ والی روایت کو احوط قرار دیا ہے اور ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اس طرح تین فرسخ نو میل کے ہوں گے، اس کی مزید وضاحت دوسری روایت میں ہے کہ راوی حدیث حضرت یحییٰ بن یزید ہنائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ کتنی مسافت پر نماز قصر کی جا سکتی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تین میل یا تین فرسخ سفر کے لیے نکلتے تو دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ [5]

اس حدیث میں وضاحت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے سائل کو بطور جواب یہ حوالہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی مسافت پر قصر کرتے تھے، بہرحال اس سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ اگر منزل مقصود نو میل ☆ حجازی یا اس سے زائد مسافت پر ہے تو مسافر اپنے شہر یا گاؤں کی حدود تجاوز کرنے کے بعد نماز قصر پڑھ سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

بے نماز خاوند کے ساتھ زندگی گزارنا

سوال میرا خاوند نماز نہیں پڑھتا، اسے بار بار کہتی ہوں لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، حتی کہ وہ عیدین کی نماز بھی پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا گیا، ایسے بے نماز کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟ کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ دیں۔

---

[1] بیہقی، ص:۱۳۷، ج۳۔ [2] بلوغ المرام حدیث نمبر ۲۴۹۔ [3] میزان الاعتدال، ص:۶۸۲، ج۲۔ [4] مسند امام احمد، ص:۱۳٦، ج۳۔ [5] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ٦۹۱۔ ☆اس کی وضاحت ص:۹۸ پر آ رہی ہے۔

جواب جو آدمی نماز نہیں پڑھتا۔ بار بار توجہ دلانے کے باوجود نماز کے قریب نہیں جاتا حتیٰ کہ عیدین کی نماز بھی نہیں پڑھتا گویا اس کے نامہ اعمال میں نماز نامی کوئی چیز نہیں ہے ایسا آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہے، اس کے ساتھ رہنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن شقیق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اصحاب محمد ﷺ اعمال میں سے نماز کے سوا اور کسی چیز کے ترک کو کفر نہیں خیال کرتے تھے۔ [1]

اس کے متعلق دیگر بہت سی احادیث ہیں جن میں ترک نماز پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، ہاں اگر کوئی کبھی کبھار نماز چھوڑ دیتا ہے لیکن ترک نماز کی کھٹک دل میں محسوس کرتا رہتا ہے، اس کے متعلق اکثر علماء کچھ نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن صورت مسؤلہ میں جس بے نماز کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس مسئلہ کی سنگینی کے پیش نظر ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو ایسے جہلاء کے نکاح میں نہ دیں جو نماز نہیں پڑھتے حتیٰ کہ نماز عیدین کے بھی قریب نہیں جاتے۔ اس مسئلہ میں وہ کسی قریبی رشتہ دار یا دوست کا لحاظ نہ کریں۔ اگر اس سلسلہ میں ہم نے نرمی دکھائی تو عنداللہ باز پرس ہوگی۔ (واللہ اعلم)

فوت شدہ نمازوں کی ادائیگی

سوال فوت شدہ نمازوں کی قضاء کس وقت اور کس طرح دینی چاہیے؟ تفصیل سے جواب دیں اور دلیل سے مزین کریں۔

جواب فوت شدہ نمازوں کی قضاء کے متعلق ہمارے ہاں مشہور ہے کہ دوسرے دن انہیں فرض نمازوں کے ساتھ پڑھا جائے مثلاً اگر کسی وجہ سے نماز فجر رہ گئی ہو تو اسے اگلے دن نماز فجر کے ساتھ پڑھا جائے، یہ بات سرے سے بے بنیاد اور غلط ہے، بلکہ فوت شدہ نماز اسی وقت پڑھی جائے جب یاد آئے اسے آئندہ دن تک مؤخر نہ کیا جائے۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی نماز کو بھول جائے یا سو یا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے اسی وقت پڑھ لے جب اسے یاد آئے۔ [2] امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے "جو شخص نماز بھول جائے وہ اسی وقت پڑھے جب اسے یاد آئے۔" [3]

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ فوت شدہ نماز کو دوسرے دن اس وقت پڑھے جب اس کا وقت آئے بلکہ فرمایا کہ اسی وقت پڑھ لے جب اسے یاد آئے، ان کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے فوت شدہ نمازوں کو پڑھا جائے اس کے بعد موجودہ نمازیں ادا کی جائیں۔ رسول اللہ ﷺ سے غزوۂ خندق کے موقع پر نماز عصر فوت ہوگئی تو آپ نے غروب آفتاب کے بعد پہلے عصر پڑھی اس کے بعد نماز مغرب ادا کی۔ [4]

اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح عنوان قائم کیا ہے "فوت شدہ نمازوں کو پڑھتے وقت ترتیب کا خیال رکھا جائے۔" یہ عنوان اور پیش کردہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ انسان پہلے فوت شدہ نماز کو پڑھے پھر موجودہ نماز کو ادا کرے،

---

[1] ترمذی، الایمان: ۲۶۶۲۔ [2] صحیح مسلم، المساجد: ٦٨٤۔
[3] صحیح بخاری، مواقیت الصلوٰۃ، باب نمبر ۳۷۔ [4] صحیح بخاری، مواقیت الصلوٰۃ: ۵۹۸۔

لیکن اگر کسی نے بھول کر یا لاعلمی میں موجودہ نماز کو فوت شدہ سے پہلے پڑھ لیا تو اس کی نماز نسیان یا لاعلمی کے عذر کی وجہ سے صحیح ہو گی۔ مسئلہ کی مناسبت سے یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ قضاء نمازوں کی دو اقسام ہیں۔

(ا) آدمی فوت شدہ نماز کی اس وقت قضاء دے جب عذر ختم ہو جائے، اس میں نماز پنجگانہ آتی ہیں کہ تاخیر کا عذر ختم ہوتے ہی انہیں پڑھ لیا جائے۔ انہیں مزید مؤخر نہ کیا جائے۔

(ب) جب نماز فوت ہو جائے تو اسے قضاء پڑھنے کے بجائے اس کے بدل کی قضا دی جائے اس قسم کے تحت نماز جمعہ آتی ہے۔ جب انسان کا جمعہ فوت ہو جائے یا امام کے ساتھ دوسری رکعت کے سجدہ میں شامل ہوا ہو تو اس صورت میں اسے نماز ظہر بطور قضا پڑھنا ہوگی، جمعہ کی نماز کے لیے کم از کم ایک رکعت پانا ضروری ہے کیونکہ حدیث میں ہے ''جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز کو پالیا۔'' [1] اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے نماز جمعہ ایک رکعت سے کم پایا تو اس نے جمعہ نہیں پایا لہٰذا جمعہ کے بجائے اسے اب نماز ظہر کی قضاء دینا ضروری ہوگا۔ (واللہ اعلم)

چار ماہ سے حاملہ عورت کو خون آ گیا نماز کا کیا حکم ہے؟

سوال میری بیوی حاملہ تھی اسے چار ماہ کے بعد خون آنا شروع ہو گیا، اس خون کا شرعاً کیا حکم ہے آیا یہ خون نماز کے لیے رکاوٹ کا باعث ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب ولادت کے بعد آنے والے خون کو نفاس کہا جاتا ہے جو خونِ حیض کی طرح نجس ہے۔ ان ایام میں نماز روزہ ادا نہیں ہوتا بلکہ ان دنوں نمازیں معاف ہوتی ہیں البتہ روزوں کی قضا ضروری ہے۔ دوران حمل جاری ہونے والا خون نفاس نہیں۔ اسی طرح چار ماہ سے قبل اگر اسقاط ہو جائے تو وہ بھی نفاس شمار نہیں ہوگا۔ ایسی عورت پر استحاضہ کے احکام جاری ہوں گے، یعنی وہ ان دنوں کی نماز روزہ کا اہتمام کرے گی، نیز اسے ہر نماز کے لیے نیا وضو کرنا ہوگا۔ ایک وضو سے متعدد نمازیں نہیں پڑھ سکے گی۔ (واللہ اعلم)

نماز میں سجدہ سہو کا حکم

سوال ہم نے گزشتہ دنوں ظہر کی نماز باجماعت ادا کی، امام صاحب پہلی رکعت میں ایک سجدہ کر کے کھڑے ہو گئے، مگر بعد میں انہوں نے سجدہ سہو کر دیا اور کہا سجدہ رہ جانے کی تلافی سجدہ سہو کرنے سے ہو جاتی ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

جواب نماز میں کمی، بیشی اور شک پڑنے سے سجدہ سہو کرنا ہوتا ہے، اگر کوئی کمی ہو تو اسے پورا کرنا ضروری ہے مثلاً اگر رکعت رہ گئی ہے تو اسے ادا کرنا ہوگا پھر سجدہ سہو کیا جائے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عصر کی دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا، یاد آنے پر آپ ﷺ نے متروکہ رکعتیں ادا کی، اس کے بعد دو سجدے کیے پھر آپ ﷺ نے سلام پھیرا۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری، المواقیت: ۵۸۰۔ [2] صحیح بخاری، السهو: ۱۲۲۷۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے متروکہ نماز ادا کی پھر سلام پھیرا، اس کے بعد اللہ اکبر کہا اور دو سجدے بطور سہو کیے۔ 1

جو رکعت ایک سجدہ کے ساتھ پڑھی گئی اور ایک سجدہ رہ گیا وہ رکعت نہیں ہے کیونکہ رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدے ہوتے ہیں، یاد آنے پر پوری ایک رکعت کا اعادہ ضروری تھا، اس رکعت کو پڑھنے کے بعد پھر سجدے سہو کرنے تھے، نماز میں جو ایک سجدہ رہ گیا اس کی تلافی صرف سجدہ سہو سے نہیں ہوگی بلکہ پوری رکعت ادا کر کے سجدہ سہو کرنا چاہیے تھا۔ (واللہ اعلم)

امام کا درمیانی تشہد بھول جانا

سوال اگر امام درمیانی تشہد بیٹھے بغیر کھڑا ہو جائے تو کیا مقتدیوں کو بھی کھڑا ہو جانا چاہیے یا وہ اپنا تشہد مکمل کر لیں اور اگر امام سیدھا کھڑا ہو کر پھر بیٹھ جائے تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنا پڑے گا یا نہیں، نیز اگر امام آخری تشہد میں جلدی سلام پھیر دے تو کیا مقتدی حضرات بھی اس کے ساتھ سلام پھیر دیں یا وہ اپنا تشہد مکمل کر کے سلام پھیریں؟

جواب اگر امام دو رکعت پڑھنے کے بعد تشہد پڑھے بغیر کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

(ا) بالکل سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے اسے خود یاد آ جائے یا مقتدیوں کے یاد دلانے پر وہ بیٹھ جاتا تو اس صورت میں کوئی سجدہ سہو نہیں ہے۔ (ب) اگر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے تو اسے یاد آنے یا مقتدیوں کے یاد دلانے پر نہیں بیٹھنا چاہیے بلکہ اسی حالت میں نماز مکمل کر کے آخر میں دو سجدے سہو کے طور پر کرے، اس صورت میں مقتدی حضرات بھی اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے اور آخر میں سجدہ سہو میں شریک ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ اگر امام دو رکعت میں بیٹھنے کی بجائے کھڑا ہو جائے تو اگر سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے یاد آ جائے تو بیٹھ جائے اور اپنی نماز مکمل کر لے اور اگر سیدھا کھڑا ہو گیا ہے تو یاد آنے پر مت بیٹھے بلکہ آخر میں دو سجدے سہو کے طور پر کر دے۔ 2

اس روایت کو بیان کرنے کے بعد امام ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میری اس کتاب میں جابر جعفی سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے تاہم علامہ البانی مرحوم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اگر امام سیدھا کھڑا ہونے کے بعد پھر بیٹھ گیا ہے تو اس صورت میں بھی سجدہ سہو کرنا ہوں گے اور مقتدی بھی اس میں سجدہ سہو میں شریک ہوں گے۔

اگر امام نے اس قدر جلدی سلام پھیر دیا ہے کہ مقتدی حضرات تشہد اور درود نہیں پڑھ سکے تو انہیں تشہد اور درود پڑھ کر سلام پھیرنا چاہیے اور اگر انہوں نے تشہد اور درود پڑھ لیا ہے لیکن دیگر ادعیہ وغیرہ نہیں پڑھ سکے تو اس صورت میں مقتدی حضرات کو امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دینا چاہیے کیونکہ حدیث میں ہے: امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ 3

پہلی صورت میں امام کے ساتھ ہی مقتدیوں کو سلام نہیں پھیرنا چاہیے کیونکہ ان کا تشہد مکمل نہیں ہوا تھا اور اس کا مکمل کرنا ضروری تھا جبکہ دوسری صورت میں مقتدی حضرات تشہد اور درود پڑھ چکے ہیں لہٰذا انہیں امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دینا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

1 صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۴۸۲۔ 2 ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۰۳۶۔ 3 صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۶۸۹۔

قربانی کے خون کا کپڑوں پر لگنا

سوال اگر کپڑوں کو قربانی کا خون اور اس کا پیشاب لگ جائے تو کیا ان کپڑوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب قربانی کو ذبح کرتے وقت جو خون تیزی سے نکلتا ہے جسے دم مسفوح کہا جاتا ہے اگر یہ خون کپڑوں کو لگا ہوا ہے تو اس کی موجودگی میں نماز نہیں ہوتی ہے کیونکہ قرآن کریم نے اسے حرام کہا ہے، اس کے علاوہ اگر خون لگا ہے تو اس میں نماز پڑھی جا سکتی ہے، اسی طرح جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا پیشاب پلید نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے چند لوگوں کو اونٹنیوں کا دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا تھا جبکہ وہ مدینہ کی آب و ہوا سے بیمار ہو گئے تھے۔ [1] اگر یہ حرام یا نجس ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اسے بطور دوا استعمال کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ کیونکہ حرام چیزوں میں شفا نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہاری شفا ان چیزوں میں نہیں رکھی جنہیں تم پر حرام کیا ہے۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ نے جن لوگوں کو اونٹوں کا پیشاب پینے کا کہا تھا انہیں اس سے شفا ہوئی جو کہ اس کی حلت اور طہارت کے لیے کافی ہے۔ اس لیے اگر کپڑوں کو قربانی کا پیشاب وغیرہ لگا ہو تو اس میں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

عورتیں مردوں کی طرح سجدہ کریں

سوال سجدہ کرنے کا کیا طریقہ ہے، کیا سجدہ کرتے وقت ہاتھ پہلے رکھے جائیں یا گھٹنے، نیز مرد اور عورت کے سجدہ میں کوئی فرق ہے تو اس کی وضاحت کریں؟

جواب سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب کے بہت قریب ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''بندہ اپنے رب کے بہت زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے لہٰذا تم سجدہ کی حالت میں بکثرت دعا کیا کرو۔'' [3]

اس لیے نمازی کو چاہیے کہ سجدہ کو نہایت آداب اور سنت طریقہ کے مطابق ادا کرے۔ اس کی کیفیت احادیث کے مطابق درج ذیل ہے: سجدہ کے لیے جھکتے وقت پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے جائیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے اور اپنے ہاتھ گھٹنوں سے پہلے رکھے۔'' [4]

☆ سجدہ کرتے وقت سات اعضاء کو زمین پر لگانا چاہیے، چہرہ، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں۔ [5]
چہرے میں ناک اور پیشانی دونوں شامل ہیں۔ [6]

☆ دوران سجدہ دونوں ہاتھ زمین پر اور کہنیاں زمین سے اٹھی ہوئی ہوں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''جب تم سجدہ کرو تو اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر رکھو اور اپنی دونوں کہنیوں کو زمین سے اونچا رکھو۔'' [7]

---

[1] صحیح بخاری، الوضوء: ۲۳۳۔ [2] ابوداود، الطب: ۳۸۷۰۔ [3] صحیح مسلم، الصلوٰۃ: ۴۸۲۔
[4] ابوداود، الصلوٰۃ: ۸۴۰۔ [5] صحیح مسلم، الصلوٰۃ: ۴۹۱۔
[6] صحیح بخاری، الاذان: ۸۱۲۔ [7] مسند امام احمد، ص: ۲۸۳، ج ۴۔

☆ دوران سجدہ قدموں کی ایڑیاں ملی ہوئی ہوں اور پاؤں کی انگلیوں کا رخ قبلہ کی طرف اور قدم کھڑے ہوں۔ [1]

☆ سجدے میں دونوں ہاتھ پہلوؤں سے دور ہوں، سینہ، پیٹ اور رانیں زمین سے اونچی ہوں نیز پیٹ کو رانوں سے اور رانوں کو پنڈلیوں سے جدا رکھا جائے۔ [2]

☆ سجدہ میں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم ملا کر رکھا جائے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو اپنی انگلیاں ملا لیتے تھے۔ [3]

☆ سجدہ کرتے وقت پیشانی ننگی ہو ہاں بوقت ضرورت کپڑے وغیرہ پر سجدہ کرنا جائز ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب گرمی کی وجہ سے زمین پر پیشانی رکھنا مشکل ہوتا تو ہم اپنا کپڑا بچھا کر اس پر سجدہ کر لیتے تھے۔ [4]

مرد اور عورت کے سجدہ میں کوئی فرق نہیں ہے، جو لوگ اس میں فرق کرتے ہیں کہ عورت زمین سے چمٹ کر سجدہ کرے، ان کا مؤقف محل نظر ہے، کتاب وسنت میں اس تفریق کی کوئی دلیل نہیں ہے، عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کی طرح مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق سجدہ کرے۔ (واللہ اعلم)

نماز چاشت اور نماز اشراق میں فرق اور رکعات وغیرہ

سوال نماز چاشت اور نماز اشراق میں کیا فرق ہے اور اس کی کتنی رکعات ہیں اور انہیں کس وقت ادا کرنا چاہیے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی کریں۔

جواب جو نماز طلوعِ آفتاب سے زوالِ آفتاب کے درمیان ادا کی جائے اسے صلوٰۃ ضحیٰ کہتے ہیں، ہم اسے نماز چاشت یا اشراق بھی کہتے ہیں، اس کا ایک نام صلوٰۃ الاوابین بھی ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل حدیث سے لگایا جا سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کے لیے صبح صبح تمام جوڑوں کا صدقہ لازم ہے، سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے، الحمد للہ کہنا بھی صدقہ ہے، اللہ اکبر کہنا بھی صدقہ ہے، نیز اچھی بات کا حکم دینا اور برے کام سے منع کرنا بھی صدقہ ہے، ان تمام صدقات سے نماز چاشت کی دو رکعات کفایت کر جاتی ہیں۔'' [5]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میرے خلیل حضرت محمد ﷺ نے مجھے تین چیزوں کی وصیت فرمائی: ہر ماہ تین دنوں کے روزے رکھو، چاشت کی دو رکعت پڑھو اور سونے سے قبل نماز وتر ادا کرو۔ [6]

اس نماز کی کم از کم دو رکعت اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعت ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چار رکعت پڑھنا مروی ہے۔ [7]

اور حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چاشت کی آٹھ رکعت ادا کی تھیں۔ [8]

---

[1] مستدرك حاكم، ص:۲۲۸، ج۱؛ صحيح بخاري، الاذان:۸۲۸۔ [2] صحيح بخاري، الاذان:۸۲۸۔
[3] مستدرك حاكم، ص:۲٤٤، ج۱۔ [4] بخاري، الصلوٰة:۳۸۵۔
[5] صحيح مسلم، صلوٰة المسافرين: ۷۲۰۔ [6] صحيح بخاري الصوم:۱۹۸۱۔
[7] صحيح مسلم، صلوٰة المسافرين:۷۱۹۔ [8] صحيح بخاري، الصلوٰة:۳۵۷۔

ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے چاشت کی بارہ رکعت ادا کیں، اس کے لیے جنت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک محل تیار کیا جاتا ہے۔ [1]

لیکن یہ حدیث ضعیف ہے جیسا کہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صراحت کی ہے۔ [2]

بہر حال اس کے نام کئی ایک ہیں، صلوٰۃ الاوابین احادیث میں آیا ہے، ہم اس نماز کو نماز چاشت اور نماز اشراق کہتے ہیں، احادیث میں اس نماز کی بہت فضیلت آئی ہے، اگر ہمت ہو تو اس کا اہتمام کرنا چاہیے، جن حضرات نے اسے بدعت قرار دیا ہے، ان کا مؤقف درج بالا احادیث کے پیش نظر مرجوح ہے۔ (واللہ اعلم)

جو آدمی اذان دے وہی تکبیر کہے؟

سوال ہماری مسجد میں ایک آدمی نے اذان دی تو کسی دوسرے نے تکبیر کہہ دی، اس کے متعلق اختلاف ہوا کہ تکبیر وہی کہے جس نے اذان دی ہو، کیا واقعی ایسا ہی کرنا چاہیے؟

جواب مصلحت کا تقاضا ہے کہ جو اذان کہے وہی تکبیر کہے تا کہ جماعتی نظم میں خرابی نہ آئے، شرعی اعتبار سے دونوں طرح جائز ہے چنانچہ حضرت زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اذان دے وہی اقامت کہے۔'' [3]

لیکن اس حدیث کی سند میں عبدالرحمن بن زیادہ افریقی ضعیف ہے، اس بناء پر یہ حدیث قابل حجت نہیں، اس پر مفصل بحث علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔ [4]

ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان دینے والے کے علاوہ کوئی دوسرا بھی اقامت کہہ سکتا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اذان دینے کے عمل کو خواب میں دیکھا، اس بناء پر میری خواہش تھی کہ مجھے مؤذن مقرر کیا جائے گا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اقامت کہو۔ [5]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان دینے والے کے علاوہ دوسرا شخص بھی اقامت کہہ سکتا ہے لیکن یہ حدیث بھی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اس میں محمد بن عمرو واقفی نامی راوی ضعیف ہے۔ [6]

چونکہ اصل اباحت ہے، اس لیے مؤذن کے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی تکبیر کہہ سکتا ہے، اگر مؤذن موجود نہ ہو تو اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ کوئی بھی دوسرا اقامت کہہ سکتا ہے لیکن اگر موجود ہے تو اسے تکبیر کہنے کا موقع دیا جائے، خواہ مخواہ ایسی باتوں کو بنیاد بنا کر اختلاف کی خلیج کو وسیع نہ کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ترمذی، الصلوٰۃ:٤٧٢۔ [2] ضعیف ترمذی حدیث نمبر ٧٠۔

[3] مسند امام احمد، ص:١٦٩، ج٤۔

[4] الاحادیث الضعیفہ، ص:٥٤، ج١۔ [5] مسند امام احمد، ص:٤٢، ج٤۔

[6] تقریب التہذیب، ص:١٩٦، ج٢۔

مؤذن کا اذان پر اجرت لینا

سوال حدیث میں اذان دینے کی اجرت لینا ممنوع ہے، پھر مؤذن حضرات تنخواہ کیوں لیتے ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب بلاشبہ حدیث میں ہے کہ مؤذن کو اذان دینے پر اجرت نہیں لینی چاہیے چنانچہ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایسے شخص کو مؤذن بناؤ جو اذان پر اجرت نہ لے۔'' [1]

لیکن حضرت ابوحمزہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے جب اپنی اذان مکمل کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک تھیلی دی جس میں کچھ چاندی تھی۔ [2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اجرت حرام اس وقت ہے جب مشروط ہو لیکن مانگے بغیر کچھ دیا جائے تو جائز ہے، لیکن ہمارے ہاں مؤذن صرف اذان دینے پر اجرت نہیں لیتے بلکہ مسجد کی نگرانی، اس کی صفائی اور دیگر کام بھی اس کے ذمے ہوتے ہیں گویا وہ چوبیس گھنٹے کا پابند ہے وہ اذان دینے کی تنخواہ نہیں لیتا بلکہ وقت دینے اور چوبیس گھنٹے پابند رہنے کی تنخواہ لیتا ہے۔ ہمارا رجحان یہ ہے کہ ایسا مؤذن مقرر کیا جائے جو اذان کہنے پر اجرت نہ لیتا ہو، جیسا کہ حدیث میں اس کی وضاحت ہے لیکن اگر ایسا مؤذن میسر نہ ہو تو پھر اجرت پر مؤذن رکھنے میں چنداں حرج نہیں ہے، پھر ہمارے ہاں مؤذن صرف اذان ہی نہیں دیتے بلکہ اور بہت سے کام سرانجام دیتے ہیں، بہرحال اوقات نماز سے آگاہی کے لیے مؤذن کی تقرری انتہائی ضروری ہے اگر مؤذن کا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے تو اس کے اجرت لینے پر کوئی حرج نہیں ہے، اگر صاحب حیثیت ہے تو اذان دینے پر اجرت لینا درست نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

حقہ نوشی کر کے مسجد میں آنے کی مذمّت

سوال کچھ لوگ تازہ تازہ حقہ نوشی کر کے مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آجاتے ہیں جب کہ ان کے منہ سے گندی ہوا آتی ہے ان کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب حقہ نوشی یا سگریٹ کا استعمال ویسے بھی منع ہے، کیونکہ اس میں بے شمار طبی اور معاشرتی نقصانات ہیں، خاص طور پر ان حضرات کا تازہ تازہ حقہ یا سگریٹ پی کر مسجد میں آنا جس سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہو، شرعاً اس کی ممانعت ہے۔ اشیاء خوردنی میں مولی یا لہسن کا استعمال جائز ہے لیکن اگر کوئی شخص انہیں استعمال کر کے مسجد میں آئے اور اس کے منہ کی ہوا سے دوسرے لوگوں کو تکلیف ہو تو شرعاً اس کی ممانعت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص کچا لہسن یا پیاز کھائے وہ ہم سے دور رہے یا فرمایا کہ وہ ہماری مسجد سے دور رہے اور اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔'' [3]

اس حدیث کے پیش نظر ہر اس چیز کو استعمال کر کے مسجد میں آنا منع ہے جو دوسروں کے لیے ناگواری کا باعث ہو، خواہ استعمال

---

[1] ابوداود، الصلوٰۃ:۵۳۱۔ [2] مسند امام احمد، ص:۴۰۹، ج۳۔

[3] صحیح بخاری، الاعتصام:۷۳۵۹۔

ہونے والی چیزیں حلال ہوں یا حرام۔ تمباکو کا استعمال تو علمائے اسلام کے ہاں محل نظر ہے چہ جائیکہ اسے استعمال کر کے مسجد میں آنا جائز ہو جس سے دوسروں کو ناگواری ہوتی ہو۔

نماز میں ہاتھ باندھنے کا درست طریقہ

سوال امسال حج کے موقع پر حکومت سعودیہ کی طرف سے حجاج کرام میں دینی کتب تحفہ کے طور پر تقسیم کی گئی ہیں، ان میں مختصر زاد المعاد بھی ہے اس میں دوران نماز ہاتھوں کے متعلق لکھا ہے کہ دونوں ہاتھوں کے رکھنے کی جگہ کے بارے میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں۔ (لیکن ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہتھیلی کو ہتھیلی پر ناف کے نیچے باندھا جائے) اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب نماز میں قیام کے دوران ہاتھ باندھنے کی جگہ کے متعلق اگرچہ علماء کا اختلاف ہے لیکن راجح اور برحق یہ ہے کہ دورانِ قیام سینے پر ہاتھ باندھے جائیں جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

☆ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز پڑھی تو آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر اپنے سینے کے اوپر رکھا۔ [1]

☆ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ آدمی نماز میں اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں بازو پر رکھیں۔ [2]

واضح رہے کہ جب بائیں بازو پر دایاں ہاتھ رکھا جائے گا تو دونوں ہاتھ خود بخود سینہ پر آ جائیں گے۔

☆ امام طاؤس رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ پر رکھتے پھر انہیں اپنے سینے پر باندھتے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ نماز میں ہوتے۔ [3]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے تاہم تمام علماء کے ہاں قابل حجت ہے، کیونکہ یہ دوسری سندوں سے متصل بھی بیان ہوئی ہے۔ [4]

اس لیے سوال میں مذکورہ کتاب کے حوالے سے لکھا گیا ہے وہ محل نظر ہے، البتہ بریکٹ میں ابوداؤد کی ایک روایت کا حوالہ دیا گیا ہے کہ ہاتھوں کو ناف کے نیچے رکھا جائے، یہ اصل کتاب مختصر زاد المعاد میں نہیں بلکہ مترجم نے اپنی طرف سے لکھا ہے غالباً اسی لیے اس عبارت کو بریکٹ میں رکھا گیا ہے۔ تاہم جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے وہ قابل حجت نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمن بن اسحاق کوفی ضعیف ہے، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس راوی کو بالاتفاق ضعیف قرار دیا ہے۔ [5]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔ [6]

بہرحال اس مسئلہ میں سب سے زیادہ صحیح روایت حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی ہے جس کا ہم نے گزشتہ سطور میں حوالہ دیا

---

[1] صحیح ابن خزیمہ، ص:۲۴۳، ج۱۔ [2] صحیح بخاری، الاذان:۷۴۰۔ [3] ابوداود، الصلوٰۃ:۷۵۹۔
[4] ارواء الغلیل، ص:۷۱، ج۲۔ [5] شرح مسلم نووی، ص:۱۰۵، ج۳۔ [6] خلاصہ، ص:۳۵۹، ج۱۔

ہے۔ ❶

نابالغ بچے کی امامت

سوال کیا کم عمر بچوں کی امامت صحیح ہے؟ جبکہ وہ سن شعور کو پہنچ چکے ہوں۔

جواب امامت کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا جائے جو قرآن کریم کا حافظ ہو، اس کے متعلق متعدد احادیث مروی ہیں، کم سن بچے کی امامت کے متعلق درج ذیل روایت بیان کی جاسکتی ہے۔

حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میرے والد نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حق لے کر آیا ہوں، آپ نے فرمایا کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے کوئی اذان کہے اور امامت ایسا شخص کرائے جو قرآن کا زیادہ عالم ہو۔ حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میری قوم نے دیکھا کہ میرے سوا کوئی دوسرا مجھ سے زیادہ قرآن کا عالم نہیں ہے تو انہوں نے مجھے جماعت کے لیے آگے کر دیا اس وقت میری عمر چھ یا سات برس تھی۔ ❷

ناپسندیدہ امام کی امامت

سوال ہماری مسجد کے اکثر نمازی اپنے امام سے راضی اور خوش نہیں ہیں کیونکہ وہ جذباتی آدمی ہیں اور جذبات میں آکر گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں، کیا ایسے امام کے پیچھے نماز درست ہے؟

جواب امام لوگوں کا ناپسندیدہ شخص نہیں ہونا چاہیے، حدیث میں ہے کہ تم ایسے لوگوں کو امامت کے لیے منتخب کرو جو تم میں معزز اور بہترین ہوں۔ ❸

اگرچہ اس روایت میں کچھ ضعف ہے لیکن اسے دیگر صحیح روایات کی تائید حاصل ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین آدمیوں کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے، پہلا وہ شخص جو امامت کے لیے کسی قوم کے آگے بڑھے جب کہ لوگ اسے ناپسند کرتے ہوں۔'' ❹ حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا یہ بات کہی جاتی تھی کہ لوگوں میں سے جنہیں سخت عذاب سے دوچار کیا جائے گا وہ دو ہیں، ایک ایسی عورت جو اپنے خاوند کی نافرمان ہو اور دوسرا وہ امام جسے مقتدی ناپسند کرتے ہوں۔ ❺

ان احادیث کے پیش نظر امام کو چاہیے کہ وہ خود بخود منصب امامت سے الگ ہو جائے اور اپنی عزت نفس اور خودداری کو مجروح نہ کرے۔ مقتدی حضرات کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے امام سے بلاوجہ ناراض نہ ہوں اور احسن انداز سے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں، آخر وہ بھی انسان ہے۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ کمی کوتاہی ضرور ہوتی ہے، اصلاح احوال کی کوشش کرنا چاہیے معمولی معمولی باتوں پر اس کی کردارکشی کرنا درست نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ نیل الاوطار، ص:۱۱، ج۲۔ ❷ صحیح بخاری، المغازی:۴۳۰۲۔ ❸ بیہقی، ص:۹۰، ج۳۔
❹ ترمذی، الصلوٰۃ:۳۶۰۔ ❺ ترمذی، الصلوٰۃ:۳۵۹۔

عورتوں کا مسجد میں با جماعت نماز ادا کرنا

سوال کیا عورتیں مسجد میں نماز با جماعت ادا کر سکتی ہیں؟ ان کا مسجد میں جانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ مسئلہ وضاحت سے بیان کریں۔

جواب عورتوں کا گھر میں نماز پڑھنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔ ہاں اگر کوئی خاتون مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرنا چاہے تو اس کی خواہش پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی، رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں خواتین مسجد کے اندر نماز با جماعت ادا کرتی تھیں، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ان عورتوں کو مسجد میں جانے سے مت روکو البتہ ان کے گھر ہی ان کے لیے بہتر ہیں۔'' [1]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خواتین کی بہترین مساجد ان کے گھروں کی چار دیواری ہے۔ [2]

لیکن اگر کسی عورت نے مسجد میں آنا ہے تو سادہ لباس میں آئے اور خوشبو وغیرہ کا استعمال نہ کرے جیسا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں حاضر ہونا چاہے تو وہ خوشبو مت لگائے۔ [3]

ان احادیث کے پیش نظر عورتوں کو مسجد میں جا کر نماز با جماعت ادا کرنے کی اجازت ہے لیکن پرفتن حالات میں ان کا گھر میں نماز ادا کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔ اگر کسی خاتون نے مسجد جانے کا شوق پورا کرنا ہو تو اسے چاہیے کہ سادہ لباس پہن کر مسجد میں آئے اور خوشبو وغیرہ استعمال نہ کرے۔ (واللہ اعلم)

اذان سن کر مسجد سے باہر جانا

سوال اگر کوئی آدمی مسجد میں ہو اور اذان ہو جائے تو کیا کسی ضرورت کے پیش نظر مسجد سے باہر جانا جائز ہے؟ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اذان کے بعد مسجد سے نہیں نکلنا چاہیے خواہ کتنی ہی سخت ضرورت ہو۔

جواب اذان ہو جانے کے بعد مسجد سے بلا ضرورت نکلنا جائز نہیں ہے، حضرت ابو شعثاء سے مروی ہے کہ ایک آدمی عصر کی اذان کے بعد مسجد سے نکلا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس نے ابو القاسم حضرت محمد ﷺ کی نافرمانی کی ہے۔'' [4]

اس سلسلہ میں ایک مرفوع روایت بھی ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم مسجد میں ہو اور نماز کے لیے اذان ہو جائے تو تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھنے سے پہلے مسجد سے باہر نہ نکلے۔ [5]

ہاں اگر کوئی ضرورت پیش نظر ہو اور مسجد سے نکلے بغیر وہ ضرورت پوری نہ ہو سکتی ہو تو مسجد سے نکل سکتا ہے بشرطیکہ جماعت سے قبل مسجد میں واپس آ جائے چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان اس طرح قائم کیا ہے، کیا کوئی آدمی مسجد سے

---

[1] ابوداؤد، الصلوٰۃ: ٥٦٢۔ [2] مسند امام احمد، ص: ٢٩٧، ج ٢۔ [3] مسند امام احمد، ص: ٣٦٣، ج ٦۔
[4] صحیح مسلم، المساجد: ٦٥٥۔ [5] مسند امام احمد، ص: ٥٣٧، ج ٢۔

ضرورت کی بنا پر نکل سکتا ہے؟

پھر انہوں نے ایک حدیث بیان کی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہا ایک مرتبہ تکبیر ہو چکی تھی، رسول اللہ ﷺ مصلے پر نماز پڑھانے کے لیے تشریف فرما تھے آپ کو اچانک یاد آیا کہ انہیں نہانے کی ضرورت ہے، آپ نے ہمیں فرمایا: ''تم اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو، آپ گھر تشریف لے گئے اور نہا کر واپس آ گئے جب کہ آپ کے سر مبارک سے پانی ٹپک رہا تھا، پھر آپ نے تکبیر تحریمہ کہی اور ہمیں نماز پڑھائی۔'' ❶

بہر حال اگر کوئی ضرورت ہو تو مسجد سے اذان کے بعد نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ جماعت کے وقت مسجد میں آ کر نماز ادا کرے اور بلا وجہ اذان کے بعد مسجد سے نکل کر باہر جانا منافقت کی علامت ہے ایک مسلمان کو اس سے گریز کرنا چاہیے۔

تورک کا درست طریقہ

سوال تورک بیٹھنے کا کیا طریقہ ہے اور اسے کس تشہد میں کرنا چاہیے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں کیا پہلے تشہد میں بھی اسی طرح بیٹھا جا سکتا ہے؟

جواب تورک اس تشہد میں بیٹھنا چاہیے جس میں سلام پھیرنا ہوتا ہے خواہ دو رکعت پر یا تین پر یا چار رکعت پر ہو، رسول اللہ ﷺ کا تورک اس تشہد میں ہوتا تھا جس میں سلام ہوتا تھا جیسا کہ حدیث میں ہے: ''جب آپ وہ سجدہ کرتے جس میں سلام پھیرنا ہوتا تو تورک کرتے۔'' ❷

جس تشہد میں سلام نہیں پھیرا جاتا اس میں تورک نہیں بیٹھا جاتا، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پہلے تشہد میں تورک نہیں بیٹھنا چاہیے، اس تورک کے مختلف طریقے احادیث میں بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب آخری رکعت میں تشہد کے لیے بیٹھتے تو بایاں پاؤں ران کے نیچے سے آگے بڑھا دیتے اور دایاں کھڑا رکھتے پھر اپنی سرین پر بیٹھ جاتے۔ ❸

☆ حضرت ابو حمید رضی اللہ عنہ سے ہی ایک دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب چوتھی رکعت میں ہوتے تو اپنے بائیں سرین کے بل زمین پر بیٹھ جاتے پھر ان دونوں قدموں کو ایک جانب سے نکال دیتے۔ ❹

☆ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تو بائیں پاؤں کو ران اور پنڈلی کے درمیان میں کر لیتے اور اپنا دایاں پاؤں بچھا لیتے۔ ❺

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ آخری رکعت میں تورک کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتے تھے البتہ پہلا طریقہ زیادہ معروف اور متداول ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحیح بخاری، الغسل: ۲۷۵۔ ❷ ابو داود، الصلوٰۃ: ۷۳۰۔ ❸ صحیح بخاری، الاذان: ۸۲۸۔
❹ ابو داود، الصلوٰۃ: ۷۳۱۔ ❺ صحیح ابن خزیمہ، ص: ۳۴۷، ج۱۔

نماز قصر کے لیے کم از کم مسافت

سوال کم از کم کتنی مسافت پر نماز قصر کرنا جائز ہے، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا صراحت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب رسول اللہ ﷺ سے مسافت قصر کے متعلق کوئی صریح قولی روایت نہیں ملتی جس سے نماز قصر کے لیے مسافت کی تعداد کو معین کیا جا سکتا ہو۔ البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ جو سفر وحضر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک خادم خاص کی حیثیت سے رہے ہیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک عمل سے استنباط کیا ہے کہ کم از کم نو میل کی مسافت پر نماز قصر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد یحییٰ بن یزید نے آپ سے نماز قصر کے لیے مسافت کی تعداد کے متعلق سوال کیا تو آپ نے جواب دیا کہ جب رسول اللہ ﷺ تین میل یا تین فرسخ کا سفر کرتے تو نماز قصر فرماتے۔

واضح رہے کہ روایت میں تین میل کے بجائے تین فرسخ مراد لینا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ اس میں تین میل بھی آ جاتے ہیں کیونکہ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ مسافت اگر نو میل ہو تو اپنے شہر یا گاؤں کی حد سے نکل کر نماز قصر کی جا سکتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ میل سے مراد کون سے میل ہیں؟ کیونکہ ہمارے ہاں برطانوی میل رائج ہیں جو 1760 گز کا ہوتا ہے جو شرعی میل سے چھوٹا ہے، چنانچہ صاحب عون المعبود لکھتے ہیں: ''مشہور قول کے مطابق میل کی مقدار موجودہ لوہے کی ذراع کے حساب سے 5250 ذراع بنتی ہے۔'' [1]

چونکہ انگریزی گز دو ذراع کا ہوتا ہے، اس لیے ہاشمی میل دو ہزار چھ سو پچیس گز کا ہوا، یہ وہ میل ہے جسے ہمارے ہاں کوس یا پنجابی میں کوہ کہا جاتا ہے، جب ہندوستان میں برطانوی دور آیا تو انگریزی میل ایک ہزار سات سو ساٹھ گز کا رائج ہوا، اس طرح ہاشمی میل کی مقدار میں آٹھ سو پینسٹھ گز کمی کر دی گئی، گویا ہاشمی میل، تقریباً ڈیڑھ میل برطانوی کے برابر ہے اس لیے نو میل ہاشمی ہوں تو ساڑھے تیرہ میل برطانوی ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں اب انگریزی میل کی جگہ اعشاری نظام آ چکا ہے، اب میل کے بجائے کلومیٹر کی اصطلاح استعمال ہونے لگی ہے اور کلومیٹر انگریزی میل سے بھی چھوٹا ہے، اب حساب اس طرح ہو گا ایک شرعی ہاشمی میل، پانچ ہزار دو سو پچاس ذراع کے برابر ہے جس میں دو ہزار چھ سو پچیس گز ہوتے ہیں۔ یہ مقدار ہمارے ہاں برطانوی میل سے آٹھ سو پینسٹھ گز زیادہ ہے۔

اعشاری نظام کے مطابق ایک شرعی ہاشمی میل دو ہزار چار سو میٹر کے برابر ہے یعنی اس میں دو کلومیٹر اور چار سو میٹر ہوتے ہیں، چونکہ نماز قصر کے لیے کم از کم نو میل ہاشمی کا ہونا ضروری ہے جس کی مقدار موجودہ اعشاری نظام کے مطابق اکیس کلومیٹر اور چھ سو میٹر ہے، پہلے ہم ہاشمی اور برطانوی میل میں فرق نہیں کرتے تھے، اب یہ تحقیق سامنے آنے پر ہم اپنے سابقہ موقف سے رجوع کرتے ہیں۔ (واللہ المستعان)

---

[1] عون المعبود، ص: ۲۱۸ ج ۳۔

بغیر وضو اذان دینا

سوال کیا اذان دینے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے؟ اگر وضو کے بغیر اذان کہہ دی جائے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب اذان دینا، اللہ کا ذکر کرنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اذان دینے کے لیے وضو کر لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ بات پسند تھی کہ آپ اللہ کا ذکر باوضو کرتے تھے جیسا کہ حضرت مہاجر بن قنفذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا جب کہ آپ پیشاب کر رہے تھے، میں نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے جب تک وضو نہ کر لیا مجھے سلام کا جواب نہ دیا پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میں اللہ کا ذکر طہارت کے بغیر کروں۔ [1]

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے تیمم کرنے کے بعد سلام کا جواب دیا، ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سلام کا جواب وضو اور تیمم کر کے دیتے تھے، چونکہ اذان بھی اللہ کا ذکر ہے اس لیے بہتر ہے کہ وضو کر کے کہی جائے لیکن وضو کو اذان کے لیے شرط قرار دینا محل نظر ہے۔ ایسی کوئی روایت کتب حدیث میں مروی نہیں ہے جس کے پیش نظر اذان کے لیے باوضو ہونے کو ضروری قرار دیا جائے، البتہ ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اذان صرف باوضو شخص ہی دے۔'' [2]

لیکن یہ حدیث سند کے اعتبار سے قابل حجت نہیں ہے۔ [3]

بہر حال اذان اللہ کا ذکر ہے اس بناء پر بہتر ہے کہ مؤذن اسے باوضو ہو کر ادا کرے لیکن اگر کسی مجبوری کی وجہ سے وضو کے بغیر اذان دی جائے تو اس میں چنداں حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

وقت سے پہلے نماز پڑھنا

سوال اگر قبل از وقت نماز پڑھ لی جائے تو کیا وقت آنے پر دوبارہ پڑھنا ہوگی یا پہلے سے پڑھی ہوئی نماز کافی ہوگی؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب شریعت نے نماز کے اوقات مقرر کیے ہیں، بلاوجہ اسے قبل از وقت ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ ﴾ [4]

''بے شک نماز کا اہل ایمان پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔''

حدیث میں ہے کہ ظہر کا وقت سورج ڈھلنے سے شروع ہوتا ہے۔ [5]

قرآنی آیت اور پیش کردہ حدیث کے مطابق اگر کسی نے وقت سے پہلے نماز ادا کی ہے تو اس سے فرض کی ادائیگی نہ ہوگی،

---

[1] ابو داود، الطہارۃ:۱۷۔ [2] بیہقی، ص:۳۹۷، ج۱۔ [3] ارواء الغلیل، ص:۲۴۰، ج۱۔
[4] ٤/النساء:۱۰۳۔ [5] صحیح بخاری، المواقیت:۵٤۱۔

البتہ اس نماز کو نفل شمار کیا جائے گا۔ یعنی اس نفل کا ثواب مل جائے گا لیکن وقت ہونے کے بعد اسے دوبارہ ادا کرنا ہوگا، پہلی ادا شدہ نماز کافی نہ ہوگی۔ (واللہ اعلم)

لاعلمی میں بغیر غسل کے نماز پڑھنا

سوال میں نے صبح کی نماز ادا کی، نماز کے بعد مجھے پتہ چلا کہ مجھے غسل کرنا چاہیے تھا کیونکہ کپڑوں پر احتلام کے اثرات تھے، ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے، مجھے نماز دوبارہ پڑھنا ہوگی یا پہلی نماز کافی ہوگی؟

جواب اگر کسی انسان کو نماز پڑھنے کے بعد پتہ چلے کہ وہ بے وضو تھا یا اس نے غسل کرنا تھا، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وضو کرے اگر وضو کرنے کی ضرورت تھی اور غسل کرے اگر اس پر غسل کرنا فرض تھا پھر دوبارہ نماز کو ادا کرے، ناپاکی کی حالت میں ادا کی ہوئی نماز شرعاً نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کوئی نماز بھی قبول نہیں کرتا۔'' [1]

اس حدیث کے پیش نظر ناپاکی کی حالت میں ادا کردہ نماز باطل ہے، اس سے کسی قسم کے ثواب کی امید نہ رکھی جائے، یعنی وہ نوافل میں بھی تبدیل نہیں ہوگی۔

مسافر کے پیچھے مقیم کی نماز

سوال ہمارے ہاں مسجد میں اگر کوئی عالم دین آ جائے تو امام مسجد اس کے احترام میں اسے نماز پڑھانے کے متعلق کہہ دیتے ہیں، جب کہ مہمان نے نماز قصر پڑھنا ہوتی ہے لیکن بعض نمازی اسے اچھا نہیں سمجھتے وہ امام کو مجبور کرتے ہیں کہ خود نماز پڑھائیں، کیا مسافر کے پیچھے مقیم کی نماز نہیں ہوتی، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب اگر مسجد میں کوئی عالم دین آ جائے تو احترام کے پیش نظر اسے نماز پڑھانے کے لیے کہنا جائز ہے اور مقیم آدمی، مسافر کے پیچھے نماز ادا کرسکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مکہ تشریف لائے تو انہوں نے وہاں کے باشندوں کو دو رکعت پڑھائیں اور فرمایا: اے اہل مکہ! تم اپنی نماز مکمل کرلو ہم تو مسافر لوگ ہیں۔ [2]

اس لیے مقتدی حضرات کو یہ عمل برا محسوس نہیں ہونا چاہیے اور انہیں اپنے امام کو اس امر پر مجبور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کسی مہمان کی موجودگی میں خود ہی نماز پڑھائے، بہرحال امام مسجد کا عمل شریعت کے عین مطابق ہے۔ (واللہ اعلم)

دوران سفر نماز قصر کرنا

سوال دوران سفر پوری نماز ادا کرنا شرعاً جائز ہے یا قصر ہی پڑھنی چاہیے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب جب نماز فرض ہوئی تو سفر وحضر کی تمام نمازیں دو دو رکعت پر مشتمل تھیں، ہجرت کے بعد سفر کی نماز کو جوں کا توں

---

[1] نسائی، الطهارة:١٣٩۔ [2] موطا امام مالك، ص:١٤٩، ج١۔

رکھا گیا البتہ حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب نماز فرض کی تو سفر و حضر میں دو، دو رکعتیں فرض کیں پھر سفر کی نماز تو اسی حالت پر برقرار رہی اور حالت اقامت کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کی زبان کے ذریعے حضر کی نماز کے لیے چار رکعت مقرر کی ہیں، سفر کی ان روایات کا تقاضا ہے کہ دوران سفر قصر نماز پر اکتفا کیا جائے، البتہ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دوران سفر پوری نماز پڑھنا بھی ثابت ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ دوران سفر قصر کرتے تھے لیکن میں پوری نماز پڑھتی تھی، آپ نے روزے سفر میں نہیں رکھے جبکہ میں بحالت روزہ سفر کرتی تھی۔ [2]

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوران سفر پوری نماز پڑھ لیا کرتے تھے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں قصر بھی کرتے تھے اور پوری نماز بھی پڑھتے تھے اور روزہ بھی رکھتے تھے کبھی افطار بھی کر دیتے تھے۔ [3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سفرِ حج میں قیام منیٰ کے دوران پوری نماز پڑھنا ثابت ہے، محدثین نے اس کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں؟ نیز ان سے دیگر اسفار میں وفات تک قصر کرنا بھی ثابت ہے۔ [4]

تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم سے بھی ایسا کرنا ثابت ہے چنانچہ مشہور تابعی ابوقلابہ فرماتے ہیں: اگر تم سفر میں دو رکعت پڑھو تو سنت ہے اور اگر چار رکعت پڑھو تو بھی سنت ہے۔ [5]

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر قصر کرو تو رخصت ہے اور اگر چاہو تو پوری نماز پڑھ لو۔ [6]

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوران سفر قصر کرنا رخصت ہے اور اگر کوئی پوری پڑھے تو جائز ہے۔ [7]

ہمارے رجحان کے مطابق عزیمت یہ ہے کہ دوران سفر نماز قصر پڑھی جائے، اس میں زیادہ ثواب ہوگا، اور اگر کوئی سفر میں نماز پوری پڑھتا ہے تو اس کی گنجائش ہے اور ایسا کرنا جائز ہے، بہر حال اس مسئلہ میں وسعت ہے لہٰذا اسے سنت و بدعت سے تعبیر نہ کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

لاعلمی میں امام کا بغیر وضو نماز پڑھانا

سوال اگر امام بھول کر بے وضو نماز پڑھا دے تو اس صورت میں مقتدیوں کے لیے کیا حکم ہے، کیا وہ نماز کو دوبارہ پڑھیں گے یا ان کی نماز ہو جائے گی؟

جواب نماز کے لیے طہارت یعنی باوضو ہونا شرط ہے، اگر کوئی امام طہارت کے بغیر نماز پڑھا دیتا ہے تو اسے اپنی نماز

---

[1] صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۳۵۰۔ [2] بیہقی، ص:۱۴۲، ج۳۔ [3] سنن دارقطنی، ص:۱۸۹، ج۲۔
[4] صحیح بخاری، حدیث نمبر ۱۱۰۲۔ [5] مصنف ابن ابی شیبہ، ج۲، ص:۴۵۲۔
[6] مصنف ابن ابی شیبہ حوالہ مذکور۔ [7] سنن ترمذی حدیث نمبر:۵۴۴۔

دوبارہ پڑھنا ہوگی البتہ مقتدی حضرات کو دوبارہ نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''امام تمہیں نماز پڑھاتے ہیں، اگر وہ ٹھیک نماز پڑھائیں تو اس کا ثواب تمہیں ملے گا اور اگر وہ غلطی کریں تو بھی تمہیں ثواب ملے گا اور غلطی کا وبال ان پر ہوگا۔'' [1]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھول کر بحالت جنابت لوگوں کو نماز پڑھا دی، یاد آنے پر انہوں نے دوبارہ نماز پڑھی، لیکن لوگوں کو نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے معلوم ہوا کہ غلطی کی وجہ سے اگر امام بے وضو نماز پڑھا دے تو اسے تو دوبارہ پڑھنا ہوگی لیکن مقتدیوں کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بھی ایک مرتبہ بھول کر لوگوں کو جنابت کی حالت میں نماز پڑھا دی، صبح کے بعد انہیں اس امر کا علم ہوا تو انہوں نے نماز کو دوبارہ پڑھا، لیکن دوسروں کو نماز دہرانے کا حکم نہیں دیا۔ [3]

امام عبدالرحمن بن مہدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں علماء کا اتفاق ہے کہ جنبی ہی اپنی نماز کو دوبارہ پڑھے اور مقتدی اسے نہ دہرائیں، اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ [4]

ان تصریحات کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ اگر امام غلطی سے بے وضو نماز پڑھا دے تو وہ اسے دوبارہ پڑھے البتہ مقتدی حضرات کی نماز صحیح ہے، انہیں دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

جلسۂ استراحت کی شرعی حیثیت

سوال جلسہ استراحت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بعض اہل علم نے اس کی عدم مشروعیت پر صحیح بخاری کی ایک روایت سے استدلال کیا ہے کہ مسیٔ الصلوٰۃ کی حدیث کے آخر میں ہے ''تو اپنے سجدہ سے سر اٹھاؤ حتیٰ کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔'' [5] اس روایت کی وضاحت کریں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

جواب امام بخاری کے نزدیک جلسۂ استراحت مشروع ہے چنانچہ انہوں نے ایک عنوان یوں قائم کیا ہے ''جو شخص دوران نماز طاق رکعت پڑھتے وقت کچھ دیر بیٹھنے کے بعد کھڑا ہو۔'' پھر آپ نے حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنی نماز کی طاق رکعت پڑھتے تو کچھ دیر بیٹھنے کے بعد کھڑے ہوتے۔ [6]

واضح ہو کہ جلسۂ استراحت پہلی رکعت کے بعد دوسری رکعت کے لیے اور تیسری رکعت کے بعد چوتھی رکعت کے لیے اٹھنے سے پہلے دوسرے سجدے کے بعد کچھ دیر اطمینان سے بیٹھنے کو کہتے ہیں، یہ جلسۂ استراحت مسنون ومشروع ہے جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی پیش کردہ روایت سے ثابت ہوتا ہے، سوال میں مسیٔ الصلوٰۃ کی حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے حالانکہ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''پھر رکوع کر حتیٰ کہ تمہیں رکوع میں اطمینان ہو جائے، پھر اپنا سر اٹھا حتیٰ کہ سیدھا کھڑا ہو جائے، اس کے بعد سجدہ کر

---

[1] بخاری، الاذان: ٦٩٤۔ [2] مصنف ابن ابی شیبہ، ص: ٣٩٧، ج ١۔ [3] دار قطنی، ص: ٣٦٥، ج ١۔
[4] دار قطنی، ص: ٣٦٥، ج ١۔ [5] صحیح بخاری، الاستیذان: ٦٢٥١۔ [6] صحیح بخاری، الاذان: ٨٢٣۔

حتیٰ کہ تجھے سجدہ میں اطمینان ہو جائے پھر سجدہ سے سر اٹھا حتیٰ کہ تو اطمینان سے بیٹھ جائے پھر سجدہ کر حتیٰ کہ تجھے سجدہ میں اطمینان حاصل ہو جائے، پھر سجدہ سے سر اٹھا حتیٰ کہ تو اطمینان سے بیٹھ جائے۔'' 1

اسی روایت کے آخر میں ہے ابو اسامہ نے کہا: ''تو اپنے سجدہ سے سر اٹھا حتی کہ سیدھا کھڑا ہو جائے'' چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پوری سند کے ساتھ اس حدیث کو دوسرے مقام پر بیان کیا ہے۔ 2

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد اس حدیث کی حیثیت بیان کرنا ہے کہ راوی حدیث عبید اللہ بن عمر کے تین شاگرد ہیں۔

① عبداللہ بن نمیر ② یحییٰ ③ ابو اسامہ۔

پہلے دو شاگرد بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اپنے سجدہ سے سر اٹھا حتیٰ کہ تو اطمینان سے بیٹھ جائے۔ البتہ ابو اسامہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اپنے سجدہ سے سر اٹھا حتیٰ کہ سیدھا کھڑا ہو جائے، جیسا کہ سوال میں بیان کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کی مخالفت کی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ ہے کہ اس کے یہ الفاظ مخالفت کی وجہ سے شاذ ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان الفاظ کو بیان کرنے کے فوراً بعد یحییٰ کی روایت کو بیان کیا ہے جس کے الفاظ ہیں کہ تو سجدہ سے سر اٹھا حتیٰ کہ اطمینان سے بیٹھ جائے۔ 3

بہر حال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جلسہ استراحت کی مشروعیت کے قائل ہیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں، اور جس روایت سے اس کی عدم مشروعیت پر استدلال کیا گیا ہے وہ شاذ ہے، اس روایت کے علاوہ کچھ دوسری روایات بھی پیش کی جاتی ہیں جو سند کے اعتبار سے محدثین کے معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں۔ لہٰذا ان کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

تیسری، چوتھی رکعت میں سورہ فاتحہ کے ساتھ مزید سورت پڑھنا

سوال: کیا ظہر اور عصر کی تیسری اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورت پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب: حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور کوئی دو سورتیں پڑھتے اور دوسری دو رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے۔ 4

لیکن دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری اور چوتھی رکعت میں فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت بھی ملائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سے ہر رکعت میں تیس آیات کے برابر قراءت کرتے اور دوسری دو رکعتوں میں پندرہ آیات کے برابر قراءت کرتے، اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سے ہر رکعت میں پندرہ آیات کے برابر قراءت کرتے اور دوسری دو رکعات میں اس سے نصف کے بقدر قراءت کرتے تھے۔ 5

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر اور عصر کی آخری دو رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی بھی سورت ملائی جا سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے بلکہ فاتحہ کا پڑھنا ہی ضروری ہے۔ (واللہ اعلم)

---

1 صحیح بخاری، الاستیذان: ٦٢٥١۔ 2 صحیح بخاری، الایمان والنذور: ٦٦٦٧۔

3 صحیح بخاری، الاستیذان: ٦٢٥٢۔ 4 بخاری، الاذان: ٧٧٦۔ 5 مسند امام احمد، ص: ٣، ج ٣۔

ملازم کا بغیر اجازت نماز کے لیے جانا

سوال میں ایک دکان پر ملازم ہوں، جب اذان ہوجاتی ہے تو میں کام چھوڑ کر نماز کے لیے چلا آتا ہوں لیکن میرا مالک اسے اچھا خیال نہیں کرتا، اس کا کہنا ہے کہ جب گاہک ہو تو اسے فارغ کر کے نماز کے لیے جانا چاہیے، اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب اذان سنتے ہی کاروبار بند کر دینا چاہیے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ایسے لوگوں کو اللہ کے ذکر، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ خرید فروخت غافل کرتی ہے اور نہ ہی تجارت وغیرہ ان کے لیے رکاوٹ بنتی ہے۔'' [1]

امام ابوداؤد نے راوی حدیث ابراہیم بن میمون کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ جب لوہے پر مارنے کے لیے ہتھوڑا اٹھاتے اتنے میں اذان شروع ہوجاتی تو فوراً کام چھوڑ کر مسجد میں چلے آتے۔'' [2]

شارح ابی داؤد صاحب عون المعبود لکھتے ہیں کہ امام ابوداؤد کا مقصد حضرت ابراہیم بن میمون کی تعریف کرنا ہے کہ ان کا لوہے کا کام کاج اللہ کی یاد میں رکاوٹ کا باعث نہیں تھا بلکہ جب بھی اذان سنتے تو ہتھوڑا چھوڑ کر مسجد میں چلے آتے۔ [3]

صورت مسئولہ میں اگر مالک ناراض ہوتا ہے تو اس کی قطعاً پروا نہ کی جائے بلکہ اذان ہوتے ہی کاروبار ترک کر کے مسجد کا رخ کر لیا جائے۔ (واللہ اعلم)

مصحف دیکھ کر امام کی قرأت سننا

سوال بعض لوگ دوران جماعت قرآن مجید اٹھا لیتے ہیں اور امام کا قرآن سنتے ہیں، جب کہیں امام بھول جائے تو وہ اسے بتا دیتے ہیں، کیا دوران جماعت ایسا کرنا جائز ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب نمازی کو خشوع وخضوع سے نماز ادا کرنے کا حکم ہے، ہر اس کام یا عمل کی ممانعت ہے جو اس کے خضوع یا حضور قلب میں رکاوٹ کا باعث ہو، صورت مسئولہ میں اگر امام کا قرآن سننا اور اسے غلطی سے متنبہ کرنا مقصود ہے تو کسی حافظ قرآن کا اہتمام کرنا چاہیے۔ دوران جماعت مقتدی کو قرآن مجید اٹھانے سے متعدد خرابیاں لازم آتی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

① دوران نماز قیام کے وقت حکم یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا جائے، قرآن پکڑنے سے یہ کیفیت برقرار نہیں رہ سکتی۔

② دوران نماز بلاوجہ نقل وحرکت اور عمل کثیر کرنے کی ممانعت ہے، دوران نماز قرآن مجید کو کھول کر سننے سے بلاوجہ عمل کثیر کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے قرآن مجید کھولنا، اسے بند کرنا، بغل میں یا جیب میں رکھنا، ان حرکات سے نمازی انسان، اپنی نماز سے غافل ہو سکتا ہے لہٰذا اس سے اجتناب کیا جائے۔

③ نمازی کو نماز پڑھتے وقت اپنی نظر سجدہ کی جگہ پر رکھنا افضل اور بہتر ہے لیکن قرآن مجید کھول کر سننے والا اپنی نظر سجدہ کی جگہ پر

---

[1] ٢٤/النور:٣٧۔ [2] ابوداؤد، الایمان والنذور: ٣٢٥٤۔ [3] عون المعبود، ص:٢٤٢، ج٣۔

نہیں رکھ سکتا بلکہ اسے اپنی نگاہ قرآن مجید پر رکھنا پڑے گی۔ بہر حال دورانِ جماعت قرآن مجید کھول کر امام کی قراءت سننا یا ساتھ ساتھ پڑھنا درست نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے متعدد خرابیاں لازماً آتی ہیں جو اسے نماز سے غافل کر سکتی ہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اگر رمضان المبارک میں کسی پختہ سامع کا بندوبست نہ ہو سکے اور امام کا قرآن پختہ نہ ہو اور وہ بار بار بھولتا ہو تو کسی اچھے ناظرہ خواں کو یہ عمل سونپا جا سکتا ہے کہ وہ حافظ کا قرآن سنے اور بھول کے وقت امام کو متنبہ کرے۔ (واللہ اعلم)

دوران نماز وساوس اور خیالات روکنے کا علاج

سوال مجھے دوران نماز بہت خیالات آتے ہیں، جب میں نماز شروع کرتی ہوں تو وساوس کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اس کے متعلق کوئی وظیفہ بتائیں۔

جواب نماز ایک مسلمان کو اپنے رب کے قریب کرتی ہے، اس لیے شیطان ہر ممکن اسے خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے، حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو اس قسم کی شکایت تھی تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! شیطان میرے اور میری نماز پر قراءت کے درمیان حائل ہو کر اسے خراب کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ شیطان ہے جسے خنزب کہا جاتا ہے، جب تم دوران نماز اس قسم کا اندیشہ محسوس کرو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو یعنی اعوذ باللہ کہو اور اپنے بائیں جانب ہلکا سا تین مرتبہ تھتکارو۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے نجات دے دی۔ [1]

اس حدیث کی روشنی میں اگر کسی کو نماز میں خیالات اور وسوسے آتے ہوں تو درج ذیل دو کام کرنا چاہئیں۔ ① دوران نماز آہستہ سے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنا چاہیے۔ ② بائیں جانب تین مرتبہ تھوکنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے وساوس کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

کرسی پر نماز پڑھنا

سوال ہماری مسجد میں مریضوں کے لیے کرسیاں رکھی گئی ہیں، بیمار اس پر بیٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں، ان کے سامنے ایک تختی لگی ہے، جن پر سجدہ کیا جاتا ہے، کیا ایسا کرنے سے سجدہ ہو جاتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب احادیث میں بیمار کے لیے نماز پڑھنے کا طریقہ بیان ہوا ہے: جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے خواہ ٹیڑھا کھڑا ہو یا دیوار کے سہارے یا بوقت ضرورت لاٹھی کا سہارا لے کر۔

② اگر کھڑا نہیں ہو سکتا تو بیٹھ کر نماز پڑھ لے اور افضل ہے کہ چوکڑی مار کر بیٹھے۔

③ اگر بیٹھ کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو قبلہ رخ لیٹ کر نماز پڑھ لے۔ اگر قبلہ رخ نہ ہو سکے تو جس طرف اس کا منہ ہو نماز پڑھ لے۔ اس کی نماز درست ہے۔

④ بیمار کے لیے نماز میں رکوع وسجدہ ضروری ہے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو رکوع اور سجدہ سر کے اشارہ سے کرے اور سجدہ کرتے

---

[1] صحیح بخاری، السلام: ۵۷۳۸۔

وقت رکوع کی نسبت زیادہ جھکے۔

⑤ اگر سر کے اشارہ سے رکوع وسجدہ نہیں کر سکتا تو رکوع اور سجدہ کے لیے اپنی آنکھوں کو استعمال کرے یعنی رکوع کے لیے آنکھوں کو تھوڑا سا بند کر لے اور سجدہ میں آنکھوں کو زیادہ بند کرے۔

اگر مریض نماز میں اپنے سر اور آنکھوں سے اشارہ نہ کر سکتا ہو تو دل کے ساتھ نماز پڑھ لے یعنی دل میں تکبیر کہہ لے، دل میں قراءت کرے، اسی طرح قیام، قعود، رکوع اور سجدہ کی دل ہی میں نیت کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی۔'' [1]

اس بناء پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ مساجد میں رکھی ہوئی کرسیوں کو استعمال کرنا محض تکلف ہے، اگر استعمال کرنا ناگزیر ہو تو سامنے والی تختی کو الگ کر دیا جائے، اس پر سر رکھ کر سجدہ کرنے کے بجائے ویسے اشارہ سے سجدہ کرتا رہے، جیسا کہ ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

پیشانی پر سجدہ کی وجہ سے پڑھنے والا کالا نشان بزرگی کی علامت ہے؟

سوال کیا پیشانی پر سجدہ کی وجہ سے پڑھنے والا سیاہ نشان بزرگی کی علامت ہے؟ ہمارے ہاں اسے نیکی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب یہ نشان جلد کے نرم یا سخت ہونے کی وجہ سے جلدی یا دیر سے پڑتا ہے، بعض ایسے شخص بھی ہیں جو پکے نمازی اور لمبے لمبے سجدے کرتے ہیں لیکن ان کی پیشانی پر نشان نمودار نہیں ہوتا، کچھ لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ وہ پیشانی پر پتھر رگڑ کر اس قسم کا نشان ڈال لیتے ہیں تاکہ لوگوں میں ان کی ''بزرگی'' مشہور ہو، ہمارے نزدیک یہ نشان بزرگی کی علامت نہیں ہے بلکہ چہرے کا نور، حسن خلق اور انشراح صدر وغیرہ بزرگی کی علامت بن سکتی ہے۔ نمازی کو ان عادات کو اختیار کرنا ہوگا۔ خواہ پیشانی پر نشان پڑے یا نہ پڑے، اس کی طرف اتنی توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سلام پھیرتے وقت کندھے کو دیکھنا

سوال اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سلام پھیرتے وقت دائیں بائیں کندھے کو دیکھتے ہیں، کیا یہ عمل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب نماز کو سلام کے ساتھ ہی ختم کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سلام کے ساتھ نماز ختم کرتے تھے۔ [2]

اس بناء پر ضروری ہے کہ نماز کا اختتام رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے مطابق کیا جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ دائیں بائیں دونوں جانب کچھ چہرے پھیرتے ہوئے سلام کہتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے

---

[1] صحیح بخاری، بدء الوحی:۱۔ [2] صحیح مسلم، الصلوٰۃ:۴۹۸۔

دائیں بائیں سلام کہتے حتیٰ کہ آپ کے رخسار کی سفیدی دیکھی جا سکتی تھی۔ ❶

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو میں آپ کے رخسار کی سفیدی دیکھ لیتا تھا۔ ❷

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سلام پھیرتے وقت اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتے تھے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ''تم میں سے جب کوئی سلام پھیرے تو اپنے بھائی کو دیکھے اور اپنے ہاتھ سے اشارہ نہ کرے۔'' ❸

اپنے دائیں بائیں ساتھی کو دیکھ کر اسے سلام کرے جیسا کہ صراحت کے ساتھ ایک حدیث میں ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کو اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنا ہاتھ اپنی ران پر رکھے پھر اپنے دائیں بائیں جانب بیٹھے ہوئے بھائی پر سلام کہے۔ ❹

اس حدیث میں اشارہ ہے کہ نمازی سلام پھیرتے وقت جماعت میں موجود حاضرین کی نیت کر لے بلکہ ایک روایت میں اس امر کا حکم بھی مروی ہے جیسا کہ حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیتے تھے کہ دوران نماز ہم اپنے ائمہ کرام اور جماعت میں موجود حاضرین کو سلام کہیں۔ ❺

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ سلام پھیرتے وقت اپنے کندھوں کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ دائیں بائیں بیٹھے اپنے ساتھی کو دیکھے اور اسے سلام کی نیت کرے۔ (واللہ اعلم)

دوران نماز بلاضرورت حرکات کرنا

سوال اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کچھ لوگ دوران نماز اپنی انگلیوں کو چٹخاتے ہیں یا بلاضرورت کھجلی کرتے ہیں، کیا ایسا کرنے سے نماز باطل ہوتی ہے؟

جواب دوران نماز کسی ضرورت کے پیش نظر حرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے مثلاً جسم کے کسی حصہ میں اگر خارش ہو تو دوران نماز کھجلی کر لی جائے لیکن انگلیاں چٹخانہ ایک فضول اور عبث حرکت ہے جو نماز کے شایانِ شان نہیں، اس قسم کی حرکات سے نمازی کو اجتناب کرنا چاہیے، دوران نماز حرکت کو فقہاء نے پانچ اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

① حرکت واجب: اس سے وہ حرکت ہے جس پر نماز کا کوئی واجب فعل موقوف ہو مثلاً انسان نماز ادا کر رہا ہے دوران نماز یاد آیا کہ اس کا رومال یا ٹوپی نجاست آلود ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے رومال یا ٹوپی کو اتار دے۔ ایسی حرکت ضروری ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران نماز نجاست آلود جوتے اتارے تھے۔

② حرکت مسنون: اس سے مراد وہ حرکت ہے جس پر نماز کا کمال موقوف ہو مثلاً ایک آدمی دوران نماز وضو ٹوٹنے کی وجہ سے چلا گیا تو خلا کو پُر کرنے کے لیے حرکت کرنا مسنون ہے کیونکہ جماعت کی صورت میں خلا کو پُر کرنا مسنون ہے۔

③ حرکت مکروہ: اس سے مراد وہ حرکت ہے جس کی نماز میں ضرورت نہ تھی اور نہ ہی تکمیل نماز کے ساتھ اس کا تعلق تھا جیسا کہ

---

❶ مسند امام احمد، ص:٤٤٤، ج١۔ ❷ صحیح مسلم، المساجد:١٣١٥۔ ❸ صحیح مسلم، الصلوٰۃ:٩٧١۔
❹ صحیح مسلم، الصلوٰۃ:٩٧٠۔ ❺ ابوداود، الصلوٰۃ:١٠٠١۔

سوال میں ذکر کیا گیا ہے کہ نمازی دوران نماز اپنی انگلیوں کو چٹخاتا رہے۔

④ حرکتِ حرام: اس سے مراد وہ حرکت ہے جو بہت زیادہ اور مسلسل ہو اور تمام نماز میں ایسی حرکت کو جاری رکھنا نماز کو باطل کر دیتا ہے۔

⑤ حرکت مباح: اس سے مراد وہ حرکت ہے جو مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ ہو مثلاً ضرورت پیش آنے پر بدن پر کھجلی کرنا، بہر حال نماز انتہائی مقدس عمل ہے اسے نہایت خشوع سے ادا کرنا چاہیے۔ دوران نماز بلا وجہ مسلسل ڈکارنا یا اپنی انگلیوں کے پٹاخے نکالنا اس خشوع کے منافی ہے جو نماز کے لیے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔

نماز فجر کے بعد سجدہ تلاوت کرنا

سوال نماز فجر کے بعد سجدہ تلاوت کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا نماز فجر کے بعد سجدہ کرنے کی ممانعت حدیث سے ثابت ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب سجدہ تلاوت کے لیے نماز کی شرائط نہیں ہیں، علماء سلف میں سے کسی نے اسے نماز نہیں کہا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ سجدہ تلاوت چونکہ نماز نہیں ہے اس لیے اس کے لیے شروط نماز مقرر نہیں کی جائیں گی، بلکہ یہ بغیر وضو کے بھی جائز ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا عمل بھی اس کی دلیل ہے۔ [1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا حوالہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے کہ وہ وضو کے بغیر سجدہ تلاوت کیا کرتے تھے۔ [2]

اسی طرح نماز فجر کے بعد سجدہ تلاوت کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے، اس سلسلہ میں ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت ابو تمیمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نماز فجر کے بعد مدینہ طیبہ میں وعظ کرتا تھا، اس دوران آیتِ سجدہ پڑھنے پر میں سجدہ بھی کرتا تھا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ مجھے ایسا کرنے سے منع کرتے تھے لیکن میں باز نہیں آتا تھا، دو تین دفعہ ایسا ہوا آخر انہوں نے حدیث بیان کی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھتا رہا ہوں۔ وہ نماز فجر کے بعد سجدہ نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جاتا ہے۔ [3]

اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے شارح سنن ابی داود علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں اوقات مکروہ میں سجدہ تلاوت جائز نہیں ہے لیکن ظاہر حکم یہ ہے کہ اوقات مکروہ میں سجدہ تلاوت کیا جا سکتا ہے کیونکہ سجدہ تلاوت نماز نہیں۔ جن روایات میں اوقات مکروہ میں سجدہ کی ممانعت ہے اس سے مراد سجدہ تلاوت نہیں بلکہ سجدہ نماز ہے۔ [4]

اس کے علاوہ مذکورہ حدیث کی سند کے متعلق علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس میں ایک راوی ابو البحر البکراوی، عبد الرحمن بن عثمان ہے، جس کی موجودگی میں یہ حدیث قابل حجت نہیں رہتی۔ [5]

اس بنا پر نماز فجر کے بعد سجدہ تلاوت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اسے بلا وضو بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ، ص: ۱٦۵، ج ۲۳۔ [2] صحیح بخاری، سجود القرآن: ۱۰۷۱ تعلیقاً۔

[3] ابو داود، ابواب السجود: ۱٤۱۵۔ [4] عون المعبود، ص: ۵۳۳، ج ۱۔ [5] مختصر ابی داود، ص: ۱۲۰، ج ۲۔

نماز میں قراءت کرتے وقت سورتوں کی ترتیب کا لحاظ رکھنا

سوال نماز میں قراءت کرتے وقت کیا سورتوں کی ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائیں، کیونکہ ہمارے ہاں کچھ لوگ اس کے متعلق بہت زور دیتے ہیں۔

جواب نماز میں قراءت کرتے وقت سورتوں کی ترتیب کا لحاظ رکھنا نہ واجب ہے اور نہ اسے سنت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک رات کی نماز میں پہلے سورۂ بقرہ تلاوت کی اس کے بعد سورۂ نساء پھر سورۂ آل عمران پڑھی۔ [1] حالانکہ سورۂ نساء، سورۂ آل عمران کے بعد ہے، اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں طور پر قائم کیا ہے: ''دو سورتیں ایک رکعت میں پڑھنا، سورتوں کی آخری آیات یا سورتوں کو تقدیم و تاخیر سے پڑھنا یا سورتوں کی ابتدائی آیات پڑھنے کا بیان۔'' پھر اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے چند احادیث و آثار کا حوالہ دیا ہے جو اس مسئلہ کے اثبات کے لیے کافی ہیں، طالب حق کو صحیح بخاری کے اس مقام کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

جسے قرآن نہ آتا ہو وہ نماز میں کیا کرے؟

سوال جو آدمی سورۃ فاتحہ یا قرآن کی دیگر آیات زبانی نہ پڑھ سکتا ہو، اسے کیا کرنا چاہیے، کیا وہ قرآن دیکھ کر پڑھ سکتا ہے؟

جواب جو آدمی سورۃ فاتحہ بھی زبانی نہ پڑھ سکتا ہو اسے چاہیے کہ وہ دوران نماز تسبیح و تہلیل کرتا رہے اور جب تک سورۃ فاتحہ یاد نہ ہو سکے وہ اسی پر اکتفا کرتا رہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز سکھائی اور فرمایا کہ اگر تمہیں قرآن کا کچھ حصہ یاد ہے تو اسے نماز میں پڑھو بصورت دیگر الحمد للہ، اللہ اکبر، اور لا الہ الا اللہ پڑھتے رہو پھر رکوع میں چلے جاؤ۔ [2]

لیکن ہمیشہ کے لیے ان کلمات پر اکتفاء کرنا صحیح نہیں ہے۔ ناخواندہ شخص کو چاہیے کہ وہ فاتحہ سیکھنا شروع کر دے جب تک یاد نہ ہو وہ ان کلمات کو دوران نماز پڑھتا رہے، اسی طرح اگر دیکھ کر قرآن پڑھ سکتا ہے تو دوران نماز قرآن دیکھ کر پڑھنا بھی جائز ہے لیکن اس پر دوام اختیار کرنا درست نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک غلام دیکھ کر قرآن پڑھتا اور امامت کراتا تھا۔ [3]

نماز کسوف میں قرأت سری ہوگی یا جہری

سوال جب سورج یا چاند گرہن لگتا ہے تو اس کی نماز میں قراءت آہستہ ہو یا بآواز بلند کیا احادیث میں اس کے متعلق روایات ملتی ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب نماز کسوف باجماعت ادا ہونی چاہیے اور اس میں با آواز بلند قراءت کی جائے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کسوف میں با آواز بلند قراءت فرمائی۔ [4]

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۳۸۲، ج ۲۔ [2] بیہقی، ص: ۱۰۲، ج ۲۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب نمبر ٥٤۔
[4] صحیح بخاری الکسوف: ۱۰٦٥۔

اس حدیث کے پیش نظر کسوف میں اونچی آواز سے قراءت کی جائے۔ اگرچہ کچھ اہل علم بایں طور فرق کرتے ہیں کہ سورج گرہن کے موقع پر آہستہ اور چاند گرہن کے وقت جہری قراءت کی جائے، لیکن یہ فرق احادیث سے ثابت نہیں۔ البتہ ایک حدیث میں اشارہ ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کسوف میں آہستہ قراءت کی تھی۔ چنانچہ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے واقعی آہستہ قراءت کی تھی، ممکن ہے دور کھڑے ہونے کی وجہ سے آپ کی قراءت سنائی نہ دیتی ہو۔ پھر یہ روایت ہی ضعیف ہے جیسا کہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ضعیف ابی داؤد رقم ۲۵۳ میں درج کیا ہے۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ سورج گرہن لگنے پر نماز کسوف پڑھائی تھی اور بخاری کی روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے باآواز بلند قراءت کی تھی اور اس کے مقابلہ میں جو حدیث پیش کی جاتی ہے وہ ضعیف ہے اور اپنے مدعا میں وہ صریح بھی نہیں۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ نماز کسوف میں قراءت بلند آواز سے کی جائے۔ (واللہ اعلم)

امام کا دو رکعات میں ایک ہی سورت تلاوت کرنا

سوال کیا کسی نماز کی دو رکعات میں ایک ہی سورت کی تلاوت کرنا جائز ہے؟ اگر کوئی امام ایسا کرتا ہے تو کیا ایسا کرنے سے نماز ہو جاتی ہے؟

جواب کبھی کبھار ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسے بطور عادت اختیار کرنا صحیح نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ سے زندگی میں صرف ایک مرتبہ ایسا کرنا ثابت ہے، چنانچہ حضرت معاذ بن عبداللہ جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے انہیں بتایا، اس نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ نے صبح کی دو رکعت میں سورۃ ''اذا زلزلت'' تلاوت فرمائی، راوی بیان کرتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بھول کر ایسا کیا یا دانستہ طور پر آپ نے اس سورت کی قراءت فرمائی۔ [1]

امام ابوداؤد نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''ایک ہی سورت کو دو رکعت میں تلاوت کرنا۔''

صاحب مرعاۃ نے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے: ظاہر یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دانستہ طور پر ایسا کیا تاکہ اس سنت کے لیے جواز مہیا ہو۔ [2]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان سے ایک ایسے آدمی کے متعلق سوال ہوا جو ایک ہی سورت کو دو رکعت میں تقسیم کر کے پڑھتا ہے یا ایک سورت کو دو رکعت میں بار بار پڑھتا ہے تو انہوں نے جواب دیا ہے کہ جائز ہے کیونکہ سب اللہ کی کتاب ہے۔ [3]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے شارح بخاری ابن منیر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سورت کو تقسیم کر کے پڑھنے سے بہتر ہے کہ دو رکعت میں بار بار ایک ہی سورت کو پڑھ دیا جائے۔ [4]

---

[1] ابوداود، الصلوٰۃ:۸۱۶۔ [2] مرعاۃ المفاتیح، ص:۱۷۷، ج۳۔

[3] صحیح بخاری، باب نمبر ۱۰۶۔ [4] فتح الباری، ص:۳۳۳، ج۲۔

مقتدی کا امام سے پہلے سجدہ میں جانا؟

سوال اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب امام رکوع سے سر اٹھاتا ہے اور سجدہ کے لیے تیاری کرتا ہے تو کچھ نمازی امام سے پہلے ہی نیچے جھک جاتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ مقتدی کی امام کے ساتھ چار حالتیں ممکن ہیں:

☆ **مسابقت:** نماز کے کسی رکن کو مقتدی اپنے امام سے پہلے ہی شروع کرلے ایسا کرنا حرام اور ناجائز ہے، حدیث میں اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا امام سے پہلے سر اٹھانے والا اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کے سر میں بدل دے یا اللہ تعالیٰ اس کی شکل وصورت کو گدھے کی شکل وصورت بنادے۔'' [1]

☆ **موافقت:** مقتدی امام کے ساتھ ساتھ چلے، جب امام رکوع کرے تو عین اسی وقت مقتدی رکوع میں چلا جائے جب امام سجدہ میں جائے تو عین اسی وقت مقتدی بھی سجدہ میں چلا جائے، ایسا کرنا بھی جائز نہیں، صرف نماز میں دو ایسے مقامات ہیں جہاں امام کے ساتھ موافقت مطلوب ہے: ایک آمین کہنے میں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اس موافقت کی صورت میں مقتدی کے سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ [2] دوسرا امام کے ساتھ ربنا لک الحمد کہنا ہے، اس موافقت سے بھی سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ [3]

☆ **متابعت:** تاخیر کے بغیر نماز کے تمام اعمال کو امام کے بعد سرانجام دیا جائے، دوران نماز ہمیں امام کی متابعت کرنے کا حکم ہے، حدیث میں ہے کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے، جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو...... [4] حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے، جب آپ سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو ہم میں سے کوئی بھی اپنی کمر نہیں جھکاتا تھا تاآنکہ رسول اللہ ﷺ اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیتے۔ [5]

☆ **مخالفت:** اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی اپنے امام سے اس قدر پیچھے رہ جائے کہ اس کی اقتداء سے ہی خارج ہوجائے مثلاً امام جب رکوع سے اپنا سر اٹھاتا ہے تو مقتدی اس وقت رکوع میں جاتا ہے، نماز کا جو رکن امام کی مخالفت میں ادا ہو وہ سرے سے ادا ہوتا ہی نہیں، ایسا کرنے سے ساری نماز خطرے میں پڑ جاتی ہے، صورت مسؤلہ بھی امام کی متابعت کے خلاف ہے، ایسا ہونا چاہیے کہ جب امام اپنا سر سجدہ میں رکھ دے تو مقتدی حضرات کو سجدہ کے لیے اس وقت جھکنا چاہیے جیسا کہ متابعت کے بیان میں اس کی وضاحت ہوچکی ہے۔ (واللہ اعلم)

بوقت مجبوری رکوع وسجود کے بغیر نماز پڑھنا

سوال بوقت مجبوری رکوع وسجود کے بغیر نماز ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں مکمل راہنمائی فرمائیں۔

جواب نماز کے کچھ اعمال یہ حیثیت رکھتے ہیں کہ اگر انہیں عمداً یا بھول کر چھوڑ دیا جائے تو پوری نماز باطل ہوجاتی ہے یا

---

[1] صحیح بخاری، الاذان:٦٩١۔ [2] صحیح بخاری، الاذان:٧٩٦۔ [3] بخاری، الاذان: ٧٩٦۔

[4] صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ:١١١٤۔ [5] صحیح بخاری، الاذان:٨١١۔

وہ رکعت باطل ہو جاتی ہے جس میں وہ عمل چھوٹ گیا ہو اور بعد والی رکعت خود بخود اس متروکہ عمل والی رکعت کے قائم مقام ہو جاتی ہے، دوران نماز اس قسم کے عمل کو رکن کہا جاتا ہے، رکوع اور سجدہ بھی ارکان نماز میں سے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا ﴾ [1]

''اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرتے رہو۔''

اس آیت کریمہ سے دوران نماز رکوع اور سجدہ کی رکنیت ثابت ہوتی ہے، علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ سے دوران نماز ہر رکعت میں رکوع اور سجدہ کرنا ثابت ہے لہٰذا قرآن وسنت سے رکوع اور سجدہ کی فرضیت ثابت ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، ہاں اگر کوئی مجبوری ہو تو رکوع اور سجدہ کی ادائیگی میں تبدیلی ہو سکتی ہے مثلاً میدان جنگ میں اگر نماز ادا کرنا ہو تو چلتے پھرتے نماز ادا کی جا سکتی ہے اور اس میں رکوع اور سجدہ کی ادائیگی عام طریقہ سے ہٹ کر ہو گی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''دشمن کا پیچھا کرنے والے یا جس کا دشمن پیچھا کر رہا ہو وہ سواری کی حالت میں اشارے سے نماز ادا کر لے۔'' [2]

اسی طرح اگر سفر کے دوران نماز ادا کرنا پڑے اور قیام ممکن نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھی جا سکتی ہے، اس حالت میں بھی رکوع اور سجدہ عام طریقے کے مطابق ادا نہیں کیا جا سکے گا بلکہ حدیث میں اس کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل پڑھتے اور سجدہ کرتے وقت رکوع کی نسبت کچھ زیادہ جھکتے تھے۔ [3]

نیز جب انسان بیمار ہو اور بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو بھی اشارہ سے رکوع اور سجدہ کیا جا سکتا ہے، الغرض رکوع اور سجدہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، البتہ ان کی ادائیگی میں تبدیلی ہو سکتی ہے، بیٹھ کر، لیٹے لیٹے نماز پڑھتے وقت رکوع اور سجدہ کرنا ہو گا، اس کے بغیر نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ دونوں ایسے رکن ہیں کہ ان کے ترک سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز کسوف کا طریقہ

سوال نماز گرہن کے متعلق احادیث میں بہت اختلاف ہے، بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رکعت میں دو رکوع کیے جب کہ بعض احادیث میں تین، چار اور پانچ رکوع کرنے کا ذکر ہے۔ حالانکہ ہم نے سنا ہے کہ نماز گرہن عہد نبوی میں صرف ایک مرتبہ پڑھی گئی تھی، اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

جواب اس میں شک نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد نماز گرہن ادا فرمائی، جب آپ کے لخت جگر حضرت ابراہیم علیہ السلام فوت ہوئے اور سورج کو گرہن لگا، عام لوگوں نے اسے آپ کے لخت جگر کی وفات کے ساتھ وابستہ کیا تو آپ نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے نماز گرہن کا اہتمام کیا کہ سورج گرہن کسی کی موت وحیات کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ چاند اور سورج اللہ کی نشانیاں ہیں، اللہ چاہے اسے بے نور کر کے لوگوں کے لیے سامان عبرت بنا دیتا ہے۔

اس امر میں بھی شک نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں مختلف احادیث وارد ہیں، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول

---

[1] ۲۲/الحج:۷۷۔ [2] صحیح بخاری، الخوف، باب نمبر ۵۔ [3] ابوداود، صلاۃ السفر:۱۲۲۷۔

اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں جب سورج کو گرہن لگا تو آپ نے دو رکعات میں چھ رکوع اور چار سجدے کیے۔ [1]

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورج گرہن کی نماز پڑھتے وقت دو رکعات میں آٹھ رکوع اور چار سجدے کیے۔ [2]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورج گرہن کی پہلی رکعت میں طویل قیام فرمایا، اس میں پانچ رکوع اور دو سجدے کیے پھر اسی طرح دوسری رکعت میں کیا۔ [3]

بعض روایات میں ایک رکعت میں ایک ہی رکوع کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ [4]

ہمارے رجحان کے مطابق ایک رکعت دو رکوع والی روایات راجح ہیں کیونکہ صحیحین کی روایات اس پر متفق ہیں، دیگر روایات مرجوح ہیں اور ان کی کوئی تاویل بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ نماز کسوف رسول اللہ ﷺ نے زندگی میں ایک مرتبہ ہی ادا کی ہے، اس سلسلہ میں ایک صحیح روایت درج ذیل ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں سورج کو گرہن لگا تو آپ نے صلوٰۃ کسوف ادا فرمائی، اس میں سورۂ بقرہ کی قراءت کے برابر قیام فرمایا پھر رکوع کیا جو بہت طویل تھا، اس کے بعد رکوع سے کھڑے ہوئے تو طویل قیام فرمایا جو پہلے قیام سے کم تھا پھر دوبارہ لمبا رکوع کیا لیکن پہلے رکوع سے کم تھا پھر سجدہ ریز ہو گئے۔ اس کے بعد اٹھے اور طویل قیام فرمایا اور وہ پہلے قیام سے قدرے کم تھا پھر ایک لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کم تھا پھر سجدہ کیا، جب سلام پھیرا تو سورج روشن ہو چکا تھا، اس کے بعد آپ نے لوگوں کو وعظ فرمایا۔ [5]

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام بخاری رحمہم اللہ کے نزدیک دو رکوع والی روایات راجح ہیں۔ (واللہ اعلم) [6]

نماز عصر کا وقت

سوال نماز عصر کا وقت ایک مثل سایہ سے شروع ہوتا ہے، کیا اس سے پہلے عصر کی اذان دی جا سکتی ہے؟

جواب حضرت جبرائیل علیہ السلام کی امامت والی حدیث میں نمازوں کے اوقات بیان ہوئے ہیں، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عصر کی نماز پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ اس کی مثل ہو گیا۔'' [7]

جب دوسرے دن حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عصر کی نماز پڑھائی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس وقت ہر چیز کا سایہ دو مثل ہو چکا تھا۔'' [8]

شریعت اسلامیہ میں اذان اس وقت دی جاتی ہے جب نماز پڑھنا جائز ہوتا ہے کیونکہ اذان کو نماز کے وقت کی علامت قرار

---

[1] صحیح مسلم، الکسوف: ۹۰۴۔ [2] صحیح مسلم، الکسوف: ۹۰۹۔ [3] ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۱۸۲۔
[4] مستدرک حاکم، ص: ۳۳۰، ج ۱۔ [5] صحیح بخاری، الکسوف: ۱۰۵۲۔ [6] زاد المعاد، ص: ۴۵۳، ج ۱۔
[7] جامع ترمذی، المواقیت: ۱۴۹۔ [8] ابوداود، المواقیت: ۳۹۳۔

دیا گیا ہے، لہٰذا وقت سے پہلے اذان دینا درست نہیں ہے چنانچہ ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے طلوع فجر سے پہلے اذان دے دی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ واپس جا کر اعلان کریں: خبردار! بندہ سو گیا تھا، خبردار! بندہ سو گیا تھا۔ [1]

البتہ سحری کی اذان طلوع فجر سے پہلے دی جاسکتی ہے اور یہ اذان فجر کی نماز کے لیے نہیں بلکہ تہجد پڑھنے والوں کو واپس بلانے اور روزے داروں کو سحری کھانے کی اطلاع دینے کے لیے ہوتی ہے، بہر حال ایک مثل سایہ ہونے سے قبل نماز عصر کی اذان دینا درست نہیں کیونکہ اذان کا مقصد اوقات نماز سے باخبر کرنا ہے اور قبل از وقت اذان دینے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ (واللہ اعلم)

بے وضو مقتدی کا امام پر اثر

سوال اگر کوئی شخص بے وضوء ہو اور امام کے پیچھے اسی حالت میں کھڑا رہے تو کیا امام پر اس کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ یہ بات بہت مشہور ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کردیں۔

جواب جب کوئی شخص بے وضو ہو اور دانستہ طور پر امام کے پیچھے کھڑا نماز پڑھتا رہے تو اس کی نحوست سے امام بھی محفوظ نہیں رہتا، وہ خود تو گناہ سمیٹتا ہی ہے البتہ امام پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ نماز صبح ادا کی، اس میں آپ نے سورۂ روم کی تلاوت شروع کی تو اختلاط ونسیان واقع ہونے لگا، نماز سے فراغت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے دوران نماز تلاوت قرآن میں اختلاط ونسیان ہو رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ لوگ ہمارے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں لیکن وہ اچھی طرح وضو نہیں کرتے، خبردار! جو شخص ہمارے ساتھ نماز ادا کرے اسے چاہیے کہ وہ اچھی طرح وضو کرے۔'' [2]

حدیث میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو نماز کے لیے اچھی طرح وضو نہیں کرتے اور اس کے آداب کا خیال نہیں رکھتے، ایسے لوگوں کے بد اثرات سے امام محفوظ نہیں رہتا، لیکن اگر کوئی بے وضو ہو کر امام کے پیچھے نماز ادا کرتا ہے، اس کے برے اثرات امام کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے؟ اس لیے مقتدی حضرات کو چاہیے کہ نماز کی ادائیگی کے وقت اپنے وضو کا خیال رکھیں اور اچھی طرح وضو کریں۔ (واللہ اعلم)

مقتدی کا دوران نماز جماعت میں داخل ہونا

سوال جب کوئی نمازی اس وقت مسجد میں آئے جب امام سجدہ میں ہو تو نماز میں شامل ہونے کا کیا طریقہ ہے، کیا اسے سجدہ میں چلے جانا چاہیے؟

جواب نماز میں داخل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ نمازی اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے پھر اللہ اکبر کہے جیسا کہ حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے پھر اللہ اکبر کہتے۔ [3]

نمازی جب دوران جماعت مسجد میں آئے تو اسے رفع الیدین کے ساتھ اللہ اکبر کہتے ہوئے نماز میں داخل ہونا ہوگا، پھر جس

---

[1] ابوداود، الصلوٰۃ:۵۳۲۔ [2] مسند امام احمد، ص:۴۷۱، ج۳۔ [3] صحیح بخاری، الاذان:۷۳۶۔

حالت میں امام ہے وہ حالت اختیار کرے۔ اگر امام سجدہ میں ہے تو اپنے ہاتھوں کو سینہ پر باندھے بغیر اللہ اکبر کہتا ہوا سجدہ میں چلا جائے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''سجدہ کے وقت اللہ اکبر کہتا ہوا نیچے جھکے۔'' ❶

پھر انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کے لیے جھکتے تو اللہ اکبر کہتے۔ ❷

دوران جماعت آنے والے نمازی کو امام کی حالت اختیار کرنے کے لیے سجدہ کے وقت دوبارہ تکبیر کہنا ہوگی، پہلی تکبیر کافی نہیں ہوگی۔ (واللہ اعلم)

مقامی امام کا چند میل پر جا کر قصر نماز پڑھنا

سوال ہم چند ساتھیوں کو اپنے امام مسجد کے ہمراہ ایک قریبی گاؤں جانے کا اتفاق ہوا جو کہ ہمارے گاؤں سے تقریباً دو میل کی مسافت پر ہے، ہمارے امام صاحب نے ہمیں نماز ظہر پڑھاتے وقت کہا کہ میں مسافر کی نماز قصر پڑھوں گا، آپ پوری پڑھ لیں، ہمارے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ میرا اصلی وطن چیچہ وطنی ہے جو یہاں سے تقریباً دو سو میل ہے، لہٰذا میں مسافر ہوں حالانکہ ہمارے امام کم وبیش ایک سال سے ہمارے ہاں مقیم ہیں، اور ہمیں پوری نماز پڑھاتے ہیں، کیا امام صاحب کا نماز قصر کے متعلق استدلال صحیح ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب فقہاء امت نے وطن کی دو اقسام لکھی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① وطن اصلی: وہ مقام جہاں انسان پیدا ہوا ہو، اور اپنے والدین یا اہل وعیال کے ہمراہ وہاں رہائش رکھے ہوئے ہو۔

② وطن اقامت: وہ مقام جہاں وہ شرعی مسافت سے زیادہ دنوں کے لیے تردد کے بغیر رہائش رکھے ہو۔

احکام کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، سوال میں ذکر کردہ امام مسجد ایک سال سے کسی گاؤں میں بغرض امامت وخطابت مقیم ہیں اور وہاں نماز پوری پڑھاتے ہیں۔ مذکورہ گاؤں ان کے لیے وطن اقامت کی حیثیت رکھتا ہے، ایسے حالات میں اگر وہ دو یا تین میل کی مسافت پر واقع کسی گاؤں جاتا ہے تو اسے پوری نماز پڑھنا ہوگی، واضح رہے کہ شرعی مسافت سے مراد یہ ہے کہ دوران سفر، قیام پڑاؤ یا منزل مقصود پر پہنچے اور وہاں سے روانگی کے دن کے علاوہ اگر تین دن اور تین رات ٹھہرنے کا ارادہ یقینی ہو تو نماز قصر ادا کرنا چاہیے کیونکہ یہ شرعی مسافت ہے اگر اس سے زیادہ دنوں کا قیام مقصود ہو تو نماز پوری پڑھنا ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر چار ذوالحجہ صبح کے وقت مکہ مکرمہ پہنچے اور آٹھویں ذوالحجہ صبح کی نماز ادا کرکے منیٰ روانہ ہوئے یعنی آمد اور روانگی کا دن نکال کر پانچ، چھ اور سات ذوالحجہ تک تین دن مکمل قیام کیا اور یہ قیام اتفاقی نہیں بلکہ حسب پروگرام تھا، اس دوران آپ قصر کرتے رہے، اس موقف کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوسرے فرمان سے بھی ہوتی ہے کہ آپ نے مہاجرین کو مناسک حج ادا کرنے کے بعد صرف تین دن مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کی اجازت دی، چنانچہ آپ نے فرمایا: ''حج ادا کرنے کے بعد مہاجر تین دن مکہ میں ٹھہر سکتا ہے۔'' ❸

---

❶ صحیح بخاری، الاذان، باب:۱۲۸۔ ❷ صحیح بخاری، الاذان:۸۰۳۔ ❸ مسلم، الحج:۳۲۹۷۔

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے مطابق تین دن اور تین رات کے قیام والا ایک مسافر انسان مقیم کے حکم میں نہیں آتا بلکہ اس قدر قیام کرنے سے اس کی مسافرانہ حیثیت برقرار رہتی ہے، اس سے زیادہ دنوں کا قیام اگر یقینی طور پر ہے تو یہ اس کی مسافرانہ حیثیت کے منافی ہے اور ایسے حالات میں اسے پوری نماز پڑھنا ہوگی، ہاں اگر قیام کے دوران تردد اور بے یقینی کی کیفیت ہے تو ایسے حالات میں وہ جتنے دن بھی قیام کرے اسے نماز قصر ادا کرنے کی اجازت ہے۔ مذکورہ امام مسجد بھی شاید اسی قسم کی غیر یقینی صورت حال سے دو چار ہوں کہ مجھے نا معلوم کب جماعت والے یہاں سے فارغ کر دیں لیکن سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورے اذعان ویقین سے وہاں رہائش رکھے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مقتدیوں کو پوری نماز پڑھاتے ہیں، بہر حال ان کا کسی قریبی گاؤں میں جا کر نماز قصر پڑھنا محل نظر ہے، انہیں وہاں بھی پوری نماز پڑھنی چاہیے تھی۔ (واللہ اعلم)

نماز استسقاء کا طریقہ

سوال نماز استسقاء کا کیا طریقہ ہے؟ کیا امام دوسری رکعت میں رکوع کے وقت قنوت وتر کی طرح کرے گا اور کیا وہ الٹے ہاتھوں دعا کرے گا؟ کتاب وسنت کے مطابق اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب نماز استسقاء میں دوران نماز دعا کرنے کا ثبوت نہیں مل سکا بلکہ نماز سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ بارش کی دعا کی، جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے بارش نہ ہونے کی بناء پر قحط سالی کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے عیدگاہ میں منبر لے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہاں منبر رکھ دیا گیا، آپ نے لوگوں سے ایک دن کا وعدہ کیا کہ وہ سب اس دن باہر نکلیں، پھر آپ اس وقت نکلے جب سورج کا ایک کنارہ ظاہر ہو چکا تھا، آپ منبر پر فروکش ہوئے۔ آپ نے لوگوں کو وعظ ونصیحت فرمائی اور اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کی۔ آپ نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھانا شروع کیا حتیٰ کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، اس کے بعد آپ لوگوں کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گئے اور اپنی چادر کو الٹا کیا پھر آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور منبر سے نیچے تشریف لائے پھر دو رکعت ادا کیں، اللہ تعالیٰ نے اس لمحہ آسمان میں بادل ظاہر کیے وہ گرجے اور بجلی چمکی پھر بارش برسنے لگی۔" [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دو رکعت پڑھنے سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا اور دعا مانگی۔ جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دو رکعت پڑھنے کے بعد خطبہ دیا لیکن وہ عام خطبہ نہیں تھا، بلکہ وہ انکساری، عاجزی، اللہ کی کبریائی اور دعا پر مشتمل تھا۔ [2]

بارش کے لیے نماز ادا کیے بغیر بھی دعا کرنا مشروع ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے دوران خطبہ بارش کے لیے دعا کی تھی ممکن ہے کہ آپ نے جمعہ کی دو رکعت کو ہی کافی خیال کیا ہو، جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان قائم کیا ہے۔ [3] بارش کے لیے دعا کرتے وقت اپنے ہاتھ الٹے کرنے کے متعلق ہمارا مؤقف یہ ہے کہ الٹے ہاتھ دعا مانگنا منع ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم اللہ سے سوال کرو تو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے مانگا

---

[1] ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۱۷۳۔ [2] ترمذی، الصلوٰۃ: ۵۵۵۔ [3] صحیح بخاری، الاستسقاء باب نمبر ۹۔

کرو، ہاتھوں کی پشت سے نہ مانگا کرو۔'' ❶

دعا کا یہ ادب عام دعاؤں کے لیے ہے مگر نماز استسقاء میں جب قحط اور خشک سالی دور کرنے کی دعا کی جائے تو نیک شگونی کے طور پر ہاتھوں کی پشت اوپر کی جانب کی جائے بلکہ مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری دعا میں ہاتھوں کی پشت اوپر نہ رکھی جائے بلکہ ایک دفعہ اشارہ کر دیا جائے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کے لیے دعا فرمائی تو اپنے دونوں ہاتھ الٹی سمت سے آسمان کی طرف اٹھا کر اشارہ فرمایا۔ ❷

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بلاؤں اور مصیبتوں کو دور کرنے کے لیے جب دعا کی جائے تو الٹے ہاتھوں سے دعا مانگنا مشروع ہے اور جب کوئی چیز مانگنا ہو تو سیدھے ہاتھ آسمان کی طرف کیے جائیں۔ ❸

ہاتھ الٹے کرنے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری حالت کو تبدیل کر دے جیسا کہ چادر الٹنے میں حکمت بیان کی جاتی ہے، البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاء استسقاء الٹے ہاتھوں سے کی جائے، آپ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بارش کے لیے اس طرح دعا کرتے تھے پھر انہوں نے اپنے ہاتھ لمبے کر کے دکھائے اور اپنی ہتھیلیوں کو زمین کی طرف کیا۔ ❹

بہر حال ہاتھوں کی پشت کو آسمان کی طرف کرنا اور چادروں کو پلٹنا یہ نیک فالی کے طور پر ہے یعنی اے اللہ! جس طرح ہم نے اپنے ہاتھ الٹے کر لیے ہیں اور چادروں کو پلٹ لیا ہے تو بھی موجودہ صورت حال کو اس طرح بدل دے یعنی بارش برسا کر قحط سالی ختم کر دے اور تنگی کو خوشحالی میں بدل دے، لیکن نماز وتر کی طرح دوران نماز دعا کرنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

الصلوٰۃ خیر من النوم کہنے کا اصل مقام

سوال حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو دوہری اذان کی تعلیم دی اور اس حدیث میں یہ وضاحت ہے کہ جب صبح کی پہلی اذان ہو تو اس وقت ''الصلوٰۃ خیر من النوم، الصلوٰۃ خیر من النوم'' کہا جائے، اس روایت کے مطابق ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کے الفاظ فجر کی پہلی اذان میں کہنے چاہئیں جب کہ ہماری تمام مساجد میں ان الفاظ کو دوسری اذان میں کہا جاتا ہے، اس کے متعلق ہمیں صحیح مؤقف سے آگاہ کریں۔

جواب بلاشبہ سوال میں مذکورہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ متعدد کتب حدیث میں مروی ہے۔ ❺ اس حدیث سے کچھ اہل علم نے یہ مسئلہ کشید کیا ہے کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کے الفاظ فجر کی پہلی اذان میں کہے جائیں، دوسری اذان میں انہیں نہیں کہنا چاہیے، لیکن یہ استدلال کئی اعتبار سے محل نظر ہے۔

اولاً: حدیث میں اذان اول، اقامت کے اعتبار سے ہے کیونکہ شریعت میں تکبیر کو بھی اذان کہا گیا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔'' ❻

---

❶ ابوداود، الوتر:۱٤۸٦۔ ❷ مسلم، الاستسقاء:۸۹٦۔ ❸ فتح الباری، ص:٦٦۸، ج۲۔
❹ ابوداود، الاستسقاء:۱۱۷۱۔ ❺ ابوداود، الصلوٰۃ:۵۰۱، نسائی والاذان:٦۳٤۔ ❻ بخاری، الاذان:٦۲٤۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر اذان اور اقامت کے درمیانی وقفے میں کم از کم دو رکعت پڑھنا مشروع ہے، اس میں اقامت کو بھی اذان سے تعبیر کیا گیا ہے، اس بناء پر اذان اول سے مراد وہ اذان ہے جو طلوع فجر کے بعد کہی جاتی ہے اور نماز فجر کے وقت کی علامت ہے، اس سے مراد اذانِ سحری نہیں جو سوتے ہوؤں کو بیدار کرنے یا تہجد پڑھنے والوں کو واپس آنے کے لیے کہی جاتی ہے۔

ثانیاً: مسجد نبوی میں دو مؤذن تھے، جن کی صراحت کتب حدیث میں موجود ہے، ایک حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ لیکن مکہ مکرمہ میں صرف ابو محذورہ رضی اللہ عنہ ہی مؤذن تھے اور وہ صبح کی اذان دیتے تھے جو نماز فجر کے لیے ہوتی تھی، اور اسی اذان میں وہ الصلوٰۃ خیر من النوم کہا کرتے تھے۔

ثالثاً: سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سنت یہ ہے کہ جب مؤذن فجر کی اذان میں حی علی الفلاح کہے تو الصلوٰۃ خیر من النوم دو مرتبہ کہے۔ [1]

جب صحابی کسی حدیث کو سنت کے حوالے سے بیان کرتا ہے تو وہ حدیث مرفوع ہوتی ہے، اس مؤقف کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت نعیم بن نحام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک صبح سخت ٹھنڈک میں اپنی بیوی کے ساتھ اس کی چادر میں لیٹا ہوا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن نے نماز صبح کے لیے اذان دینا شروع کر دی۔ جب میں نے اذان سنی تو دل میں کہا کاش! مؤذن یہ کلمات کہہ دے ''اور جو بیٹھا رہے اس پر کوئی حرج نہیں'' وہ فرماتے ہیں کہ جب مؤذن نے الصلوٰۃ خیر من النوم کہا تو اس کے بعد یہ الفاظ بھی کہے اور جو بیٹھا رہے اس پر کوئی حرج نہیں۔ [2]

اس حدیث میں صراحت ہے کہ مؤذن نے الصلوٰۃ خیر من النوم کے الفاظ نماز فجر کی اذان میں کہے تھے اگر الصلوٰۃ خیر من النوم کے الفاظ طلوع فجر سے پہلے کی اذان میں ہوتے تو حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کو یہ تمنا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی کہ کاش! مؤذن یہ الفاظ کہہ دے ''اور جو بیٹھا رہے اس پر کوئی حرج نہیں ہے۔'' بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق الصلوٰۃ خیر من النوم کے الفاظ فجر کی پہلی اذان میں نہیں جو طلوع فجر سے پہلے کہی جاتی ہے بلکہ فجر کی دوسری اذان میں کہے جائیں جو طلوع فجر کے بعد دی جاتی ہے اور جو نماز فجر کے وقت کے لیے ایک علامت کی حیثیت رکھی ہے۔ (واللہ اعلم)

دوران نماز سلام کا جواب دینا

سوال کیا دوران نماز سلام کا جواب دیا جا سکتا ہے، اس کی کتاب وسنت سے کوئی دلیل ہو تو ضرور ذکر کریں، پھر اگر جواب دینا جائز ہے تو کیسے دیا جائے؟

جواب اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہے اس دوران باہر سے آنے والا شخص سلام کہے تو دوران نماز وعلیکم السلام کہنے کے بجائے وہ اپنے ہاتھ کے اشارہ سے اس کا جواب دے گا، چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے کہا میں نے حضرت

---

[1] سنن دارقطنی، ص:۲۴۳، ج۱۔ [2] بیہقی، ص:۲۴۳، ج۱۔

بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ دوران نماز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ سلام کہتے تو کیا آپ انہیں جواب کہہ دیتے تھے انہوں نے کہا: ''اس طرح کرتے'' پھر انہوں نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ (1) دوران نماز باہر سے آنے والے کو چاہیے کہ اگر وہ سلام کہنا چاہتا ہے تو با آواز بلند سلام کہنے کی بجائے اپنی آواز کو ذرا آہستہ کرے تاکہ دوسرے نمازی خلل اندازی کا شکار نہ ہوں اور نمازی کو چاہیے کہ وہ منہ سے وعلیکم السلام کہنے کی بجائے اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے اس کا جواب دے دے۔ (واللہ اعلم)

جلسہ استراحت کی شرعی حیثیت

سوال جلسہ استراحت کیا ہوتا ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کا ذکر کسی حدیث میں ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب دو سجدوں کے بعد کچھ دیر بیٹھنے کو جلسہ استراحت کہتے ہیں، یہ مسنون عمل ہے، جس کا اہتمام ہر نمازی کو کرنا چاہیے چنانچہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دوسرے سجدہ سے سر اٹھایا تو سیدھے بیٹھ گئے، پھر اپنے ہاتھوں کو زمین پر رکھا اور دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہوئے۔ (2)

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مسیئ الصلوٰۃ کی حدیث یں جلسہ استراحت کا واضح طور پر ذکر ہے۔ (3)

کچھ حضرات کا مؤقف ہے کہ جس کے لیے سیدھا کھڑا ہونا مشکل ہو وہ بیٹھ کر پھر اٹھے اور جس کے لیے مشکل نہ ہو وہ نہ بیٹھے بلکہ سجدہ سے فراغت کے بعد سیدھا کھڑا ہو جائے، انہوں نے حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعلق کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمزوری اور کبرسنی کی وجہ سے سیدھا کھڑا ہونے میں مشقت محسوس فرماتے تھے، اس لیے آپ کچھ وقت بیٹھ کر اٹھتے، لیکن ان کا یہ مؤقف محل نظر ہے۔ ہمارے نزدیک دوران نماز جلسہ استراحت کو غیر ضروری قرار دینا یا اسے کمزور اور سن رسیدگی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے، جلسہ استراحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ ایک مسلمان کو چاہیے کہ نماز ادا کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کرے اور اسے قیل وقال کی بھینٹ نہ چڑھائے۔ (واللہ اعلم)

نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا

سوال کیا کسی حدیث میں ہے کہ عورتیں نماز میں اپنے سینے پر ہاتھ باندھیں جب کہ مرد حضرات زیر ناف اپنے ہاتھ رکھیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب دوران نماز سینے پر ہاتھ باندھے جائیں، اس میں مرد وعورت کے متعلق کوئی تفریق نہیں ہے، ہاتھوں کو چھوڑنا یا زیر ناف ہاتھ باندھنا یا مرد وعورت میں تفریق کرنا سنت سے ثابت نہیں ہے، چنانچہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے: ''لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ دوران نماز اپنے دائیں ہاتھ کو اپنی بائیں کلائی پر رکھیں۔'' (4)

---

(1) ابوداود، الصلوٰۃ:۹۲۷۔ (2) صحیح بخاری، الاذان:۸۲٤۔

(3) صحیح بخاری، الاستیذان:٦٢٥١۔ (4) بخاری، الاذان:٧٤٠۔

واضح رہے کہ جب بائیں کلائی پر دایاں ہاتھ رکھا جائے تو دونوں ہاتھ خود بخود سینہ پر آجاتے ہیں چنانچہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز پڑھی تو آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر اپنے سینے کے اوپر رکھا۔ [1]

اس حدیث میں قدرے ضعف ہے لیکن دیگر احادیث سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے، لہٰذا دوران نماز اپنے ہاتھوں کو سینے پر باندھنا چاہیے، اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ہاتھوں کو بائیں جانب اپنے دل پر باندھتے ہیں، یہ عمل بھی بے اصل بلکہ بدعت ہے، زیر ناف ہاتھ باندھنے کے متعلق ایک اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے، اس کے مقابلہ میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بہت قوی ہے، ہاتھ باندھنے کے متعلق مرد اور عورت میں فرق کرنا بھی خود ساختہ ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ احکام میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا، البتہ کتاب وسنت میں اگر تفریق کی کوئی دلیل موجود ہو تو الگ بات ہے، لیکن اس سلسلہ میں ہمیں کوئی دلیل نہیں ملی جس سے پتہ چلے کہ سینے پر ہاتھ باندھنے سے مرد اور عورت میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

بے ہوشی کی نماز

سوال اگر کوئی آدمی ہسپتال میں مسلسل دو دن بے ہوش رہا تو کیا ہوش آنے کے بعد اسے فوت شدہ نمازیں پڑھنا ہوں گی؟ قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت کریں۔

جواب شعور گم ہونے کی صورت میں انسان کے ذمہ مالی حقوق ساقط نہیں ہوتے لیکن بدنی عبادات مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ ساقط ہو جاتے ہیں البتہ ہوش آنے کے بعد رمضان کے روزوں کی قضا واجب ہو گی لیکن نمازوں کی ادائیگی اس کے ذمے نہیں ہے، کیونکہ یہ سوئے ہوئے شخص کی طرح نہیں ہے کہ وہ جب بیدار ہو تو فوت شدہ نمازوں کو ادا کرے۔ اس لیے کہ سوئے شخص میں ادراک ہوتا ہے اگر اسے بیدار کیا جائے تو وہ بیدار ہو سکتا ہے لیکن بے ہوشی میں مبتلا انسان کو اگر بیدار کیا جائے تو وہ بیدار نہیں ہو سکتا، بے ہوش انسان کی فوت شدہ نمازوں کے متعلق اہل علم کے دو قول ہیں:

1. جمہور اہل علم کا مؤقف ہے کہ بے ہوشی کے دوران رہ جانے والی نمازوں کی قضا اس کے ذمے نہیں ہے چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر ایک رات بے ہوشی طاری رہی تو انہوں نے اس دوران فوت ہونے والی نمازوں کی قضا نہیں دی تھی۔ [2]
2. کچھ اہل علم کا مؤقف ہے کہ بے ہوش آدمی اپنی فوت شدہ نمازیں ادا کرنے کا پابند ہے وہ اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا عمل پیش کرتے ہیں کہ ان پر ایک دن اور ایک رات بے ہوشی طاری رہی تو انہوں نے ہوش میں آنے کے بعد فوت ہونے والی نمازوں کی قضا دی تھی۔ [3]

ہمارے رجحان کے مطابق جمہور اہل علم کا مؤقف صحیح ہے جس کی ہم نے پہلے ہی وضاحت کر دی ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح ابن خزیمہ، ص: ج ۱، ص: ۲۴۳۔ [2] مصنف عبدالرزاق، ص: ۴۷۷، ج ۲۔
[3] مصنف عبدالرزاق، ص: ۴۷۹، ج ۲۔

ظہر کی سنتیں نماز کے بعد ادا کرنا

سوال اگر کوئی ظہر سے پہلے سنتیں نہیں پڑھ سکا تو کیا فرض نماز کے بعد انہیں ادا کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں ہماری قرآن وحدیث کے مطابق راہنمائی فرمائیں۔

جواب اگر بھول جائے یا نماز کے وقت سویا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے جب یاد آئے تو اس وقت پڑھ لے۔'' [1]

اسی طرح اگر مصروفیات کی وجہ سے سنتیں رہ جائیں تو مصروفیت ختم ہونے کے بعد انہیں پڑھا جا سکا ہے، چنانچہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ مصروفیت کی وجہ سے ظہر کے بعد والی دو سنتیں نہیں پڑھ سکے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد مصروفیت کے اختتام پر انہیں ادا کیا تھا۔ [2]

ان احادیث کی روشنی میں اگر نماز ظہر سے پہلے والی سنتیں رہ جائیں تو انہیں نماز کے بعد ادا کیا جا سکتا ہے لیکن پہلے نماز ظہر کے بعد والی دو سنتیں پڑھی جائیں پھر ان کے بعد پہلی چار سنتیں ادا کی جائیں۔ (واللہ اعلم)

ظہر کی سنتیں اور ان کا طریقہ

سوال نماز ظہر سے پہلے اور بعد کتنی سنتیں پڑھنی چاہئیں اور انہیں کس طرح ادا کرنا ہے، اگر چار رکعت ہیں تو ایک سلام سے پڑھی جائیں یا دو، دو رکعت پڑھنا افضل ہے؟

جواب ظہر کی سنتوں کے متعلق مندرجہ ذیل تفصیل ہے:

☆ پہلے چار اور نماز کے بعد دو۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص دن اور رات میں (فرضوں کے علاوہ) بارہ رکعتیں پڑھے اس کے لیے بہشت میں گھر بنایا جاتا ہے، چار رکعت ظہر سے پہلے، دو رکعت اس کے بعد، دو رکعت مغرب کے بعد دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت فجر سے پہلے۔ [3]

☆ نماز ظہر سے پہلے چار اور اس کے بعد بھی چار۔ چنانچہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور اس کے بعد چار رکعتیں باقاعدگی سے ادا کرتا رہے اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ پر حرام کر دے گا۔ [4] چار رکعت پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیر دیا جائے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعت اور بعد میں دو رکعت اور عصر سے پہلے بھی چار رکعت پڑھتے تھے اور ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیر کر فاصلہ کرتے تھے۔ [5] اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر سے پہلے پڑھی جانے والی چار رکعت کو دو، دو کر کے پڑھنا چاہیے لیکن درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر سے پہلے والی چار رکعت کو ایک سلام کے ساتھ ہی پڑھنا افضل ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ظہر سے پہلے ایسی چار رکعتوں کے لیے جن میں سلام نہ ہو

---

[1] صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۵۹۷۔ [2] صحیح بخاری، السھو: ۱۲۳۳۔ [3] جامع ترمذی، الصلوٰۃ: ۴۱۵۔
[4] مسند امام احمد، ص: ۳۲۶، ج۶۔ [5] جامع ترمذی، الصلوٰۃ: ۴۲۹۔

آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ [1]

ہمارے رجحان کے مطابق ظہر سے پہلے چار رکعت اور اس کے بعد دو رکعت ادا کرنے کا معمول بنایا جائے اگر وقت کم ہو تو ظہر سے پہلے دو رکعت بھی پڑھی جا سکتی ہیں، فرصت کے لمحات ملنے پر ظہر کے بعد چار رکعت پڑھی جائیں، ظہر سے پہلے چار رکعت ایک سلام سے ادا کرنی چاہئیں، دو، دو کر کے پڑھنا بھی جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز قصر کی مسافت اور کاروبار کے لیے باہر رہنے والوں کی نماز قصر ہوگی یا مکمل؟

سوال میں سوات کا رہنے والا ہوں اور میرا کاروبار سوات سے ٦٥ کلومیٹر دور ایک شہر میں ہے، میں روزانہ وہاں آتا جاتا ہوں اور نماز قصر پڑھتا ہوں، کیا میرا یہ عمل قرآن وحدیث کے مطابق ہے؟ جواب میں کسی حدیث کا حوالہ ضرور دیں۔

جواب نماز قصر کے لیے کم از کم مقدار سفر کے متعلق علماء سلف میں خاصا اختلاف ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق کوئی صریح قولی روایت نہیں ملتی البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ سفر وحضر میں ایک خادم خاص کی حیثیت سے رہے ہیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک فعل سے استنباط کیا ہے کہ منزل مقصود اگر کم از کم نو میل کی مسافت پر ہو تو نماز قصر کی جا سکتی ہے چنانچہ آپ کے شاگرد یحییٰ بن یزید ہنائی نے نماز قصر کے لیے مسافت کی مقدار کے متعلق سوال کیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ جب تین میل یا تین فرلانگ کا سفر کرتے تو نماز قصر فرماتے۔ (روایت میں سفر کی تعیین کے متعلق تردد ایک راوی شعبہ کو ہوا ہے)۔ [2]

واضح رہے کہ روایت میں تین میل کے تین فرسخ مراد لینا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ اس میں تین میل بھی آجاتے ہیں، ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ منزل مقصود اگر کم از کم نو میل کی مسافت پر واقع ہے تو اپنے شہر یا گاؤں کی حد سے نکل کر نماز قصر کی جا سکتی ہے۔

صورت مسئولہ میں سائل کا کاروبار اس کی رہائش سے ٦٥ کلومیٹر دور ایک شہر میں واضع ہے لہٰذا اسے دورانِ سفر قصر کی اجازت ہے، وہاں پہنچ کر بھی اگر شرعی مسافت سے زیادہ دنوں تک ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو نماز قصر کی جا سکتی ہے، سائل تو روزانہ وہاں سے اپنے گھر واپس آجاتا ہے، اس بناء پر اسے دوران سفر اور جائے کاروبار پر نماز قصر کرنے کی اجازت ہے اور اس کا عمل قرآن وحدیث کے مطابق ہے۔ (واللہ اعلم)

جوتے پہن کر نماز پڑھنا

سوال جوتے پہن کر نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں، اس کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ پاک ہوں، ان میں کسی قسم کی نجاست نہ لگی ہوئی ہو، کیونکہ رسول

---

[1] ابوداود، الصلوٰۃ: ١٢٧٠۔ [2] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ٦٩١۔

اللہ ﷺ سے جوتوں سمیت نماز پڑھنا ثابت ہے۔ چنانچہ سعید بن زید ازدی، جناب انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوال کرتے ہیں۔ کیا رسول اللہ ﷺ جوتوں سمیت نماز پڑھ لیتے تھے تو انہوں نے جواب دیا ''ہاں'' ❶ امام بخاری نے اس حدیث پر ''جوتوں سمیت نماز پڑھنے'' کا عنوان قائم کیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں آئے تو وہ دیکھ لے اگر اس کے جوتوں میں کوئی گندگی ہو تو اسے رگڑ کر صاف کرلے اور ان میں نماز پڑھ لے۔ ❷

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جوتے نجاست آلود ہوں تو ان میں نماز نہیں ہوتی اگر ان کی نجاست دور کردی جائے تو ان میں نماز پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ہم اس مقام پر یہ وضاحت کردینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر مسجد میں قالین اور دریاں بچھی ہوئی ہوں تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ آدمی اپنے جوتے اتار کر کسی مناسب جگہ پر رکھ دے پھر نماز ادا کرے، کیونکہ جوتوں میں نماز پڑھنا ضروری نہیں اور نہ ہی یہ کوئی مردہ سنت ہے جس کا زندہ کرنا ضروری ہے۔ خوامخواہ ضد اور ہٹ دھرمی سے ماحول کو خراب نہ کیا جائے، ایسے حالات میں موقع محل کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز تراویح کی درست تعداد

سوال نماز تراویح کی تعداد کے متعلق وضاحت کریں، اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس تراویح پڑھنے کا حکم دیا تھا، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب رمضان المبارک میں نماز عشاء کے بعد جو نفل پڑھے جاتے ہیں اس کے مختلف نام حسب ذیل ہیں۔

ا۔ قیام رمضان، ب۔ قیام اللیل، ج۔ تراویح۔ د۔ تہجد، عام طور پر جو نوافل نماز عشاء کے بعد باجماعت ادا کیے جائیں اسے نماز تراویح اور جو پچھلی رات انفرادی طور پر پڑھے جائیں اسے تہجد کہا جاتا ہے، ان کی تعداد کے متعلق راجح موقف یہ ہے کہ گیارہ رکعت ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رمضان ا' بارک میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کیسے تھی؟ تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ ماہ رمضان اور دیگر مہینوں میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ ❸

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان اور غیر رمضان میں رسول اللہ ﷺ کا قیام اللیل گیارہ رکعات ہوتا تھا، اس سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں رمضان میں آٹھ رکعات اور نماز وتر پڑھائی پھر اگلی رات آئی تو ہم جمع ہوگئے، ہمیں امید تھی کہ آپ گھر سے باہر نکلیں گے لیکن ہم صبح تک انتظار کرتے رہے، ہم نے اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا: ''مجھے اندیشہ تھا کہ مبادہ تم پر نماز وتر فرض کردی جائے۔'' ❹

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو بس گیارہ رکعات باجماعت پڑھائی تھیں۔ اس سے

---

❶ صحیح بخاری، الصلوٰۃ:٣٨٦۔ ❷ ابوداود، الصلوٰۃ:٦٥٠۔ ❸ صحیح بخاری، صلوٰۃ التراویح:٢٠١٣۔
❹ صحیح ابن خزیمہ حدیث نمبر:١٧٠۔

زیادہ پڑھنے کا اہتمام نہیں کیا تھا۔

امام مالک نے سائب بن یزید سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور تمیم داری رضی اللہ عنہ کو گیارہ رکعات پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ (1) اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز تراویح پڑھنے کے لیے لوگوں کو جمع کیا تو انہوں نے بھی گیارہ رکعات پڑھانے کا اہتمام کیا تھا چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کو یہی مسنون تعداد پڑھانے کا حکم دیا۔

البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری روایت بھی پیش کی ہے، یزید بن رومان بیان کرتے ہیں کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں دوران نماز ۲۳ رکعات پڑھا کرتے تھے۔ (2) اس اثر سے کچھ لوگوں نے بیس رکعات نماز تراویح پڑھنے کا مسئلہ کشید کیا ہے حالانکہ یہ منقطع ہونے کی بنا پر قابل حجت نہیں ہے کیونکہ اس کے راوی یزید بن رومان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا اگر اسے بالفرض صحیح مان بھی لیا جائے تو بھی روایت میں یہ ہے کہ لوگ از خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں ۲۳ رکعات پڑھا کرتے تھے، لہٰذا جس کام کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا وہی راجح ہوگا کیونکہ وہ سنت نبوی کے مطابق ہے۔

بہرحال نماز تراویح کی مسنون تعداد گیارہ رکعات ہیں، بیس رکعات مسنون نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

نماز میں آنکھیں بند کر لینا؟

سوال بعض لوگ نماز پڑھتے وقت اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب دوران نماز آنکھیں بند کر لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں ہے، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے وقت اپنی نظر سجدے کی جگہ پر رکھتے تھے، اسی طرح جب تشہد بیٹھتے تو آپ دعا کرتے وقت اپنی نظر انگلی کے اشارہ کی طرف رکھتے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر آپ کے اشارے سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔ (3)

اس حدیث کی رو سے نمازی، دوران نماز اپنی آنکھیں بند کرنے کی بجائے انہیں کھلا رکھے، آنکھیں بند کرنے کا عمل کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

نمازی کے آگے سے گزرنا؟

سوال جب نماز کی جماعت ہو رہی ہو تو کیا اس وقت کسی مقتدی کے آگے سے گزرنا جائز ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کے مطابق جواب دیں۔

جواب جب جماعت ہو رہی ہو تو کسی مقتدی کے آگے سے گزرنا جائز ہے کیونکہ اس وقت تمام مقتدیوں کا سترہ امام ہوتا

---

(1) مؤطا امام مالک، باب ماجاء فی قیام رمضان۔ (3) ابوداود، الصلوٰۃ: ۹۹۰۔

(2) مؤطا امام مالک، ص: ۷۳، ج ۱۔

ہے یا امام کا سترہ ہی سب مقتدیوں کا سترہ ہے، اس سترہ کے آگے سے گزرنا منع ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب آپ منیٰ میں لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، میں اس وقت گدھی پر سوار ہو کر صف کے آگے سے گزر گیا اور مجھے کسی نے منع نہیں کیا [1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر جماعت کھڑی ہو تو مقتدیوں کے آگے سے گزرنا جائز ہے البتہ امام کے آگے سے نہیں گزرنا چاہیے۔ اسی طرح اگر کوئی اکیلا نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے آگے سے بھی نہیں گزرنا چاہیے۔

نادانستہ ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھ لینا

سوال میں نے فجر کی نماز پڑھی، نماز سے فراغت کے بعد پتہ چلا کہ میرے کپڑے نجاست آلود تھے، اب کیا مجھے دوبارہ نماز پڑھنی چاہیے یا اسے دھرانے کی ضرورت نہیں؟

جواب اس مسئلہ میں اختلاف ہے، کچھ حضرات کا خیال ہے کہ ایسے شخص کی نماز باطل ہے اسے دوبارہ پڑھنا ہوگی اور کچھ حضرات کہتے ہیں کہ اگر بھول کر یا لاعلمی کی وجہ سے نجاست آلود کپڑوں میں نماز پڑھ لی جائے تو اس کی نماز صحیح ہے، اسے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق دوسرا مؤقف صحیح ہے کہ جب کوئی نماز سے فارغ ہو پھر اپنے کپڑوں کو نجاست آلود دیکھے تو اس کی نماز درست ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ دوران نماز جوتیاں اتار دیں، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کا یہ عمل دیکھا تو انہوں نے بھی اپنی جوتیاں اتار دیں، نماز سے فراغت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تم نے اپنی جوتیاں کیوں اتاریں؟ تو انہوں نے جواب دیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کو جوتیاں اتارتے ہوئے دیکھا تو ہم نے بھی اتار دیں، آپ نے فرمایا کہ میرے پاس تو حضرت جبریل علیہ السلام آئے تھے انہوں نے بتایا کہ آپ کے جوتے نجاست آلود ہیں اس لیے میں نے انہیں اتار دیا تھا۔ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کردہ نماز کو نہیں دھرایا، بلکہ آپ نے جوتے اتارنے کی وجہ سے بیان کر دی، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی لاعلمی میں نجاست آلود کپڑوں میں نماز پڑھ لے اسے فراغت کے بعد پتہ چلے تو نماز کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

قبل از وقت اذان دینا

سوال ہمارے علاقہ میں حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کے مرتب کردہ دائمی ٹائم ٹیبل کے مطابق اذان کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض مساجد میں مذکورہ ٹائم ٹیبل سے دس، پندرہ منٹ پہلے اذان فجر دی جاتی ہے، قبل از وقت اذان فجر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کتاب وسنت کے مطابق راہنمائی کریں۔

جواب نماز کی بروقت ادائیگی ضروری ہے، چونکہ اذان، نماز کے وقت کی ایک علامت ہے اس لیے اذان وقت سے

---

[1] صحیح بخاری، العلم:٧٦۔ [2] ابوداود:٦٥٠۔

پہلے دینا درست نہیں ہے۔ البتہ فجر کی دو اذانیں مشروع ہیں ایک اذان سحر جو طلوع فجر سے پہلے دی جاتی ہے اس کے بعد روزے دار کے لیے کھانا پینا تو جائز ہے لیکن نماز فجر پڑھنا جائز نہیں ہے اور دوسری اذان نماز فجر کی ہے اس کے بعد کھانا پینا منع ہے اور نماز فجر ادا کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ احادیث میں اس کی وضاحت ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر مؤذن اذان سحر، اذان نماز فجر سے دس پندرہ منٹ پہلے دیتا ہے تو جائز ہے لیکن اگر وہ نماز فجر کے وقت سے پہلے صلوٰۃ صبح کی اذان کہتا ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے طلوع فجر سے پہلے اذان کہہ دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ جاؤ اور اعلان کرو خبردار! بندہ سو گیا تھا، خبردار بندہ سو گیا تھا، چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جا کر اعلان کیا خبردار! بندہ سو گیا تھا۔ [1]

اس حدیث کی بناء پر نماز کا وقت ہونے سے پہلے اذان دینا صحیح نہیں ہے ہاں اگر غلطی سے تھوڑا فرق ہو تو اذان دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر وقفہ بہت زیادہ ہو تو اذان دوبارہ کہی جائے تو قبل از وقت دی ہوئی اذان کے متعلق اعلان کر دیا جائے کہ یہ غلطی سے ہوئی ہے، بعض اہل علم کا موقف ہے کہ صبح کی اذان فجر کاذب میں کہی جائے تا کہ صبح صادق ہوتے ہی نماز کھڑی کی جا سکے اور وہ اندھیرے میں پڑھی جائے، لیکن یہ مؤقف محل نظر ہے اور طریقہ نبوی کے خلاف ہے۔ بہر حال ہمارا رجحان یہ ہے کہ صبح کی اذان وقت سے پہلے کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ کچھ ضرورت مند حضرات قبل از وقت کہی گئی اذان سن کر نماز پڑھ لیں گے جو قبل از وقت ہوگی، لہٰذا نماز فجر کے لیے صبح کی اذان فجر طلوع ہونے پر ہی دی جائے۔ (واللہ اعلم)

دوران نماز کندھے سے کندھا ملانا

سوال کیا دوران نماز کندھے سے کندھا اور ٹخنے سے ٹخنا ملانا ضروری ہے؟ اس کے متعلق کتاب وسنت میں کوئی وضاحت وارد ہے؟

جواب احادیث میں صف بندی کا معیار یہ ہے کہ صف میں کھڑے ہوئے نمازیوں کے ٹخنے ایک دوسرے کے برابر ہوں صرف انگلیوں کے کناروں کا ملنا کافی نہیں ہے، ٹخنے ملانے سے صفوں میں برابری بھی آتی ہے اور درمیان میں آنے والا خلا بھی پر ہو جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ صفوں کو سیدھا کرو، کندھوں کو برابر کرو، خلا کو پر کرو، اپنے بھائیوں کے لیے نرم ہو جاؤ، شیطان کے لیے صف میں خالی جگہیں نہ چھوڑو، جس نے صف کو ملایا اللہ اسے ملائے گا اور جس نے صف کو کاٹا اللہ اس سے تعلق کاٹ لے گا۔ [2]

ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک دوسرے سے مضبوطی کے ساتھ مل جاؤ اور برابر ہو جاؤ۔'' [3]

نمازیوں کے پاؤں مختلف ہوتے ہیں، کسی کا پاؤں لمبا ہوتا ہے اور کسی کا چھوٹا ہوتا ہے لہٰذا صفوں کی درستی اور برابری ٹخنوں ہی

---

[1] ابوداود الصلوٰۃ: ۵۳۲۔ [2] ابوداود، الصلوٰۃ: ۶۶۶۔ [3] مسند امام احمد، ص ۲۶۸، ج ۳۔

سے ہوسکتی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل حدیث میں آیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ٹخنوں کے ساتھ ٹخنے ملا کر کھڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہم میں سے ایک آدمی دوسرے کے ٹخنے کے ساتھ اپنا ٹخنا ملا کر کھڑا ہوتا تھا۔ [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک اپنا کندھا دوسرے کے کندھے کے ساتھ اپنا قدم دوسرے کے قدم کے ساتھ ملا کر کھڑا ہوتا تھا۔ [2]

ہر نمازی کو چاہیے کہ وہ قیام اور رکوع کی حالت میں اپنے ٹخنے کو اپنے ساتھی کے ٹخنے کے ساتھ لگا دے تاکہ صفیں سیدھی اور برابر ہو جائیں اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ساری نماز میں ایک دوسرے کے ٹخنے آپس میں چمٹے رہیں، ہمارے ہاں اس سلسلہ میں کچھ غلو بھی کیا جاتا ہے کہ ٹخنے سے ٹخنا ملانے کے لیے حد سے زیادہ پاؤں کھول دیئے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے پاؤں پھیل جاتے ہیں کہ ساتھی کے کندھوں کے درمیان بہت فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے، ایسا کرنا خلاف سنت ہے۔ صف بندی میں مقصود یہ ہے کہ نمازیوں کے کندھے اور ٹخنے برابر ہوں اس طرح یہ بھی تفریط کی ایک صورت ہے کہ ہم دوران نماز صرف پاؤں کی انگلیاں ملاتے ہیں اور ٹخنوں کو ملانے کی زحمت نہیں کرتے، صف بندی کا تقاضا یہ ہے کہ صفیں سیدھی اور برابر ہوں اور صفیں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہوں، کندھے سے کندھا اور ٹخنے سے ٹخنا ملا ہوا ہو، اس کے لیے اپنے وجود کے مطابق پاؤں کھولنے چاہیے۔ (واللہ اعلم)

رکوع اور سجدہ میں تسبیحات کی تعداد

سوال رکوع میں سبحان ربی العظیم تین مرتبہ اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ تین مرتبہ، جس روایت میں ہے اس کے متعلق امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند متصل نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے عون بن عبداللہ ہیں جن کی ملاقات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے تو کیا رکوع اور سجدہ میں مندرجہ بالا تسبیحات پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ وضاحت فرمادیں۔

جواب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے۔ [3]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دعاؤں کو رکوع اور سجدے میں تین تین بار پڑھتے۔ [4] حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ﴾ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسے اپنے رکوع میں اختیار کرو۔'' (یعنی سبحان ربی العظیم رکوع میں پڑھو) اور جب ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے اپنے سجدہ میں اختیار کرو۔'' (یعنی سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھو) [5]

---

[1] صحیح بخاری، الاذان قبل حدیث: ۷۲۵۔ [2] صحیح بخاری الاذان: ۷۲۵۔

[3] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۷۷۲۔ [4] ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ: ۸۸۸۔

[5] ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ: ۸۸۷۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے متعلق واقعی امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سوال میں ذکر کردہ تبصرہ کیا ہے کہ اس کی سند متصل نہیں ہے۔ [1]

اس تبصرہ کے باوجود لکھتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر عمل ہے کہ سجدہ اور رکوع میں کم از کم تین تسبیحات ضرور کہتے ہیں لہٰذا اس سے کم تعداد اختیار نہ کرے۔ [2]

ان تسبیحات کے پڑھنے کے متعلق حضرت ابوبکر، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں جنہیں علامہ ہیثمی نے بیان کیا ہے۔ [3] مولانا عبیداللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں انفرادی طور پر کچھ کلام ہے تاہم کثرت طرق سے انہیں تقویت پہنچتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو مضبوط کر دیتی ہیں لہٰذا مجموعی طور پر قابل حجت ہیں اور مطلوب کے لیے دلیل بن سکتی ہیں۔ [4]

ہمارے رجحان کے مطابق سبحان ربی العظیم کو رکوع میں اور سبحان ربی الاعلیٰ کو سجدہ میں پڑھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کے حوالے سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے اور ان تسبیحات کی تعداد کم از کم تین ہونی چاہیے جیسا کہ دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے اور ترمذی کی روایت بھی کثرت طرق کی بناء پر حسن درجہ کی ہے اور اس پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

تحیۃ المسجد میں دعائے استخارہ پڑھنا

سوال بعض لوگ ہر روز نماز استخارہ پڑھنے کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں، کیا یہ عمل صحیح ہے؟ نیز تحیۃ المسجد اور صبح کی سنتوں میں دعائے استخارہ پڑھی جا سکتی ہے؟ قرآن وحدیث کی رو سے اس کی وضاحت کریں۔

جواب نماز استخارہ اس وقت مشروع ہے کہ جب انسان کوئی کام کرنا چاہے لیکن یہ واضح نہ ہو کہ یہ کام کرنا بہتر ہے یا اس کے نہ کرنے میں بھلائی ہے، ایسے حالات میں دعائے استخارہ کی جائے۔ جب یہ بات بالکل واضح ہو کہ اس کام کا کرنا یا نہ کرنا بہتر ہے تو پھر استخارہ کی ضرورت نہیں، اگر کسی انسان کو ہر روز کسی کام کے بارے میں یہ مشکل درپیش ہو تو ہر روز استخارہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس کے بغیر ہر روز استخارہ کرنے کو معمول بنانا سنت سے ثابت نہیں ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت سے کام سر انجام دیتے اور انہیں باضابطہ پروگرام کے تحت عمل میں لاتے لیکن ایسے کاموں کے لیے استخارہ کا عمل آپ سے ثابت نہیں ہے۔

واضح رہے کہ جو کام انسان کے ذمے ہیں، ان کے لیے استخارہ مشروع نہیں، مثلاً انسان اگر نماز پڑھنے یا زکوٰۃ دینے کا ارادہ کرے تو استخارہ کی کوئی ضرورت نہیں، اسی طرح انسان کے عام معمولات کے لیے بھی استخارہ فائدہ مند نہیں ہے جیسے کھانے، پینے یا سونے کا ارادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح بیٹے یا بیٹی کی شادی کے لیے استخارہ نہیں کرنا چاہیے البتہ ان کے انتخاب کے لیے استخارہ کیا جا سکتا ہے، نیز ماضی میں ہونے والے واقعات مثلاً چوری وغیرہ کی برآمدگی کے لیے استخارہ کرنا بھی درست نہیں ہے، ہمارے نزدیک ہر روز نماز استخارہ پڑھنے کا معمول بنانا محل نظر ہے، ہاں کسی معاملہ میں واقعی ضرورت ہے تو استخارہ کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] ترمذی، ابواب الصلوٰۃ:۲۶۱۔ [2] حوالہ مذکور۔

[3] مجمع الزوائد، ص:۱۲۸، ج۲۔ [4] مرعاۃ المفاتیح ص:۴۳۵، ج۲۔

تحیۃ المسجد یا صبح کی سنتوں کے بعد استخارہ کرنا بھی درست نہیں کیونکہ نماز استخارہ ایک مستقل نماز ہے جس کے لیے نیت کرنا ضروری ہے، چنانچہ حدیث میں ہے: ''جب کسی کو کوئی معاملہ درپیش ہو تو وہ فرض نماز کے علاوہ دو رکعت پڑھے۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ان دو رکعت پڑھنے کا مقصد استخارہ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہونا چاہیے، اس بنا پر ہمارا رجحان ہے کہ استخارہ کے لیے دو مستقل رکعات پڑھی جائیں، البتہ اگر کوئی انسان تحیۃ المسجد یا فجر کی سنت ادا کرنے سے پہلے استخارہ کی نیت کرے تو اس سے مسئلہ کا جواز کشید کیا جا سکتا ہے اگرچہ بہتر نہیں ہے، واضح رہے کہ دعائے استخارہ دو رکعت سے سلام پھیرنے کے بعد پڑھی جائے۔ (واللہ اعلم)

ہوائی جہاز میں نماز کا حکم؟

سوال ہوائی جہاز میں فرض نماز کے متعلق شریعت میں کیا ہدایات ہیں؟ کیا نماز مؤخر کر دی جائے یا اسی دوران سفر ہی میں پڑھ لی جائے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما دیں۔

جواب نماز میں دو چیزیں انتہائی ضروری ہیں، ایک قبلہ رخ ہونا اور دوسرا قیام۔ سواری پر نماز پڑھنے سے یہ دونوں چیزیں تقریباً مشکل ہوتی ہیں۔ البتہ دوران جنگ، استقبال قبلہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، اس طرح سفر میں نوافل سواری پر پڑھے جا سکتے ہیں، البتہ دونوں صورتوں میں بھی تکبیر تحریمہ کے وقت قبلہ رخ ہونا ضروری ہے، دوران سفر نوافل پڑھنے کے متعلق حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کرتے، جب دوران سفر نفل پڑھنے کا ارادہ کرتے تو اپنی اونٹنی کو قبلہ رخ کر لیتے پھر اللہ اکبر کہتے، اس کے بعد جس طرف بھی سواری منہ کر لیتی آپ نماز جاری رکھتے تھے۔ [2]

لیکن آپ سواری پر فرض نماز نہیں پڑھا کرتے تھے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر نفل پڑھ لیتے تھے جس طرف بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا رخ ہوتا اور اس پر وتر بھی پڑھ لیتے لیکن فرض نماز اس پر نہیں پڑھتے تھے۔'' [3]

ان احادیث میں صراحت ہے کہ سواری پر نوافل پڑھنے کی گنجائش ہے، ہاں اگر سواری ایسی ہو جس میں استقبالِ قبلہ اور قیام کی سہولت ہے تو اس سواری پر فرض نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے جیسا کہ ٹرین میں نماز کے لیے جگہ مخصوص ہوتی ہے، ہوائی جہاز میں بھی ایسا ممکن ہے، اس بناء پر ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے کے متعلق ہمارا مؤقف یہ ہے۔

☆ ہوائی جہاز میں نفل نماز اپنی سیٹ پر بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ ابتدا کرتے وقت اس کا رخ قبلہ کی طرف ہو، اس کے بعد اس کا رخ کسی بھی طرف ہو جائے۔ رکوع اور سجدہ اشارہ سے کر سکتا ہے۔

☆ فرض نماز ہوائی جہاز میں نہ پڑھے الا یہ کہ ساری نماز قبلہ رخ ہو کر ادا کرنا ممکن ہو اور قیام، رکوع وسجود بھی ممکن ہو۔ ان کی ادائیگی اگر نہ ہو سکے تو ہوائی جہاز میں فرض نماز نہ پڑھے۔

---

[1] صحیح بخاری، الدعوات: ۶۳۸۲۔ [2] ابو داود، الصلوٰۃ: ۱۲۲۵۔

[3] صحیح البخاری، الوتر: ۹۹۹۔

اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو نماز کو مؤخر کر دے اور ہوائی جہاز سے اترنے کے بعد اسے زمین پر ادا کرے تاکہ استقبالِ قبلہ اور قیام، رکوع وسجود کو صحیح طور پر ادا کر سکے، اگر ہوائی جہاز سے اترنے سے پہلے نماز کے وقت کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اسے دوسری نماز کی ساتھ جمع کر کے ادا کرے اور نماز کی شرائط، ارکان اور واجبات جس قدر ممکن ہو ادا کرے مثلاً اگر ہوائی جہاز غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے پرواز شروع کرے اور فضا میں ہی سورج غروب ہو جائے تو وہ نماز مغرب جہاز سے اترنے کے بعد ادا کرے اور اگر مغرب کا وقت ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو جہاز سے اترنے کے بعد مغرب کی نماز عشاء کی نماز کے ساتھ جمع کر کے پڑھ لے، واضح رہے کہ ہوائی جہاز میں مسافر کی نماز قصر ہو گی یعنی چار رکعت والی نماز کی صرف دو رکعات ادا کرنا ہوں گی، کیونکہ ہوائی جہاز کا سفر اتنا ضرور ہوتا ہے جس میں نماز قصر ادا کی جاتی ہے۔ (واللہ اعلم)

تورک کا اصل مقام

سوال تورک کیا ہوتا ہے، کیا اسے دوسرے تشہد میں کرنا چاہیے یا اس رکعت میں جہاں سلام پھیرنا مقصود ہو؟ قرآن و حدیث کے مطابق اس کی وضاحت کریں۔

جواب تشہد کے لیے بیٹھتے وقت بایاں پاؤں دائیں ران کے نیچے سے آگے بڑھانے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھنے پھر سرین پر بیٹھ جانے کو تورک کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جب آپ دو رکعت پڑھ کر بیٹھتے تو بایاں پاؤں زمین پر بچھا لیتے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھتے اور جب آپ آخری رکعت میں بیٹھتے تو بایاں پاؤں آگے بڑھا دیتے اور دایاں کھڑا رکھتے پھر سرین پر بیٹھ جاتے۔ [1]

علماء امت کا اس امر میں اختلاف ہے کہ تورک دوسرے تشہد میں کیا جائے یا اس تشہد میں جب سلام پھیرنا ہو خواہ وہ دو رکعت والی نماز میں ہو۔ ہمارا رجحان یہ ہے کہ تورک اس تشہد میں کیا جائے جب سلام پھیرنا ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تورک کا ذکر صرف اسی تشہد میں کیا گیا ہے جس میں سلام ہوتا ہے جیسا کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: حتیٰ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ سجدہ کرتے جس میں سلام ہے تو تورک کرتے۔ [2]

اس لیے تورک ہر اس تشہد میں کرنا چاہیے جس میں سلام پھیرنا مقصود ہو۔ (واللہ اعلم)

دوران نماز سلام کہنا

سوال کیا دوران جماعت نمازیوں کو سلام کہنا ضروری ہے؟ جبکہ ایسا کرنے سے خشوع متاثر ہوتا ہے ہمارے ہاں کچھ ساتھی جب جماعت کھڑی ہوتی ہے تو با آواز بلند سلام کہتے ہیں کچھ نمازی کہتے ہیں کہ جماعت کھڑی ہو تو سلام نہیں کہنا چاہیے اور نہ ہی اس کا جواب دینا چاہیے قرآن کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب دوران نماز انسان کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو نماز کا حصہ نہیں اور نہ ہی باہر سے آنے والے کو کوئی ایسا کام

---

[1] صحیح بخاری، الاذان: ۸۲۸۔ [2] ابو داود، الصلوٰۃ: ۷۳۰۔

کرنے کی اجازت ہے جس سے نمازی حضرات کا خشوع متاثر ہو لیکن بعض کام ایسے ہیں جو نماز کا حصہ نہ ہونے کے باوجود بھی دوران نماز کیے جا سکتے ہیں کیونکہ شریعت نے ان کی اجازت دی ہے، اس طرح کچھ کام ایسے ہیں کہ باہر سے آنے والا انہیں سر انجام دے سکتا ہے اگرچہ اس سے کسی حد تک نمازی کا خشوع متاثر ہوتا ہے۔ ان میں سلام کا کہنا اور اس کا مخصوص انداز سے جواب دینا بھی ہے، واضح رہے کہ نماز سے متعلقہ احکام کی تکمیل کئی ایک مراحل میں ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلے دوران نماز باہر سے آنے والوں کو سلام کہنے اور نمازیوں کو اس کا جواب دینے کی اجازت تھی، لیکن بعد میں اجازت کو ختم کر دیا گیا چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھ رہے ہوتے تو ہم آپ کو سلام کہتے اور آپ اس کا دوران نماز جواب بھی دیتے تھے لیکن جب ہم حبشہ کے فرمانروا حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ کے پاس سے واپس مدینہ آئے تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حسب معمول دوران نماز سلام کہا لیکن آپ نے اس کا جواب نہ دیا۔ میرے دل میں اس سے متعلق طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو میں نے اس کے متعلق آپ سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ''نماز میں مصروفیت ہوتی ہے۔'' ❶

ایک روایت میں ہے کہ جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہا تو آپ نے میری طرف اشارہ فرمایا۔ ❷

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران نماز سلام کہا جا سکتا ہے لیکن ایسا کرنا ضروری نہیں ہے کہ اگر نہ کہا جائے تو کسی فرض کا تارک قرار پائے گا، اس لیے باہر سے آنے والے کو چاہیے کہ وہ اگر سلام کہنا چاہتا ہے تو باآواز بلند سلام ''پھینکنے'' کی بجائے نہایت شائستگی سے سلام کہے، نماز میں مصروف انسان کے لیے اس کا جواب کہنا دو طرح سے جائز ہے۔

❶ نماز سے فراغت کے بعد زبان سے اس کا جواب دے دے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوران نماز سلام کہا تو آپ نے فراغت کے بعد اس کا جواب دیا اور اس کے ساتھ ساتھ وضاحت بھی کر دی۔ ❸

❷ دوران نماز اپنے ہاتھ کے اشارہ سے بھی جواب دیا جا سکتا ہے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ مسجد قباء تشریف لے گئے وہاں آپ نے نماز پڑھی تو وہاں مقیم انصاری حضرات دوران نماز آپ کو سلام کرنے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ تھے، اس لیے میں نے ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سلام کا جواب کیسے دیتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ آپ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے۔ ❹

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے بھی یہی سوال کیا تھا تو انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔ ❺

---

❶ صحیح مسلم، المساجد: ۱۲۰۱۔ ❷ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۰۵۔
❸ ابوداود، الصلوٰۃ: ۹۲٤۔ ❹ ابن ماجه، اقامة الصلوٰت: ۱۰۱۷۔
❺ جامع الترمذی، الصلوٰۃ: ۳٦۸۔

جبکہ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ پھیلا کر وضاحت فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوران نماز اس طرح جواب دیتے تھے۔ ❶

دراصل شریعت بعض اوقات کسی انسان کی حسن نیت کے پیش نظر اس کے کسی عمل کو افضل ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف جواز کی حد تک گوارا کر لیتی ہے۔ اس لیے ایسے اعمال کو مسنون ہونے کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، جیسا کہ آدمی نے دوران جماعت رکوع سے اٹھ کر باآواز بلند ''کلمات تحمید'' ادا کیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اخلاص کے پیش نظر اس کی تحسین فرمائی لیکن خود اس پر عمل نہیں کیا اور نہ ہی دوسروں کو یہ عمل بجالانے کی تلقین فرمائی، دوران جماعت سلام کہنا بھی اسی قبیل سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں کم از کم تین مرتبہ دورانِ جماعت نماز میں شامل ہوئے ہیں لیکن آپ کا نمازیوں کو سلام کہنا کسی روایت سے ثابت نہیں ہے، اگر یہ افضل عمل ہوتا تو آپ اسے ضرور بجالاتے، اسی طرح اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے جواز کی حد تک برقرار رکھا ہے۔ پھر آپ کے جواب دینے کی جو دو صورتیں ہیں اس سے بھی اس کا افضل ہونا ثابت نہیں صرف جواز ثابت ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنا

سوال ہمارے معاشرہ میں کچھ بزرگ فجر کی سنت ادا کرنے کے بعد دائیں پہلو پر لیٹنے کا اہتمام کرتے ہیں، جبکہ نوجوان نسل میں یہ اہتمام متروک ہوتا جا رہا ہے، اس کی حیثیت پر روشنی ڈالیں۔

جواب فجر کی سنتوں کے بعد دائیں پہلو پر لیٹنا ایک مستحب عمل ہے ضروری نہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں دو عنوان قائم کیے ہیں پہلا عنوان یہ ہے کہ ''فجر کی سنتوں کے بعد دائیں پہلو پر لیٹنا'' اسے ثابت کرنے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دو رکعتیں پڑھ لیتے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔ ❷

دوسرا عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جو شخص سنتوں کے بعد گفتگو کرے اور لیٹنے کا اہتمام نہ کرے'' اس کے لیے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کردہ ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دو سنت پڑھ لیتے تو اگر میں بیدار ہوتی تو میرے ساتھ محو گفتگو ہوتے بصورت دیگر آپ لیٹ جاتے تاآنکہ جماعت کا وقت ہو جاتا۔ ❸

ان روایات کی روشنی میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے کہ فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنا ضروری نہیں ہے، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ امر ثابت ہے اس لیے اس کا اہتمام کرنا استحباب کا درجہ رکھتا ہے اور باعث ثواب ہے۔ بعض مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم بھی دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی فجر کی دو سنتیں پڑھ لے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹے۔ ❹

اس امر کے پیش نظر بعض ائمہ کرام نے سنتوں کے بعد لیٹنے کے عمل کو واجب قرار دیا ہے لیکن یہ موقف محل نظر ہے، ہمارے نزدیک یہ عمل مستحب ہے اگرچہ بعض مقامات پر اس عمل کو چھوڑ دیا گیا ہے جسے دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس سلسلہ میں

---

❶ ابوداود، الصلوٰۃ: ۹۲۷۔ ❷ صحیح بخاری، التہجد: ۱۱۶۱۔

❸ صحیح بخاری، التہجد: ۱۱۶۱۔ ❹ مسند امام احمد، ص: ۴۱۵، ج۲۔

تشدد کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

کیا نماز اشراق یا نماز چاشت بدعت ہے؟

سوال نماز اشراق یا نماز چاشت کی کیا حیثیت ہے؟ کچھ صحابہ کرام نے اسے بدعت قرار دیا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب نماز چاشت وہ نماز ہے جو طلوع آفتاب کے بعد ادا کی جاتی ہے اسے نماز اشراق اور صلوٰۃ اوابین بھی کہا جاتا ہے یہ نماز شرعاً مشروع ہے اور بڑی اہمیت کی حامل ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں کی وصیت کی تھی پہلی یہ کہ ہر ماہ تین دن کے روزے رکھنا، دوسری چاشت کی دو رکعت ادا کرنا اور تیسری یہ کہ سونے سے پہلے وتر پڑھ لینا۔ [1]

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت کو بایں طور پر اجاگر فرمایا، آپ فرماتے ہیں تم میں سے ہر ایک کے لیے صبح صبح تمام جوڑوں کا صدقہ ادا کرنا ضروری ہے، ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تحمید صدقہ ہے، ہر تکبیر صدقہ ہے، اچھی بات کا حکم دینا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے، ان تمام صدقات سے نماز چاشت کی دو رکعت کفایت کر جاتی ہیں۔ [2]

یہ تمام احادیث صلوٰۃ چاشت کی مشروعیت کی واضح دلیل ہیں، اس لیے اسے بدعت قرار دینا صحیح نہیں ہے، البتہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اسے بدعت کہا تھا، ممکن ہے کہ انہیں مشروعیت کی احادیث نہ پہنچی ہوں یا وہ لوگ کسی خاص حیثیت پر ادا کرتے ہوں جسے دیکھ کر آپ نے اسے بدعت قرار دیا ہے، بہرحال نماز چاشت اور اشراق مشروع ہے اور ایک مستحب عمل ہے، ہمیں کوشش کر کے اس کا اہتمام کرنا چاہیے، اس کی کم از کم دو رکعت ہیں اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعت پڑھنا ثابت ہے، جیسا کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر میں ادا کی تھیں۔ [3]

اہل خانہ کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنا

سوال ہم میاں بیوی اور بچے رات دیر سے اپنے گھر واپس آئیں، اگر گھر میں نماز باجماعت ادا کرنا ہو تو بیوی کو اپنے ساتھ کھڑا کیا جائے اور بچے پیچھے کھڑے ہوں یا کوئی اور صورت ہے؟ اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں ہمیں آگاہ کریں۔

جواب گھر میں نماز باجماعت ادا کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے، خاص طور پر جن خواتین وحضرات پر مسجد میں جانا ضروری نہیں وہ ضرور اس کی پابندی کریں، متعدد افراد کے لحاظ سے نماز باجماعت کی کئی ایک صورتیں ممکن ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اکیلا آدمی بھی جماعت سے نماز ادا کر سکتا ہے خواہ وہ خاتونِ خانہ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایک حدیث سے اس کا اشارہ ملتا ہے

---

[1] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۸۱۔ [2] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۷۲۰۔

[3] صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۳۵۷۔

کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوصعصعہ انصاری رضی اللہ عنہ کو کہا تھا کہ تو جنگل میں اپنی بکریوں کے پاس رہنا پسند کرتا ہے، اگر تو نماز کے لیے اذان کہے تو اپنی آواز کو اذان دیتے ہوئے خوب اونچا کرو، جہاں تک تیری آواز جائے گی وہاں کی ہر چیز تیرے لیے گواہی دے گی۔ 1 اس حدیث سے اشارہ ملتا ہے کہ اکیلا آدمی بھی نماز باجماعت ادا کرسکتا ہے۔

☆ اگر امام کے ساتھ کوئی دوسرا آدمی ہے تو امام کو چاہیے کہ اسے اپنی دائیں جانب کھڑا کرے وہ خواہ بچہ ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو رات کے وقت اپنی دائیں جانب کھڑا کرکے نماز باجماعت ادا کی تھی۔ 2

اگر امام کے علاوہ دو یا اس سے زیادہ مقتدی ہوں تو امام انہیں اپنے پیچھے کھڑا کرے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے دائیں جانب کھڑا کیا پھر ایک دوسرا شخص آ گیا تو وہ آپ کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو دھکیل کر اپنے پیچھے کھڑا کرلیا۔ 3

البتہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ دو مقتدیوں کو اپنے دائیں بائیں کھڑا کرلیتے تھے۔ 4 لیکن یہ موقوف روایت ہے جسے مرفوع حدیث کے مقابلہ میں مرجوح قرار دیا جائے گا۔

☆ اگر مقتدیوں میں کوئی عورت بھی ہے تو وہ مردوں کے پیچھے کھڑی ہوگی اگرچہ وہ اکیلی ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے ایک مرتبہ اپنے گھر میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی تو میں اور ایک دوسرا شخص رسول اللہ ﷺ کے پیچھے تھے اور ہماری والدہ ام سلیم ہم سب کے پیچھے تھیں۔ 5

صورت مسئولہ میں عورت امام کے پیچھے ہی کھڑی ہوگی خواہ اکیلی ہو یا اس کی ہمراہ بچے بھی ہوں وہ کسی صورت میں مردوں کے برابر کھڑی نہیں ہوسکتی۔ (واللہ اعلم)

امام کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو آگے کرنا

سوال ایک عالم دین کسی مسجد میں مستقل طور پر امام اور خطیب ہیں، لیکن مسجد کی انتظامیہ ان کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے عالم دین کو جمعہ کے لیے منبر پر اور نماز کے لیے مصلیٰ پر کھڑا کر دیتی ہے، کیا ایسا کرنا قرآن وحدیث کی رو سے جائز ہے؟

جواب ہمارے ہاں ایسے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونے چاہئیں، اگر امام یا خطیب نے کہیں جانا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ قبل از وقت انتظامیہ کو مطلع کرے تاکہ وہ کوئی متبادل بندوبست کرسکیں اور اگر انتظامیہ نے کسی کو دعوت دینی ہے تو اس کے متعلق امام یا خطیب سے ضرور مشورہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے اوقات کو مصروف کرلے، لیکن اکثر وبیشتر اس سلسلہ میں ہم لوگ افراط وتفریط کا شکار ہیں، کچھ خطباء ایسے خودسر ہوتے ہیں کہ انتظامیہ کو اطلاع دیئے بغیر اپنا جمعہ کسی دوسرے مقام پر دے دیتے ہیں اور کسی مقام پر انتظامیہ پر دولت کا بھوت سوار ہوتا ہے وہ امام یا خطیب کو غلام اور نوکر خیال کرتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں کسی دوسرے کو منبر پر بیٹھا دیتے ہیں یا مصلیٰ جماعت پر کھڑا کر دیتے ہیں، جبکہ امام یا خطیب کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا، ہمارے

---

1 صحیح بخاری، الاذان: ۶۰۹۔ 2 صحیح بخاری، الاذان: ۷۲۸۔ 3 صحیح مسلم، الزھد: ۳۰۱۰۔
4 بیہقی، ص: ۸۳، ج۲۔ 5 صحیح البخاری، الاذان: ۷۲۷۔

رجحان کے مطابق خطیب یا امام مسجد کا سربراہ اور مسجد اس کا گھر ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کوئی آدمی کسی آدمی کے دائرہ اقتدار میں امامت نہ کرائے۔'' (1)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ کسی آدمی کے گھر میں یا اس کے دائرہ اقتدار میں کوئی دوسرا امامت نہ کرائے۔ (2)

ہاں اگر امام یا خطیب سے اجازت لے لی جائے تو دوسرا شخص خطبہ دے سکتا ہے اور امامت بھی کرا سکتا ہے جیسا کہ بعض روایات میں اس کی صراحت ہے کہ مالک خانہ کی اجازت سے کوئی دوسرا امامت کرا سکتا ہے، حدیث میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا مہمان ہے تو ان کی امامت نہ کرائے بلکہ ان (مقامی لوگوں) میں سے ہی کوئی ان کی امامت کرائے۔ (3)

ہاں اگر مہمان آدمی اہل علم اور صاحب فضل لوگوں میں سے ہے تو امام راتب کے لیے اخلاقی اعتبار سے بہتر ہے کہ وہ اسے امامت یا خطابت کی دعوت دے اور اسے آگے کرے، بہر حال ایسے مسائل افہام وتفہیم کے ذریعے حل ہونے چاہئیں ہر ایک کو دوسرے کی قدر شناسی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

رسول اللہ ﷺ کا اذان دینا

سوال کیا رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی زندگی میں اذان کہی تھی؟ اگر کہی تھی تو کب اور کس موقع پر؟ اگر نہیں کہی تو کیوں؟ اولین فرصت میں جواب ارشاد فرمائیں۔

جواب کسی کام کو دین اسلام کا ضابطہ بننے کے لیے یہی کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہو یا اس کے متعلق ترغیب دلائی ہو، اس پر عمل کر کے دکھانا ضروری نہیں ہے مثلاً نمازِ تسبیح کے متعلق آپ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ترغیب دلائی لیکن اس کا خود پڑھنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے، نماز کے لیے اذان دینے کا بھی یہی معاملہ ہے، رسول اللہ ﷺ سے اس عمل کی ترغیب تو ثابت ہے لیکن آپ نے خود اس پر عمل نہیں کیا، بلکہ مختلف مقامات پر اپنے جانثاروں میں سے کسی کو اذان کے لیے تعینات فرمایا، چنانچہ مدینہ طیبہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور مکہ مکرمہ میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اس عمل کے لیے مامور تھے، البتہ بعض ضعیف روایات میں اس امر کی تصریح ہے کہ دوران سفر، بارش کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اذان دی تھی جیسا کہ درج ذیل روایت میں اس کی وضاحت ہے: ''حضرت یعلیٰ بن مرہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کی ہمراہ تھے، ہم ایک تنگ مقام پر پہنچے جہاں نماز کا وقت آ گیا، اس وقت اوپر سے بارش برسنے لگی اور نیچے کیچڑ تھا، ایسے حالات میں رسول اللہ ﷺ نے سواری پر اذان دی اور اقامت کہی پھر آپ سواری پر ہی آگے بڑھے اور ساتھیوں کو اشارہ سے نماز پڑھائی، اس دوران سجدہ کے لیے رکوع سے زیادہ جھکتے تھے۔'' (4)

امام ترمذی نے ایک راوی عمر بن رباح البلخی کی وجہ سے اس روایت کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، بلکہ امام بیہقی نے صراحت کی ہے کہ مذکورہ روایت کمزور ہے۔ (5) محدثین کرام نے صراحت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اذان نہیں دی تھی

---

(1) صحیح مسلم، المساجد: ۶۷۳۔ (2) ابو داود، الصلوۃ: ۵۸۲۔

(3) مسند امام احمد، ص:۴۳۶، ج۳۔ (4) جامع ترمذی، الصلوٰۃ: ۴۱۱۔ (5) بیہقی، ص:۷، ج۲۔

بلکہ کسی دوسرے مؤذن کو اذان کہنے کا حکم دیا تھا، حکم دینے کی بناء پر بعض راویوں نے اس عمل کو آپ کی طرف منسوب کر دیا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مؤذن کو حکم دیا تو اس نے اذان کہی یا صرف تکبیر کہنے پر اکتفا کیا۔ [1]

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اذان دینا کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے کتب حدیث میں صرف یہی ایک روایت ہے لیکن اس کی سند قابل حجت نہیں۔ (واللہ اعلم)

''صلوٰۃ الاوّابین'' کا وقت

سوال صلوٰۃ الاوّابین کے متعلق وضاحت فرمائیں کہ اس کا وقت کونسا اور اس کی رکعات کتنی ہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا وقت مغرب اور عشاء کے درمیان ہے جبکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ صلوٰۃ اشراق کو ہی صلوٰۃ الاوّابین کہا گیا ہے، اس کے متعلق تفصیل سے لکھیں۔

جواب بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''صلوٰۃ الاوابین'' ایک مستقل نفلی نماز ہے جو مغرب کے بعد عشاء سے پہلے پڑھی جاتی ہے اس سلسلہ میں درج ذیل دو روایات پیش کی جاتی ہیں۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''صلوٰۃ الاوابین'' جب نمازی اپنی نماز مغرب سے فارغ ہوں تو اس وقت سے لے کر نماز عشاء سے پہلے تک ادا کی جاتی ہے۔ [2]

سند کے اعتبار سے یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں ایک راوی موسیٰ بن عبیدۃ ہے جسے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے نیز امام ابن معین، علی بن مدینی، ابوزرعہ اور امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ [3]

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے کہ فرشتے ان لوگوں کو گھیر لیتے ہیں جو مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں اور یہی ''صلوٰۃ الاوابین'' ہے۔ [4]

لیکن یہ روایت بھی قابل حجت نہیں ہے کیونکہ امام بغوی نے اس روایت کو ''صیغہ تمریض'' سے بیان کیا ہے جو اس روایت کے ضعیف ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے، اس لیے نماز مغرب کے بعد صلوٰۃ الاوابین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے بلکہ احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صلوٰۃ الضحیٰ کو ہی صلوٰۃ الاوابین کہا گیا ہے جیسا کہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صلوٰۃ الاوابین اس وقت پڑھی جاتی ہے جب اونٹ کے بچوں کے پاؤں جلنے لگیں۔'' [5]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت اس سلسلہ میں نص صریح کی حیثیت رکھتی ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مسند امام احمد، ص:۱۷۳، ج۴۔ [2] مصنف ابن ابی شیبہ، ص:۱۹۷، ج۲۔
[3] تہذیب، ۳۱۹، ج۱۰۔ [4] شرح السنۃ، ص:۴۷٤، ج۳۔
[5] صحیح مسلم، الصلوٰۃ: ۱٤٤۔

نے فرمایا: ''نماز ضحیٰ کی حفاظت اواب یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہی کر سکتا ہے پھر فرمایا کہ یہی صلوٰۃ الاوابین ہے۔'' [1]
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے خلیل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین کاموں کی وصیت فرمائی تھی میں انہیں کسی حالت میں چھوڑنے والا نہیں ہوں وتر پڑھے بغیر نیند نہ کروں، صلوٰۃ ضحیٰ کی دو رکعت ترک نہ کروں کیونکہ یہ صلوٰۃ الاوابین ہے اور ہر ماہ تین روزے رکھوں۔ [2] صلوٰۃ ضحیٰ کی دو، چار اور آٹھ رکعت ثابت ہیں، جس قدر وقت میسر آئے پڑھ لی جائیں۔
واضح رہے کہ صلوٰۃ ضحیٰ کا دوسرا نام صلوٰۃ اشراق ہے، وقت کے اعتبار سے اس کے دو الگ الگ نام ہیں یعنی اگر سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد ادا کریں تو صلوٰۃ الاشراق اور اگر سورج اچھی طرح بلند ہو جائے اور دھوپ میں اس قدر شدت آ جائے کہ پاؤں جلنے لگیں لیکن زوال سے قبل پڑھیں تو اسے صلوٰۃ ضحیٰ کہا جاتا ہے اسے محدثین نے ضحوۃ صغریٰ اور ضحوۃ کبریٰ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

تحیۃ المسجد ترک کرنا

سوال کچھ لوگ مسجد میں آتے ہیں تو جماعت کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں، کیا اس طرح تحیۃ المسجد کی دو رکعات ترک کر دینا جائز ہے؟

جواب تحیۃ المسجد کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی مسجد میں آئے تو دو رکعت ادا کیے بغیر وہ نہ بیٹھے، اس حدیث کے پیش نظر نمازی کو تحیۃ المسجد ادا کرنا چاہیے، اگر اس نے جماعت سے پہلے سنت وغیرہ پڑھ لی ہیں تو تحیۃ المسجد اس سے ادا ہو جائیں گے، اگر جماعت کے لیے تھوڑا سا وقت باقی ہو کہ اس میں تحیۃ المسجد ادا نہ کیے جا سکتے ہوں تو مسجد میں آ کر کھڑے رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر معلوم نہ ہو کہ امام کب آئے گا تو تحیۃ المسجد شروع کر دے پھر اگر امام آ جائے اور جماعت کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو تحیۃ المسجد کو ختم کر کے جماعت میں شامل ہو جائے بصورت دیگر اسے پورا کرے بہرحال مسجد میں آنے کے بعد اگر دو رکعت ادا کرنے کا وقت ہو تو کھڑے رہنا اچھا نہیں ہے بہتر ہے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر باوقار طریقہ سے بیٹھ جائے۔ (واللہ اعلم)

دوڑ لگا کر جماعت میں شامل ہونا؟

سوال اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کچھ نمازی رکعت پانے کے لیے دوڑ لگاتے ہیں، ایسا کرنا انسانی وقار کے خلاف معلوم ہوتا ہے، کیا رکعت پانے کے پیش نظر انسان دوڑ کر جماعت میں شامل ہو سکتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب جماعت میں شمولیت کے لیے جلدی کرنا اور تیز چل کر آنا ایک اچھی عادت ہے لیکن تیز دوڑ کر بھاگتے ہوئے آنا ممنوع ہے، اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم بھاگ کر مت آؤ بلکہ سکون و وقار کے ساتھ چل کر آؤ، نماز کا جو حصہ پالو اسے پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اسے مکمل کر لو۔'' [3]

---

[1] مستدرك حاكم، ص:٦٢٢، ج١۔ [2] مسند امام احمد، ص:٤١٢، ج٣۔
[3] صحيح بخاري، الجمعه:١٩٠٨۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

''نماز کی طرف بھاگ کر نہ آئے بلکہ سکون ووقار کے ساتھ جماعت میں شمولیت کرے۔'' [1]

البتہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ ایسی تیز رفتاری میں کوئی حرج نہیں جو معیوب نہ ہو اور نہ انسانی وقار کے منافی ہو، ہمارے رجحان کے مطابق سکون ووقار کے ساتھ آنا اور جلد بازی نہ کرنا افضل ہے، خواہ اس کی رکعت ہی فوت ہو جائے۔ حدیث کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔

فوت شدہ نماز کی قضا

سوال ہمارے والد محترم دو دن تک بے ہوش رہے، اس دوران انہیں کسی چیز کا شعور نہیں تھا، کیا ان پر فوت شدہ نمازوں کی قضا ضروری ہے؟ کتاب وسنت کے مطابق وضاحت کریں۔

جواب جو شخص بے ہوش رہا اور اسے کسی چیز کا شعور نہیں تھا تو اس پر کچھ بھی واجب نہیں ہے، البتہ جن عبادات کا تعلق اس کے مال سے ہے وہ ادا کرنا ہوں گی اور بدنی عبادتیں مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ ایسے شخص سے ساقط ہیں، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ پر ایک دن رات بے ہوشی طاری رہی تو انہوں نے اس دوران فوت ہونے والی نمازوں کی قضا نہیں دی تھی۔ [2]

البتہ بے ہوش آدمی کے مال سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی، اس کی ادائیگی ضروری ہے، ہمارے نزدیک اگر بے ہوشی، بغیر سبب کے ہو تو بدنی عبادات ساقط ہو جاتی ہیں اور اگر اس کا کوئی سبب ہو مثلاً شراب نوشی یا بھنگ وغیرہ کے استعمال سے بے ہوشی طاری ہو تو اس قسم کی بے ہوشی میں نمازیں ساقط نہیں ہوں گی۔ بلکہ اس دوران فوت شدہ نمازوں کی قضا ضروری ہے، سوئے ہوئے انسان کو بے ہوش قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ سوئے ہوئے انسان میں ادراک ہوتا ہے اگر اسے بیدار کیا جائے تو وہ بیدار ہو سکتا ہے لیکن بے ہوش انسان میں ادراک نہیں ہوتا کہ اگر اسے بیدار کیا جائے تو وہ بیدار نہیں ہو سکتا، سوئے ہوئے انسان کے متعلق ارشاد نبوی ہے:

''جو شخص نماز بھول جائے یا اس سے سو یا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے جب یاد آئے تو پڑھ لے۔'' [3]

اس لیے بے ہوش انسان سے نماز ساقط ہے اور سوئے ہوئے کے ذمے واجب الاداء ہے۔ (واللہ اعلم)

جان بوجھ کر نماز دیر سے پڑھنا

سوال ہمارے ایک نمازی، دیر سے نماز پڑھتے ہیں اور تکبیر کہہ کر اکیلے ہی جماعت کراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے نماز باجماعت کا ثواب ملتا ہے، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کوئی وضاحت ہے، براہِ کرام ہماری اس سلسلہ میں راہنمائی کریں۔

جواب نمازی کو چاہیے کہ وہ باجماعت نماز ادا کرے اور اسے معمول بنائے، اگر کبھی دیر سے آئے تو اکیلا بھی پڑھ سکتا ہے اور نمازیوں میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائے تو نماز باجماعت کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحیح بخاری، الاذان، باب:۲۱۔ [2] مصنف عبدالرزاق، ص:۴۷۹، ج۲۔

[3] صحیح بخاری، المواقیت: ۵۹۷۔

نے ایک آدمی کو اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو اس پر صدقہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ نماز پڑھ لے۔'' [1] ایک روایت میں ہے کہ نمازیوں میں سے ایک آدمی اس کے ساتھ کھڑا ہوا پھر انہوں نے نماز باجماعت ادا کی۔ [2] اکیلے آدمی کا نماز باجماعت ادا کرنا اس کے متعلق ایک حدیث بیان کی جاتی ہے جسے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارا پروردگار بکریاں چرانے والے پر تعجب کرتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر رہ کر اذان دیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے کو دیکھو جو نماز کے لیے اذان دیتا ہے اور اقامت کہتا ہے نیز وہ مجھ سے ڈرتے ہوئے یہ کام کرتا ہے تم گواہ رہو کہ میں نے اسے بخش دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔'' [3]

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص سفر میں ہو تو اذان دے کر اقامت کہہ کر امام کی طرح نماز پڑھے تو اس کے لیے اجر و ثواب ہے، اس روایت کو بنیاد بنا کر اکیلے آدمی کے لیے گنجائش ہے کہ وہ امام کی طرح نماز پڑھ لے لیکن اسے معمول بنانا اچھا نہیں کہ وہ ہر روز جماعت کے بعد آئے اور نماز باجماعت کا اہتمام ''خود'' ہی کرے۔ (واللہ اعلم)

شرعی عذر کی وجہ سے نماز باجماعت ترک کرنا

سوال ایک آدمی مسجد میں آیا اور اسے قضاء حاجت بھی کرنا تھی، کیا وہ حاجت روک کر نماز باجماعت ادا کرے یا قضاء حاجت کے لیے نماز باجماعت کو چھوڑ دے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب نماز باجماعت ادا کرنا فرض ہے، لیکن کسی شرعی عذر کی بناء پر نماز باجماعت کو ترک کیا جا سکتا ہے جس انسان کو قضاء حاجت کی ضرورت ہے، اسے چاہیے کہ وہ پہلے قضاء حاجت سے فارغ ہو جائے پھر وضو کر کے نماز ادا کرے خواہ اس دوران اس کی جماعت فوت ہو جائے کیونکہ یہ نماز باجماعت ادا نہ کرنے کے لیے ایک شرعی عذر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''کھانے کی موجودگی میں نماز نہیں ہوتی اور نہ اس وقت نماز ہوتی ہے جب اسے قضاء حاجت کا معاملہ درپیش ہو۔'' [4]

اس حدیث کے پیش نظر مذکورہ شخص کو چاہیے کہ پہلے وہ قضاء حاجت سے فارغ ہو، اس کے بعد وہ نماز ادا کرے، اس دوران اگر جماعت فوت ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سفر کی رخصتیں

سوال دورانِ سفر کون سی رخصتوں کو عمل میں لانا چاہیے، کیا سفر میں نوافل وغیرہ ادا کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے متعلق ذرا تفصیل سے آگاہ کریں؟

جواب ہمارے علم کے مطابق سفر کی پانچ رخصتیں ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: ❶ چار رکعات والی نماز قصر کرنا یعنی ان کی دو رکعات ادا کرنا۔ ❷ رمضان کے روزے نہ رکھنا اور دوسرے دنوں میں ان کی تعداد کے مطابق روزوں کی قضا دینا۔

---

[1] ابوداود، الصلوٰۃ: ۵۷٤۔ [2] صحیح ابن خزیمہ، ص: ٦٤، ج۳۔
[3] ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۲۰۳۔ [4] صحیح مسلم، المساجد: ۵٦۰۔

❸ موزوں پر تین دن اور تین رات تک مسح کرنا۔ ❹ ظہر، مغرب اور عشاء کی سنن مؤکدہ کو ترک کرنا۔ ❺ نماز ظہر اور عصر کو اسی طرح نماز مغرب اور عشاء کو جمع کر کے ادا کرنا۔

دوران سفر نوافل کی ادائیگی پر کوئی قدغن نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ سے نماز چاشت دوران سفر پڑھنا ثابت ہے، اس طرح فجر کی دو سنتیں، وضو کی سنتیں، مسجد میں داخل ہونے کی دو رکعات اور سفر سے واپسی کی دو رکعات بھی پڑھی جا سکتی ہیں، اسی طرح دیگر نوافل بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ (واللہ اعلم)
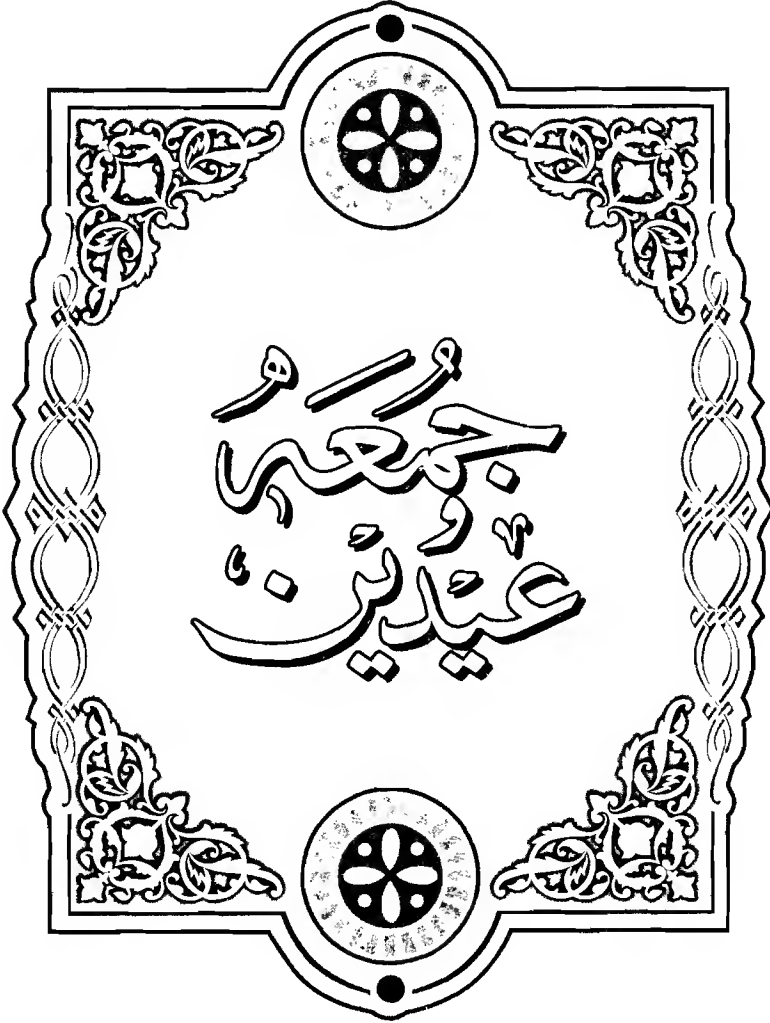
جمعہ و عیدین

دوران خطبہ مسجد میں آنا

سوال اگر کوئی جمعہ کے دن دوران خطبہ آئے تو اسے کیا کرنا چاہیے، بیٹھ کر خطبہ سنے یا سنت ادا کرے، اگر سنت ادا کرے تو کتنی پڑھے؟

جواب دوران خطبہ آنے والے نمازی کو چاہیے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا: ''اگر تم میں سے کوئی جمعہ کے دن آئے، جب امام جمعہ کے لیے کھڑا ہو چکا ہو تو وہ شخص دو رکعت پڑھے۔'' [1]

اگر دو رکعت پڑھے بغیر بیٹھ جائے تو پھر بھی چاہیے کہ وہ کھڑا ہو کر دو رکعت نماز ادا کرے پھر خطبہ سننے کے لیے بیٹھ جائے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور خطبہ سننے کے لیے بیٹھ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تو نے نماز پڑھی ہے؟ اس نے عرض کیا جی نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اٹھو، دو رکعت ادا کرو۔'' [2]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ دوران خطبہ آنے والے کو چاہیے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے، اگر بے خیالی میں بیٹھ جائے تو کھڑا ہو کر دو رکعت ادا کرے پھر خطبہ سنے۔ (واللہ اعلم)

عید گاہ میں منبر لے جانا

سوال عید گاہ میں منبر لے جانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر مسجد میں عید پڑھنے کا اہتمام کیا جائے تو کیا ایسی صورت میں منبر استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب سنت یہ ہے کہ عیدین کی نماز کھلے میدان میں ادا کی جائے، کھلے میدان میں عیدین کی نماز ادا کرنے سے دین کے شعائر کا اظہار ہوتا ہے نیز اسلام اور اہل اسلام کا رعب طاری ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی روایت میں نہیں آیا کہ آپ نے عذر کے بغیر مسجد میں عیدین کی نماز ادا کی ہو، کھلے میدان میں منبر کے بغیر عیدین کا خطبہ دیا جائے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''عید گاہ کی طرف منبر کے بغیر جانا۔''

پھر آپ نے ایک حدیث سے عنوان کو ثابت کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید کی ادائیگی کے بعد اپنا

---

[1] صحیح مسلم، الجمعه: ۸۷۵۔ [2] صحیح بخاری، الجمعة: ۹۳۱۔

رخ پھیرتے اور لوگوں کے بالمقابل کھڑے ہو جاتے۔ [1]

یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ عید کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر استعمال نہیں کیا، البتہ ابن حبان کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر خطبہ ارشاد فرمایا [2] علامہ ہیثمی نے اس روایت کے رجال کو ''صحیح کے رجال'' کہا ہے۔ [3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سواری پر بیٹھ کر خطبہ دیا جا سکتا ہے، عید گاہ میں منبر لے جانا، مروانی سنت ہے چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عیدین کے متعلق معاملہ اسی طرح برقرار رہا حتی کہ میں ایک دفعہ مروان کے ہمراہ عید گاہ گیا تو میں نے وہاں ایک منبر بنا ہوا دیکھا ہے جسے کثیر بن صلت نے تیار کیا تھا، مروان نماز پڑھنے سے قبل اس پر چڑھنے لگا تو میں نے اس کے کپڑے پکڑ کر نیچے کھینچنا چاہا لیکن وہ مجھ پر غالب آ گیا اور منبر پر چڑھ کر نماز عید سے پہلے خطبہ دینے لگا، میں نے اسے کہا کہ تم لوگوں نے دینی معاملات کو تبدیل کر دیا ہے۔ [4] بہر حال عید گاہ میں منبر لے جانا مسنون نہیں ہے اگر کسی مجبوری کی وجہ سے مسجد میں نماز عید پڑھنی پڑے تو سنت کی پاسداری کرتے ہوئے منبر کو استعمال نہ کیا جائے، منبر کے بغیر ہی خطبہ دیا جائے، البتہ سہارے کے لیے کسی چیز کو استعمال کیا جا سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا سہارا لیا تھا، حدیث کے الفاظ ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ سے پہلے اذان اور اقامت کے بغیر نماز پڑھائی اور پھر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا، تقویٰ کا حکم دیا اور اطاعت کرنے کی تلقین کی۔'' [5]

بہر حال عیدین کی نماز کھلے میدان میں ادا کی جائے اور خطبہ کے لیے منبر استعمال نہ کیا جائے، اگر کسی مجبوری کے پیش نظر مسجد میں نماز عید ادا کرنی پڑے تو بھی منبر استعمال نہ کیا جائے تا کہ سنت کی خلاف ورزی نہ ہو۔ (واللہ اعلم)

عید گاہ میں عید سے پہلے اشراق کی نماز پڑھنا

سوال بعض لوگ عید گاہ میں نماز عید سے پہلے اشراق کی نماز پڑھتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا عید گاہ میں نفل پڑھے جا سکتے ہیں؟

جواب عید گاہ میں کسی قسم کے نفل نہیں پڑھنے چاہئیں، صرف نماز عید کی ادائیگی پر اس سے پہلے یا بعد میں نفل پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے روز دو رکعت نماز پڑھائی، ان سے پہلے اور بعد کوئی نفل نہیں پڑھے۔ [6]

اکثر ائمہ کرام کا فتویٰ ہے کہ عید گاہ میں امام اور مقتدی دونوں کو نفل پڑھنا مکروہ ہیں، البتہ عید گاہ سے فارغ ہونے کے بعد گھر آ کر دو رکعت پڑھی جا سکتی ہیں کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید سے قبل کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے، البتہ گھر آ کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ [7] اس لیے عید گاہ میں نماز اشراق کا اہتمام صحیح نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، العیدین: ۹۵۶۔ [2] الاحسان، ص: ٦٥، ج ۷۔ [3] مجمع الزوائد، ص: ٦٠٥، ج ۲۔
[4] صحیح بخاری، العیدین: ۹۵۶۔ [5] صحیح مسلم، العیدین: ۵۵۸۔
[6] صحیح بخاری، العیدین: ۹۸۹۔ [7] ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ: ۱۲۹۳۔

مسجد میں نماز عید کے لیے منبر استعمال کرنا

سوال اگر نماز عید مسجد میں ادا کی جائے تو کیا امام منبر پر کھڑا ہو کر عید کا خطبہ دے سکتا ہے یا خطبہ عید کے لیے منبر مشروع نہیں ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے کہ آپ ﷺ عیدین کی نماز آبادی کے باہر عیدگاہ میں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ کی طرف باہر نکلتے تھے۔ [1]

لیکن کسی عذر کی وجہ سے مسجد میں عیدین کا ادا کرنا صحیح ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہے کہ اگر بارش وغیرہ کا عذر ہو تو نماز عید مسجد میں پڑھی جا سکتی ہے۔ [2]

پھر یہ قاعدہ ہے کہ ضروریات ممنوع کاموں کو جائز اور مباح کر دیتی ہیں، لیکن خطبۂ عید کے لیے منبر مشروع نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس کا استعمال ثابت نہیں ہے جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز عید کی ادائیگی کے بعد اپنا رخ پھیرتے اور لوگوں کے بالمقابل کھڑے ہو جاتے، باقی تمام لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے، آپ انہیں وعظ و نصیحت فرماتے، اس کے بعد گھر واپس تشریف لاتے۔ [3]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے کہ ''عیدگاہ کی طرف منبر کے بغیر جانا'' اس روایت میں صراحت ہے کہ سب سے پہلے مروان بن حکم نے عیدگاہ میں منبر رکھوایا۔ اس بناء پر ہمارا رجحان ہے کہ خطبۂ عید کے لیے منبر کا استعمال مشروع نہیں ہے خواہ نماز عید مسجد میں ہی ادا کی جائے۔ (واللہ اعلم)

نماز عید کی قضا

سوال اگر کوئی شخص نماز عید میں بحالت تشہد ملے تو اسے کیا کرنا چاہیے یا اس کی نماز عید رہ جائے تو کیا اسے قضا کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ نماز کا جو حصہ امام کے ساتھ مل جائے اسے پڑھ لو اور جو رہ جائے اسے پورا کر لو۔'' [4]

یہ حکم مطلق ہے کہ امام کے ساتھ جتنی نماز ملے وہ پڑھ لینی چاہیے اور جو رہ جائے اسے بعد میں پورا کر لینا چاہیے۔ اس بناء پر جو شخص نماز عید کے لیے بحالت تشہد شامل ہوا ہے اسے چاہیے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہو جائے اور نماز عید کے طریقہ کے مطابق دو رکعت نماز ادا کر لے جیسا کہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر آدمی امام کو تشہد میں پائے تو اس کے ساتھ بیٹھ جائے، اور جب امام سلام پھیر لے تو کھڑا ہو جائے اور دو رکعت

---

[1] صحیح بخاری، العیدین: ۹۵۔ [2] بیہقی، ص: ۳۱۰، ج۳۔ [3] صحیح بخاری، العیدین: ۹۵٦۔
[4] صحیح بخاری، الاذان: ٦۳٦۔

ادا کرلے اوران رکعات میں تکبیرات بھی کہے۔'' ❶

جس کی نماز عید رہ جائے وہ اس کی قضا اسی طرح ادا کرے جس طرح نماز عید پڑھی جاتی ہے یعنی وہ رکعت ادا کرے اور اس میں اس طرح تکبیریں اور ذکر کرے جیسے نماز عید میں کیا جاتا ہے۔اس سلسلہ میں سعودی افتاء کمیٹی کا فتویٰ حسب ذیل ہے:

''نماز عیدین کی ادائیگی فرض کفایہ ہے اگر اتنے افراد پڑھ لیں جو کافی ہوں تو باقی افراد سے اس کا گناہ ساقط ہو جاتا ہے اور جس کی یہ نماز فوت ہو جائے اور وہ اس کی قضا دینا چاہے تو اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خطبہ کے بغیر نماز عید کے طریقہ کے مطابق اسے ادا کرلے۔'' ❷

جمعہ کے دن عید پڑھنا

سوال کیا جمعۃ المبارک کے دن نماز عید پڑھی جا سکتی ہے؟ لوگوں میں مشہور ہے کہ جمعہ کے دن دو خطبے حاکم وقت کے لیے زوال کا باعث ہیں، اس مفروضے کی کیا حیثیت ہے؟

جواب اسلام میں کسی چیز کے جائز یا ناجائز ہونے کا معیار کتاب وسنت ہے، لوگوں کے ہاں کسی چیز کی شہرت یا رواج کی کوئی حیثیت نہیں ہے، جمعہ کے دن دو خطبوں کے متعلق جو مشہور ہے یہ عوامی ذہن کی پیداوار ہے، قرآن وسنت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، ہمارے نزدیک جمعہ اور عید کا دن باعث برکت ہے، جب دونوں برکتیں ایک دن میں جمع ہو جائیں تو اسے نحوست کا باعث کیوں خیال کیا جاتا ہے؟ شرعی طور پر اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے کہ ایک دن میں جمعہ اور عید کا خطبہ حکمرانوں کے لیے زوال کا باعث ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں نماز عید اور جمعہ اکٹھے آگئے تو آپ نے ان دونوں کو جمع فرمایا جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے لیے دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں، اس لیے جو چاہے جمعہ بھی پڑھ سکتا ہے اور رخصت بھی ہے البتہ ہم دونوں کو جمع کریں گے یعنی ہم جمعہ بھی ادا کریں گے۔ ❸

رسول اللہ ﷺ نے جمعہ اور عید کے اجتماع کو دو خوشیاں قرار دیا ہے اور ہم اسے منحوس خیال کرتے ہیں، بہرحال سوال میں ذکر کردہ خیال خرافات سے ہے شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

عید کے دن عورتوں کو وعظ نصیحت کا خصوصی اہتمام کرنا

سوال کیا عید کے دن عورتوں کو وعظ ونصیحت کرنے کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے یا مشترکہ وعظ ونصیحت ہی کافی ہے؟ سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں کو وعظ نصیحت کا خصوصی اہتمام کرتے تھے قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔''امام کا عید کے دن عورتوں کو نصیحت کرنا'' اور اس کے تحت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو الگ وعظ ونصیحت کرنے کا

---

❶ مغنی، ص: ۲۸۵، ج۳۔ ❷ فتاویٰ اللجنة الدائمه، ص: ۳۰۶، ج۸۔

❸ ابو داود، الصلوٰۃ: ۱۰۷۳۔

اہتمام اس لیے فرمایا کہ ان تک پہلے وعظ کی آواز نہیں پہنچی تھی۔ جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی صراحت ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ سے پہلے نماز پڑھی پھر آپ ﷺ نے خطبہ دیا، آپ ﷺ کو خیال آیا کہ عورتوں تک آواز نہیں پہنچ پائی، اس لیے آپ ﷺ ان کے پاس آئے انہیں وعظ ونصیحت کی اور انہیں صدقہ وخیرات کرنے کا حکم دیا۔ [1]

لیکن آج کل لاؤڈ سپیکر کے ذریعے مردوں کے ساتھ ہی عورتوں تک بھی خطبہ کی آواز پہنچ جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ہاں بچوں کی وجہ سے شور وغل اتنا ہوتا ہے کہ نہ خود سنتی ہیں بلکہ مردوں کے لیے بھی ان کا شور تشویش کا باعث ہوتا ہے۔ بہرحال دورِ حاضر میں سپیکر نے اس ضرورت کو پورا کردیا ہے لہٰذا عورتوں کی طرف الگ وعظ ونصیحت کے لیے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر بجلی کی بندش یا سپیکر کی خرابی کی وجہ سے عورتوں تک خطبہ کی آواز نہ پہنچ سکتی ہو تو انہیں وعظ ونصیحت کرنے کا خصوصی اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے خصوصی پردہ کا اہتمام کرنا ہوگا۔ (واللہ اعلم)

خواتین کا تکبیرات عید کہنا

سوال کیا خواتین کو تکبیرات عید کہنی چاہیے؟ پردہ داری کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کریں نیز تکبیرات کے الفاظ بھی ذکر کریں۔

جواب تکبیرات کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ عید کے موقع پر اللہ کی عطا کردہ ہدایت کے مطابق کہو۔ [2]

اس آیت کریمہ کے مطابق تکبیرات کہنے کا حکم ہے۔ روایات میں ان کے مختلف الفاظ ہیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مبارکہ کے الفاظ یہ ہیں: اللہ اکبر، اللہ اکبر اللہ اکبر کبیرا [3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے درج ذیل الفاظ کو بیان کیا ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد [4]

اس سلسلہ میں تشدد اور سختی نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ آج کل کچھ حضرات نے شور وغل کیا ہے۔

عورتوں کو بھی اپنی پردہ داری کے مطابق تکبیرات کہنے کا حکم ہے، وہ اس قدر تو بلند آواز سے تکبیرات نہ کہیں کہ مردوں کو ان کی آواز سنائی دے بہرحال اپنی ساتھ والی عورتیں اس کی آواز کو ضرور سنیں، حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''ہمیں حکم دیا جاتا تھا ہم عید کے دن حائضہ عورتوں کو نکالیں تاکہ وہ بھی تکبیرات کہنے میں لوگوں کے ساتھ شریک ہوں۔'' [5]

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا دسویں تاریخ کو تکبیرات کہتی تھیں اور دیگر خواتین بھی ابان بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے مسجد میں مردوں کے ساتھ تکبیرات کہا کرتی تھیں۔ [6]

---

[1] صحیح مسلم، صلوٰۃ العیدین: ۸۸٤۔ [2] ۲/البقرہ: ۱۸۵۔ [3] بیھقی، ص: ۳۱٦، ج۳۔
[4] مصنف ابن ابی شیبہ، ص: ٤۸۸، ج۱۔ [5] صحیح بخاری، العیدین: ۹۷۱۔
[6] صحیح بخاری، تعلیقاً، کتاب العیدین، باب نمبر ۱۲۔

بہر حال عورتوں کو چاہیے کہ وہ بھی تکبیرات کہیں لیکن اپنی آواز مردوں کی آواز سے پست رکھیں۔

مسجد میں نماز عید سے پہلے تحیۃ المسجد پڑھنا

سوال اگر نماز عید مسجد میں پڑھی جائے تو کیا نماز عید سے پہلے تحیۃ المسجد کی دو رکعت پڑھ لینی چاہیے یا نہیں ادا کیے بغیر ہی بیٹھ جائے۔ قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا وضاحت ہے؟

جواب نماز عید سے پہلے کسی قسم کی نماز سنت یا نفل پڑھنا ثابت نہیں ہے، ایک حدیث میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عید کے دن دو رکعت نماز پڑھائی جبکہ دو رکعتوں سے پہلے اور بعد کوئی نماز نہیں پڑھی۔ [1]

البتہ عیدگاہ سے فارغ ہونے کے بعد گھر جا کر دو رکعت پڑھی جا سکتی ہیں جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے البتہ جب اپنے گھر کی طرف لوٹتے تو دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ [2]

البتہ سوال میں ذکر کردہ تحیۃ المسجد کی دو رکعت سے ضرور مغالطہ ہوتا ہے، واقعی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جب کوئی آدمی مسجد میں داخل ہو تو اس وقت تک مسجد میں نہ بیٹھے جب تک دو رکعت نماز ادا نہ کر لے۔ [3] اس روایت کی بنا پر تحیۃ المسجد کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھی، اس لیے ہمارے رجحان کے مطابق بہتر یہ ہے کہ نماز عید سے پہلے کوئی نفل و سنت نہ پڑھے جائیں خواہ نماز عید مسجد میں ہی کیوں نہ ادا کی جائے، کیونکہ لوگ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ان دو رکعت کو نماز عید کا کچھ حصہ سمجھ کر ادا کرنا شروع کر دیں گے۔ (واللہ اعلم)

بچوں کو عیدگاہ لے جانا

سوال بچوں کو عیدگاہ لے جانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جن عورتوں کے بچے ساتھ ہوتے ہیں وہ نماز عید اور خطبہ عید میں خلل کا باعث بنتے ہیں۔ بچوں کے متعلق نماز عید کے حوالہ سے شرعی ہدایات کیا ہیں؟ براہ کرم کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں طور پر قائم کیا ہے "بچوں کو عیدگاہ لے جانا" [4]

حالانکہ اس حدیث میں بچوں کو عیدگاہ لے جانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ دراصل امام بخاری بہت بڑے فقیہ اور روشن دماغ رکھنے والے ہیں۔ آپ نے اس حدیث کے ایک طرق کی طرف اشارہ کیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ آیا آپ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ باہر جایا کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا "ہاں" اگر اصغر سنی کے باوجود رسول اللہ ﷺ کے ہاں میرا مرتبہ و مقام نہ ہوتا تو مجھے آپ ﷺ اپنے ساتھ کیوں لے جاتے، اس کے بعد آپ نے مذکورہ حدیث بیان فرمائی۔ [5]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مطلب یہ ہے کہ خود ابن عباس رضی اللہ عنہ اس وقت چھوٹی عمر کے تھے جب رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ عیدگاہ

---

[1] صحیح بخاری، العیدین: ۹۸۹۔ [2] ابن ماجه، اقامة الصلوٰت: ۱۲۹۳۔

[3] بخاری، التهجد: ۱۶۳۔ [4] صحیح بخاری، العیدین، باب نمبر ۱۶۔

[5] صحیح بخاری، الاذان: ۸۶۳۔

گئے، اس سے بچوں کا عیدگاہ جانا ثابت ہوتا ہے، لیکن ہمارے رجحان کے مطابق بچوں کو چند شرائط کے ساتھ عیدگاہ لے جانا جائز ہے جو حسب ذیل ہیں:

① وہ بچے سن شعور کو پہنچ چکے ہوں کیونکہ سات سال کی عمر میں رسول اللہ ﷺ نے بچوں کو نماز پڑھنے کے متعلق کہا ہے، اس عمر میں بچہ سمجھدار اور صاحب شعور ہو جاتا ہے۔

② عیدگاہ لانے سے پہلے ان کی تربیت کرنا ضروری ہے کہ عید اور عیدگاہ کے آداب کیا ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ عیدگاہ میں اودھم مچاتے رہیں اور انہیں کوئی باز پرس کرنے والا نہ ہو۔

③ چھوٹے شیر خوار بچوں کو عیدگاہ لے جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود ماؤں اور دیگر خواتین وحضرات کی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔

④ شرارتی اور بے عقل بچوں کو بھی گھر میں رہنے دیا جائے۔ کیونکہ شرارتی بچوں کو دیکھ کر سنجیدہ بچے بھی اچھل کود میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

⑤ بچے ماں کے بجائے باپ کے ساتھ ہوں تاکہ بوقت ضرورت ان پر کنٹرول کرنا آسان ہو تا کہ عیدگاہ میں دوسروں کی نماز خراب نہ کرسکیں۔ (واللہ اعلم)

نماز جمعہ کے ساتھ نماز عصر ادا کرنا

سوال کیا نماز جمعہ کے ساتھ نماز عصر ادا کی جاسکتی ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب رسول اللہ ﷺ نے بڑی تفصیل کے ساتھ ہمیں نمازوں کے اوقات سے آگاہ کیا ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ [1]

''بے شک نماز کا اہل ایمان پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔''

اس لیے اوقات مقررہ کے علاوہ دوسرے اوقات میں نماز ادا کرنا حدود اللہ سے تجاوز ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [2]

''جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔''

ہاں بعض اوقات کسی مجبوری کی وجہ سے ایک نماز کو کسی دوسری نماز کے وقت میں ادا کیا جا سکتا ہے، وہ مجبوری سفر، مرض اور بارش وغیرہ ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی خطیب باہر سے آتا ہے اور اسے نماز جمعہ کے بعد سفر کرنا ہے تو اسے اجازت ہے کہ وہ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد نماز عصر اس کے ساتھ ہی ادا کر لے۔ احادیث میں دوران سفر نمازوں کو جمع کرنے کا جواز ملتا ہے۔ اس عموم میں نماز جمعہ اور نماز عصر کو جمع کیا جاسکتا ہے۔ اس کی ممانعت کے متعلق اگر کوئی خصوصی دلیل ہے تو اسے پیش کیا جائے لیکن ہمارے علم کی حد

---

[1] ٤/النساء: ١٠٣۔ [2] ٢/البقرة: ٢٢٩۔

تک کوئی ایسی خصوصی دلیل نہیں جس میں نماز جمعہ کے ساتھ نماز عصر کو ادا کرنے سے روکا گیا ہو، یہ بھی واضح رہے کہ نمازوں کو جمع کرنا قصر کے ساتھ مشروط نہیں ہے کیونکہ قصر کا تعلق سفر سے ہے جب کہ جمع کا تعلق حاجت وضرورت سے ہے۔ انسان کو سفر وحضر میں جب بھی نمازوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہو وہ جمع کر سکتا ہے، البتہ بلا وجہ نمازوں کو جمع کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق جس طرح نماز ظہر کے وقت میں نماز عصر پڑھی جا سکتی ہے اسی طرح نماز جمعہ کے ساتھ نماز عصر ادا کرنا جائز ہے، ہمارا اسی پر عمل ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز مختصر اور خطبہ لمبا کرنا

سوال ہمارے ہاں خطباء حضرات خطبہ بہت لمبا کرتے ہیں، جس سے سامعین اکتا جاتے ہیں اور نماز بہت مختصر پڑھاتے ہیں، کیا قرآن وحدیث میں اس کا جواز ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب عقل مند اور صاحب بصیرت خطیب وہ ہے جو حالات پر نظر رکھتے ہوئے خطبہ دیتے وقت جامع کلمات استعمال کرے اور مختصر گفتگو کرے کیونکہ مختصر اور جامع بات جلدی ذہن نشین ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ طویل خطبے سے احتراز فرماتے تھے، چنانچہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بہت طویل وعظ ونصیحت نہیں فرماتے تھے بلکہ چند مختصر کلمات پر ہی اکتفاء فرماتے تھے۔ [1] خطبہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا درج ذیل ارشاد گرامی ہمارے واعظین اور خطباء کے لیے مشعل راہ ہے، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی کی لمبی نماز اور چھوٹا خطبہ اس کی فقاہت کی علامت ہے۔'' [2] اس میں نماز اور خطبہ کا باہمی تقابل مراد نہیں ہے بلکہ عام نمازوں سے جمعہ کی نماز طویل اور عام خطبوں سے جمعہ کا خطبہ مختصر ہونا چاہیے، چنانچہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز اور خطبہ اعتدال کے ساتھ ہوتے تھے۔ [3]

یہ بھی ذہن میں رہے کہ نماز بھی اتنی طویل نہ ہو کہ مقتدی اکتا جائیں اور وہ مشقت میں پڑ جائیں جیسا کہ ائمہ حضرات کو رسول اللہ ﷺ نے نماز کے متعلق تنبیہ فرمائی ہے۔ بہر حال ہمارے خطباء حضرات کو چاہیے کہ وہ وقت اور سامعین کی نزاکت کا خیال رکھیں اور اعتدال کے ساتھ نماز اور خطبہ ادا کریں، دو اڑھائی گھنٹے پر مشتمل خطبہ جمعہ کسی طرح بھی درست نہیں، خطبہ جامع، مختصر اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے اور نماز کا بھی جھٹکا کرنے کے بجائے اسے اعتدال کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

دوران خطبہ آنا

سوال کچھ لوگ جمعہ کے دن دوران خطبہ آتے ہیں اور بیٹھ کر خطبہ سننا شروع کر دیتے ہیں، کیا ایسا کرنا درست ہے یا انہیں دو رکعت پڑھ کر خطبہ سننا چاہیے؟

جواب جمعہ کے دن نمازی حضرات کو جلدی آنا چاہیے تا کہ خطبہ شروع ہونے سے پہلے وہ مسجد میں موجود ہوں اگر کسی

---

[1] ابو داود، الصلوٰۃ: ۱۱۰۷۔ [2] صحیح مسلم، الجمعہ: ۸۶۹۔ [3] مسلم، الجمعہ: ۸۶۶۔

وجہ سے دیر ہو جائے تو دوران خطبہ آنے والا دو رکعت پڑھ کر خطبہ سننے کے لیے بیٹھے جیسا کہ حدیث میں اس امر کی صراحت ہے، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، اس دوران ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور بیٹھ کر خطبہ سننے لگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تو نے نماز پڑھی ہے؟ اس نے عرض کیا جی نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اٹھو دو رکعت ادا کرو۔ [1]

ایک حدیث میں مزید وضاحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کوئی جمعہ کے دن اس وقت آئے جب امام خطبہ دے رہا ہو تو اسے چاہیے کہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے۔ [2] ان احادیث سے معلوم ہوا کہ دوران خطبہ آنے والا پہلے دو رکعت پڑھے پھر خطبہ سننے کے لیے بیٹھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن مسجد میں آئے جب مروان بن حکم خطبہ دے رہے تھے، آپ نے چوکیداروں کی مخالفت کے باوجود نماز ادا کی۔ [3]

امام ترمذی نے حسن بصری رحمہ اللہ کا عمل ذکر کیا ہے کہ جب وہ مسجد میں آتے اور امام خطبہ میں مصروف ہوتا تو دو رکعت پڑھ کر خطبہ سننے کے لیے بیٹھتے، اس کے علاوہ کسی ایک صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے کہ خطبہ جمعہ کے وقت کوئی صحابی مسجد میں آیا ہو اور دو رکعت ادا کیے بغیر وہ مسجد میں بیٹھ گیا ہو، بہرحال ہمارے رجحان کے مطابق دوران خطبہ آنے والے کو چاہیے کہ وہ پہلے دو رکعت ادا کرے پھر خطبہ سننے کے لیے بیٹھے۔ (واللہ اعلم)

نماز جمعہ میں تشہد میں شریک ہونا

سوال بعض لوگ جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد میں آتے ہیں، دیر سے پہنچنے کی وجہ سے وہ صرف تشہد میں امام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، پھر دو رکعت ادا کر کے سلام پھیر دیتے ہیں، کیا یہ عمل کتاب وسنت سے ثابت ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب جمعہ کے دن اگر کسی کو جمعہ کی نماز سے امام کے ساتھ کم از کم ایک رکعت ادا کرنے کا موقع ملے تو وہ جمعہ کی دو رکعت پڑھ سکتا ہے بصورت دیگر اسے ظہر کی چار رکعت پڑھنا ہوں گی، جب انسان جمعہ کے دن اس وقت آئے جب امام تشہد میں ہو تو اس وقت وہ امام کے ساتھ شامل ہوتا ہے تو اس کا جمعہ فوت ہو جاتا ہے، اس کے لیے جمعہ کی دو رکعت ادا کرنا جائز نہیں بلکہ اسے ظہر کی چار رکعت ادا کرنا ہوں گی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے نماز کی ایک رکعت پائی اس نے نماز پا لی۔'' [4]

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے ایک رکعت سے کم پایا تو اس نے نماز کو نہیں پایا، اس کے علاوہ جمعہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے نماز جمعہ کی ایک رکعت پالی، اس نے جمعہ پالیا۔'' [5]

---

[1] صحیح بخاری، الجمعہ: ۹۳۰۔ [2] صحیح مسلم، الجمعۃ: ۸۷۵۔ [3] ترمذی، ابواب الصلوٰۃ: ۵۱۱۔

[4] بخاری، الاذان: ۵۸۰۔ [5] سنن نسائی، جمعہ: ۱۴۲۶۔

ان احادیث کی روشنی میں ہمارا موقف ہے کہ اگر کوئی جمعہ کے دن اس وقت آتا ہے جب امام تشہد میں بیٹھا ہوا اور وہ اس حالت میں شامل ہو جاتا ہے تو اسے ظہر کی نماز پڑھنی ہوگی، کیونکہ اتنی مقدار میں امام کے ساتھ شمولیت کرنے سے جمعہ نہیں ہوتا، اگرچہ ہمارے ہاں لاعلمی کی وجہ سے لوگ دو رکعت ہی پڑھ لیتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ ایسے حالات میں ظہر کی چار رکعت پڑھیں۔ (واللہ اعلم)

خطیب کا جماعت نہ کروانا

سوال ہمارے ہاں جمعہ پڑھانے ایک خطیب صاحب باہر سے تشریف لاتے ہیں، ان کا معمول ہے کہ وہ خطبہ سے فراغت کے بعد خود نماز نہیں پڑھاتے بلکہ مسجد میں تعینات قاری صاحب کو جماعت کرانے کا کہتے ہیں، چنانچہ وہ نماز پڑھاتے ہیں، کیا ایسا جائز ہے کتاب و سنت میں اس کی گنجائش ہے؟

جواب سنت طریقہ یہی ہے کہ جو شخص خطبہ دے وہی نماز پڑھائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ یہی معمول رہا اور آپ کے بعد خلفائے راشدین بھی اسی پر عمل پیرا رہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔'' [1]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ تم میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔ [2] اگر کسی معقول عذر کی بناء پر خطیب کے علاوہ کوئی دوسرا نماز پڑھائے تو جائز ہے اور نماز درست ہوگی لیکن اسے معمول نہ بنایا جائے جیسا کہ صورت مسئولہ میں بیان کیا گیا ہے، عذر کے بغیر ایسا کرنا خلاف سنت ہے، البتہ نماز ہو جائے گی۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو اختیار کرتے ہوئے جو خطبہ وہی جمعہ کی نماز پڑھائے، پھر خلفائے راشدین اور ان کے بعد ائمہ کرام بھی اس پر عمل پیرا تھے۔ (واللہ اعلم)

نماز عید کا وقت

سوال ہمارے ہاں عیدین کی نماز کے لیے جو وقت مقرر کیا جاتا ہے، اس میں کافی اختلاف ہوتا ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب عید الاضحیٰ کے بعد قربانی کرنی ہوتی ہے اس لیے اس کی ادائیگی میں جلدی کی جائے جب کہ عید الفطر کو ذرا تاخیر سے پڑھا جائے، بہر حال جب سورج طلوع ہو کر بلند ہو جائے تو نماز عید کا وقت شروع ہو جاتا ہے، چنانچہ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر اس وقت پڑھتے تھے جب سورج دو نیزوں کے برابر بلند ہو جاتا اور عید الاضحیٰ اس وقت ادا کرتے جب سورج ایک نیزے کے برابر ہو جاتا ہے۔ [3]

اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن علامہ شوکانی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''نماز عیدین کے وقت کی تعیین میں سب سے اچھی وارد

---

[1] صحیح بخاری، الاذان: ٦٣١۔ [2] مسند امام احمد، ص: ١٢٦، ج٤۔

[3] تلخیص الحبیر، ص: ١٦٧، ج٢۔

شدہ حدیث یہی حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے۔''[1]

اس کی تائید حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، روایت میں ہے کہ وہ لوگوں کے ہمراہ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے دن نکلے تو انہیں امام کے تاخیر کرنے پر انتہائی تعجب ہوا، انہوں نے فرمایا کہ ہم تو اس وقت نماز پڑھ کر فارغ ہو چکے ہوتے تھے اور وہ چاشت کا وقت تھا۔[2]

بہر حال اسے طلوع آفتاب کے فوراً بعد نہیں ادا کرنا چاہیے اور نہ ہی بلا وجہ اس کی ادائیگی میں تاخیر کی جائے، اس کی ادائیگی کا آخری وقت زوال آفتاب ہے جیسا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زوال آفتاب کے بعد عید کا چاند نظر آنے کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کل صبح لوگ نماز عید ادا کرنے کے لیے عید گاہ پہنچیں۔''[3]

دوران خطبہ سلام کا جواب دینا

سوال دوران خطبہ سلام کا جواب دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر چھینک آئے تو اس کا جواب دینا شرعاً کیسا ہے؟ قرآن وسنت کے حوالے سے جواب دیں؟

جواب خطبہ جمعہ کے آداب سے ہے کہ اسے خاموشی اور توجہ سے سنا جائے، حتی کہ اگر دو شخص دوران خطبہ باتیں کرتے ہیں تو انہیں خاموش بھی نہیں کرانا چاہیے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جمعہ کے دن دوران خطبہ جب تم اپنے ساتھی سے کہو کہ خاموش ہو جاؤ تو بلاشبہ تم نے لغو حرکت کی ہے۔''[4]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران خطبہ ہر قسم کا کلام ممنوع ہے اگرچہ بعض احادیث میں ایسی حرکت سے جمعہ کے ضائع ہونے کا ذکر ہے لیکن یہ احادیث صحیح نہیں ہیں، اس لیے دورانِ خطبہ بات کرنے سے جمعہ تو ضائع نہیں ہو گا البتہ اجر وثواب میں ضرور کمی ہو جائے گی، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران خطبہ سلام کا جواب دینا اور جسے چھینک آئے اس کے لیے یرحمک اللہ کہنا ممنوع ہے۔

مولانا عبدالرحمن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ شارح ترمذی لکھتے ہیں: ''میرے نزدیک زیادہ مناسب یہ ہے کہ دوران خطبہ کلام سے ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی باہمی گفتگو ممنوع ہے اور اسی طرح خاموشی سے مراد لوگوں کی باہمی گفتگو سے خاموشی ہے نہ کہ اللہ کے ذکر سے خاموشی مراد ہے جیسا کہ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ دوران خطبہ لوگوں سے کلام کرنے سے خاموش رہے لیکن پوشیدہ طور پر اپنے دل میں سلام کا جواب دے یا جسے چھینک آئے تو اسے خفیہ جواب دے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آنے پر آپ پر خفیہ درود پڑھ لے تو یہ شخص ہر مذکورہ ممانعت سے اجتناب اور حکم پر عمل کرنے والا ہو گا۔''

ہمارے رجحان کے مطابق یہ موقف صحیح ہے کیونکہ ان تمام اشیاء کو کلام نہیں کہا جاتا اور یہ انصات کے خلاف بھی نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] نیل الاوطار، ص: ۵۹۲، ج۲۔ [2] ابو داود، الصلوٰۃ: ۱۱۳۵۔
[3] ابو داود، الصلوٰۃ: ۱۱۵۷۔ [4] بخاری، الجمعہ: ۹۳٤۔

جمعہ سے پہلے اور فراغت کے بعد رکعات پڑھنا

سوال جمعہ سے پہلے اور فراغت کے بعد کتنی رکعات پڑھنا مسنون ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب جمعہ سے پہلے نفل پڑھنے کی تعداد متعین نہیں ہے، جمعہ کے لیے آنے والے کو حسب توفیق نوافل پڑھ لینے چاہئیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق کوئی حد مقرر نہیں فرمائی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو جمعہ کے دن غسل کرے، پھر جمعہ پڑھنے کے لیے آئے اور جس قدر اس کے مقدر میں ہو نماز پڑھ لے پھر خاموشی سے اس وقت تک بیٹھا رہے جب تک امام خطبہ سے فارغ نہ ہو۔ اس کے بعد امام کے ساتھ فرض نماز ادا کرے تو اس کے دونوں جمعوں کے درمیانی گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور مزید تین دن کے اور بھی۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ سے پہلے نماز پڑھنے کی کوئی حد متعین نہیں ہے البتہ دوران خطبہ آنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی جمعہ کے دن آئے جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعت ادا کرے اور ان دونوں کو اختصار کے ساتھ پڑھے۔ [2] نماز جمعہ کے بعد نوافل ادا کرنے کے متعلق دو روایات ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز جمعہ ادا کرے تو اس کے بعد چار رکعات ادا کرے۔ [3]

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''تم میں سے جو جمعہ کے بعد نماز پڑھے تو وہ چار رکعات ادا کرے۔'' [4]

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے بعد اپنے گھر میں دو رکعت ادا کرتے تھے۔ [5] صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن گھر واپس آنے تک کوئی نماز نہ پڑھتے تھے، گھر آ کر دو رکعت ادا کرتے۔ [6]

ان دو مختلف روایات میں دو طرح سے تطبیق دی گئی ہے۔

① نماز جمعہ کے بعد چار رکعات پڑھنا افضل ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔ پھر تعداد میں اضافہ اجر وثواب میں اضافے کا باعث ہوگا، لیکن اگر کوئی دو رکعت پڑھ لے تو بھی جائز ہے۔

② اگر کوئی مسجد میں پڑھے تو چار رکعات ادا کرے اور انہیں دو، دو کر کے پڑھے اور اگر کوئی گھر آ کر پڑھنا چاہے تو دو رکعت پڑھے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول بیان ہوا ہے۔

بہر حال جمعہ کا دن بڑی فضیلت کا حامل ہے، اس دن کثرت سے عبادت کی جائے اور رسول اللہ ﷺ پر بکثرت درود پڑھا جائے، نوافل کی ادائیگی میں سستی نہ کی جائے نیز اس دن خطبہ سے پہلے مسجد میں آنے کی کوشش کی جائے۔

---

[1] صحیح مسلم، الجمعہ: ۸۵۷۔ [2] ابو داود، الجمعہ: ۱۱۱۷۔ [3] صحیح مسلم، الجمعہ: ۸۸۱۔
[4] جامع ترمذی، الجمعہ: ۵۲۳۔ [5] مسند امام احمد، ص: ۱۰۳، ج ۲۔ [6] صحیح بخاری، الجمعہ: ۹۳۷۔

نماز عید کی تکبیرات

سوال عیدین کی نماز میں کتنی تکبیریں ہیں نیز بتائیں کہ کیا وہ قراءت سے پہلے ہیں؟ اگر کوئی امام یہ تکبیریں بھول جائے اور قراءت شروع کر دے تو کیا عید کی نماز ہو جائے گی؟

جواب عیدین کی نماز میں تکبیروں کو ''تکبیرات زوائد'' کہا جاتا ہے، قراءت سے پہلے پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں پانچ ہیں، جیسا کہ حضرت عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کی پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں قراءت سے پہلے پانچ تکبیریں کہیں۔ [1]

ہر دو تکبیروں کے درمیان ایک ایک درمیانی آیت کی مقدار ٹھہرنا چاہیے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے طبرانی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے: ''ہر دو تکبیروں کے درمیان ایک کلمہ کی مقدار کا فاصلہ ہونا چاہیے۔'' [2] تکبیرات زوائد کی حیثیت یہ ہے کہ ان کی ادائیگی سنت ہے اگرچہ کچھ حضرات ان کی فرضیت کے قائل ہیں، تاہم جمہور اہل علم نے ان تکبیرات کو سنت کہا ہے۔ امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''تکبیرات زوائد اور ان کے درمیان ذکر سنت ہے، واجب نہیں، اگر کوئی انہیں دانستہ بھی ترک کر دے تو نماز باطل نہیں ہوگی اور نہ ہی بھول کر چھوڑنے سے سجدہ سہو لازم ہوتا ہے، اس میں کسی اہل علم کا اختلاف نہیں ہے۔ اگر کوئی تکبیرات زوائد بھول جائے اور قراءت شروع کر دے تو دوبارہ اس کا اعادہ نہیں کرے گا۔'' [3]

مختصر یہ کہ ان کی مقدار بارہ ہے، سات پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے اور پانچ دوسری رکعت میں قراءت سے پہلے اور اگر کوئی دانستہ یا بھول کر ترک کر دے تو اس سے نماز باطل نہیں ہوگی اور نہ ہی اس پر کوئی سجدہ سہو ہے۔ (واللہ اعلم)

عیدین کے موقع پر تکبیرات پڑھنا

سوال عیدین کے موقع پر تکبیرات کا آغاز کب کرنا چاہیے اور ان کے کیا الفاظ ہیں، نیز عورتیں بھی تکبیرات کہہ سکتی ہیں؟ کتاب وسنت کے مطابق راہنمائی کریں۔

جواب عیدالفطر کے موقع پر چاند دیکھ کر تکبیرات کا آغاز کر دیا جائے اور نماز عید سے فراغت کے بعد انہیں چھوڑ دیا جائے اور عیدالاضحیٰ میں ۱۳ ذوالحجہ کی شام تک کہی جائیں، خاص طور پر عیدگاہ جاتے ہوئے بلند آواز سے تکبیریں کہنی چاہئیں۔ عورتوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی تکبیریں کہیں جیسا کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: ''ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ ہم عید کے روز حائضہ عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں تاکہ وہ تکبیرات کہنے میں لوگوں کے ساتھ شریک ہوں۔ [4]

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا دسویں تاریخ میں تکبیرات کہتی تھیں نیز خواتین ابان بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے مسجد میں مردوں کے ساتھ تکبیریں کہا کرتی تھیں۔ [5] تکبیرات کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

---

[1] ترمذی، الجمعہ: ۵۳۶۔ [2] تلخیص الحبیر، ص: ۸۵، ج۲۔ [3] المغنی، ص: ۲۷۵، ج۳۔
[4] صحیح بخاری، العیدین: ۹۷۷۔ [5] صحیح بخاری، تعلیقات قبل حدیث: ۹۷۰۔

① حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی الفاظ یہ ہیں: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر کبیرا ❶

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے درج الفاظ کو بیان کیا ہے: اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر واجل اللہ اکبر وللہ الحمد ❷

③ حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ مروی ہیں: اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ واللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد ❸

اگرچہ ان احادیث کے بارے میں محدثین نے کچھ کلام کیا ہے تاہم قرآنی حکم کی بجا آوری میں ان احادیث پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنا

سوال جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے کے متعلق کوئی فضیلت حدیث میں آئی ہے؟ نیز بتائیں کہ اسے پورا پڑھنا چاہیے اور کس وقت پڑھا جائے؟ صحیح احادیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب جمعہ کے دن سورۃ الکہف پڑھنے کے متعلق احادیث آتی ہیں، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے والے کے لیے دو جمعوں کے درمیانی عرصہ کے لیے روشنی رہتی ہے۔'' ❹

امام حاکم نے بھی اسے روایت کیا ہے ❺ اور اسے صحیح قرار دیا ہے، البتہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے نعیم بن حماد راوی کی وجہ سے اس پر اعتراض کیا ہے، لیکن ان پر اعتراض درست نہیں کیونکہ بیہقی میں اس کے متابعات اور شواہد موجود ہیں، جیسا کہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ ❻

اس کے وقت کے متعلق کوئی حدیث تعیین میری نظر سے نہیں گزری، البتہ خالد بن معدان فرماتے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن امام کی آمد سے پہلے سورہ کہف کی تلاوت کرے تو ایسا کرنا جمعہ سے آئندہ جمعہ تک کفارہ بن جاتا ہے اور اس کا نور بیت اللہ تک پہنچتا ہے۔ ❼ لیکن یہ مرفوع روایت نہیں بلکہ ایک مشہور تابعی کا قول ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ جمعہ کے دن عصر کے بعد سورۂ کہف پڑھنے کے متعلق کوئی حدیث آئی ہے تو انہوں نے جواب دیا: جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے کے متعلق کچھ آثار ملتے ہیں۔ جنہیں محدثین اور فقہاء نے بیان کیا ہے لیکن وہ مطلق ہیں، میری نظر میں عصر کے بعد پڑھنے کی تعیین کسی روایت میں نہیں ہے۔ ❽

---

❶ بیہقی، ص: ۳۱٦، ج۳۔ ❷ مصنف ابن ابی شیبة، ص: ٤٨٩، ج۱۔ ❸ مصنف ابن ابی شیبة، ص: ٤٨٨، ج۱۔
❹ سنن بیہقی، ص: ۲۹، ج۳۔ ❺ مستدرك ص: ۳٦٨، ج۲۔ ❻ ارواء الغلیل، ص: ۹۳، ج۳۔
❼ المغنی ابن قدامه، ص: ۲۳٦، ج۳۔ ❽ مجموع الفتاویٰ ص: ٥١٥، ج٢٤۔

اذکار و دعوات

اذکار و دعوات

بکری کے خون سے غسل دینا

سوال میری ہمشیرہ بیمار ہے ہم نے اس کا بہت علاج معالجہ کرایا ہے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا، آخر ایک تعویذ گنڈا کرنے والے نے ہمیں کہا ہے کہ اسے کسی بکری کے خون میں غسل دیا جائے ،ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہماری راہنمائی کریں۔

جواب بیمار کا علاج معالجہ کرنا سنت ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ احتیاط کی جائے کہ علاج معالجہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے کیا جائے،سوال میں جس تعویذ گنڈا کرنے والے کا ذکر ہے ایسے لوگ شعبدہ باز اور کاہن ہوتے ہیں،ان کے پاس مسائل حل کرانا،ان سے کچھ دریافت کرنا یا ان کی بات ماننا جائز ہی نہیں بلکہ کبیرہ گناہ ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”جو شخص کسی کاہن یا نجومی کے پاس آئے،اس سے کچھ پوچھے تو اس کی چالیس رات تک کوئی نماز قبول نہیں ہوگی۔“ [1] اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی کاہن یا نجومی کے پاس آئے پھر اس کی تصدیق کرے تو اس نے گویا ان تعلیمات کا انکار کر دیا جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی ہیں۔ [2] جہاں تک غسل کرنے کا تعلق ہے تو ذبح کرتے وقت حلال جانور کا جو خون نکلتا ہے یہ حرام ہے جیسا کہ نص قرآن سے ثابت ہے اور حرام چیزوں کا بطور دواء استعمال کرنا بھی ناجائز ہے جیسا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:”اللہ تعالیٰ نے بیماری اور اس کا علاج نازل کیا ہے اور ہر بیماری کے لیے اس کا علاج بھی پیدا کیا ہے لہٰذا بیماری کا علاج کیا کرو لیکن حرام چیزوں سے علاج نہ کرو۔“ [3] اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد ہے:”اللہ تعالیٰ نے حرام اشیاء میں تمہارے لیے قطعاً کوئی شفا نہیں رکھی ہے۔“ [4] لوگوں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے شراب کے ساتھ علاج کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:”شراب دوا نہیں بلکہ بذات خود وہ بیماری ہے۔“ [5]

ان دلائل کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ بیماری کا علاج کرنا اور کرانا سنت سے ثابت ہے لیکن حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے بکری کے خون سے غسل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ وہ حرام ہے اور حرام چیز کو بطور علاج استعمال کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔(واللہ اعلم)

---

[1] مسند امام احمد، ص: ٤٢٩، ج٢۔ [2] ابو داود، الکھانه: ٣٩٠٤۔

[3] جامع ترمذی، الطب: ٢٠٣٨۔

[4] صحیح بخاری، معلقاً قبل حدیث: ٥٦١٤۔ [5] ابو داود، الطب: ٣٨٧٣۔

قرآنی دعاؤں کا صیغہ بدلنا

سوال قرآن کریم میں بہت سی دعائیں منقول ہیں، کیا ان کی ضمیروں کو بدلا جا سکتا ہے یعنی واحد کو جمع اور جمع کو واحد کرنا جائز ہے؟ مثلاً قرآن میں ہے: ﴿رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ کیا اسے اجتماعی طور پر رَبَّنَا زِدْنَا عِلْمًا پڑھا جا سکتا ہے؟

جواب قرآن وحدیث میں آنے والی دعاؤں میں اپنی طرف سے تبدیلی جائز نہیں ہے، کیونکہ ایسا کرنا حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا ہے جس کی حدیث میں ممانعت ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''میری امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو دعا کرتے وقت حد اعتدال سے تجاوز کریں گے۔'' [1]

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا سکھائی جس میں یہ الفاظ تھے: ''ونبيك الذى ارسلت'' انہوں نے جب رسول اللہ ﷺ کو یہ دعا یاد کر کے سنائی تو بایں الفاظ پڑھا: ''ورسولك الذى ارسلت'' یعنی انہوں نے ''نبيك'' کے بجائے ''رسولك'' پڑھ دیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ونبيك الذى ارسلت کے الفاظ ہی یاد کرو۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ نے بتائی ہوئی دعا میں ترمیم کو قبول نہ فرمایا، اس بنا پر ہمارے رجحان کے مطابق تذکیر وتانیث یا واحد جمع کا اعتبار کرتے ہوئے ضمیروں کو بدلنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی امام ہے تو اسے چاہیے کہ الفاظ وہی ادا کرے جو قرآن وحدیث میں ہیں، البتہ نیت جمع کی کرے یعنی الفاظ بدلنے کی بجائے مقتدی حضرات کو نیت میں شامل کر لے، بعض حضرات آیت کریمہ میں انی کنت من الظالمین میں انا کنا من الظالمین بولنے کی تلقین کرتے ہیں، ایسا کرنا جائز نہیں ہے، صورت مسئولہ میں رب زدنی علماً کو ربنا زدنا علمًا پڑھنا بھی محل نظر ہے، اگر مقتدی حضرات کو دعا کرتے وقت شامل کرنا ہے اور جمع کے الفاظ لانے ہیں تو درج ذیل دعا پڑھ لی جائے:

((اَللّٰهُمَّ انْفَعْنَا بِمَا عَلَّمْتَنَا وَ عَلِّمْنَا مَا يَنْفَعُنَا وَزِدْنَا عِلْمًا)) ''اے اللہ! ہمیں جو تو نے علم سکھایا ہے اسے ہمارے لیے نفع مند بنا اور ہمیں ایسا علم عطا فرما جو ہمیں نفع دے اور ہمارے علم میں اضافہ فرما۔''

بہر حال ائمہ کرام کو چاہیے کہ وہ اس طرح کے حساس مسائل میں سمجھ داری سے کام لیا کریں، اللہ تعالیٰ بصیرت ودانائی سے ہمیں بہرہ ور کرے۔ (آمین)

نماز کے بعد آیت الکرسی اور معوذتین پڑھ کر ہاتھوں پر پھونک مارنا

سوال میں نماز کے بعد آیت الکرسی اور معوذتین پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونک مارتا ہوں پھر ان ہاتھوں کو تمام بدن پر پھیرتا ہوں، لیکن مجھے ایک ساتھی نے کہا ہے کہ یہ عمل رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب نماز کے بعد آیت الکرسی اور معوذتین پڑھنے کا مروجہ عمل میری نظر سے نہیں گزرا، البتہ سوتے وقت ایسا کرنا

---

[1] ابو داود، الوتر: ۱۴۸۰۔ [2] صحیح بخاری، الوضو: ۲۴۷۔

مسنون ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات جب اپنے بستر پر جاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اکٹھا کرتے، سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر ان میں پھونک مارتے پھر انہیں حسب استطاعت تمام بدن پر پھیرتے، اس کا آغاز اپنے سر سے کرتے پھر چہرے پر پھر جسم کے اگلے حصہ پر، اس عمل کو تین مرتبہ کرتے۔ [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیمار ہوئے تو آپ ﷺ خود معوذتین پڑھ کر دم کرتے، جب آپ ﷺ کو زیادہ تکلیف ہوگئی تو میں معوذتین پڑھتی اور آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر اس میں پھونک مارتی پھر اسے آپ ﷺ کے جسم پر پھیرتی تاکہ ان سورتوں کی برکت سے آپ ﷺ کو افاقہ ہو۔ [2] اس لیے دم کر کے اپنے ہاتھوں پر پھونک مارنے، پھر انہیں جسم پر پھیرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کیونکہ قرآنی آیات پڑھنے سے انسان کی پھونک میں برکت پیدا ہو جاتی ہے اور وہی برکت تمام جسم کو مس کرتی ہے اس سے اللہ تعالیٰ آفات و بلیات سے محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن آج کل عاملین حضرات نے دم کرنے کا ایک نیا طریقہ رائج کیا ہے کہ موبائل اور فون میں پھونک مارتے ہیں اور بیمار کو پہلے سے تلقین کی ہوتی ہے کہ وہ اپنے موبائل یا رسیور کو متاثرہ جگہ پر رکھ لے، قبل ازیں ایک یہ بھی طریقہ رائج تھا کہ سپیکر میں کچھ پڑھ کر پھونک ماری جاتی اور مریدین کو پہلے سے کہہ دیا جاتا کہ وہ پانی سے بھری ہوئی بوتلوں کے ڈھکن اتار دیں تاکہ سپیکر یا فون کے ذریعے وہ برکت پانی میں حلول کر جائے۔ ہمارے نزدیک ایسا دم محلِ نظر ہے اور اس قسم کے روحانی علاج سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

قبولیت دعا کے اوقات

سوال وہ کون سے اوقات ہیں جن میں دعا قبول ہوتی ہے نیز ان شخصیات کی بھی نشاندہی کریں جن کی دعا اللہ کے ہاں شرف پذیرائی سے نوازی جاتی ہے۔

جواب دعا ایک عبادت ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ دعا عبادت ہے پھر آپ نے تائید کے طور پر آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ''تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں وہ عنقریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' [3]

ایک حدیث میں ہے کہ دعا ہی تو اصل عبادت ہے۔ [4]

اگر دعا کرنے کے بعد ہمیں مطلوبہ چیز حاصل نہ ہو تو عبادت تو کسی صورت میں ضائع نہیں ہوگی۔ لیکن اس کے کچھ آداب اور شرائط ہیں۔ پہلا ادب یہ ہے کہ خلوص دل سے دعا کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعا کرتے وقت اللہ کے علاوہ کسی اور سے سوال نہ کیا جائے نیز دعا کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا جائے وہ اس طرح کہ اگر دعا کا نتیجہ سامنے نہ آئے تو انسان اللہ سے دعا کرنا ہی ترک کر دے۔ [5]

---

[1] صحیح بخاری، فضائل قرآن: ٥٠١٧۔ [2] بخاری، فضائل قرآن: ٥٠١٦۔ [3] المومن: ٦٠۔

[4] ابن ماجہ، الدعا: ٣٨٢٩۔ [5] صحیح مسلم، الذکر: ٦٩٣٦۔

پھر دعا کرتے وقت خیر و برکت کا سوال کرنا چاہیے۔ کوئی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کی جائے۔ [1]

چوتھی شرط یہ ہے کہ حضورِ قلب سے دعا کی جائے کیونکہ غفلت شعار دل کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ [2]

پانچواں ادب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کے لیے رزق حلال کا اہتمام کیا جائے۔ [3]

پھر جن اوقات میں دعا قبول ہوتی ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ رات کے آخری حصہ میں کیونکہ اس وقت بندہ اپنے رب کے بہت قریب ہوتا ہے۔ [4]

☆ اذان اور اقامت کے درمیان بھی دعا قبول ہوتی ہے۔ [5]

☆ سجدہ کی حالت میں بھی بندہ اللہ کے قریب ہوتا ہے اور دعا جلد قبول ہوتی ہے۔ [6]

☆ فرض نماز سے فراغت کے بعد قبولیت کا وقت ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو وصیت کی تھی۔ [7]

☆ بارش کے نزول اور مرغ کے اذان دیتے وقت۔ [8]

☆ اذان اور معرکہ حق و باطل کے وقت بھی دعا مسترد نہیں ہوتی۔ [9]

☆ عرفہ کے دن اور قدر کی رات بھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرتے ہیں۔ [10]

جن شخصیات کی دعا کو مسترد نہیں کیا جاتا ان میں سے مظلوم، مسافر، والد، حج اور عمرہ کرنے والا، غازی اور کسی کے لیے غائبانہ دعا کرنے والا سرفہرست ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ان کے حوالہ جات ذکر نہیں کیے گئے۔

درازی عمر کی دعا دینا

سوال اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ رکھے یا اللہ تعالیٰ آپ کی عمر کو طویل کرے، اس طرح کی دیگر دعائیں شرعاً کیا حیثیت رکھتی ہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کسی کو دعا دینے کے آداب سکھائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ دعا کرنے میں حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مذکورہ پہلی دعا اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حد سے تجاوز کرنا ہے کیونکہ دنیا میں دوام اور ہمیشگی محال ہے، ہمیشہ رہنا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یہ کسی اور کے لیے نہیں مانگی جا سکتی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝﴾ [11]

''جو کچھ زمین میں ہے، سب نے فنا ہونا ہے، صرف تمہارے رب کے چہرے کو بقا ہے جو صاحب جلال وعظمت

---

[1] صحیح مسلم، التوبۃ: ٦٩٣٦۔ [2] مسند امام احمد، ص: ١٧٧، ج٢۔ [3] صحیح مسلم، الزکوٰۃ: ٢٣٤٦۔

[4] صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ١٧٧٥۔ [5] صحیح ابن خزیمہ، ص: ٢٢٢، ج١۔

[6] صحیح مسلم، الصلوٰۃ: ١٠٨٣۔ [7] مسند امام احمد، ص: ٢٤، ج٥۔

[8] جامع ترمذی، الدعوات: ٣٤٥٩۔ [9] ابو داود، الجہاد: ١٤١١۔

[10] مسند امام احمد، ص: ١٤١٩، ج۔ [11] ٥٥/الرحمن: ٢٦،٢٧۔

ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے خطاب فرمایا:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴾ [1]

"اے پیغمبر ﷺ! ہم نے آپ سے پہلے کسی آدمی کو بقاء اور دوام نہیں بخشا، اگر آپ فوت ہو جائیں تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟"

ان تصریحات کی وجہ سے کسی کے لیے ہمیشہ رہنے کی دعا نہیں کرنی چاہیے، اسی طرح کسی کو یہ دعا دینا کہ اللہ آپ کو طویل عمر عطا فرمائے، یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ طول بقا اچھی اور بری دونوں ممکن ہیں، وہ انسان انتہائی برا ہے جس کی عمر طویل ہو لیکن کردار انتہائی گندا ہو، اگر اس میں خیر و برکت کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے تو اس میں چنداں حرج نہیں مثلاً یوں کہا جائے اللہ خیر و برکت کے ساتھ آپ کو طویل عمر عطا فرمائے یا اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی اطاعت فرمانبرداری میں لمبی عمر عطا کرے۔ بہرحال کسی کے لیے بھلائی کی دعا کرنی چاہیے اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس کے لیے وہی کچھ مانگتا ہے جو یہ دوسرے انسان کے لیے اللہ سے طلب کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)

دم کرنے کا شرعی طریقہ

سوال دم کرنے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب دم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآنی آیات یا ادعیہ ماثورہ پڑھ کر اپنے ہاتھ پر پھونک ماری جائے۔ پھر اس ہاتھ کو ممکن حد تک اپنے جسم پر پھیر لیا جائے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "رسول اللہ ﷺ اپنی مرض وفات میں اپنے آپ پر معوذتین ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾ پڑھ کر دم کرتے تھے، پھر جب ایسا کرنا آپ کے لیے دشوار ہو گیا تو میں انہیں پڑھ کر آپ پر دم کیا کرتی تھی، اور برکت کے لیے آپ کا ہاتھ آپ کے جسم پر پھیر دیتی تھی، راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا آپ کس طرح دم کرتے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ آپ اپنے ہاتھ پر دم کر کے اسے اپنے چہرے پر پھیرا کرتے تھے۔" [2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معوذتین کو بطور دم استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونک ماری جائے پھر ہاتھوں کو تمام جسم پر پھیر لیا جائے۔ (واللہ اعلم)

اجتماعی دعا کی حیثیت

سوال دعا کے متعلق درج ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے، (۱) فرض نماز یا نماز جمعہ کے بعد اگر کوئی کہہ دے کہ مریضوں کے لیے دعا کریں تو کیا اس وقت اجتماعی دعا کرنا جائز ہے۔ (۲) دعا کے آخر میں "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" پڑھنا سنت سے ثابت ہے؟ (۳) دعا کے بعد ہاتھوں کو منہ پھیرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

---

[1] ۲۱/الانبیاء: ۳۴۔ [2] صحیح بخاری، الطب: ۵۷۳۵۔

جواب اجتماعی دعا کی حیثیت بیان کرنے سے قبل ہم ایک اصولی بات بیان کرتے ہیں کہ جو کام رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ضروری بھی ہو اور اسے کرنے کے لیے کوئی رکاوٹ بھی موجود نہ ہو، اس کے باوجود پورے عہد نبوت میں اسے کوئی نہ کرے مگر اس طرح کا کام اگر کوئی ہمیشہ کرے اور دوسروں کو اس کی دعوت دے تو بلاشبہ یہ عمل بدعت کے زمرہ میں شمار ہوگا، ایک اور بات بھی قارئین کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ فرض نماز ایک الگ عبادت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرنا ایک الگ عبادت ہے اور جب کسی شرعی دلیل کے بغیر دو الگ الگ عبادتوں کو ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ ہمیشہ ایک ساتھ ادا کیا جائے کہ دونوں ایک دوسرے کا حصہ معلوم ہوں اور جو شخص ان عبادات کو مروجہ طریقہ کے مطابق ادا نہ کرے اسے برا بھلا کہا جائے تو ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا کیونکہ جب مختلف عبادات کو اپنی مرضی سے یکجا کر کے ایک نیا طریقہ رائج کیا جائے گا تو یہ سنت نہیں بلکہ بدعت ہو جائے گا، اس وضاحت کے بعد ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی موقع کی سنت کے ساتھ ایک اور سنت آ ملے تو ایسے حالات میں دونوں سنتوں کو بجا لانا درست ہے مثلاً فرض نماز سے فراغت کے بعد لوگ مسنون اذکار کی ادائیگی میں مصروف ہیں اچانک کسی نے کہا کہ بیماروں کے لیے دعا کریں تو کسی کے مطالبے پر دعا کرنا بھی سنت ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں دعا کرنا جائز ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ جمعہ میں مصروف تھے ایک آدمی نے بارش کے لیے دعا کرنے کی اپیل کر دی تو رسول اللہ ﷺ نے خطبہ چھوڑ کر ہاتھ اٹھائے، آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھائے، آپ نے بارش کے لیے اجتماعی دعا فرمائی۔ [1]

لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اجتماعی دعا کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے دعا شفا کی اپیل کرنے والوں کی ڈیوٹیاں لگا دی جائیں کہ فلاں نماز کے بعد فلاں آدمی نے دعا کی اپیل کرنی ہے تا کہ اجتماعی دعا کا عمل جاری رہے اور اس میں انقطاع نہ آئے، ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی امام اس سازش کو بھانپ کر دعا نہیں کرتا تو اسے دعا کا منکر نہیں کہنا چاہیے بلکہ ہمیں اپنے کردار پر نظر ثانی کرنی چاہیے، بہر حال ہم لوگ اس سلسلہ میں افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ اس سے اجتناب کرنا انتہائی ضروری ہے۔

☆ دعا کے اختتام پر رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ کے الفاظ ادا کرنا سنت سے ثابت نہیں ہیں اور نہ ہی ان الفاظ کے پڑھنے کو سنت کا درجہ دیا جائے، دراصل حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام جب بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو انہوں نے ان الفاظ سے دعا کی تھی:

﴿ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۲۷ ﴾ [2]

''اے پروردگار! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرما لے، بلاشبہ تو ہی سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اگر کوئی دعا کرنے کے بعد ان الفاظ کو اس لیے پڑھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قبولیت دعا کی اپیل کی جائے تو اس کی گنجائش ہے لیکن اس پر دوام اور استمرار درست نہیں کیونکہ سننے والوں کو یہ وہم ہوگا کہ شاید ایسا کرنا مسنون ہے اور دعا کا ایک حصہ ہے، بہر حال اگر اسے سنت خیال نہ کیا جائے تو ان قرآنی الفاظ کو دعا کے اختتام پر پڑھنے کا جواز ہے۔

☆ دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنا ایک عمل ہے اور یہ عمل صحیح سنت سے ثابت نہیں ہے، اس کے متعلق حضرت عبداللہ بن

---

[1] صحیح بخاری، الاستسقاء: ۱۰۲۹۔ [2] ۲/البقرہ: ۱۲۷۔

عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھوں کو چہرے پر پھیر لو۔'' [1] امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ حدیث کئی ایک اسناد سے مروی ہے، اس کے تمام طرق بے اصل اور انتہائی کمزور ہیں، یہ سند کچھ بہتر ہے لیکن یہ بھی ضعیف ہے۔'' [2]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے ضعف کا سبب بایں طور پر بیان کیا ہے کہ اس سند میں ایک راوی ہے جس کا نام نہیں بیان ہوا اگرچہ ابن ماجہ کی روایت میں صراحت ہے کہ وہ صالح بن سمان ہے لیکن یہ بھی انتہائی ضعیف ہیں۔ اس بنا پر اضافہ منکر ہے اور اس کا ابھی تک کوئی شاہد یا متابع نہیں مل سکا۔ اسی بنا پر علامہ عز بن عبدالسلام نے کہا ہے ''دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ صرف جاہل پھیرتا ہے۔'' [3] علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے متعلق ایک دو حدیثیں مروی ہیں جو قابل حجت نہیں ہیں۔ [4] بہر حال چہرے پر ہاتھ پھیرنے والی روایات صحیح نہیں ہیں۔ واللہ اعلم

قبرستان کے علاوہ جگہ پر قرآن خوانی کرنا

سوال اہل حدیث شمارہ نمبر ۱۷ مجریہ ۲۳ اپریل میں قبرستان میں قرآن خوانی کے متعلق ایک فتویٰ شائع ہوا ہے، آپ نے لکھا ہے کہ قبرستان چونکہ قراءت قرآن کا محل نہیں ہے لہٰذا اس میں قرآن خوانی کا اہتمام خلاف شریعت ہے، اس فتویٰ میں عدم جواز کے لیے اس امر کو علت قرار دیا گیا ہے کہ قبرستان، قراءت قرآن کا محل نہیں ہے، اس سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ جو مقامات قراءت قرآن کا محل ہیں وہاں قرآن خوانی کی جا سکتی ہے مثلاً:

☆ گھروں میں برکت کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

☆ کارخانوں اور فیکٹریوں میں کاروبار کی ترقی کے لیے قرآن خوانی کرائی جاتی ہے۔

☆ کسی بیمار کی شفایابی کے لیے بھی گھروں میں قرآن پڑھایا جاتا ہے۔

☆ ناگہانی آفات سے محفوظ رہنے کے لیے بسوں میں قرآن خوانی بھی کی جاتی ہے۔

☆ شادی ہال میں قرآن خوانی کا اہتمام ہوتا ہے۔

☆ فوت شدگان کے ایصال ثواب کے لیے حفاظ کرام کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں، اس قسم کا اہتمام گھروں اور مساجد میں کیا جاتا ہے۔

یہ مذکورہ تمام مقامات قرآن پڑھنے کا محل ہیں، کیا ان مقامات میں قرآن خوانی کرائی جا سکتی ہے، امید ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت اولین فرصت میں کر دیں گے تاکہ آپ کے استعمال کردہ الفاظ سے شکوک و شبہات پیدا نہ ہوں۔

جواب اصل بات یہ ہے کہ مروجہ قرآن خوانی کئی ایک اعتبار سے محل نظر ہے، قبرستان میں اس کا اہتمام کسی طرح سے

---

[1] ابو داود، الوتر: ۱٤۸٥۔ [2] ابو داود: ۱٤۸٥۔ [3] الاحادیث الصحیحہ: ٥۹٥۔ [4] مجموع الفتاویٰ، ٥۱٤، ج۲۲۔

بھی درست نہیں، اس کے ناجائز ہونے کی کئی ایک وجوہات ہیں، جن میں سے ہم نے صرف ایک علت کو بیان کیا تھا کہ قبرستان قراءت قرآن کا محل نہیں، لہٰذا وہاں قرآن خوانی کا اہتمام خلاف شریعت ہے، اس عبارت کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ جن مقامات میں قرآن پڑھا جا سکتا ہے وہاں مروجہ قرآن خوانی جائز ہے، بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق مروجہ قرآن خوانی برائے حصول برکت یا شفاء مریضاں یا ترقی کاروبار یا ایصال ثواب ناجائز ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ عمل ثابت نہیں ہے، اگر ایسا کرنا خیر و برکت کا ذریعہ ہوتا تو اسلاف ضرور عمل میں لاتے، خیر القرون میں اس کا اہتمام نہ کرنا اس کے محل نظر ہونے کے لیے کافی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''جو شخص ہمارے اس امر دین میں نیا کام کرتا ہے وہ مردود اور نا قابل قبول ہے۔'' [1]

نیز آپ کا فرمان ہے: ''جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہماری مہر ثبت نہیں وہ رد کر دینے کے قابل ہے۔'' [2]

اس طرح کے غیر مشروع کام کو جائز قرار دینا انتہائی سنگین اقدام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں دین مکمل نہیں ہوا تھا، حالانکہ قرآن کریم نے صراحت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی دین اسلام مکمل ہو چکا تھا، اب اس میں کسی چیز کے اضافہ کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، ایسا کرنا بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

بہر حال مروجہ قرآن خوانی بدعت ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، الصلح: ۲۶۹۷۔ [2] صحیح مسلم، الاقضیہ: ۱۷۱۸۔
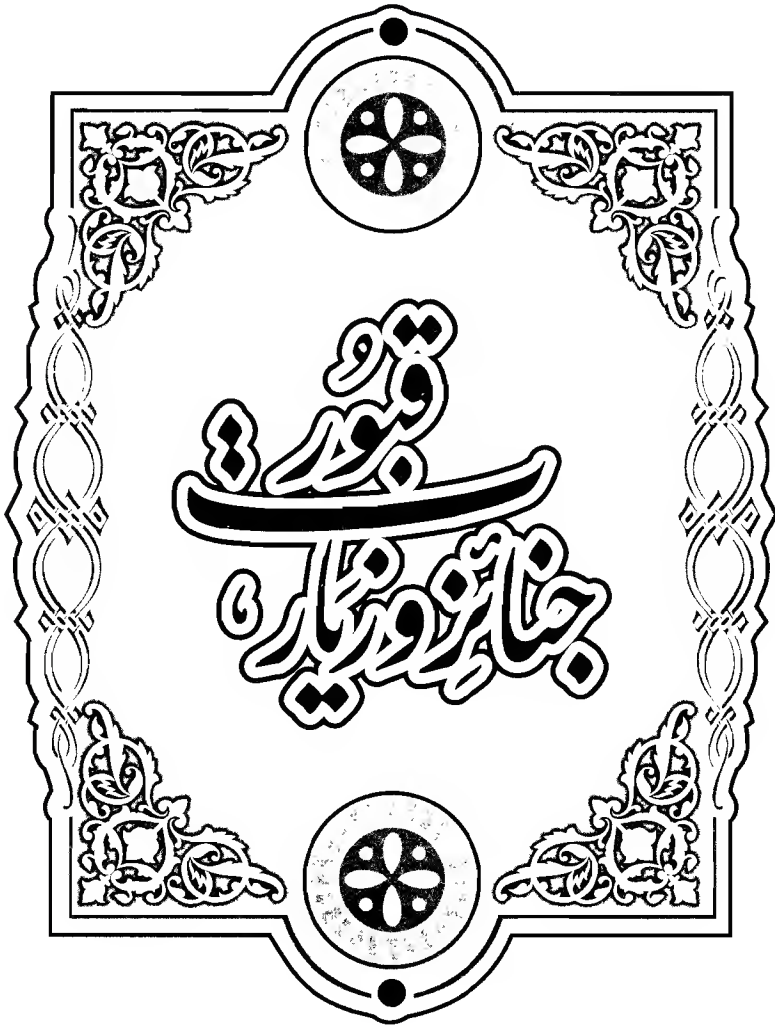
جنائز و زیارت قبور

جنائزِ وزیارتِ قبور

میت کو غسل دینے کا طریقہ

سوال میت کو غسل کیسے دیا جاتا ہے؟ کتاب وسنت کے مطابق وضاحت سے تحریر کریں کیونکہ ہم میں سے اکثر اس کا طریقہ نہیں جانتے۔

جواب میت کو غسل دینا ضروری ہے اور غسل کے لیے کسی ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو بااعتماد اور مسائل غسل سے واقف ہو کیونکہ میت کو غسل دینا ایک شرعی حکم ہے اور اس کا ایک خاص طریقہ ہے لہٰذا اسے وہی شخص صحیح طور پر سرانجام دے سکتا ہے جو اس سلسلہ میں احکام شرعیہ سے واقف ہو، میت کو غسل دینے کے لیے حسب ذیل اقدام کرنے چاہئیں۔

① میت کو غسل دینے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ ہو، مکان کی چھت کے نیچے یا کپڑے سے اوٹ کر لی جائے۔

② میت کو غسل کے تختہ پر اس طرح لٹایا جائے کہ پاؤں کی طرف سے کچھ نیچے ہو تاکہ جسم کا میل کچیل اور استعمال شدہ پانی پاؤں کی طرف سے نیچے بہہ جائے۔

③ غسل کے مقام پر غسل دینے والا اور اس کے معاون حضرات ہی موجود ہوں، وہاں زائد افراد کی موجودگی درست نہیں ہے۔

④ غسل سے پہلے اگر ناخن یا زیر ناف بال بڑھے ہوں تو انہیں کاٹ دیا جائے، اسی طرح مونچھیں اگر حد سے زیادہ بڑھ گئی ہوں تو انہیں تراش دیا جائے۔

⑤ غسل دینے والا میت کا سر اس قدر اٹھائے کہ وہ بیٹھنے کی حالت کے قریب ہو جائے پھر اس کے پیٹ پر آہستہ آہستہ دبا کر ہاتھ پھیرے تاکہ نجاست نکل جائے، پھر وہاں اچھی طرح پانی بہا دیا جائے تاکہ نجاست بہہ جائے۔

⑥ غسل دینے والا ہاتھوں پر کپڑے کی تھیلیاں چڑھا کر میت کو استنجا کرائے، اگر ڈھیلے استعمال کرنے کی ضرورت ہو تو انہیں بھی استعمال کرے۔

⑦ اس کے بعد غسل کی نیت کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھے اور نماز کی طرح اسے وضو کرائے البتہ کلی کے لیے منہ میں اور اسی طرح ناک میں پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں بلکہ گیلے ہاتھ یا کپڑے سے میت کے دانت، منہ اور ناک صاف کر لینا کافی ہے۔

⑧ میت کا سر اور ڈاڑھی صابن وغیرہ سے اچھی طرح دھوئے اور انہیں صاف کر کے پھر جسم کی دائیں جانب سے غسل کا آغاز اس

طرح کرے کہ گردن، کندھا، بازو اور ہاتھ دھوئے پھر دائیں پاؤں تک دھوئے پھر بائیں پہلو کو اٹھا کر اس کی پشت اور کمر کو دھوئے۔

⑨ بائیں جانب بھی اسی طرح دھوئی جائے جس طرح دائیں پہلو کو دھویا تھا، غسل دیتے وقت صابن کا استعمال کیا جائے اور اچھی طرح میل کچیل اتاری جائے۔

⑩ آخری بار پانی بہاتے وقت اس میں کافور شامل کر لیا جائے کیونکہ وہ میت کے جسم کو نرم، خوشبودار اور ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

⑪ اس کے بعد میت کے جسم کو کپڑے سے خشک کر لیا جائے اگر میت عورت ہے تو اس کے سر کے بالوں کی تین لٹیں بنا کر انہیں پیچھے کی طرف ڈال دیا جائے۔

⑫ اگر میت کو غسل دینے کے لیے پانی میسر نہ ہو یا پانی کے استعمال سے جسم کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو میت کو مٹی کے ساتھ تیمم کرا دیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ مسح کروانے والا میت کے چہرے اور ہاتھوں پہ مسح کرے۔

⑬ بہتر ہے غسل سے فراغت کے بعد غسل دینے والا خود غسل کر لے۔ ممکن ہے کہ اس کے جسم سے نکلنے والی نجاست وغیرہ اسے لگ گئی ہو، اگر اسے اپنی طہارت کا یقین ہے تو غسل کرنا ضروری نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

میت کے گھر اجتماع کو نوحہ تصور کرنا

سوال ایک حدیث میں ہے کہ میت کے گھر اجتماع کو ہم نوحہ شمار کرتے تھے، اس حدیث کا حوالہ درکار ہے اور اس کا مطلب بھی بیان کریں۔

جواب حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم میت کے اہل خانہ کے پاس جمع ہونے اور تدفین کے بعد کھانا تیار کرنے کو نوحہ شمار کرتے تھے۔ [1] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے۔ [2]

حافظ بوصیری نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ [3] اس حدیث میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں۔

❶ میت کے گھر تعزیت کے لیے اجتماع کرنا اور وہاں کھانے کا اہتمام کرنا نوحہ ہے۔

❷ نوحہ حرام ہے جیسا کہ متعدد احادیث میں اس کی حرمت کا ذکر ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ شہید ہو گئے ہیں تو آپ نے فرمایا: ''جعفر رضی اللہ عنہ کے اہل خانہ کے لیے کھانا تیار کرو، کیونکہ انہیں ایسی تکلیف دہ خبر موصول ہوئی ہے جو انہیں کھانا پکانے سے مشغول رکھے گی۔'' [4]

یہ دونوں احادیث آپس میں متعارض معلوم ہوتی ہیں، ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اگر اہل میت کے لیے کوئی دوسرا آدمی یا گھر کھانا تیار کر کے لائے اور انہیں کھلانے کا اہتمام کرے تو درست ہے لیکن میت کے گھر دوسرے لوگوں کے لیے کھانا تیار کرنا اور

---

[1] ابن ماجه، الجنائز: ١٦١٢۔ [2] مسند امام احمد، ص: ٢٠٤، ج٢۔

[3] مجمع الزوائد، ص: ٥٣٥، ج١۔ [4] ابوداود، الجنائز: ٣١٣٢۔

اجتماع کے لیے اہتمام کرنا منع ہے، اس لیے میت کے گھر تعزیت کے لیے خصوصی طور پر اجتماع کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی ان کے گھر آئے مہمانوں کے لیے کھانا تیار کرنا جائز ہے، البتہ میت کی وجہ سے چونکہ اہل خانہ پریشان خاطر ہیں، ان کے لیے باہر سے کھانا تیار کر کے لانا اور انہیں کھلانے کا اہتمام مستحب ہے۔ (واللہ اعلم)

بیوی کا مردہ خاوند کو غسل دینا

سوال میں نے ایک پمفلٹ میں پڑھا ہے کہ اگر بیوی فوت ہو جائے تو خاوند اسے غسل نہ دے کیونکہ وہ بیوی کی وفات کے بعد اس کے لیے غیر محرم ہو جاتا ہے لیکن جب خاوند فوت ہو جائے تو بیوی اسے غسل دے سکتی ہے کیونکہ وہ دوران عدت مرنے والے کی بیوی رہتی ہے، قرآن وحدیث کے مطابق اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب پمفلٹ کے حوالے سے سوال میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس کا تعلق رائے اور قیاس سے ہے، قرآن وحدیث نے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ شریعت میں اس کے خلاف حکم ہے۔ کیونکہ ہماری شریعت میں میاں بیوی ایک دوسرے کو غسل دینے کے زیادہ حقدار ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا تھا: ''اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہو گئی تو میں تمہیں غسل دوں گا۔'' [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک دوسری روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اگر مجھے اپنے اس معاملہ کا پہلے علم ہو جاتا جس کا مجھے تاخیر سے علم ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی ازواج ہی غسل دیتیں۔ [2]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد انہیں ان کے خاوند حضرت علی رضی اللہ عنہ غسل دیں چنانچہ ان کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی ان کو غسل دیا تھا۔ [3]

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم کرے جسے مرنے کے بعد اس کی بیوی غسل دے اور اسے پرانے کپڑوں میں کفن دیا جائے، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے غسل دیا تھا اور انہیں استعمال شدہ کپڑوں میں کفنایا گیا تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس امر کی وصیت کی تھی چنانچہ وہ اکیلی غسل دینے میں کمزور تھیں، اس لیے انہوں نے ان کے بیٹے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کا تعاون لیا تھا۔ [4] امام بیہقی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس کے شواہد بھی ذکر کیے ہیں۔ [5] علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے اس عمل پر کوئی انکار نہیں کیا تو یہ عمل اجماع کی مانند ہے۔ [6]

جمہور اہل علم بھی اس کے قائل ہیں البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مرد اپنی بیوی کو غسل نہیں دے سکتا حتیٰ کہ اگر خاوند کے علاوہ وہاں غسل دینے والا کوئی دوسرا نہ ہو تو پھر بھی اسے غسل دینے کی اجازت نہیں بلکہ بیوی کو تیمم کرائے تاہم بیوی اپنے خاوند کو غسل دے سکتی ہے۔ [7]

---

[1] ابن ماجه، الجنائز: ١٤٦٥۔ [2] ابو داود، الجنائز: ١٣٤١۔ [3] دارقطني، ص: ٧٩، ج ٢۔ [4] بيهقي، ص: ٣٩٧، ج ٣۔
[5] تعليق روضة النديه، ص: ٤٣٠، ج ١۔ [6] نيل الاوطار، ص: ٦٧٦، ج ٢۔ [7] المغني، ص: ٤١، ج ٣۔

بہر حال سوال میں جو موقف پیش کیا ہے، اسے احناف نے عقلی طور پر اختیار کیا ہے، کتاب وسنت میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز جنازہ کی قراءت

سوال نماز جنازہ میں قراءت آہستہ کرنی چاہیے یا با آواز بلند قراءت کی جائے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب نماز جنازہ میں قراءت آہستہ اور با آواز بلند دونوں طرح ثابت ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھائی، اس میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کسی اور سورت کو بھی ملایا اور انہیں اونچی آواز سے پڑھا، جب اس سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ یہ حق اور سنت ہے۔ [1] اونچی آواز سے قراءت کرنے کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے، حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھائی تو ہم نے آپ کی جنازہ میں پڑھی ہوئی دعا یاد کر لی۔ [2]

امام کے پیچھے کھڑے ہو کر دعا اس وقت یاد کی جا سکتی ہے جب وہ اونچی آواز سے نماز جنازہ پڑھا رہا ہو، اس لیے نماز جنازہ میں اونچی آواز سے قراءت کی جا سکتی ہے، البتہ آہستہ قراءت کرنا بھی جائز ہے جیسا کہ حضرت ابوامامہ بن سہل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: ''سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد آہستہ آواز سے سورۂ فاتحہ پڑھی جائے پھر تین تکبیریں کہی جائیں اور آخری تکبیر کے بعد سلام پھیر دیا جائے۔ [3]

بہر حال نماز جنازہ میں قراءت کے متعلق توسع ہے، اونچی اور آہستہ آواز سے دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

نماز جنازہ کے بعد میت کا منہ دیکھنا

سوال نماز جنازہ کے بعد میت کا منہ دیکھا جاتا ہے، کیا یہ عمل سنت سے ثابت ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب نماز جنازہ کے بعد میت کا منہ دیکھنا جائز ہے خواہ جنازہ سے پہلے ہو یا بعد میں لیکن اسے جنازے کا جزو نہ بنایا جائے۔ اگر چہرہ نہ دیکھا جائے تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بہر حال میت کا چہرہ دیکھنا مشروع ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ جب میرے والد گرامی غزوۂ احد میں شہید ہوئے تو میں ان کے چہرے سے کپڑا اٹھانے لگا، اس وقت میں رو رہا تھا، لوگوں نے مجھے ایسا کرنے سے روکا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے منع نہیں کرتے تھے۔ [4]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھاری دار چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا، انہوں نے آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے کپڑا اٹھایا پھر جھکے اور آپ کا بوسہ لیا۔ [5] امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''جب میت کو کفن میں لپیٹ دیا جائے تو اسے دیکھنا اور اس کے پاس جانا۔''

بہر حال میت کو کفن دینے کے بعد اس کا چہرہ کھولا جا سکتا ہے اور اس کا منہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] نسائی، الجنائز: ۱۹۹۰۔ [2] مسند امام احمد، ص: ۲۳، ج ۶۔ [3] سنن نسائی، الجنائز: ۱۹۹۱۔

[4] صحیح بخاری، الجنائز: ۱۲۴۴۔ [5] صحیح بخاری، الجنائز: ۲۱۴۱۔

ناتمام بچے کا جنازہ؟

سوال ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ ناتمام بچے کی ولادت پر اس کا جنازہ ادا کیا جائے گا جب کہ ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ اس بچے کا جنازہ پڑھا جائے جو پیدائش کے وقت چیخ مارے۔ترمذی میں ہے کہ بچے کا نہ جنازہ پڑھا جائے اور نہ ہی اسے وارث بنایا جائے تا آنکہ وہ چیخ مارے اور بخاری میں ہے کہ جب بچہ چیخ مارے تو اس کا جنازہ ادا کیا جائے اور جو چیخ نہ مارے اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے کیونکہ وہ ناتمام پیدا ہوا ہے،ان احادیث میں بظاہر تعارض ہے تطبیق کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

جواب بچے کا جنازہ پڑھنا جائز ہے،حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''بچے کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔''[1]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:''اس حدیث پر بعض اہل علم کا عمل ہے،وہ کہتے ہیں کہ بچے کا جنازہ پڑھا جائے اگرچہ وہ پیدائش کے وقت چیخ نہ مارے لیکن اس میں روح ڈالی جا چکی ہو۔'' چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''ناتمام بچے کا بھی جنازہ پڑھا جائے اور اس کے والدین کے لیے بخشش اور رحمت کی دعا کی جائے۔''[2]

اور ناتمام بچے سے مراد وہ ہے جو شکم مادر میں چار ماہ پورے کر چکا ہو اور اس میں روح پھونکی جا چکی ہو،پھر وفات پائے البتہ اس سے پہلے کی صورت میں نماز ادا نہیں ہوگی اس لیے کہ ایسی حالت میں اسے میت نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ اس بات کی وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:''تمہاری پیدائش اس طرح ہے کہ چالیس دن تک وہ ماں کے پیٹ میں نطفے کی شکل میں رہتا ہے،پھر اتنے ہی دن لوتھڑے کی شکل میں پھر اتنے ہی دن بوٹی کی صورت اختیار کر لیتا ہے پھر ایک فرشتہ بھیج دیا جاتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے۔''[3]

ایک حدیث میں ہے کہ جب بچہ چیخ مارے تو جنازہ پڑھا جائے اور اسے وارث بنایا جائے۔[4] علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ناقابل حجت ٹھہرایا ہے۔[5] سوال میں جامع ترمذی کی ایک حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:''بچے کا نہ جنازہ پڑھا جائے اور نہ ہی اسے وارث بنایا جائے تا آنکہ وہ چیخ مارے۔''[6]

امام ترمذی نے اسے بیان کرنے کے بعد مضطرب قرار دیا ہے۔البتہ بچے کو ترکہ میں سے حصہ دینے کی شرط ضرور ہے کہ وہ پیدائش کے وقت چیخ مارے لیکن نماز جنازہ کے لیے اس کا چیخ مارنا شرط نہیں ہے۔سوال میں صحیح بخاری کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔دراصل یہ حدیث نہیں بلکہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے وہ فرماتے ہیں:''جب بچہ چیخ مارے تو اس کا جنازہ ادا کیا جائے اور جو چیخ نہ مارے،اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے،کیونکہ وہ ناتمام پیدا ہوا ہے۔''[7]

ظاہر ہے کہ امام زہری کے قول کی مرفوع حدیث کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے،اس سلسلہ میں ابوداؤد کے حوالے سے

---

[1] جامع ترمذی، الجنائز: ۱۰۳۱۔ [2] ابوداود، الجنائز: ۳۱۸۰۔ [3] صحیح بخاری، بدء الخلق: ۳۲۰۸۔
[4] ابن ماجه، الجنائز: ۱۵۰۸، یہ روایت ضعیف ہے؛ نصب الروایة، ص: ۲۷۷، ج ۲۔
[5] احکام الجنائز، ص: ۸۱۔ [6] ترمذی، الجنائز: ۱۰۳۲۔ [7] صحیح بخاری، الجنائز: ۱۳۵۸۔

مرفوع حدیث قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے۔ بہر حال بچے کا جنازہ پڑھا جا سکتا ہے خواہ وہ نا تمام ہی پیدا ہوا ہو اور جن احادیث میں جنازہ کے لیے چیخ مارنے کی شرط بیان کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہیں، البتہ وراثت میں اسے شریک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ چیخ مارے جو اس کے زندہ پیدا ہونے کی علامت ہے۔ (واللہ اعلم)

خیانت کرنے والے کا جنازہ

سوال حدیث میں ہے کہ خیبر کے دن ایک آدمی فوت ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم اس کی نماز جنازہ پڑھو۔" (میں نہیں پڑھوں گا) اس نے مالِ غنیمت سے خیانت کا ارتکاب کیا تھا۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس حکم سے دو طرح کے لوگ مستثنیٰ ہیں، ان کی نماز جنازہ ادا کرنا فرض نہیں، ان میں سے ایک نابالغ بچہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لخت جگر ابراہیم کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ اب بتایا جائے کہ ابراہیم نے کون سی خیانت کی تھی جس بناء پر جنازہ نہ پڑھا گیا۔ اس کے علاوہ احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بیٹے ابراہیم کا جنازہ پڑھا تھا جیسا کہ ابن ماجہ میں اس امر کی صراحت ہے۔

جواب مذکورہ سوال میں نماز جنازہ کے متعلق علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف کئی ایک احادیث میں موجود ہے، ان احادیث میں سے ایک حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے جس میں ایک صحابی کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "تم اس کی نماز جنازہ پڑھو۔" لیکن آپ نے اس کا جنازہ نہ پڑھا کیونکہ اس نے مالِ غنیمت کے سامان سے کچھ خیانت کی تھی جیسا کہ سوال میں بیان کیا گیا ہے۔ [1]

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان کا جنازہ پڑھنا فرض ہے چونکہ آپ نے نہیں پڑھا اس لیے فرض عین کے بجائے فرض کفایہ ہے، اس حکم سے دو طرح کے لوگ مستثنیٰ ہیں۔ ایک نابالغ بچہ اور دوسرا میدان کارزار میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والا شہید، اس سلسلہ میں علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے دلیل کے طور پر رسول اللہ ﷺ کا ایک عمل پیش کیا ہے کہ آپ نے اپنے لخت جگر ابراہیم کا جنازہ نہیں پڑھا تھا۔ [2]

جنازہ نہ پڑھنے کا سبب نعوذ باللہ خیانت وغیرہ نہ تھی جیسا کہ سوال میں تاثر دیا گیا ہے، اس کی وجہ بیان جواز ہو سکتی ہے۔ جن روایات میں حضرت ابراہیم کے جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے۔ وہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "وہ روایات معلول ہیں، مرسل ہیں یا ان میں ضعف شدید پایا جاتا ہے، جیسا کہ نصب الرایہ ص:۲۷۹ میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔" [3]

انہوں نے اپنے مؤقف کی تائید میں ایک دوسری روایت بھی پیش کی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا، آیا رسول اللہ ﷺ نے اپنے بیٹے حضرت ابراہیم کا جنازہ پڑھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا مجھے علم نہیں ہے۔ [4] اگر آپ نے جنازہ پڑھا ہوتا تو کم از کم خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ پر یہ بات مخفی نہیں رہتی جبکہ وہ سفر وحضر میں آپ کے ساتھ رہے ہیں اور دس سال تک آپ کی خدمت کی ہے۔ بہر حال بچے کا جنازہ عام مسلمانوں کی طرح فرض نہیں ہے بلکہ اگر کوئی پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے جیسا کہ دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق ایک الگ عنوان قائم کیا ہے۔

---

[1] ابو داود، الجهاد: ۲۷۱۰۔ [2] ابو داود، الجنائز: ۳۱۸۷۔ [3] حاشیه احکام الجنائز، ص: ۸۰۔

[4] مسند امام احمد، ص: ۲۸۱، ج۳۔

قبر پر کتبہ لگانا

سوال قبر کی شناخت کے لیے اس پر کتبہ لگایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ آج کل قبروں پر پتھر کی تختی لگائی جاتی ہے جس پر میت کا نام ولدیت اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب قبر کی شناخت کے لیے اس پر کوئی پتھر وغیرہ رکھا جا سکتا ہے یا لکڑی گاڑی جا سکتی ہے اس میں چنداں حرج نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو دفن کرنے کے بعد ان کی قبر پر ایک بھاری پتھر رکھا اور فرمایا: ''اس نشانی سے میں اپنے بھائی کی قبر کو پہچان لوں گا اور اس کے اہل میں سے جو فوت ہوگا اس کے قریب ہی دفن کروں گا۔'' ❶

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر پر بطور علامت ایک بھاری پتھر رکھا تھا۔ ❷

لیکن قبر پر کتبہ لگانا، تختی پر اس کا نام، ولدیت اور تاریخ وفات لکھ کر قبر پر لگانا کسی صورت میں جائز نہیں ہے کیونکہ حدیث میں اس کی بطور خاص ممانعت ہے چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر پر کوئی بھی تحریر لکھنے سے منع فرمایا ہے۔ ❸

اس حدیث کے مطابق قبر پر لکھنا یا کتبہ لگانا حرام ہے البتہ اس کی شناخت کے لیے کوئی جائز علامت رکھی جا سکتی ہے وہ پتھر ہو یا لکڑی، اسے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

قبر پر دعا کرنا

سوال قبرستان میں اہل قبور کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر جائز ہے تو دعا کرتے وقت قبلہ رو ہونا چاہیے یا قبر کی طرف منہ کیا جائے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب قبرستان میں اہل قبور کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ رات کے وقت بقیع میں تشریف لے گئے، وہاں جا کر کھڑے ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کی پھر واپس چلے آئے۔ ❹ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بقیع میں تین مرتبہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اہل بقیع کے لیے دعا فرمائی۔ ❺ لیکن دعا کرتے وقت قبر کی طرف منہ کرنے کے بجائے قبلہ رو ہونا چاہیے رسول اللہ ﷺ نے قبر کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ ❻ چونکہ نماز کی روح دعا ہے اس لیے دعا کرتے وقت بھی قبر کی طرف منہ نہیں کرنا چاہیے، البتہ عام حالات میں امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے قبلہ رخ اور غیر قبلہ رخ دونوں طرح دعا کو جائز قرار دیا ہے، انہوں نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''غیر قبلہ رخ دعا کرنا'' ❼

بہرحال قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کی جا سکتی ہے لیکن دعا کرتے وقت قبلہ رخ ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ ابوداود، الجنائز: ٣٢٠٦۔ ❷ ابن ماجه، الجنائز: ١٥٦١۔ ❸ ابن ماجه، الجنائز: ١٥٦٣۔
❹ مسند امام احمد، ص: ٩٢، ج٦۔ ❺ صحیح مسلم، الجنائز: ٢٢٥٥۔ ❻ صحیح مسلم، الجنائز: ٢٢٥٠۔
❼ کتاب الدعوات۔

قبروں کی مرمت کرنا

سوال بارش کی وجہ سے اگر قبر گر جائے تو کیا قبر کو درست کیا جا سکتا ہے، اگر میت کو نکالنا پڑے تو کیا شرعاً اس کی اجازت ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اگر قبر گرنے سے آیندہ اس کے معدوم ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے مرمت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ قبر کو برقرار رکھنا اور اس کی شناخت کے لیے اس پر پتھر وغیرہ رکھنا مشروع ہے، اس بناء پر مسمار شدہ قبروں کو درست کیا جا سکتا ہے، ضرورت پڑنے پر میت کو بھی قبر سے نکالا جا سکتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے" کیا کسی ضرورت کے پیش نظر میت کو قبر یا لحد سے نکالا جا سکتا ہے؟ پھر آپ نے وہ حدیث ذکر کی ہے کہ عبداللہ بن ابی منافق کو قبر میں داخل کرنے کے بعد دوبارہ نکالا گیا اور آپ نے اپنی قمیص پہنائی پھر اسے دفن کیا گیا۔ [1] نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد گرامی کو دفن کرنے کے چھ ماہ بعد قبر سے نکالا اور دوسری جگہ پر دفن کیا تھا، ان کے صرف کان کا تھوڑا سا حصہ متاثر ہوا تھا، باقی جسم اسی طرح تھا گویا ابھی دفن کیا گیا ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت لی ہوگی، کیونکہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے، پھر چھیالیس سال بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں ان کی دوبارہ قبر کشائی کی گئی اور انہیں نکال کر کسی دوسری جگہ دفن کیا گیا، کیونکہ سیلاب کی وجہ سے قبریں مسمار ہو چکی تھیں نیز حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وہاں پانی کا ایک چشمہ جاری کرنا چاہتے تھے۔ [2]

بہرحال اگر میت کو دفن کیے ہوئے زیادہ عرصہ بیت گیا ہو تو میت کو نکالنے کے بجائے قبر کو ہی درست کر دیا جائے، عام طور پر دفن کے چھ ماہ بعد زمین میت پر اثر انداز ہونے کا آغاز کرتی ہے، اگر میت کے خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اسے نکال کر کفن سے مٹی وغیرہ دور کر دی جائے پھر اسے دفن کر دیا جائے، ایسا کرنا صرف جائز ہے ضروری نہیں، اس گنجائش کے باوجود ہمارا ذاتی رجحان یہ ہے کہ میت کو اپنی جگہ پر رہنے دیا جائے اور صرف قبر پر مٹی ڈال کر اسے درست کر دیا جائے، کیونکہ معلوم نہیں میت کس حالت میں ہو؟ ایسا نہ ہو کہ اسے نکال کر کسی دیگر پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔ (واللہ اعلم)

مردہ پیدا ہونے والے بچے کا جنازہ

سوال جو بچہ مردہ پیدا ہو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے، نیز اسے کہاں دفن کیا جائے؟ ہمارے ہاں اس کا نہ تو جنازہ پڑھا جاتا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے قبرستانوں میں اسے دفن کیا جاتا ہے، اس کے متعلق وضاحت کریں۔

جواب نومولود بچہ اگر فوت ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھنا مشروع ہے، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بچے کی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے۔" [3]

ایک روایت بایں الفاظ ہے: "ناتمام بچے کی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے۔" [4]

---

[1] صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۳۵۱۔ [2] موطا امام مالک، کتاب الجهاد۔ [3] جامع ترمذی، الجنائز: ۱۰۳۱۔
[4] ابو داود، الجنائز: ۳۱۸۰۔

اس حدیث میں مزید وضاحت ہے کہ اس کے والدین کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کی جائے اور اس کا جنازہ پڑھا جائے۔ ❶
اور یہ بات ظاہر ہے کہ ناتمام سے مراد وہ بچہ جو اپنی ماں کے پیٹ میں چار ماہ پورے کر چکا ہو، اور اس میں روح پھونک دی گئی ہو پھر اس کی موت واقع ہوئی ہو، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بچہ جب اپنی ماں کے پیٹ میں چار ماہ کی عمر کو پہنچتا ہے، تو اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ ❷ اگر کوئی چار ماہ کی مدت سے پہلے ساقط ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی کیونکہ اسے اس صورت میں میت نہیں کہا جا سکتا۔

ایک روایت میں ہے کہ اس بچے کی نماز جنازہ پڑھی جائے جو پیدا ہونے کے بعد چیخ مارے اور اسے وارث بھی بنایا جائے۔ ❸
امام ترمذی نے بھی اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، الغرض چار ماہ کے بعد اگر بچہ ناتمام یعنی مردہ پیدا ہو تو اس کا جنازہ پڑھنا مشروع ہے، نیز اسے گھر میں دفن نہیں کرنا چاہیے بلکہ مسلمانوں کے قبرستان میں ہی دفن کیا جائے، بعض جہلا اس کا نام رکھتے ہیں اور اس کا عقیقہ بھی کرتے ہیں، یہ سب باتیں خود ساختہ ہیں، کیونکہ نام رکھنا اور عقیقہ کرنا زندہ ہونے والے بچے کے ساتویں دن ہوتا ہے، واضح رہے ناتمام بچے کا اگر جنازہ نہ پڑھا جائے تو بھی جائز ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لخت جگر ابراہیم رضی اللہ عنہ کا جنازہ نہیں پڑھا تھا جن کی عمر تقریباً ڈیڑھ سال تھی۔ (واللہ اعلم)

مرنے والے کے پاس سورۂ یٰسین پڑھنا

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ مرنے والے کے پاس سورۂ یٰسین پڑھنے سے اس کی روح آسانی سے قبض ہو جاتی ہے؟ ہمارے ہاں ایسے موقع پر سورۂ یٰسین تلاوت کرنے کا عام رواج ہے، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں۔

جواب قریب الموت انسان کے پاس تلاوت قرآن خاص طور پر سورۂ یٰسین پڑھنے کی کوئی دلیل قرآن و سنت میں نہیں ہے بلکہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میت کے قریب سورۂ یٰسین پڑھنے کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے۔ ❹

عام طور پر اس سلسلہ میں دو روایات پیش کی جاتی ہیں جو محدثین کے معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں۔

❶ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے مرنے والوں کے قریب سورۂ یٰسین پڑھا کرو۔'' ❺
ابن قطان نے اس حدیث کو اضطراب اور ابو عثمان کی جہالت کی بناء پر معلول قرار دیا ہے، ابو بکر ابن العربی نے امام دارقطنی سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف السند اور مجہول المتن ہے انہوں نے مزید کہا کہ اس باب میں کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے۔ ❻

❷ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''جس میت پر سورۂ یٰسین کی تلاوت کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر آسانی کر دیتے ہیں۔ ❼
یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں مروان بن سالم راوی ثقہ نہیں ہے۔ ❽

ابو عروبہ نے کہا کہ یہ راوی موضوع احادیث بیان کرتا ہے۔ ❾

---

❶ ابو داود، حدیث: ۳۱۸۰۔ ❷ بخاری، بدء الخلق: ۳۲۰۸۔ ❸ ترمذی، الجنائز: ۱۰۳۲۔
❹ احکام الجنائز، ص: ۱۱۱۔ ❺ مسند امام احمد، ص: ۲۶،۵۔ ❻ تلخیص الحبیر، ص: ۱۰۴، ج۲۔
❼ اخبار اصبہان، ص: ۱۸۸، ج۱۔ ❽ میزان اعتدال، ص: ۹۰، ج۴۔ ❾ تلخیص، ارواء الغلیل، ص: ۱۵۲، ج۳۔

بہرحال قریب الموت شخص کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرنی چاہیے جس کی دو صورتیں ہیں۔

(الف) اس کے پاس بیٹھ کر کلمہ طیبہ پڑھا جائے تاکہ وہ دیکھ کر اسے پڑھے اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہو۔

(ب) اسے کلمہ طیبہ پڑھنے کے متعلق کہا جائے جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ سے ایسا کرنا ثابت ہے، لیکن سورۃ یٰسین وغیرہ کی تلاوت صحیح احادیث سے ثابت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

رسول اللہ ﷺ کے بیٹے کی نماز جنازہ

سوال آپ نے اہل حدیث کے ایک شمارہ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لخت جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی، اس کی کیا دلیل ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ کے جنازہ کے متعلق مختلف احادیث مروی ہیں، چنانچہ بعض احادیث میں ان پر نماز جنازہ پڑھنے کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے لخت جگر سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو آپ نے ان کی نماز پڑھی تھی۔ [1]

لیکن اس حدیث کی سند میں ابراہیم بن عثمان راوی کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ محدثین کرام نے اس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جس راوی کے متعلق یہ الفاظ استعمال کریں وہ سخت ضعیف ہوتا ہے۔ [2]

اسی طرح حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لخت جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا جنازہ پڑھا تھا۔ [3] لیکن اس کی سند میں مشہور ضعیف راوی جابر جعفی ہے، لہٰذا یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ بہرحال جنازہ پڑھنے کے متعلق جس قدر روایات کتب حدیث میں مروی ہیں وہ ضعیف ہیں یا مرسل، اس قسم کی روایات محدثین کے ہاں قابل حجت نہیں ہیں، تفصیل کے لیے نصب الرایہ، ص: ۲۷۸، ج ۲ کا مطالعہ مفید رہے گا۔

آپ کا جنازہ نہ پڑھنے کے متعلق صحیح روایات موجود ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لخت جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو آپ نے اس کا جنازہ نہیں پڑھا تھا۔ [4] اس روایت کے متعلق حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: هذا خبر صحيح ''یہ صحیح خبر ہے۔'' [5]

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پر نماز جنازہ پڑھنے کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: مجھے پتہ نہیں ہے۔'' [6]

---

[1] ابن ماجه، الجنائز: ۱۵۱۱۔ [2] حاشيه ابن ماجه، حديث نمبر ۱۵۱۱۔

[3] مسند امام احمد، ص: ۲۸۳، ج ٤۔

[4] ابو داود، الجنائز: ۳۱۸۷۔ [5] محلیٰ ابن حزم، ص: ۱۵۸، ج ٥۔

[6] مسند امام احمد، ص: ۲۸۱، ج ۳۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے خادم خاص کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کی دس سال خدمت کی ہے، اگر رسول اللہ ﷺ نے اپنے لخت جگر سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ کا جنازہ پڑھا ہوتا تو کم از کم حضرت انس رضی اللہ عنہ پر یہ بات مخفی نہ رہتی۔ بعض اہل علم نے جنازہ نہ پڑھنے کی مختلف توجیہات ذکر کی ہیں کہ آپ اس دن سورج گرہن لگنے کی وجہ سے مصروف تھے، اس لیے آپ نے اپنے لخت جگر کا جنازہ نہیں پڑھایا، آپ نے خود نہیں پڑھا لیکن دوسروں کو اس سے منع نہیں فرمایا وغیرہ۔

ہمارے نزدیک یہ توجیہات محل نظر ہیں، البتہ یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ نابالغ بلکہ ناتمام بچے کی نماز جنازہ پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں پہلو برابر ہیں، اس حدیث کو واضح کرنے کے لیے آپ نے عملی طور پر اپنے لخت جگر کا جنازہ نہیں پڑھا اور اپنے ارشادات سے اس قسم کے جنازے کی مشروعیت کو اجاگر فرمایا ہے البتہ بالغ حضرات کا جنازہ پڑھنا تمام مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت اور بچے کا اکٹھا جنازہ پڑھنا

سوال ہمارے ہاں امام مسجد نے ایک عورت اور بچے کا جنازہ اکٹھا پڑھا دیا، اس پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ اکٹھا جنازہ درست نہیں۔ کیا شرعی طور پر ایسا کیا جا سکتا ہے؟

جواب عورت اور بچے کا اکٹھا جنازہ پڑھا جا سکتا ہے، اس میں شرعی طور پر کوئی حرج نہیں ہے چنانچہ حارث بن نوفل کے آزاد کردہ غلام حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ام کلثوم اور ان کے بیٹے کے جنازہ میں موجود تھے، جب کہ بچے کو امام کی جانب رکھا گیا اور عورت کے جنازے کو اس کے پیچھے قبلہ کی طرف رکھا گیا، پھر ان دونوں کا جنازہ پڑھایا گیا، مجھے یہ بات عجیب سی لگی، اس وقت حضرت ابن عباس، ابوسعید خدری، ابوقتادہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم بھی جنازہ میں شریک تھے، میں نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ سنت طریقہ ہے۔ [1] اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے، انہوں نے میتوں کی اکٹھی نماز جنازہ پڑھی، مردوں کو امام کے قریب اور عورتوں کو قبلہ کے قریب کیا۔ [2] ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جنازے خواہ مردوں اور عورتوں کے ہوں یا عورتوں کے ساتھ بچے ہوں، ان سب پر ایک ہی وقت نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ مردوں اور بچوں کے جنازوں کو امام کی جانب اور عورتوں کے جنازوں کو قبلہ کی جانب رکھا جائے۔ یہ بھی یاد رہے کہ زیادہ جنازوں کی صورت میں علیحدہ علیحدہ جنازہ پڑھنا بھی صحیح ہے، کیونکہ یہی اصل ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر امام نے عورت اور بچے کا اکٹھا جنازہ پڑھایا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (واللہ اعلم)

عزیز و اقارب کے انتظار میں جنازہ مؤخر کرنا

سوال ہمارے ہاں رواج ہے کہ عزیز و اقارب کے انتظار میں جنازہ مؤخر کیا جاتا ہے، کئی کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے، شریعت مطہرہ میں اس انتظار کی کیا حیثیت ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

---

[1] ابوداود، الجنائز: ٣١٩٣۔ [2] بیهقی، ص: ٣٣، ج ٤۔

جواب کسی کے عزیز و اقارب کو اس کی وفات کے متعلق آگاہ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ کی وفات کے متعلق اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مطلع کیا تھا لیکن ان کے انتظار میں میت کی تجہیز و تکفین اور تدفین میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جنازہ میں جلدی کرو کیونکہ میت اگر نیک ہے تو اسے تم خیر کی طرف لے جا رہے ہو اور اگر وہ اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو تم شر کو اپنی گردنوں سے اتار رہے ہو۔'' [1]

رشتہ داروں کے انتظار میں میت کی تدفین میں دیر کرنا مستحسن امر نہیں ہے، البتہ چند گھنٹے تو انتظار کیا جا سکتا ہے لیکن افضل یہی ہے کہ اس کی تدفین جلدی عمل میں لائی جائے، کچھ رشتہ دار اگر تاخیر سے پہنچیں تو وہ اس کی قبر پر جا کر جنازہ پڑھ سکتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ ثابت ہے کہ جب مسجد میں جھاڑو دینے والے مرد یا عورت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اس وقت فرمایا: ''تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی، مجھے اس کی قبر بتاؤ۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو بتایا تو آپ نے اس کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔'' [2]

بہرحال کسی کے فوت ہونے کے بعد عزیز و اقارب اور دوست و احباب کو اطلاع دی جا سکتی ہے تا کہ اس کی نماز جنازہ میں زیادہ سے زیادہ موحد حضرات شریک ہو سکیں، لیکن ان کے انتظار میں تجہیز و تکفین، نماز جنازہ اور تدفین وغیرہ میں تاخیر درست نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

رات کے وقت میّت کو دفن کرنا

سوال کیا رات کے وقت میت کو دفن کرنا منع ہے؟ قرآن و حدیث کے مطابق اس کی وضاحت کریں۔

جواب رات کے وقت میت کو دفن کرنے کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہ ہدایت دی ہے جسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔ ''اپنے مرنے والوں کو رات کے وقت دفن نہ کرو مگر یہ کہ تم اس کے لیے مجبور کر دیئے جاؤ۔'' [3]

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رات کے وقت میت کو دفن کرنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ رات کے وقت نماز جنازہ میں کم لوگ شریک ہوں گے، لہٰذا اگر دن کے وقت جنازہ پڑھ لیا گیا ہو اور کسی عذر کی وجہ سے رات کو دفن کرنا پڑے تو ایسا ممنوع نہیں ہے، نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رات کے وقت ایک آدمی کو قبر میں داخل کیا تھا۔ [4] امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''رات کے وقت دفن کرنا۔'' پھر سند کے بغیر یہ حدیث لائے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ [5] بہرحال کسی مجبوری کے بغیر میت کو رات کے وقت دفن نہیں کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، الجنائز قبل حدیث: ۱۳٤۰۔ [2] صحیح بخاری، الجنائز: ۳۱۱۵۔
[3] صحیح بخاری، الجنائز: ۱۳۳۷۔ [4] ابو داود، الجنائز: ۳۱٤۸۔
[5] ابن ماجه، الجنائز: ۱۵۲۰۔

کفن کا کپڑا

سوال کفن کس قسم کا ہونا چاہیے، کیا میت کے ترکہ سے کفن دیا جا سکتا ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب کفن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اچھا ہو، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے عمدہ کفن دینا چاہیے۔'' [1]

عمدہ اور اچھا کفن دینے سے مراد یہ ہے کہ کفن کا کپڑا صاف ستھرا، عمدہ اور اس قدر ہو کہ میت کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ سکے، اس سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ وہ بہت زیادہ قیمتی ہو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہت قیمتی کفن نہ دیا کرو کیونکہ یہ تو بہت جلد بوسیدہ ہو جاتا ہے۔'' [2] یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کے باوجود زیادہ قیمتی کفن پہنانا جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں مال کا ضیاع ہے جس کی صحیح احادیث میں ممانعت ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک کپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اسے دھو لینا اور اس کی ساتھ دو اور چادریں ملا کر مجھے کفن دینا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا یہ تو پرانا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ زندہ آدمی نئے کپڑے کا مردہ سے زیادہ حقدار ہے۔ [3] کفن کا انتظام میت کے ترکہ سے کرنا چاہیے خواہ وہ اسی قدر ہو جس سے صرف کفن کا بندوبست ہو سکتا ہو، چنانچہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ احد کے دن شہید کر دیئے گئے، انہوں نے اپنے ترکہ میں صرف ایک چادر چھوڑی، اگر ہم ان کا سر ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اگر پاؤں ڈھانپتے ان کا سر ننگا ہو جاتا، آخر کار رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ان کا سر ڈھانپنے کا حکم دیا اور ان کے قدموں پر کچھ گھاس ڈال دینے کا فرمایا۔ [4]

بہر حال میت کو اس کے ترکہ سے ہی کفن دینا چاہیے ہاں اگر کوئی از خود کفن تیار کر کے میت کو پہنا دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، نیز بہتر ہے کہ تین سفید چادروں میں کفن دیا جائے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سحولیہ کے بنے ہوئے سفید رنگ کے تین سوتی کپڑوں میں کفن دیا گیا جن میں قمیص اور پگڑی نہیں تھی۔ [5]

نماز جنازہ باآواز بلند یا آہستہ؟

سوال نماز جنازہ باآواز بلند پڑھنا چاہیے یا آہستہ بھی پڑھا جا سکتا ہے، قرآن وحدیث میں اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ وضاحت سے جواب دیں۔

جواب جنازہ میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ قراءت، درود شریف اور میت کے لیے دعائیں وغیرہ۔ جنازہ میں قراءت آہستہ اور باآواز بلند دونوں طرح ثابت ہے، چنانچہ حضرت امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ

---

[1] مسلم، الجنائز: ۹۴۳۔ [2] ابوداود، الجنائز: ۳۱۵٤۔ [3] صحیح بخاری، الجنائز: ۱۳۸۷۔
[4] صحیح بخاری، الجنائز: ۱۲۷٦۔ [5] صحیح بخاری، الجنائز: ۱۲٦٤۔

کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بتایا: نماز جنازہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ امام تکبیر کہے پھر پہلی تکبیر کے بعد آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھے پھر درود پڑھے اور میت کے لیے خلوص کے ساتھ دعائیں کرے۔ [1]

اسی طرح جہری قراءت کے متعلق احادیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی تو فاتحہ پڑھی پھر فرمایا کہ میں نے یہ اس لیے پڑھی ہے تاکہ تمہیں اس کے سنت ہونے کا علم ہو جائے۔ [2]

ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے فاتحہ اور کوئی اور سورت پڑھی اور باآواز بلند قراءت کی، پھر جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ یہ سنت اور حق ہے۔ [3] اسی طرح دعائیں باآواز بلند پڑھنے کی یہ دلیل ہے کہ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی تو ہم نے آپ کی پڑھی ہوئی دعا یاد کر لی۔ [4]

ظاہر ہے کہ یہ دعائیں اونچی آواز سے پڑھی گئی تھیں، تبھی تو صحابی نے اسے یاد کر لیا۔ بہرحال نماز جنازہ سری اور جہری دونوں طرح ثابت ہے۔ (واللہ اعلم)

خاوند کا مردہ بیوی کو غسل دینا

سوال کیا خاوند اپنی فوت شدہ بیوی کو غسل دے سکتا ہے؟ کتاب و سنت میں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب بہتر ہے کہ سمجھدار اور تجربہ کار عورتیں، مرنے والی عورت کو غسل دیں، پردہ داری کا یہی تقاضا ہے تاہم اگر کوئی مجبوری ہے یا بیوی نے خاوند کو وصیت کی ہے تو خاوند اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔ قرون اولیٰ میں اس کی متعدد مثالیں بھی ملتی ہیں، اس کے متعلق چند دلائل حسب ذیل ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ جنازہ سے واپس آئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سر میں شدید درد تھا، آپ اپنا سر پکڑ کر ''ہائے میرے سر میں درد'' کہہ رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ تجھے ہائے وائے کرنے کی فکر کیوں لاحق ہے اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہو گئی تو میں تجھے غسل دوں گا اور تجھے اپنے ہاتھوں سے کفن پہناؤں گا، پھر میں تیرا جنازہ پڑھوں گا اور خود تجھے دفن کروں گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تسلی دے رہے تھے۔ [5]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشاد گرامی سے معلوم ہوا کہ خاوند اپنی مرنے والی بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔ اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت کی تھی کہ جب میں فوت ہو جاؤں تو آپ نے مجھے غسل دینا ہے۔ [6]

چنانچہ اس وصیت پر عمل کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا۔ [7]

---

[1] مستدرك حاكم، ص: ٣٦٠، ج١۔ [2] صحيح بخاری، الجنائز: ١٣٣٥۔ [3] نسائی، الجنائز: ١٩٩٠۔
[4] صحيح مسلم، الجنائز: ٩٦٣۔ [5] مسند امام احمد، ص: ٢٢٨، ج٦۔ [6] دار قطنی، ص: ٧٧، ج٧۔
[7] بيهقی، ص: ٣٩٦، ج٣۔

اس طرح بیوی اپنے مرنے والے شوہر کو غسل دے سکتی ہے، مرنے کے بعد وہ اس کے لیے اجنبی نہیں بن جاتا کہ وہ اسے غسل نہ دے یا اس کا چہرہ نہ دیکھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اگر ہمیں پہلے اس چیز کا علم ہوتا جو بعد میں ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فوت ہونے کے بعد انہیں ان کی بیویاں ہی غسل دیتیں۔'' [1] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے غسل دیا تھا۔ [2]

درج بالا دلائل سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد بیوی، خاوند کے لیے اور خاوند اپنی بیوی کے لیے اجنبی نہیں ہوجاتے کہ وہ ایک دوسرے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے یا بوقت ضرورت ایک دوسرے کو غسل نہیں دے سکتے، شرعی طور پر مرنے کے بعد بیوی کو اس کا خاوند غسل دے سکتا ہے، اس طرح بیوی، اپنے فوت شدہ شوہر کو غسل دے سکتی ہے، بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو اور وہاں کوئی دوسرا غسل دینے والا نہ ہو۔

جنازہ پڑھاتے وقت امام کہاں کھڑا ہو

سوال نماز جنازہ پڑھاتے وقت امام کو میت کے کس طرف کھڑا ہونا چاہیے، درمیان میں یا ایک طرف ہٹ کر؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیا جائے۔

جواب جب نماز جنازہ پڑھا جائے تو امام کو مرد کے جنازہ میں اس کے سر کے پاس اور عورت کے جنازہ کے لیے اس کے درمیان میں کھڑا ہونا چاہیے، حدیث میں اس کی صراحت ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھائی تو اس کے سر کے پاس کھڑے ہوئے، جب اسے اٹھا لیا گیا تو ایک عورت کا جنازہ لایا گیا تو اس کے درمیان میں کھڑے ہوئے پھر کسی نے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس طرح کھڑے ہوتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مرد اور عورت کے جنازے کے لیے اس طرح کھڑے ہوتے تھے۔ [3]

اسی طرح حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک عورت کا جنازہ پڑھا جو حالتِ نفاس میں فوت ہوگئی تھی تو آپ اس کے درمیان میں کھڑے ہوئے تھے۔ [4]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آدمی کے جنازہ میں امام کو میت کے سر کے پاس اور عورت کے جنازہ میں اس کے درمیان میں کھڑا ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

مشرک باپ کے لیے دعائے مغفرت کرنا

سوال میرا باپ شرک کی حالت میں فوت ہوا ہے، کیا اس کے لیے مغفرت کی دعا کی جاسکتی ہے؟ قرآن وحدیث کے حوالے سے فتویٰ درکار ہے۔

---

[1] ابن ماجه، الجنائز: ١٤٦٤۔ [2] بیهقی، ص: ٣٩٧، ج ٤۔

[3] ابن ماجه، الجنائز: ١٤٩٤۔ [4] صحیح بخاری، الجنائز: ١٣٣١۔

جواب: مشرک اگر زندہ ہو تو اس کی رشد و ہدایت کے لیے دعا کرنا سنت سے ثابت ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ دوس کے لیے ہدایت کی دعا کی تھی جب کہ وہ اس وقت مشرک تھا۔ (1) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''مشرکین کے لیے دعا کرنا۔'' (2) لیکن مرنے کے بعد مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کرنا جائز نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۱۳﴾ (3)

''نبی اور اہل ایمان کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کریں اگرچہ وہ قرابت دار ہی ہوں جب کہ ان پر واضح ہو چکا ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔''

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی ماں کے لیے بخشش کی دعا کرنے کی اجازت طلب کی تو اس نے مجھے اجازت نہ دی پھر میں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت مانگی تو اس نے مجھے اجازت دے دی۔'' (4)

اس قرآنی آیت کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ مشرک والدین کے لیے مغفرت کی دعا کرنا جائز نہیں ہے، البتہ ان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ سے ان کی رشد و ہدایت کے لیے دعا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (واللہ اعلم)

مساجد میں نماز جنازہ کا اعلان کرنا

سوال: مساجد میں نماز جنازہ کا اعلان کیا جاتا ہے، کیا قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جنازے کا اعلان کیا جائے؟

جواب: جنازے کے لیے مسجد میں اعلان کرنا درست ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مسجد میں ہی نجاشی کے فوت ہونے کی اطلاع دی تھی۔ (5) اس طرح رشتہ داروں اور دوستوں کو مطلع کرنے کے لیے مسجد میں اعلان کیا جا سکتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جنازے میں شریک ہو سکیں، نیز رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا تھا کہ تم نے مجھے اس کے مرنے کی اطلاع کیوں نہ دی؟ (6)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس عورت کو رات کے اندھیرے میں دفن کر دیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع نہ دی لہٰذا کسی کے جنازے کے لیے اعلان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے تاکہ اس کے جنازہ میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہو سکیں، ایسا کرنا سنت سے ثابت ہے، اس طرح اہل خانہ رشتہ داروں اور دوست واحباب کو اطلاع دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

(1) بخاری، الدعوات: ٦٣٩٧۔ (2) صحیح بخاری، الدعوات، باب نمبر ٥٩۔ (3) ٩/التوبۃ: ١١٣۔
(4) صحیح مسلم، الجنائز: ٢٢٥٨۔ (5) صحیح بخاری، الجنائز: ١٢٩٥۔ (6) صحیح مسلم، الجنائز: ٩٥٦۔

تدفین کے بعد قبر پر اجتماعی دعا کرنا

سوال تدفین سے فراغت کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر میت کے لیے اجتماعی دعا کرنا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا رسول اللہ ﷺ سے قولاً وعملاً دونوں طرح سے ثابت ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کو دفن کر کے فارغ ہوتے تو کھڑے ہوتے اور فرماتے:

''اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو پھر اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرو کیونکہ اس سے اب باز پرس ہو رہی ہے۔''[1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو جب قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو سوال و جواب کرنے کے لیے فرشتے وہاں آ جاتے ہیں اور میت سے سوال و جواب کرتے ہیں، اس بناء پر رسول اللہ ﷺ نے تلقین کی ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کی جائے اور اللہ سے ثابت قدم رہنے کی بھی التجاء کی جائے، اس کے علاوہ فتح الباری میں صحیح ابو عوانہ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت عبداللہ بن ذی البجادین رضی اللہ عنہ کی قبر پر دیکھا، جب آپ اسے دفن کرنے سے فارغ ہوئے تو قبلہ کی طرف منہ کیا، دونوں ہاتھ اٹھائے (اور دعا کی)۔[2] اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کا عمل معلوم ہوا کہ آپ ﷺ جب حضرت عبداللہ بن ذی البجادین رضی اللہ عنہ کی تدفین سے فارغ ہوئے تو ان کے لیے قبلہ رو ہو کر دعا کی اور اپنے ہاتھ بھی اٹھائے، قبلہ رو کھڑے ہو کر دعا کرنا بہتر ہے۔ لیکن یہ دعا کے لیے شرط نہیں ہے، ویسے جس طرف بھی منہ کر کے دعا کر لی جائے جائز ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ [3]

''تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا چہرہ ہے۔''

بہر حال دفن کے بعد میت کے لیے قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا رسول اللہ ﷺ سے قولاً وعملاً دونوں طرح ثابت ہے، اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

نبی ﷺ کا جنازہ

سوال رسول اللہ ﷺ کے جنازہ کے متعلق وضاحت فرمائیں کہ کس نے پڑھا تھا؟ ہمارے ہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا جنازہ نہیں پڑھا گیا تھا۔

جواب انسان خطا کار اور گنہگار ہے، اس عالم رنگ و بو میں آنے کے بعد کئی قسم کے گناہوں سے اپنے دامن کو آلودہ کرتا ہے، کچھ سعادت مند توبہ کر کے اپنے دامن کو صاف کر لیتے ہیں، لیکن بہت سے لوگوں کو اس کی سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں ان کی نماز جنازہ غنیمت ہوتی ہے کہ اگر چالیس موحد آدمی اس کا جنازہ پڑھ لیں اور اللہ تعالیٰ سے اس کے گناہوں

---

[1] ابوداود، الجنائز: ۳۲۲۱۔ [2] فتح الباری، ص: ۱۷۲، ج ۱۱۔

[3] ۲/البقرة: ۱۱۵۔

سے معافی کی سفارش کر دیں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔ بشرطیکہ اس نے شرک کا ارتکاب نہ کیا ہو، رسول اللہ ﷺ گناہوں سے پاک تھے۔ مزید یہ کہ آپ ﷺ شب و روز اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے تھے، اس لیے آپ ﷺ کے جنازہ کی ضرورت نہ محسوس کی گئی اور نہ ہی معمول کا جنازہ پڑھا گیا، آپ ﷺ کو غسل اور کفن دینے کے بعد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں رکھ دیا گیا، وہاں محدود تعداد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جاتے اور درود پڑھ کر واپس آ جاتے، یہی آپ ﷺ کا جنازہ تھا، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے: ''منگل کے دن جب رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی تو آپ ﷺ کے جسد اطہر کو آپ کے حجرہ مبارک میں آپ کی چار پائی پر رکھ دیا گیا پھر لوگ گروہ در گروہ اندر جاتے تھے اور آپ ﷺ پر درود پڑھتے تھے، جب مرد حضرات فارغ ہو گئے تو خواتین کو داخل ہونے کی اجازت دی گئی، جب ان سے فراغت ہوئی تو بچوں کو اندر جانے کی اجازت دی گئی، رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ کے لیے کسی نے لوگوں کی امامت نہیں کی۔'' [1]

حدیث کے آخری الفاظ کہ آپ ﷺ کی نماز جنازہ کے لیے کسی نے لوگوں کی امامت نہیں کی، ان سے یہ مفہوم بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اندر جانے والے خواتین و حضرات انفرادی طور پر نماز جنازہ پڑھ کر واپس آ جاتے لیکن ہمارے رجحان کے مطابق اس کا معنی نماز جنازہ کے بجائے درود پڑھنا زیادہ موزوں اور قرین قیاس ہے، جنازہ پڑھنے سے یہ بات اخذ کرنا کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اقتدار کے چکر میں پڑ گئے اور آپ ﷺ کی نماز جنازہ تک نہ پڑھی گئی، یہ بات سرے سے غلط ہے، آخر رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین اور تدفین بھی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے ہی عمل میں آئی تھی۔

میّت کو اٹھاتے وقت چار پائی کا رخ کس طرف ہونا چاہیے

سوال جب میت کو اٹھایا جاتا ہے تو چار پائی کا رخ کس طرف کرنا چاہیے؟ کیا یہ سنت ہے کہ اس کا رخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب میت کو اٹھاتے وقت اس کا رخ کدھر ہونا چاہیے اس سلسلہ میں مجھے کوئی صحیح اور صریح حدیث نہیں ملی البتہ مسلمانوں کا عمل یہ ہے کہ میت کو لے جاتے وقت اس کا رخ آگے کی طرف ہوتا ہے، اس سلسلہ میں ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے: ''وہ بیت اللہ جو تمہارے زندہ اور مردہ دونوں کا قبلہ ہے۔'' [2]

واقعی بیت اللہ ہر اعتبار سے مسلمانوں کا قبلہ ہے یعنی موت کے وقت اور قبر میں میت کا منہ قبلہ کی طرف کر دینا مسنون ہے۔ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اسے مسلمانوں کے ایک متفقہ عمل کے بطور تائید پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال کوشش کی جائے کہ میت کو لے جاتے وقت اس کا رخ قبلہ کی طرف کیا جائے یعنی اس کا سر آگے کی طرف ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

نماز جنازہ میں تکبیرات کے وقت رفع الیدین کرنا

سوال کیا نماز جنازہ میں تکبیرات کے وقت رفع الیدین کرنا احادیث سے ثابت ہے؟ اس سلسلہ میں واضح مؤقف کی

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۲۹۲، ج ۱۔ [2] ابو داود، الوصایا: ۲۸۷۵۔

نشاندہی کریں۔

جواب نماز جنازہ پڑھتے وقت تکبیرات کے موقع پر رفع الیدین کرنا ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ جنازے کی ہر تکبیر پر رفع الیدین کرتے تھے۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ [2]

اس سلسلہ میں ایک مرفوع حدیث بھی بیان کی جاتی ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز جنازہ پڑھتے تو ہر تکبیر کے وقت رفع الیدین کرتے تھے اور جب نماز ختم کرتے تو سلام پھیرتے تھے۔ [3]

بہرحال حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اتباع سنت کے متعلق بہت حساس طبیعت رکھتے تھے، ان سے نماز جنازہ میں تکبیرات کے وقت رفع الیدین کرنا ثابت ہے لہٰذا اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ رفع الیدین نہ کرنے سے متعلق جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ صحیح سند سے ثابت نہیں ہیں، واللہ اعلم۔

میّت کو غسل دینے والے کے لیے نہانا؟

سوال میت کو غسل دینے والے کے لیے نہانا ضروری کیوں ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب میت کو غسل دینا بہت بڑی فضیلت ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے کسی مسلمان کو غسل دیا اور اس کے عیب کو چھپایا اللہ تعالیٰ اسے چالیس مرتبہ معاف کر دیتا ہے۔'' [4] لیکن اس پروانہ مغفرت کے لیے دو شرائط ہیں:

☆ اگر دوران غسل کوئی ناپسندیدہ بات سامنے آئے تو اسے چھپائے اور کسی سے بیان نہ کرے جیسا کہ حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔

☆ یہ کام محض اللہ کو راضی کرنے کے لیے کرے، کسی قسم کا دنیوی مفاد پیش نظر نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اسی کام کو شرف قبولیت بخشتا ہے جو صرف اس کی رضا کے لیے ہو۔

حدیث میں اس امر کی وضاحت ہے کہ جو آدمی میت کو غسل دے وہ خود بھی غسل کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص کسی میت کو نہلائے وہ غسل کرے اور جو اسے اٹھائے وہ وضو کرے۔'' [5]

اس حدیث کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کو نہلانے والے کے لیے غسل کرنا ضروری ہے لیکن دیگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل مستحب ہے واجب نہیں۔ بلکہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اسے غسل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وضو ہی کافی ہے، تاہم دیگر احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر استحبابی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ نہلاتے وقت کوئی ایسی چیز لگ گئی ہو جس کا دور کرنا

---

[1] بیہقی، ص:٤٤، ج٤۔ [2] تلخیص الحبیر، ص:١٤٦، ج٢۔ [3] کتاب العلل للدارقطنی، ص:٢٢، ج٢۔
[4] مستدرك حاکم، ص:٣٥٤، ج١۔ [5] ابو داود، الجنائز: ٣١٦١۔

ضروری ہے، بلکہ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے صراحت مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب تم میت کو غسل دو تو تم پر غسل ضروری نہیں کیونکہ تمہارے مردے نجس نہیں ہوتے، اپنے ہاتھ دھو لو یہی کافی ہے۔'' [1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میت کو غسل دیا کرتے تھے، اس کے بعد کوئی غسل کر لیتا اور کوئی نہیں کرتا تھا۔ [2]

ان احادیث وآثار کے پیش نظر میت کو غسل دینے والے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ خود بھی غسل کرے البتہ بہتر ہے کہ وہ غسل کر لے تاکہ شکوک وشبہات دور ہو جائیں۔ (واللہ اعلم)

جنازہ اٹھاتے وقت بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھنا

سوال ہمارے ہاں جب جنازہ اٹھایا جاتا ہے تو کچھ لوگ باآواز بلند کلمہ شہادت کے الفاظ کہتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پھر دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر اذان دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے شیطان میت سے وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا، کیا ایسا کرنا شرعی طور پر ثابت ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب بلاشبہ ہمارے معاشرہ میں کچھ کام ایسے رواج پا چکے ہیں جن کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ہے جیسا کہ سوال میں دو کاموں کا ذکر ہے، اس کا ثبوت کتاب وسنت سے نہیں ملتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی جنازہ اٹھایا جاتا تھا، لیکن حاضرین میں سے کوئی کلمہ شہادت کے الفاظ باآواز بلند نہیں کہتا تھا، اگر ایسا کرتا تو ضرور کتب حدیث میں اس کا ذکر ہوتا، اس طرح میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر اذان دینے کا مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق بھی کتاب وسنت سے کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس سے اس امر کا جواز ثابت ہوتا ہو۔

باقی رہی شیطان کی وسوسہ اندازی تو وہ انسان کی زندگی تک محدود ہے، مرنے کے بعد اسے کسی کے متعلق وسوسہ اندازی کا اختیار نہیں ہے، قبر کے اندر فرشتوں کے سوالات کے جوابات ایمان کی بنیاد پر ہوں گے، وہاں شیطان کا قطعاً کوئی اختیار نہیں ہو گا کہ وہ غلط جوابات اس کی زبان سے جاری کرا سکے، ہمارے نزدیک جنازہ لے جاتے وقت باآواز بلند کلمہ شہادت کے الفاظ کہنا اور میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر اذان دینا بدعت ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے ہمارے اس دین میں کسی نئے کام کو رواج دیا جو اس سے نہیں ہے، وہ مردود ہے۔'' [3]

ہمیں چاہیے کہ کتاب وسنت سے تمسک کریں، اس کے علاوہ دوسری ہر چیز کو چھوڑ دیں، اسی میں ہماری کامیابی اور عزت و ناموس کا تحفظ ہے۔ (واللہ اعلم)

غیر محرم آدمی کا عورت کے جنازے کو کندھا دینا

سوال غیر محرم آدمی کسی عورت کے جنازے کو کندھا دے سکتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی رو سے اس کی وضاحت کریں؟

جواب جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے جنازے کے ساتھ جانا اور اسے کندھا دینا، اس کا حق ہے جو دوسرے

---

[1] مستدرك حاكم، ص: ٣٨٦، ج١۔ [2] تاريخ بغداد، ص: ٤٢٤، ج٥۔

[3] بخاري، الصلح: ٢٦٩٧۔

مسلمانوں کو ادا کرنا چاہیے، جنازے کے ساتھ جانے والے مرد ہی ہوتے ہیں کیونکہ عورتوں کو جنازے کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے: ہمیں جنازوں کے پیچھے جانے سے روک دیا گیا لیکن اس معاملہ میں ہم پر زیادتی اور سختی نہیں کی جاتی تھی۔ ❶

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنازے کے ساتھ جانے والے مرد حضرات ہوتے ہیں اور عورتوں کا جنازے کے ساتھ جانا مکروہ ہے پھر عورت کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے محرم اور غیر محرم کی تفریق کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے، کوئی بھی مسلمان میت کو کندھا دے سکتا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جنازہ اٹھانا مردوں کا کام ہے، عورتوں کا نہیں۔'' ❷

بلکہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر محرم آدمی عورت کی میت کو قبر میں اتار سکتا ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر کے جنازے میں موجود تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم میں کوئی ایسا آدمی ہے جس نے آج اپنی بیوی سے صحبت نہ کی ہو۔'' حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ہوں، آپ نے فرمایا: ''تم اس قبر میں اترو۔'' چنانچہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ قبر میں اترے اور انہیں لحد میں لٹایا۔ ❸

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو قبر میں اتارنا اس بات کی دلیل ہے کہ غیر محرم مرد عورت کو قبر میں اتار سکتا ہے۔ جب غیر محرم میت کو قبر میں اتار سکتا ہے تو اسے کندھا دینے میں کون سا امر مانع ہے؟ ہمارے رجحان کے مطابق میت کو کندھا دیتے ہوئے محرم اور غیر محرم کی تفریق کرنا غیر شرعی ہے اور غیر محرم میت کو کندھا دے سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

قبرستان میں قرآن خوانی کرنا

سوال ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ قبرستان میں قرآن خوانی کے لیے حفاظ کرام کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، وہ قبروں کے پاس شبینہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب قبرستان قراءت قرآن کا محل نہیں ہے لہٰذا ان میں قرآن خوانی کا اہتمام خلاف شریعت ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث میں اس کا واضح اشارہ ملتا ہے: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔ ❹

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گھروں میں قرآن مجید کی تلاوت کا اہتمام کرنا چاہیے اور انہیں قبرستان نہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ قبرستان قرآن پڑھنے کا محل نہیں ہے۔ حفاظ کرام کو بھی چاہیے کہ وہ ناجائز کام کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے سے گریز کیا کریں۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحیح بخاری، الجنائز: ۱۲۷۸۔ ❷ صحیح بخاری، الجنائز، باب نمبر ۵۰۔

❸ بخاری، الجنائز: ۱۳۴۲۔ ❹ مسند امام احمد، ج۲، ص: ۲۸۴۔

تعزیت کرتے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا

سوال ایک معاصر ہفت روزہ میں ایک فتویٰ شائع ہوا ہے کہ میت کی تعزیت کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر دعا کی جا سکتی ہے، اس کے لیے دو حدیثیں پیش کی گئی ہیں، کیا واقعی ایسے موقع پر ہاتھ اٹھانا جائز ہے، جبکہ ہم اہل حدیث حضرات کا عمل اس کے خلاف ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔ معاصر ہفت روزہ کی فوٹو سٹیٹ ارسال کی جا رہی ہے۔

جواب ہمارے ہاں عام طور پر یہ رواج پایا جاتا ہے کہ کسی آدمی کی وفات کے موقع پر لوگ گلیوں میں دریاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں پھر مرنے والے کے لیے فاتحہ خوانی ہوتی ہے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہیں، تعزیت کے موقع پر اس انداز سے بیٹھنا خود محل نظر ہے پھر موجودہ طریقے کے مطابق ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی حدیث سے ثابت نہیں ہے، اس سلسلہ میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ اس سلسلہ میں صریح نہیں ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1. جب حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ جنگ موتہ میں شہید ہوئے تو رسول اللہ ﷺ بہت غمناک ہوئے، مسجد میں بیٹھے اور آپ کے چہرہ پر غم اور افسوس کے اثرات نمایاں تھے، آپ تین دن ان کے اہل خانہ کے پاس نہیں گئے، تین دن کے بعد ان کے گھر تشریف لے کر گئے اور فرمایا آج کے بعد میرے بھائی پر کسی نے رونا نہیں ہے، میرے بھائی کے بیٹوں کو میرے پاس لاؤ۔ انہیں لایا گیا تو وہ چوزوں کی طرح تھے، آپ نے فرمایا حجامت کرنے والے کو بلاؤ جب وہ آیا تو آپ نے اسے بچوں کے سر مونڈنے کا حکم دیا پھر آپ نے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی۔ [1]

اس حدیث کو تعزیت کے موقع پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے حالانکہ یہ تعزیت کا موقع نہیں ہے کیونکہ تعزیت صرف تین دن کے لیے ہوتی ہے اور رسول اللہ ﷺ تین دن کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے ہیں، بچوں کی خبر گیری کی اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کی ہے، یہ حدیث تعزیت کے موقع پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کی قطعاً دلیل نہیں ہے، ہمارے ہاں باعث نزاع وہ دعا ہے جو تعزیت کے موقع پر عام اجتماع میں ہاتھ اٹھا کر کی جاتی ہے، مذکورہ حدیث اس کے متعلق صریح نہیں ہے۔

2. غزوۂ اوطاس کے موقع پر حضرت ابو عامر عبید رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی کہ اے اللہ! ابو عامر عبید رضی اللہ عنہ کو معاف کر دے۔ [2]

اس حدیث کو بھی تعزیت کے موقع پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے لیے بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہ کی وصیت پر عمل کیا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو میرا اسلام عرض کرنا اور انہیں کہنا کہ میرے لیے مغفرت کی دعا کریں، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے کہ کہ میں نے اپنے چچا ابو عامر رضی اللہ عنہ کا پیغام رسول اللہ ﷺ کو دیا تو آپ نے پانی

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۲۰٤، ج۱۔ [2] صحیح بخاری، المغازی: ٤۳۲۳۔

منگوایا، وضو کیا پھر ہاتھ اٹھائے اور دعا کی: ''اے اللہ! ابو عامر عبید رضی اللہ عنہ کو معاف کر دے اور قیامت کے دن اسے بے شمار لوگوں پر برتری عطا فرما۔'' ❶

اس روایت میں کوئی تعزیت کا موقع نہیں ہے بلکہ انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی اپیل کرنا، آپ نے ان کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، اس حدیث سے تعزیت کے موقع پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا مسئلہ کشید کرنا محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

میّت کا دوبارہ جنازہ پڑھنا

سوال اگر میت کا دوبارہ جنازہ پڑھا جائے، کیا میت کے لواحقین دوبارہ جنازہ میں شامل نہیں ہو سکتے؟ اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب ایک میت کا دوبارہ جنازہ پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق لواحقین اور غیر لواحقین کی تفریق خود ساختہ ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک عورت مسجد کی صفائی کیا کرتی تھی وہ فوت ہوگئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے رات کے وقت ہی جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قبر پر جنازہ پڑھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنازہ ادا کیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں بھی جنازہ میں شامل تھا۔ ❷

مذکورہ حدیث کے پیش نظر ایک میت کا دو مرتبہ جنازہ پڑھا جا سکتا ہے اور جو حضرات پہلے جنازہ پڑھ چکے ہیں، ان کے لیے دوبارہ جنازہ پڑھنے کی ممانعت احادیث میں مروی نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

دفن میں تاخیر کرنا

سوال ہمارے معاشرہ میں میت کو دفن کرنے میں بلا وجہ تاخیر کی جاتی ہے، کسی عزیز اور قریبی رشتہ دار کے انتظار میں اسے دفن نہیں کیا جاتا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب بلا وجہ جنازے میں تاخیر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں جلدی کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت طلحہ بن براء رضی اللہ عنہ مرض موت میں مبتلا ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، ان کی حالت دیکھ کر فرمایا: ''جب فوت ہو جائیں تو مجھے اس کی اطلاع کرنا اور اس کے دفن کرنے میں جلدی کرنا کیونکہ مسلمان کے مردہ جسم کو اس کے گھر والوں کے درمیان روکے رکھنا جائز نہیں ہے۔ ❸

بہر حال جب کوئی مسلمان فوت ہو جائے تو اس کے کفن و دفن میں بلا وجہ تاخیر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، المغازی: ٤٣٢٣۔ ❷ صحیح بخاری، الجنائز: ١٣٢١۔
❸ بیہقی، ص: ٣٨٦، ج٣۔

کٹی ہوئی لاش کو غسل دینا

سوال ایک آدمی کا جسم کسی حادثہ میں بری طرح متاثر ہوا ہے اور اس کے جسم سے خون بہتا ہے، اگر وہ اسی حالت میں فوت ہو جائے تو کیا اسے غسل دینا ضروری ہے یا صرف تیمم ہی کروا دیا جائے، اور اگر جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو تو پھر غسل کی کیا صورت ہوگی؟

جواب مسلمان میت کا یہ اکرام ہے کہ اسے غسل دے کر کفن پہنایا جائے، اگر جسم کسی حادثہ میں بری طرح متاثر ہو گیا ہے یا اس کے جسم سے خون بہتا ہے تو روئی وغیرہ سے اس کا خون صاف کیا جائے پھر اسے غسل دیا جائے اور زخموں پر روئی رکھ دی جائے تاکہ خون نکلنے سے کفن خراب نہ ہو، اگر جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے تو بھی تمام اجزاء کو جمع کر کے ان پر پانی بہا دیا جائے، تیمم کی سہولت صرف زندہ انسانوں کے لیے ہے تاکہ انہیں تکلیف نہ ہو یا پانی لگنے سے زخم خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ میت کو بہر حال غسل ہی دینا چاہیے خواہ پانی بہا دینے کی شکل میں ہی ہو۔ ہاں البتہ اگر پانی میسر نہ ہو تو میت کو تیمم کروایا جا سکتا ہے۔

سینہ کوبی کرنا

سوال مروجہ سینہ کوبی کی شرعی حیثیت واضح کریں، کیا کسی بھی لحاظ سے اس کی اجازت ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اگر کوئی مصیبت آئے یا کوئی عزیز فوت ہو جائے تو ہمیں صبر کرنے کا حکم ہے، رونے دھونے اور گریبان چاک کرنے کی اجازت نہیں، جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بھی مصیبت کے وقت اپنے چہرے کو پیٹے، اپنا گریبان چاک کرے اور دور جاہلیت کی باتیں بکے وہ ہم سے نہیں ہے۔'' [1]

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اس شخص سے بری ہوں جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان برأت کیا ہے، بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبت کے وقت اونچی آواز نکالنے والی، پریشانی کے وقت اپنے بال منڈوانے والی اور آفت کے وقت اپنے کپڑے پھاڑنے والی سے بری ہیں۔ [2] حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نوحہ کرنے والی عورت اگر موت سے پہلے توبہ نہیں کرے گی تو قیامت کے دن اسے بایں حالت اٹھایا جائے گا کہ اس پر گندھک کا کرتا اور خارش کی قمیص ہوگی۔ [3]

ان احادیث کی روشنی میں مروجہ سینہ کوبی کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اگر کسی کو مصیبت سے دوچار ہونا پڑے تو وہ اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہوئے صبر سے کام لے۔ شاید اللہ تعالیٰ اس مصیبت کی تلافی کر دے جبکہ سینہ کوبی کرنے سے گناہ کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، الجنائز: ۱۲۹۴۔ [2] صحیح مسلم، الایمان: ۱۰۴۔

[3] مسند امام احمد، ص: ۳۴۲، ج۵۔

پریشانی کے وقت موت کی تمنا کرنا

سوال کچھ لوگ پریشانی کے وقت کہہ دیتے ہیں کہ کاش! میں مرجاتا، کیا اس طرح موت کی تمنا کرنا جائز ہے؟

جواب پریشانی یا مصیبت یا بیماری کے وقت ایسے الفاظ کہنا درست نہیں ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تم میں سے کوئی بھی کسی تکلیف یا مصیبت کی وجہ سے ہرگز موت کی تمنا نہ کرے۔ [1]

آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: چچا جان! موت کی تمنا مت کریں۔ [2]

اگر زیادہ پریشانی یا مصیبت ہو یا بیماری خطرناک صورت حال اختیار کر جائے تو درج ذیل دعا پڑھنی چاہیے۔

((اللهم احيني ما كانت الحياة خيرا لي وتوفني اذا كانت الوفاة خيرا لي)) [3]

''اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک میرے لیے زندگی بہتر ہے اور اس وقت مجھے فوت کر دینا، جب میرے لیے وفات بہتر ہو۔''

بہر حال ایک مرد مومن کی شان کے خلاف ہے کہ وہ مصائب و آلام سے گھبرا کر موت کی خواہش کرے۔ (واللہ اعلم)

دنیا میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا

سوال میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ مغربی سائنسدان یہ تجربہ کر رہے ہیں کہ مردہ کے جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے ٹھنڈک میں رکھا جاتا ہے پھر کیمیائی مواد سے اس تجمید شدہ جسم کو دوبارہ زندہ کیا جائے، کیا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا امکان ہے کہ سائنس کے تجربات سے اسے دوبارہ حیات دی جا سکے؟

جواب اس عالم رنگ و بو میں اللہ تعالیٰ کا یہ نظام ہے کہ جس آدمی کو موت سے دوچار کر دیا جائے وہ دنیا میں دوبارہ زندہ نہیں ہو سکے گا بلکہ قیامت کے دن اس کے جسم میں روح ڈالی جائے گی اور پھر اس سے وہ روح جدا نہیں ہوگی بلکہ اسے ابدی حیات دی جائے گی، انسانی جسم میں روح کا اعادہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے ممکن نہیں ہے، اس سلسلہ میں قرآن کریم صاف اعلان کرتا ہے: ''یہاں تک کہ جب کسی کو موت آپہنچے گی تو وہ کہے گا، اے میرے پروردگار! مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دے تاکہ میں نیک اعمال کر کے آؤں، جسے میں نے پہلے فراموش کر دیا تھا، اللہ کی طرف سے جواب ملے گا ہرگز نہیں! اس کی یہ آرزو صدا بصحراء ثابت ہوگی اور ان کے لیے حیات دنیوی کے بعد قیامت کے دن تک کے لیے حیات برزخی ہوگی۔'' [4]

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو زندگی کے تین مراحل سے گزرنا ضروری ہے۔

حیات دنیا: ولادت سے موت تک، حیات برزخ: موت سے قیامت تک۔ حیات آخرت: حساب کے دن سے لے کر ہمیشہ تک کے لیے۔ پھر اسے موت نہیں آئے گی۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں متنبہ کر دیا ہے کہ دنیا میں اعادہ کسی کے

---

[1] صحیح بخاری، الدعوات: ۲۳۵۔ [2] مسند امام احمد: ۲۳۹، ج۶۔ [3] صحیح بخاری، الدعوات: ۶۳۵۱۔
[4] ۲۳/المؤمنون: ۱۰۰۔

لیے ممکن نہیں ہے، خواہ کوئی سائنس ترقی کا کتنا ہی ڈھنڈورا پیٹ لے۔ اگر مغربی سائنس دانوں نے موہوم امید پر تجربات شروع کر رکھے ہیں تو اس میں ایک مومن کا ایمان مزید پختہ ہونا چاہیے، ممکن ہے کہ ایسا پروپیگنڈا دجال کے فتنے کا پیش خیمہ ہو، اہل ایمان کا امتحان لینے کے لیے اللہ تعالیٰ دجال کو محدود پیمانے پر یہ قدرت دے گا کہ وہ کسی مردہ کو زندہ کر سکے گا لیکن ایک دفعہ زندہ کرنے کے بعد دوبارہ وہ بھی بے بس ہو جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''دجال ایک نوجوان کو بلائے گا اور اس کے دو ٹکڑے کر دے گا جس طرح نشانہ لگنے کی غرض سے کوئی چیز دو ٹکڑے ہو جاتی ہے پھر اسے زندہ کر کے بلائے گا تو وہ نوجوان چمکتے، دمکتے اور مسکراتے چہرے کے ساتھ دجال کی طرف چلا جائے گا۔'' [1]

ایک روایت میں ہے اس کے بعد وہ نوجوان کہے گا اللہ کی قسم! آج سے زیادہ مجھے تیرے معاملہ میں پہلے اتنی بصیرت کبھی حاصل نہ تھی، اس کے بعد دجال اسے دوبارہ قتل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ [2]

حدیث میں اس امر کی بھی وضاحت ہے کہ دجال جس شخص پر موت و حیات کا تجربہ کرے گا وہ اس امت کا بہترین مومن ہو گا جس کے ذریعے دجال کو شکست فاش ہو گی، بہر حال ہمارا ایمان ہے کہ جو انسان مر چکا ہے اسے دنیا میں دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا، یہ قدرت صرف اللہ رب العالمین کو ہے کہ وہ قیامت کے دن مردہ اجسام کو زندہ کرے گا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح مسلم، الفتن: ۲۹۳۷۔

[2] صحیح بخاری، الفتن: ۷۱۲۳۔

زکوٰۃ و صدقات

زیر استعمال زیورات کی زکوٰۃ

سوال زیر استعمال زیورات کی زکوٰۃ کے متعلق وضاحت کریں، ہمارے ہاں مشہور ہے کہ ان میں زکوٰۃ نہیں ہوتی۔

جواب زیر استعمال زیورات میں زکوٰۃ کے متعلق درج ذیل چار موقف ہیں۔

① زیورات میں زکوٰۃ فرض ہے خواہ وہ زیر استعمال ہوں۔

② ان میں زکوٰۃ واجب نہیں کیونکہ انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔

③ زیورات کی زکوٰۃ انہیں دوسروں کو عاریۃ دینا ہے اس کے علاوہ الگ زکوٰۃ ضروری نہیں ہے۔

④ زیر استعمال زیورات میں صرف ایک مرتبہ زکوٰۃ دینا فرض ہے۔

ہمارے رجحان کے مطابق زیر استعمال زیورات کی زکوٰۃ دینا ضروری ہے، بشرطیکہ نصاب کو پہنچ جائیں، اس کے متعلق حسب ذیل دلائل ہیں۔

☆ آیات وحدیث میں مطلق طور پر سونے اور چاندی سے زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس عموم میں زیورات بھی شامل ہیں خواہ وہ زیر استعمال ہی کیوں نہ ہوں، مثلاً:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ......﴾ [1]

’’وہ لوگ سونے اور چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے ہیں ....۔‘‘

’’جو بھی سونے اور چاندی کا مالک اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا......۔‘‘ [2]

☆ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس کے ہمراہ اس کی بیٹی تھی، جس کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ’’کیا تو اس کی زکوٰۃ دیتی ہے۔‘‘ اس نے عرض کیا: نہیں، آپ نے فرمایا: ’’کیا تجھے یہ پسند ہے کہ قیامت کے دن تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے جائیں، یہ سن کر اس خاتون نے وہ کنگن پھینک دیے۔ [3]

☆ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے سونے کا زیور پہن رکھا تھا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ کنز ہے جس کی مخالفت قرآنی آیات کرتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اگر تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو تو یہ کنز نہیں ہے۔‘‘ [4]

---

[1] ۹/التوبة: ٣٤۔ [2] مسلم، الزكوٰة: ٩٧٨۔
[3] ابو داود، الزكوٰة: ١٥٦٣۔ [4] مستدرك حاكم، ص: ٣٩٠، ج١۔

☆ ان تمام دلائل سے معلوم ہوا کہ سونا اور چاندی دونوں قسم کے زیورات میں زکوٰۃ ہے، اس سلسلہ میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زیور میں زکوٰۃ نہیں۔'' [1]

لیکن اس کی سند انتہائی کمزور ہے، اس بنا پر بہت سے علماء نے اسے ناقابل حجت ٹھہرایا ہے۔

حج کے لیے جمع شدہ رقم سے زکوٰۃ دینا

سوال میں نے حج کے لیے حکومت کی حج سکیم میں رقم جمع کرائی تھی۔ قرعہ اندازی میں میرا نام نہیں آیا جس کی وجہ سے میری رقم مجھے واپس مل گئی ہے، اب کیا مجھے اس سے زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے یا نہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے۔

جواب زکوٰۃ، دین اسلام کا تیسرا رکن ہے، صاحب استطاعت انسان پر زکوٰۃ فرض ہے، فرضیت زکوٰۃ کی تین شرائط حسب ذیل ہیں:

☆ وہ رقم ضروریات سے زائد ہو۔ اگر کوئی ضرورت کے لیے ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

☆ وہ رقم نصاب کو پہنچ جائے، اگر نصاب سے کم سرمایہ ہے تو اس پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں ہے زکوٰۃ کا نصاب ساڑھے سات تولے (۸۵ گرام) سونا، یا ساڑھے باون تولے چاندی ہے۔

☆ اس زائد ضرورت رقم پر سال گزر جائے۔ سال سے پہلے پہلے کسی قسم کی رقم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں سائل نے وہ رقم حج کے لیے رکھی تھی بلکہ وہ حکومت کی حج اسکیم میں جمع کرادی تھی، اب اگر قرعہ اندازی میں نام نہیں نکلا تو اس سے ضرورت ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کا مصرف بدستور قائم ہے کہ اسے حج کے لیے استعمال کرنا ہے، اس لیے حج کے لیے مختص کی جانے والی رقم میں زکوٰۃ نہیں ہے ہاں اگر کوئی اس سے زکوٰۃ دینا چاہے تو اس کار خیر پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

مصرف زکوٰۃ

سوال ایک تنگدست آدمی، کسی مالدار دوست سے دوسروں میں تقسیم کرنے کے لیے زکوٰۃ وصول کرتا ہے تو کیا اسے زکوٰۃ خود استعمال کرنے کی شرعاً اجازت ہے؟ براہ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں اس کا جواب دیا جائے۔

جواب وکیل کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مال زکوٰۃ کو اپنے لیے استعمال کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دوست کو بتائے کہ وہ خود اس کا محتاج ہے اگر وہ اجازت دے تو اپنے استعمال میں لائے اگر وہ اجازت نہ دے تو اسے آگے تقسیم کردے، اس کی اجازت کے بغیر مال زکوٰۃ کو خود استعمال کر لیا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے اس کی ادائیگی کرے اور اسے دوسرے غرباء میں تقسیم کرے، بعض لوگ ایسے بھی سامنے آتے ہیں کہ لوگ انہیں محتاج سمجھ کر زکوٰۃ دیتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس مال زکوٰۃ اس قدر جمع ہو چکا ہے کہ وہ تنگ دستی کے دائرہ سے نکل چکے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے غنی کر دیا ہوتا ہے لیکن لوگ انہیں حقیر سمجھ کر زکوٰۃ بدستور دیتے رہتے ہیں اور وہ بھی حسب معمول وصول کرتے رہتے ہیں اور وہ اسے اپنے استعمال میں لاتے

---

[1] دارقطنی، ص: ۱۰۶، ج ۲۔

رہتے ہیں اور یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ ہم نے لوگوں سے نہیں مانگا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہنچایا ہے، ایسا کرنا حرام اور ناجائز ہے کیونکہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے غنی کر دیا ہو اس کے لیے زکوٰۃ وصول کرنا حرام ہے، بہرحال صورت مسئولہ میں آدمی کو وضاحت کر دینا چاہیے کہ میں خود زکوٰۃ کا حقدار ہوں، اگر وہ اجازت دے تو مال زکوٰۃ اپنے لیے رکھ لے بصورت دیگر اسے فقراء میں تقسیم کر دے۔

والدین کو مال زکوٰۃ دینا

سوال میرے والدین انتہائی غریب ہیں، کیا میں انہیں مال زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟ قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا وضاحت ہے۔

جواب انسان کے لیے یہ انتہائی شقاوت اور بدبختی ہے کہ وہ والدین کی خدمت کرنے کے بجائے انہیں اپنی زکوٰۃ دینے کے متعلق سوچ و بچار کرے، والدین نے اسے بچپن سے جوانی تک پالا اور اس کے جملہ اخراجات برداشت کیے، اب جب بیٹا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے تو انہیں اپنی جیب سے کچھ دینے کی بجائے زکوٰۃ دینے کے لیے فتویٰ پوچھتا ہے، بیٹے کو چاہیے کہ وہ اپنے ضرورت مند والدین پر اپنے ذاتی مال سے خرچ کرے، بلکہ اگر والدین ضرورت مند ہیں تو وہ اولاد کی اجازت کے بغیر بھی ان کے مال میں سے حسب ضرورت لے سکتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''سب سے پاکیزہ چیز جو آدمی کھاتا ہے وہ ہے جو اس نے خود کمائی ہو اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی ہے۔''[1]

ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ اس کا والد اس کا مال لے لیتا ہے تو آپ نے فرمایا: ''تو اور تیرا مال تیرے والد ہی کا ہے۔''[2]

والدہ کا حق تو والد سے بھی بڑھ کر ہے جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔[3]

گھریلو ضرورت میں استعمال ہونے والے زیورات کی زکوٰۃ

سوال میرے پاس دس تولے سونے کے زیورات تھے، جو میں نے ایک گھریلو ضرورت کے پیش نظر فروخت کر دیئے ہیں، میں نے ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی، اب مجھے شریعت کیا حکم دیتی ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں میری راہنمائی کریں۔

جواب سونے کے زیورات اگر نصاب کو پہنچ جائیں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، اگر کسی کو زکوٰۃ کے وجوب کا علم نہیں تھا پھر انہیں فروخت کیا ہے تو اس صورت میں زکوٰۃ نہ ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر آپ کو اس کے وجوب کا علم تھا اور دیدہ دانستہ طور پر اس سے پہلو تہی کی ہے تو اڑھائی فیصد کے حساب سے اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے اور اگر کئی سالوں سے زکوٰۃ ادا نہیں کی تو مارکیٹ میں سونے کی قیمت کے حساب سے ان زیورات سے زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی اور اگر اس کے وجوب کا علم آخری سال ہوا پھر انہیں فروخت کر دیا اور زکوٰۃ ادا نہیں کی تو ایک سال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ ان کی زکوٰۃ آپ خود ادا کریں یا آپ کی

---

[1] ابو داود، البیوع: ٣٥٢٨۔ [2] ابو داود، البیوع: ٣٥٣٠۔ [3] ترمذی، البر والصلۃ: ١٨٩٧۔

مشاورت سے آپ کا خاوند اپنی گرہ سے دے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کا بھائی، باپ اور بیٹا بھی آپ کی اجازت سے زیورات کی زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے، بہرحال اس فرض کی ادائیگی ضروری ہے خواہ آپ خود ادا کریں یا آپ کی اجازت سے کوئی دوسرا ادا کردے، مسئلہ کی نوعیت یکساں رہے گی۔ (واللہ اعلم)

قبل از وقت زکوٰۃ دینا

سوال ہم عام طور پر ماہ رمضان میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں لیکن بعض اوقات کوئی ضرورت مند ہمارے پاس آتا ہے جو تعاون کا حقدار ہوتا ہے، کیا ہم مالِ زکوٰۃ سے اس کی مدد کرسکتے ہیں۔ پھر اسے ماہ رمضان میں ادا شدہ زکوٰۃ کے حساب میں لے آئیں؟

جواب زکوٰۃ کے وجوب کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے، ایک یہ کہ وہ مال ضروریات سے زائد ہو، دوسرے یہ کہ وہ نصاب کو پہنچ جائے اور تیسرے یہ کہ اس پر سال گزر جائے، اگر دوران سال کوئی محتاج یا ضرورت مند آجائے جسے مال وغیرہ کی ضرورت ہے تو مال زکوٰۃ سے اس کا تعاون کیا جاسکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ زکوٰۃ اپنے وقت مقررہ سے پہلے دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبل از وقت زکوٰۃ دینے کی اجازت دے دی۔ [1]

امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔ ''قبل از وقت زکوٰۃ ادا کرنے کا بیان۔''

اصحاب خیر کو چاہیے کہ وہ مال زکوٰۃ کے علاوہ فقرا اور مساکین کا تعاون کرتے رہا کریں، اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کی وجہ سے مال واسباب میں برکت عطا فرمائے گا۔

جہالت کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہ کرنا

سوال ایک آدمی نے عرصہ ۳۰ سال سے زکوٰۃ ادا نہیں کی، اب اسے ہوش آیا ہے اور اپنے کیے پر نادم ہے، کیا اسے سابقہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی یا توبہ کرنے سے ہی گناہ معاف ہوجائے گا؟

جواب ہمارے نزدیک مذکورہ سوال کی دو صورتیں ممکن ہیں اور دونوں کا جواب الگ الگ ہے:

① اگر اسے زکوٰۃ کی فرضیت کا علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ میرے پاس اتنا مال موجود ہے جس میں سے زکوٰۃ دینا ضروری ہے، لیکن وہ دانستہ طور پر اس کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتا رہا تو اس صورت میں اسے سابقہ سالوں کا حساب لگا کر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے جرم کی اللہ تعالیٰ سے معافی بھی طلب کرے۔

② اگر اسے زکوٰۃ کی فرضیت کا علم نہ تھا اور نہ وہ جانتا تھا کہ میرے پاس اس قدر مال ہے کہ اس میں سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے، اس صورت میں اسے سابقہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ یہ ''جرم'' لاعلمی اور جہالت میں ہوا ہے، امید ہے کہ

---

[1] ابو داود، الزکوٰۃ: ۱۶۲۴۔

اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ [1]

''اور ہماری سنت نہیں کہ رسول بھیجنے سے پہلے ہی عذاب کرنے لگیں۔''

اس آیت کریمہ میں جہالت کو بطور عذر پیش کیا گیا ہے، اس بنا پر امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے مؤاخذہ نہیں کریں گے جس نے لاعلمی کی وجہ سے فریضۂ زکوٰۃ نظر انداز کیے رکھا۔ (واللہ اعلم)

یتیم بچوں کے مال سے زکوٰۃ دینا

سوال میرا بھائی فوت ہوا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ان بچوں کو اپنے باپ کی جائیداد نقدی کی شکل میں ملی ہے کیا اس نقدی میں سے زکوٰۃ دینا فرض ہے؟

جواب زکوٰۃ دینا مال کا حق ہے۔ یہ حق کسی چھوٹے یا بڑے سے ساقط نہیں ہوتا، اگر یتیم بچوں کا مال نصاب کو پہنچ چکا ہے تو اس پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ فرض ہے بشرطیکہ وہ ضروریات سے زائد ہو قرآن کریم میں ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ﴾ [2]

''آپ ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لیں جس کے ذریعے آپ انہیں پاک کریں۔''

اسی طرح حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ اغنیاء سے لی جائے گی۔ [3] یہ حکم عام ہے وہ غنی بالغ ہو یا نابالغ، دونوں کو شامل ہے۔ اس بنا پر یتیم بچوں کے مال پر بھی زکوٰۃ واجب ہے اور اس کی ادائیگی ان کا سرپرست کرے گا۔ (واللہ اعلم)

صدقۂ فطر کی مقدار اور اوقات

سوال صدقۂ فطر کیوں ادا کیا جاتا ہے، اس کی کتنی مقدار ہے، کیا اس کی قیمت دینا بھی جائز ہے؟ کتاب و سنت سے جواب دیں۔

جواب صدقہ فطر ادا کرنے میں شریعت نے یہ حکمت رکھی ہے کہ اس کی ادائیگی سے غریب لوگوں کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ روزہ کے دوران جو لغویات یا بے ہودہ اقوال و افعال سرزد ہو جاتے ہیں، ان کا کفارہ بن جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر فرض قرار دیا ہے، اس سے روزہ داران لغویات اور بے حیائی پر مبنی اقوال و افعال کے گناہ سے پاک ہو جاتا ہے جو اس سے دوران روزہ سرزد ہوتے ہیں اور مساکین کے لیے کھانے کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ [4]

اس کی مقدار ایک صاع ہے جو اشیاء خوردنی سے ادا کی جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرانہ غلام پر بھی، آزاد پر بھی، مرد پر بھی

---

[1] ١٧/بنی اسرائیل: ١٥۔ [2] ٩/التوبة: ١٠٣۔ [3] صحیح بخاری: ١٣٩٥۔
[4] ابو داود، الصوم: ١٦٠٩۔

عورت پر بھی، الغرض آپ نے مسلمانوں میں سے ہر چھوٹے بڑے پر اس کو فرض قرار دیا ہے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کی قیمت ادا کرنا ثابت نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی روزانہ بازار سے غلہ خرید کر اپنی خوراک کا بندوبست کرتا ہے تو ایسا شخص اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ صاع کی مقدار موجودہ وزن کے لحاظ سے دو کلو سو گرام ہے۔ ویسے بہتر ہے کہ صدقۂ فطر پیمانہ سے ادا کیا جائے جو رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے صاع اور مد کے پیمانے سعودیہ سے مل جاتے ہیں انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ (واللہ اعلم)

پیشہ ور گداگروں کو صدقہ دینا

سوال بسوں، ٹرینوں پر سفر کے دوران دیکھا جاتا ہے کہ جوان لڑکیاں مانگتی ہیں، کچھ لوگ انہیں ضرورت مند خیال کر کے ان کا تعاون کر دیتے ہیں، کیا ایسی پیشہ ور لڑکیوں کا تعاون کرنا چاہیے؟

جواب بھیک مانگنا اور اسے پیشہ بنا لینا انتہائی ناپسندیدہ کردار ہے، اس سلسلہ میں متعدد احادیث مروی ہیں، چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگ گداگری اور بھیک مانگنے کو پیشہ بنا لیتے ہیں وہ قیامت کے دن ایسی حالت میں آئیں گے کہ ان کے چہروں پر گوشت نہیں ہوگا۔'' [2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے مال کو بڑھانے کی غرض سے لوگوں کے سامنے دست سوال پھیلاتا ہے وہ اپنے لیے انگاروں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں مانگتا، اب اس کی مرضی ہے کہ چاہے انہیں کم کرے یا زیادہ۔'' [3]

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مانگنا ایک زخم ہے جس سے انسان اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے البتہ ایسا شخص جو کسی مجبوری کی وجہ سے سوال کرے یا سربراہ مملکت سے مانگے تو اس کے لیے چنداں حرج نہیں ہے۔ [4]

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر لکڑیوں کا گٹھا جنگل سے اپنی پشت پر اٹھا کر لائے پھر اسے بازار میں فروخت کر دے، اس طرح اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مانگنے سے روک دے تو یہ اس کے لیے کہیں بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے، وہ اسے دیں یا نہ دیں۔ [5]

ان احادیث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گداگری کس قدر گھناؤنا جرم ہے، پھر جوان لڑکیاں اس پیشہ کو جب اختیار کرتی ہیں تو پس پردہ بہت سے جرائم چھپے ہوتے ہیں، اس کی آڑ میں قحبہ گری کا راستہ ہموار کیا جاتا ہے، اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ بسوں اور ٹرینوں میں مانگنے والی بے پردہ لڑکیوں کے ساتھ ہرگز تعاون نہ کیا جائے، ان کے ساتھ تعاون کرنا گویا ظلم و زیادتی کے کاموں میں تعاون کرنا ہے جس سے قرآن نے ہمیں منع کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۵۰۳۔ [2] صحیح بخاری، الزکوٰۃ: ۱۴۷۴۔ [3] صحیح مسلم، الزکوٰۃ: ۱۰۴۱۔
[4] ابو داود، الزکوٰۃ: ۱۶۳۹۔ [5] صحیح بخاری، الزکوٰۃ: ۱۴۷۱۔

سونے چاندی کے زیورات پر زکوٰۃ

سوال سونے چاندی کے زیورات کے متعلق صحیح مؤقف کی نشاندہی کریں کہ ان میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنے زیورات پر، ان کے متعلق نصاب کیا ہے اور کس قدر زکوٰۃ نکالی جائے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب سونے چاندی کے زیورات میں زکوٰۃ کے متعلق حسب ذیل اقوال ہیں:

① ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔

② زیورات میں صرف ایک مرتبہ زکوٰۃ دی جائے، ہر سال زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں۔

③ زیورات کی زکوٰۃ یہ ہے کہ انہیں دوسری خواتین کو پہننے کے لیے عاریۃً دے دیا جائے۔

④ زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے اور ہر سال دینی چاہیے بشرطیکہ نصاب کو پہنچ جائیں۔

ان اقوال میں راجح موقف یہ ہے کہ زیورات میں زکوٰۃ فرض ہے اور ہر سال دی جائے، اس مؤقف کی تائید میں حسب ذیل احادیث پیش کی جاتی ہیں:

❶ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس کے ہمراہ اس کی بیٹی بھی تھی، اس بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کیا تو اس کی زکوٰۃ دیتی ہے؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! نہیں، آپ نے فرمایا: ''کیا تجھے پسند ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے بدلے تمہیں آگ کے دو کنگن پہنائے، یہ سن کر اس خاتون نے دونوں کنگن پھینک دیے۔'' [1]

❷ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ سونے کا زیور پہن رکھا تھا، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ کنز ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو تو یہ کسی صورت میں کنز نہیں۔ [2]

❸ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چاندی کے چھلے پہن رکھے تھے، رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: ''آیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟'' انہوں نے عرض کیا: جی نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تمہیں جہنم کی آگ برداشت کرنے کے لیے یہی کافی ہے۔'' [3]

ان احادیث کے علاوہ وہ تمام آیات و احادیث جن میں مطلق طور پر سونے چاندی سے زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، اس مؤقف کی تائید کرتی ہیں۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۴ ہے جس میں سونے چاندی کو کنز بنانے پر سخت وعید ہے۔ پھر ایک حدیث میں ہے کہ جو انسان سونے چاندی کا مالک ہو پھر اس سے وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو اسے زہریلے سانپ کی شکل دی جائے گی جو اسے بار بار ڈسے گا۔ [4]

ان تمام دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ سونا اور چاندی دونوں کے زیورات میں زکوٰۃ فرض ہے، ان کے نصاب کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جب کسی کے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر پورا سال گزر جائے تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ واجب

---

[1] ابو داود، الزکوٰۃ: ۱۵٦۳۔ [2] مستدرك حاكم، ص: ۳۹۰، ج۱۔

[3] ابو داود، الزکوٰۃ: ۱۵٦۵۔ [4] مسند امام احمد، ص: ۱٦۲، ج۲۔

ہے اور جب کسی کے پاس بیس دینار ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو ان میں نصف دینار زکوٰۃ فرض ہے۔'' ❶

واضح رہے کہ دوسو درہم ساڑھے باون تولے چاندی اور بیس دینار ساڑھے سات تولے سونے کے برابر ہوتے ہیں، ان میں چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ (واللہ اعلم)

خاندان سادات کو زکوٰۃ دینا

سوال ہمارے ہاں ایک سادات خاندان کا سربراہ کسی حادثہ کا شکار ہو گیا جس کی وجہ سے اس کے معاشی حالات بہت خراب ہو چکے ہیں، کیا ایسے حالات میں مال زکوٰۃ سے ان کا تعاون کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب ہمارے ہاں سادات کی بھرمار ہے لیکن اصل سادات بنو ہاشم ہیں، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جن کا سلسلہ نسب ملتا ہے، ان کے لیے ہر قسم کا صدقہ وخیرات حرام ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صدقہ یعنی زکوٰۃ وغیرہ آل محمد کے لیے جائز نہیں کیونکہ یہ تو لوگوں کے مال کی میل کچیل ہوتی ہے۔'' ❷

صحیح مسلم کی دوسری روایت میں ہے کہ یہ زکوٰۃ وغیرہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمد کے لیے جائز نہیں ہے۔ ❸ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور لے کر منہ میں ڈال لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ''کخ کخ'' کہا تاکہ وہ اسے منہ سے نکال دیں پھر فرمایا: ''کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے ہیں۔'' ❹

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ہمارے لیے صدقہ جائز نہیں ہے۔'' ❺ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گری پڑی کھجور کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ''اگر یہ شبہ نہ ہوتا کہ یہ کھجور صدقہ کی ہو سکتی ہے تو میں اسے اٹھا کر کھا لیتا۔'' ❻

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سادات خاندان کے لیے صدقہ وخیرات جائز نہیں ہے، اہل ثروت حضرات کو چاہیے کہ ایسے مفلوک الحال سادات کے ساتھ دست تعاون بڑھائیں اور صدقہ وخیرات کے علاوہ اپنی جیب سے ان کی ضروریات کو پورا کریں، بعض حضرات کا خیال ہے کہ سادات خاندان والے کسی دوسرے سید کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، اور بطور دلیل یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ رسول اللہ سے دریافت کیا: ''کیا ہم ایک دوسرے کو صدقہ دے سکتے ہیں تو آپ نے فرمایا: ''ہاں'' دے سکتے ہو۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں، اس لیے ناقابل حجت ہے۔ ❼

---

❶ ابو داود، الزکوٰۃ: ۱۵۷۳۔ ❷ صحیح مسلم، الزکوٰۃ: ۲٤۸۱۔ ❸ حدیث نمبر: ۲۱۸۲۔
❹ بخاری، الزکوٰۃ: ۱٤۹۱۔ ❺ صحیح مسلم، الزکوٰۃ: ۲٤۷٤۔ ❻ صحیح بخاری، البیوع: ۲۰۵۵۔
❼ نیل الاوطار، ص: ۱۳۵، ج۳۔

موجودہ دور میں زکوٰۃ کے لیے سونے چاندی کا نصاب کیا ہے؟

سوال موجودہ دور میں زکوٰۃ کے لیے سونے چاندی کا نصاب کیا ہے، کیا ان کی زکوٰۃ میں قیمت دی جا سکتی ہے یا سونا چاندی ہی دینا ہوگا؟

جواب چاندی کا نصاب کم از کم پانچ اوقیہ ہے [1] ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے اس طرح دوصد درہم سے کم میں زکوٰۃ نہیں، ایک درہم کا وزن 2.97 گرام ہے، اس طرح دوصد درہم کا وزن ۵۹۴ گرام ہے، اس سے کم مقدار میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسی طرح سونے کے متعلق حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیس دینار سے نصف دینار اور چالیس دینار سے ایک دینار بطور زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔ [2] تولہ، ماشہ کے اعتبار سے چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولے اور گرام کے لحاظ سے ۵۹۴ گرام ہے، سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ اور گرام کے لحاظ سے ۸۵ گرام ہے، اس نصاب پر چالیسواں حصہ یا اڑھائی فیصد زکوٰۃ دینی ہوتی ہے، جس قدر مقدار زکوٰۃ دینی پڑے اس کی قیمت بھی موجود ریٹ کے لحاظ سے دی جا سکتی ہے۔ واضح رہے کہ سونا چاندی ڈھیلے کی شکل میں ہو یا زیورات کی صورت میں ہوں، ان میں زکوٰۃ فرض ہوگی، اسی طرح کاغذی نوٹ بھی سونے چاندی کے حکم میں ہیں، جس شخص کے پاس سونے یا چاندی کے نصاب کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ کرنسی نوٹ ہوں، ان پر سال گزر چکا ہو اور وہ ضروریات سے فاضل ہوں تو ان پر زکوٰۃ دینا ہوگی۔

شرائطِ زکوٰۃ

سوال مال سے زکوٰۃ ادا کرنے کی کیا شرائط ہیں، انسان کو کب اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب زکوٰۃ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مال کسی مسلمان کا ہو، کیونکہ کافر کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اگر وہ ادا بھی کرے تو اس سے زکوٰۃ قبول نہ کی جائے، البتہ آخرت میں اس کے متعلق اس سے ضرور باز پرس ہوگی، دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مال کسی مسلمان کی ملکیت میں ہے، کیونکہ ادھار لیا ہوا مال اس کی ملکیت نہیں، لہٰذا وہ اس سے زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا ہاں جس کا مال ہے اس نے اگرچہ کسی دوسرے کو قرض دیا ہے لیکن وہ ادھار دیے ہوئے مال کی خود زکوٰۃ ادا کرے گا، تیسری شرط یہ ہے کہ وہ مال نصاب کو پہنچ جائے، شریعت میں مختلف اموال کا مختلف نصاب ہے اگر کسی مسلمان کے پاس بقدر نصاب مال نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، کیونکہ مالِ قلیل ہے جو ہمدردی اور خیر خواہی کا متحمل نہیں ہو سکتا، چوتھی اور آخری شرط یہ ہے کہ اس پر سال گزر جائے، اگر سال ختم ہونے سے پہلے پہلے مال ختم ہو گیا تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، اسی طرح اگر سال سے پہلے مال تلف یا چوری ہو گیا تو بھی اس سے زکوٰۃ ساقط ہے، البتہ تین چیزیں سال کی شرط سے مستثنیٰ ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری، الزکوٰۃ: ۱٤٤٧۔ [2] ابن ماجہ، الزکوٰۃ: ۱۷۹۱۔

① تجارت کا نفع کیونکہ یہ اصل مال کے تابع ہے۔

② مویشیوں سے پیدا ہونے والے بچے، یہ بچے اپنی ماؤں کے حکم میں ہیں اوران کے تابع ہیں۔

③ زمین کی پیداوار، فصلوں اور پھلوں کا سال اس وقت ہے جب یہ حاصل ہوں۔ جب مذکورہ شرائط کسی مال میں پائی جائیں تو اس سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

وقت سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا

سوال کیا زکوٰۃ کسی ہنگامی ضرورت کے پیش نظر وقت سے پہلے دی جاسکتی ہے، نیز کیا یہ ضروری ہے کہ وہ مقامی غرباء میں ہی تقسیم کی جائے؟ کتاب وسنت کے مطابق جواب دیا جائے۔

جواب اگر کوئی ضرورت مند آجائے تو اسے وقت سے پہلے زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا زکوٰۃ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ادا ہوسکتی ہے؟ تو آپ نے انہیں اجازت دے دی۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ وقت سے پہلے دینے میں چنداں حرج نہیں ہے بشرطیکہ کوئی ہنگامی ضرورت سامنے آجائے مثلاً کوئی غریب یا نادار ہے، اسے علاج کرانے کے لیے رقم کی ضرورت ہے تو اسے زکوٰۃ کی مد سے رقم دی جاسکتی ہے اگرچہ اس وقت زکوٰۃ فرض نہ ہو، اسی طرح بہتر ہے کہ مقامی فقراء اور ضرورت مندوں پر زکوٰۃ صرف کی جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ زکوٰۃ اہل یمن کے اغنیاء سے وصول کی جائے اوران کے ضرورت مندوں اور محتاجوں میں تقسیم کی جائے۔[2] اسی طرح ایک صحابی حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہمارے پاس ایک زکوٰۃ وصول کرنے والا شخص آیا تو اس نے ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کرکے ہمارے فقراء میں تقسیم کردی۔[3]

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے مقامی فقراء اور ضرورت مند زیادہ حقدار ہیں لیکن ضرورت اور مصلحت کے پیش نظر کسی دوسرے شہر میں بھی زکوٰۃ بھیجی جاسکتی ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ''مالداروں سے زکوٰۃ وصول کرکے فقراء پر تقسیم کردی جائے خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔''

بہرحال ہمارے رجحان کے مطابق بہتر ہے کہ زکوٰۃ مقامی طور پر صرف کی جائے اگر مقامی طور پر ضرورت نہ ہو یا مصلحت کا تقاضا دوسرے شہر میں خرچ کرنے کا ہو تو وہاں زکوٰۃ صرف کرنے میں ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں ہوگا۔ البتہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرکے جہاں بھی تقسیم کردی جائے تو یہ فریضہ ادا ہوجائے گا اوراس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

بیوی کا خاوند کو زکوٰۃ دینا

سوال کیا بیوی اپنے ضرورت مند خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے؟ پھر اس نے خود ہی اس زکوٰۃ کو استعمال کرنا ہے، اس کی

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۱۰٤، ج۱۔ [2] بخاری، الزکوٰۃ: ۱٤۵۸۔ [3] ترمذی، الزکوٰۃ: ٦٤۹۔

شرعی حیثیت کیا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب زکوٰۃ کے متعلق ضابطہ یہ ہے کہ جس کی کفالت کسی کے ذمہ ہو اس پر زکوٰۃ صرف نہیں کی جاسکتی مثلاً باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی کفالت کرے، ان میں زکوٰۃ صرف نہیں ہوسکے گی، اسی طرح خاوند پر بیوی کا نان ونفقہ واجب ہے، لہٰذا وہ اپنی بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا البتہ بیوی اپنے ضرورت منداور غریب خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی نے جب اپنے زیورات کی زکوٰۃ دینے کا ارادہ کیا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خود کو اور اپنے بچوں کو زکوٰۃ کا زیادہ حقدار پایا، اس پر ان کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ٹھیک کہا ہے، تیرا شوہر اور اس کی اولاد تیری زکوٰۃ کے زیادہ حقدار ہیں۔'' [1]

جب زکوٰۃ حقدار کو مل جاتی ہے تو اس کی حیثیت بدل جاتی ہے، زکوٰۃ لینے والا اسے جہاں چاہے صرف کرسکتا ہے، صورت مسئولہ میں بیوی اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے اگرچہ بیوی نے اسی گھر سے کھانا ہوتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ زکوٰۃ کی حیثیت تبدیل ہوچکی ہے، یہ خود پر زکوٰۃ صرف کرنا نہیں، لیکن یہ بات یاد رہے کہ محتاج ہونے کی صورت میں ہی بیوی اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے سکے گی بصورت دیگر ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔ (واللہ اعلم)

بیٹیوں کے زیورات پر زکوٰۃ

سوال ایک شخص کی دو بیٹیاں ہیں، اس نے دونوں کے لیے آٹھ تولے کا زیور بنا کر رکھا ہوا ہے یعنی ہر ایک کے لیے چار چار تولے، کیا ایسے زیور پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے؟

جواب اگر اس نے زیور بنا کر اپنے پاس رکھا ہے تو اس سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ ابھی تک اس کی ملکیت میں ہے اور وہ زیور نصاب کو پہنچ چکا ہے اور اگر اس نے اپنی بیٹیوں کو عاریتاً دیا ہے۔ تب بھی اس سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی کیونکہ اس صورت میں بھی وہ اس زیور کا مالک ہے، ہاں اگر اس نے وہ زیور مستقل طور پر اپنی بیٹیوں کو دے دیا ہے اور انہیں اس کا مالک بنادیا ہے تو اس صورت میں اس پر زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ اب وہ اس کی ملکیت سے نکل چکا ہے اور جن کی ملکیت میں آیا ہے وہ انفرادی طور پر نصاب سے کم ہے اور چار تولہ زیور میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے، یاد رہے کہ بطور حیلہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے وہ زیور اپنی بیٹیوں کو نہ دیا جائے جبکہ وہ اس کی ضرورت مند بھی نہیں ہیں، ایسا کرنا گناہ ہے اور شریعت میں اس کی گنجائش نہیں۔ (واللہ اعلم)

بینک میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ

سوال میں نے تقریباً پچاس ہزار روپیہ بینک میں جمع کروا رکھا ہے، ضرورت کے مطابق رقم نکلواتا اور جمع کرواتا رہتا ہوں، اس رقم پر مجھے کچھ منافع دیا جاتا ہے کیا اسے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ اور زکوٰۃ کے متعلق کیا اصول ہے کیا صرف منافع پر ہوگی یا منافع اور اصل رقم دونوں پر؟ کتاب وسنت کی روشنی میں تفصیل سے جواب دیں۔

---

[1] بخاری، الزکوٰۃ: ۱٤٦۲۔

جواب بینک جو رقم منافع کے طور پر دیتا ہے شرعی اعتبار سے وہ سود ہے، نام کے بدلنے سے حقیقت نہیں تبدیل ہوتی، اس لیے ایک مسلمان کو اس قسم کے ''منافع'' سے پرہیز کرنا چاہیے جو سود ہی کا نام ہے، اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر اسے حرام کہا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ [1]

''اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔''

اس سے اجتناب نہ کرنے والے کو اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے خلاف جنگ قرار دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ [2]

''اگر تم سودی کاروبار کو ترک نہیں کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، دینے والے، اس کی دستاویز تیار کرنے والے اور اس کی گواہی دینے والے پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔ [3]

سود کی شکل میں بینک کے ''منافع'' کو استعمال کرنا کس قدر سنگین جرم ہے اس کا اندازہ درج ذیل حدیث سے لگایا جا سکتا ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''دانستہ طور پر سود کا ایک درہم کھانا چھتیس مرتبہ بدکاری کرنے کے برابر ہے۔'' [4]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس قوم میں زنا اور سود پھیل جاتا ہے وہ خود پر اللہ کا عذاب حلال قرار دے لیتے ہیں۔'' [5]

ان احادیث کی روشنی میں ایک مسلمان کو تنبیہ ہے کہ وہ سود سے پرہیز کرے، اس سے دنیا اور آخرت تباہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق یہ اصول ہے کہ جو مال تجارت میں لگا ہوا ہو، سال گزر جانے کے بعد اس سے زکوٰۃ دی جائے بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے اور جو رقم بینک میں پڑی ہے، اس سے انسان خود زکوٰۃ ادا کرے، ''منافع'' یعنی سودی رقم اس کی نہیں اور نہ ہی اس سے زکوٰۃ دینے کی ضرورت ہے، صارف کو صرف اپنی رقم کی زکوٰۃ نکالنی چاہیے، زکوٰۃ کے سلسلہ میں بینک کے رحم و کرم پر اکتفا نہ کیا جائے کہ اس کی کاٹی ہوئی ''زکوٰۃ'' کو کافی خیال کر لیا جائے، کیونکہ بینک اس کھاتے میں زکوٰۃ کاٹتا ہے جس پر سود دیتا ہے، کرنٹ کھاتے سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی، جتنی زکوٰۃ کاٹی جاتی ہے اس سے کہیں زیادہ اصل رقم کے ساتھ سود شامل کر دیا جاتا ہے، اس لیے صارف بینک میں پڑی ہوئی اپنی رقم کی خود زکوٰۃ ادا کرے۔ (واللہ اعلم)

زرعی پیداوار کی زکوٰۃ

سوال ہمارے ملک میں بہت سی زرعی پیداوار ہوتی ہیں، مثلاً گندم، کپاس، گنا اور پھل وغیرہ بھی زمین کی پیداوار ہیں، قرآن کریم نے زرعی پیداوار سے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے، اس سلسلہ میں کیا فیصلہ ہے، کتنی پیداوار پر کتنا حق،

---

[1] ۲/البقرہ: ۲۷۵۔ [2] ۲/البقرہ: ۲۷۹۔ [3] صحیح مسلم، البیوع: ۱۵۹۸۔

[4] مسند امام احمد، ص: ۲۲۵، ج۵۔ [5] صحیح الترغیب، البیوع: ۱۸۶۰۔

کس پیداوار سے ادا کرنا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب کتاب وسنت میں دو قسم کی زکوٰۃ کا ذکر ہوا ہے، ایک تجارتی زکوٰۃ اور دوسری زرعی زکوٰۃ، اگرچہ کچھ معاصرین نے صنعتی زکوٰۃ کو الگ قسم قرار دیا ہے تاہم یہ تجارت ہی کا ایک شعبہ ہے، اس سلسلہ میں قرآن کریم کی درج ذیل آیات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں:

① ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ [1]

''اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین میں سے نکالا ہے، اس میں سے اچھی چیزیں اس اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جیسے اموال صنعت وتجارت میں زکوٰۃ فرض ہے ویسے ہی زمین کی پیداوار میں بھی فرض ہے۔

② ﴿وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ [2]

''وہی تو ہے جس نے چھتوں اور بغیر چھتوں کے باغات پیدا کیے نیز کھیتیاں اور کھجوریں پیدا کیں، جن سے کئی طرح کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں اور اس نے زیتون اور انار پیدا کیے جن کے ذائقے ملتے جلتے بھی ہیں اور مختلف بھی، جب یہ درخت پھل لائیں تو ان سے خود بھی کھاؤ اور فصل اٹھاتے وقت ان میں اللہ کا حق بھی ادا کرو۔''

❶ زرعی زکوٰۃ کے لیے پیداوار کا پانچ وسق یا اس سے زیادہ ہونا شرط ہے، ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے گویا زرعی پیداوار کا نصاب ۳۰۰ صاع ہے، جدید اعشاری نظام کے مطابق ایک صاع ۲ کلو اور ۱۰۰ گرام کا ہوتا ہے، اس حساب سے پانچ وسق میں چھ صد تین کلوگرام وزن بنتا ہے، اس سے کم مقدار پر زکوٰۃ دینا ضروری نہیں کیونکہ اس سے کم پیداوار تو کاشتکار یا زمیندار کے گھر کا سالانہ خرچ تصور کیا جائے گا، جب کہ تجارتی زکوٰۃ کے لیے سرمایہ کا پانچ اوقیہ چاندی کے برابر ہونا ضروری ہے یہ چاندی ساڑھے باون تولے ہوتی ہے، اس سے کم مالیت میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''پانچ وسق کھجور سے کم مقدار میں زکوٰۃ نہیں ہے اور پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ نہیں ہے۔'' [3]

❷ زرعی زکوٰۃ میں پیداوار پر سال گزرنے کی شرط نہیں ہے بلکہ جب بھی فصل کاٹی جائے یا پھل توڑا جائے تو اسی وقت زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے جیسا کہ درج بالا آیت میں ہے لیکن تجارتی زکوٰۃ کے لیے سرمایہ پر سال گزرنا ضروری ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مال میں بھی اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں جب تک اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔ [4]

یہ امر انتہائی عدل پر مبنی ہے اگر اس کا وجوب ہر ماہ ہر ہفتہ میں ہوتا تو اس سے اغنیاء کو نقصان ہوتا اور اگر زکوٰۃ کا وجوب زندگی میں ایک مرتبہ ہوتا تو اس سے مساکین خسارے میں رہتے، اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے کھیتوں اور پھلوں کے صحیح طور پر پختہ ہونے پر اور

---

[1] ٢/البقرة: ٢٦٧۔ [2] ٦/الانعام: ١٤١۔

[3] صحيح بخاري، الزكوٰة۔ [4] بيهقي، ص: ٩٥، ج٤۔

تجارتی اموال میں سال گزرنے پر زکوٰۃ فرض کی ہے۔

❸ شرح زکوٰۃ میں بھی فرق ہے کیونکہ اگر کھیتیاں اور باغات قدرتی چشمہ یا بارش کے پانی سے سیراب ہوں تو اس میں عشر یعنی دسواں حصہ اور اگر انہیں مصنوعی طریقوں سے سیراب کیا جائے تو اس میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ زکوٰۃ دینا ہوگی، جب کہ تجارتی اموال میں چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فیصد زکوٰۃ دی جاتی ہے جیسا کہ احادیث میں اس کی وضاحت ہے، چنانچہ زرعی زکوٰۃ کی شرح صحیح بخاری حدیث نمبر ۱۴۸۳ اور تجارتی زکوٰۃ کی شرح صحیح بخاری، حدیث نمبر ۱۴۴۷ میں بیان ہوئی ہے۔ تجارتی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے بشرطیکہ وہ نصاب تک پہنچ جائے۔ اس سلسلہ میں کچھ اجناس کو خاص کرنا درست نہیں کیونکہ قرآن و حدیث میں زکوٰۃ کو خاص اجناس تک محدود رکھنے کے متعلق کوئی صحیح اور صریح دلیل موجود نہیں ہے بلکہ درج ذیل دلائل کے عموم کا تقاضا ہے کہ ہر قسم کی زمینی پیداوار سے زکوٰۃ دی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ ❶

"اس چیز میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہے۔"

❶ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ﴾ ❷ "کھیتی کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔"

❷ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "وہ زمین جسے آسمانی پانی یا قدرتی چشمے سیراب کریں، اس کی پیداوار میں دسواں حصہ اور جسے کنویں سے پانی کھینچ کر سیراب کیا جاتا ہو اس کی پیداوار سے بیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔" ❸

ان آیات و احادیث میں کسی خاص جنس کا ذکر نہیں ہے بلکہ زمین کی ہر پیداوار پر زکوٰۃ دینے کی صراحت ہے بشرطیکہ وہ مقدار نصاب تک پہنچ جائے، البتہ کچھ اہل علم نے زرعی زکوٰۃ کو خاص اجناس تک محدود کیا ہے مثلاً گندم، جو، منقیٰ اور کھجور وغیرہ سے زکوٰۃ لی جائے اور کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ ہر اس جنس سے زکوٰۃ لی جائے جو بطور غذا استعمال ہوتی ہے اور اس کا ذخیرہ بھی کیا جا سکتا ہو، ان کے نزدیک پھلوں اور ترکاریوں میں زرعی زکوٰۃ نہیں، اسی طرح گنے کی فصل میں بھی زرعی زکوٰۃ کے بجائے تجارتی زکوٰۃ لینے کے قائل ہیں بشرطیکہ اس کی مجموعی قیمت نصاب کو پہنچ جائے، ان کے دلائل اور ان پر ہمارا تبصرہ حسب ذیل ہے:

☆ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا تھا، جب انہیں یمن میں لوگوں کو دین سکھانے کے لیے روانہ کیا، آپ نے فرمایا: "جو، گندم، منقیٰ اور کھجور۔ ان چار اجناس کے علاوہ کسی دوسری جنس سے زکوٰۃ وصول نہ کرنا۔" ❹

سنن ابن ماجہ میں پانچ اصناف کا ذکر ہے، مذکورہ چار کے علاوہ اس میں مکئی کا بھی ذکر ہے یعنی ان پانچ اصناف سے زکوٰۃ لی جائے۔ ❺ لیکن یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس میں محمد بن عبداللہ خزرجی راوی ضعیف ہے جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے۔ ❻

---

❶ ۲/البقرہ: ۲۶۷۔ ❷ ٦/الانعام: ۱۴۲۔ ❸ بخاری، زکوٰۃ: ۱۴۸۳۔

❹ مستدرك حاكم، ص: ۴۰۱، ج۱۔ ❺ سنن ابن ماجه، الزكوٰة: ۱۸۱۵۔ ❻ ضعيف، ابن ماجه: ۴۰۰۔

اس لیے چار اجناس سے ہی زرعی زکوٰۃ وصول کی جائے۔ چونکہ مسلمان کا مال حرام ہے۔ اس لیے صرف اتنا ہی لیا جا سکتا ہے جتنے مال کے متعلق قطعی دلیل موجود ہو اور دلیل کی رو سے صرف چار چیزوں سے زکوٰۃ لینا ثابت ہے لہٰذا انہی چار پر اکتفا کیا جائے۔

اس دلیل کے متعلق ہماری گزارش یہ ہے کہ اگرچہ امام حاکم نے اس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے اور علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی موافقت کی ہے، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ❶

لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ روایت قابل حجت نہیں ہے کیونکہ اس میں ابو حذیفہ راوی صدوق سیئ الحفظ ہے، سفیان ثوری جیسے مدلس راوی نے اس روایت کو عَنْ سے بیان کیا ہے اور طلحہ بن یحییٰ راوی بھی مختلف فیہ ہے، ان تمام راویوں کے متعلق جرح کتبِ جرح وتعدیل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کچھ شواہد پیش کیے ہیں لیکن وہ بھی مرسل اور ضعیف ہیں۔ اس لیے یہ روایت اس پایہ کی نہیں کہ اس سے قرآنی عموم کو خاص کیا جائے۔ اس لیے ہر زمینی پیداوار سے زکوٰۃ دی جائے، سورۃ الانعام کی آیت کے سیاق کو دیکھا جائے تو اس میں مختلف باغات بالخصوص کھجوروں اور اناروں کا ذکر ہے پھر تمام زرعی اجناس کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ﴾ ❷

''جب یہ درخت پھل لائیں تو ان سے خود بھی کھاؤ اور فصل اٹھاتے وقت ان میں سے اللہ کا حق بھی ادا کرو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں گندم، جو، منقیٰ اور کھجور سے زکوٰۃ لی جاتی تھی مگر ہمارے ہاں ان کے علاوہ اور بہت سی اجناس بکثرت پیدا ہوتی ہیں جیسے چاول، جوار، باجرہ، مکئی، جو اور چنے وغیرہ۔ لہٰذا ان سب اجناس پر زکوٰۃ فرض ہوگی، ان کے علاوہ اخروٹ، بادام، خوبانی، مونگ پھلی اور کشمش بھی بکثرت دستیاب ہیں، یہ سب چیزیں جب حد نصاب کو پہنچ جائیں تو ان سے بھی زرعی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ سبزیوں اور ترکاریوں کے متعلق بھی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں زرعی زکوٰۃ نہیں ہے مثلاً

☆ حضرت عطاء بن سائب فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مغیرہ نے حضرت موسیٰ بن طلحہ کی زمین میں سے سبزیوں کی زکوٰۃ لینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا کہ تم ان سبزیوں سے زکوٰۃ نہیں لے سکتے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ ❸

لیکن اس روایت کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت مرسل ہے۔ ❹

☆ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھیرا، ککڑی، تربوز، انار اور گنے سے زکوٰۃ معاف فرمائی ہے۔ ❺

لیکن اس روایت کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس میں ضعف اور انقطاع پایا جاتا ہے، اس لیے یہ بھی قابل حجت نہیں ہے۔ ❻

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سبزیوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔'' ❼

---

❶ تمام المنه: ٣٦٩۔ ❷ ٦/الانعام: ١٤١۔ ❸ دارقطنی، ص: ٩٧ ج٢۔ ❹ تلخیص الحبیر، ص: ٣٢١، ج٢۔
❺ دارقطنی، ص: ٩٧، ج٢۔ ❻ تلخیص الحبیر، ص: ٣٢١، ج٢۔ ❼ دارقطنی، ص: ٩٦، ج٢۔

اس روایت کے متعلق خود امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں مروان سنجاری راوی ضعیف ہے لہٰذا قابل حجت نہیں، چونکہ اس طرح کی تمام روایات ضعیف ہیں، اس لیے قرآن وسنت کے عمومی دلائل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر زمینی پیداوار سے زرعی زکوٰۃ ادا کی جائے بشرطیکہ وہ پیداوار نصاب کو پہنچ جائے۔ ہمارے ہاں بعض سبزیاں اور ترکاریاں ایسی پائی جاتی ہیں جو جلدی خراب نہیں ہوتیں مثلاً آلو، لہسن، پیاز، ادرک، ہلدی اور پیٹھا وغیرہ اور جو جلدی خراب ہونے والی ہیں مثلاً کدو، ٹینڈے، کریلے، گوبھی اور توریاں وغیرہ ان تمام سبزیوں سے زرعی زکوٰۃ دی جائے یعنی پیداوار کا بیسواں حصہ ادا کیا جائے۔

بعض علاقوں میں سورج مکھی، بانس اور سفیدا کاشت کیا جاتا ہے، ان سے بھی زرعی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ کپاس کی فصل بھی زرعی پیداوار ہے اور خاصی منفعت بخش ہے، اس سے بھی بیسواں حصہ ادا کرنا ہوگا اگر کوئی کاشتکار تجارت پیشہ بھی ہے تو اسے چاہیے کہ پہلے اس سے عشر ادا کرے پھر اسے تجارت میں فروخت کرنے کے بعد اس سے تجارتی زکوٰۃ ادا کرے یعنی کھیتی کا حساب الگ ہوگا اور تجارتی مال کی زکوٰۃ کا حساب الگ ہوگا۔

بعض علاقوں میں گنا بھی کاشت کیا جاتا ہے، اگر اسے ملوں میں فروخت کیا جاتا ہے تو بیس ٹرالیوں میں سے ایک ٹرالی زرعی زکوٰۃ کے طور پر دی جائے۔ اس کی قیمت بطور عشر ادا کی جائے، اگر کسی نے کماد کو چارا کے طور پر استعمال کر لیا ہے تو اس میں کوئی زرعی زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ اگر اس کماد سے گڑ، شکر یا چینی بنائی جائے تو اس سے بیسواں حصہ ادا کرنا ہوگا بشرطیکہ وہ نصاب کی حد تک پہنچ جائے۔

بہر حال ہمارا مؤقف یہ ہے کہ زمین کی ہر پیداوار سے بیسواں یا دسواں حصہ ادا کیا جائے، اس کی بعض پیداوار کو زکوٰۃ کے لیے مخصوص کرنا محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

خیراتی ہسپتال میں زکوٰۃ استعمال کرنا

سوال ایک خیراتی ہسپتال جہاں علاج معالجہ مفت ہوتا ہو کیا ایسے ہسپتال کے لیے مال زکوٰۃ سے آپریشن کے آلات یا دیگر سامان خریدا جاسکتا ہے، قرآن وحدیث کی اس سلسلہ میں کیا ہدایات ہیں؟

جواب زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فریضہ ہے جس کے مصارف خود اللہ تعالیٰ نے ہی بیان فرمائے ہیں اور وہ یہ ہیں:

1. فقیر: اس سے مراد ایسا مسلمان ہے جس کے پاس اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔
2. مساکین: جس کے پاس کچھ مال تو موجود ہو لیکن اس کی ضروریات کے لیے ناکافی ہو۔
3. عاملین زکوٰۃ: وہ افراد جو زکوٰۃ جمع کرنے پر تعینات ہیں اور اس کا حساب وکتاب رکھتے ہیں۔
4. تالیف قلب: کسی غیر مسلم کی دلجوئی کرنا جس کے اسلام لانے کا قوی امکان ہو۔
5. گردن آزاد کرنا: کسی غلام کو آزادی دلانے میں مالی مدد کرنا یا مسلمان قیدی کو کفار سے رہائی دلانا۔
6. قرض دار: ایسا مقروض جس نے اپنی ضروریات کے لیے قرض لیا لیکن تنگ دستی کی وجہ سے ادائیگی پر قادر نہیں رہا۔

⑦ فی سبیل اللہ: اللہ کے راستے میں خرچ کرنا جس سے مقصود اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ہو۔

⑧ ابن السبیل: مسافر انسان کو دورانِ سفر ضروریات پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

قرآن کریم کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ صرف انہی مصارف پر خرچ کی جا سکتی ہے جیسا کہ آغاز میں کلمہ اِنَّمَا سے معلوم ہوتا ہے۔ان مصارف میں مریض شخص شامل نہیں ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر مریض کو بھی زکوٰۃ کا مستحق خیال کیا جاتا ہے پھر اس بنا پر ہسپتالوں کو زکوٰۃ دی جاتی ہے، جب کہ مرض کی بناء پر زکوٰۃ کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا مریض جو صاحب استطاعت ہو اس پر زکوٰۃ صرف کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ حدیث میں ہے: ''زکوٰۃ میں مالدار آدمی کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی کسی طاقتور، کمائی کی صلاحیت رکھنے والے کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔'' [1]

ان خیراتی ہسپتالوں میں مال زکوٰۃ کو غریب لوگوں کے علاج تک محدود نہیں رکھا جاتا بلکہ وہ لوگ بھی سہولیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو صاحب حیثیت یا بااثر ہوتے ہیں، چونکہ ادویات امیر وغریب کے امتیاز کے بغیر ہر مریض کو دی جاتی ہیں لہٰذا ایسے ہسپتالوں کو زکوٰۃ دینا صحیح نہیں ہے اسی طرح درج ذیل مدات میں مال کی زکوٰۃ استعمال کرنا بھی محل نظر ہے۔

❶ ہسپتالوں کے لیے جگہ خریدنا اور عمارت تعمیر کرنا۔ ❷ ادویات خریدنا اور علاج کے لیے آلات فراہم کرنا۔

❸ ٹیسٹ لیبارٹری کا اہتمام کرنا۔ ❹ مریضوں کو لانے اور گھر پہنچانے کے لیے ایمبولینس لینا۔

❺ بے سہارا اور لاوارث لوگوں کے لیے کفن ودفن کا اہتمام کرنا۔

بہر حال زکوٰۃ کا اولین مستحق فقیر یا مسکین شخص ہے، ایسے خیراتی ہسپتال جو صرف فقراء کے علاج کے لیے مخصوص ہوں اور یا مال زکوٰۃ سے صرف غرباء کا علاج کیا جاتا ہو، ایسے ہسپتالوں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے بشرطیکہ صرف ادویات وغیرہ خریدی جائیں لیکن جہاں امراء ترجیحی طور پر فائدہ اٹھاتے ہوں وہاں زکوٰۃ دینے سے گریز کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ابو داود، الزکوٰۃ: ۱۳۱۹۔

حج و عمرہ
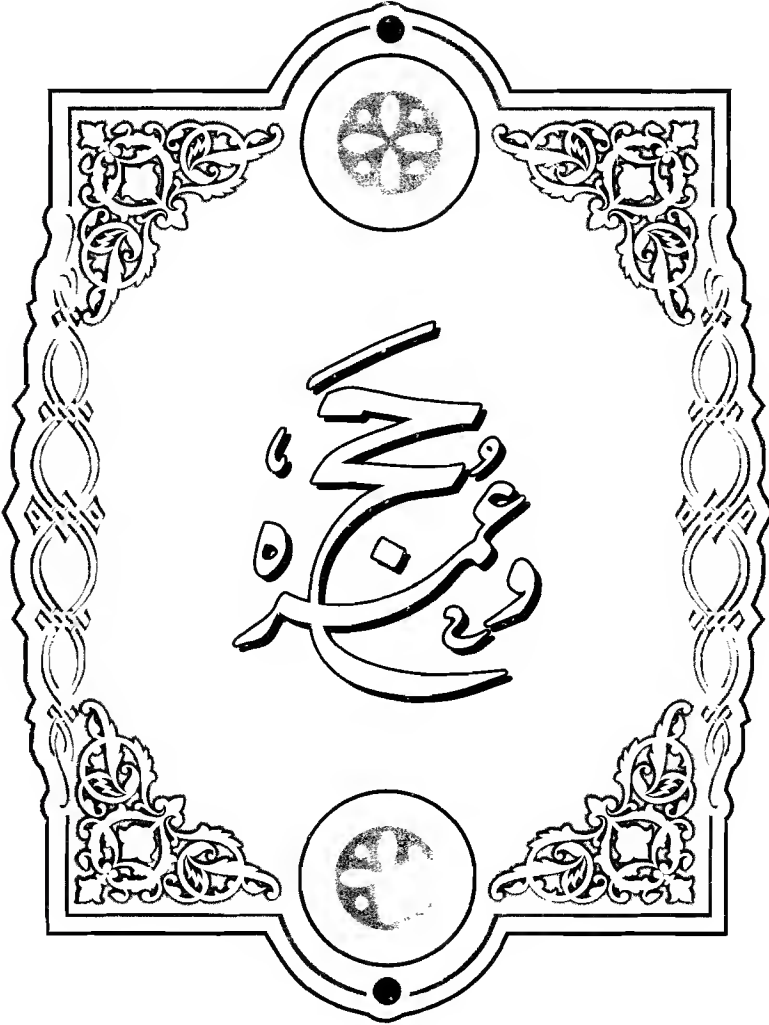
موجودہ حالات میں حج پر جانا

سوال ایک آدمی حج کے لیے تیار ہے جبکہ دوسری طرف طاغوتی طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے متحد ہو چکی ہیں، کیا ایسے حالات میں حج کے لیے جانا ضروری ہے یا اس کا خرچہ دعوت و جہاد میں صرف کر دینا بہتر ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب واضح رہے کہ ہوس ملک گیری اور باہمی افتراق نے عالم اسلام کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا ہے، نتیجہ کے طور پر آج ہم صحیح اسلامی قیادت سے محروم ہیں اور ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہیں، ایک طرف ہمارے پڑوس میں ہندو غنڈے ہماری عزتوں سے کھیل رہے ہیں اور والدین کی آنکھوں کے سامنے ان کی جوان بیٹیوں کی عصمتوں کو تار تار کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ انہیں خواہشات نفس اور دنیا پرستی کے علاوہ کوئی دوسرا فکر دامن گیر نہیں ہے۔ ایسے پرفتن حالات میں طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہمارا ایک اہم فریضہ ہے، صورت مسئولہ میں اگر حج فرض ہے تو اسے حج ادا کرنا چاہیے اور اپنی بساط کے مطابق دعوت و جہاد میں بھی حصہ لینا چاہیے لیکن ایسا کرنے سے فریضہ حج ساقط نہیں ہوگا۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے فریضہ حج سے سبکدوش ہونے کے لیے موقع فراہم کر دیا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ اسے ضائع نہ کیا جائے اور دعوت و جہاد کے لیے اپنی ہمت کے مطابق حصہ ڈالتا رہے۔ (واللہ اعلم)

لاعلمی میں نجس کپڑوں میں عمرہ ادا کرنا

سوال میں نے عمرہ کیا، فراغت کے بعد مجھے علم ہوا کہ احرام کے کپڑے نجاست آلود تھے، میرے لیے اب کیا حکم ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اگر کسی انسان نے عمرہ کیا اور طواف وسعی کر لینے کے بعد اسے پتہ چلا کہ احرام کی چادروں کو نجاست لگی ہوئی تھی تو اس کا عمرہ مکمل ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں عمرہ ہوا جبکہ اسے نجاست کا علم نہ تھا یا اسے معلوم تھا مگر وہ اسے دھونا بھول گیا، ان دونوں صورتوں میں اس کا عمرہ صحیح ہے، دوبارہ عمرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ [1]

---

[1] ۲/البقرۃ: ۲۸۶۔

''اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول ہو جائے یا ہم کسی خطاء کے مرتکب ہوں تو اس پر ہمارا مؤاخذہ نہ فرما۔''

رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھائی اور آپ جوتوں سمیت نماز پڑھ لیتے تھے، اس دن آپ نے دوران نماز اپنے جوتوں کو اتار دیا، آپ کو دیکھ کر آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے جوتوں کو اتار دیا، نماز کے مکمل کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا تھا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے دیکھا کہ آپ نے جوتے اتار دیے ہیں تو ہم نے بھی اپنے جوتے اتار دیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس تو جبرئیل علیہ السلام آئے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے جوتوں کو نجاست لگی ہوئی ہے۔''[1]

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے کچھ نماز کا حصہ نجاست آلود جوتوں میں ادا کیا۔ لیکن آپ نے اس ادا شدہ نماز کا اعادہ نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص بھول جائے یا لاعلمی کی وجہ سے ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہے، اسے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، اس طرح اگر نادانستہ یا لاعلمی کی وجہ سے نجاست آلود احرام میں عمرہ کر لیا تو علم ہونے کے بعد اسے دوبارہ عمرہ کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا عمرہ صحیح ہے۔

حج بدل کرنا

سوال میرے والد گرامی کا چند روز قبل انتقال ہوا، زندگی میں ان پر حج فرض نہیں ہوا تھا کیونکہ جب ان کے پاس زادِ سفر (رقم) کا بندوبست ہوا تو وہ صحت کے حوالے سے سفر حج کے قابل نہ تھے، اب ان کی وفات کے بعد حج بدل کا حکم ان کے ورثاء پر لاگو ہوگا یا نہیں اور اگر ہوگا تو ان کی طرف سے کون حج ادا کر سکتا ہے؟

جواب حج ارکان اسلام میں سے پانچواں رکن ہے اور یہ اس شخص پر فرض ہے جو اس کی استطاعت رکھتا ہو، استطاعت سے مراد یہ ہے۔

(ا) بیت اللہ شریف جانے اور واپس آنے کا خرچہ اس کے پاس موجود ہو۔

(ب) اس کی عدم موجودگی میں گھر کے اخراجات کے لیے فاضل رقم موجود ہو۔

(ج) سفر حج پر امن ہو اور اس کے مال وجان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

(د) جسمانی صحت اس قابل ہو کہ اس سفر کی صعوبتوں کو برداشت کر سکتا ہو۔

اگر کسی کے پاس حج اور اہل خانہ کے اخراجات موجود ہیں اور راستہ بھی پر امن ہے مگر جسمانی صحت ساتھ نہیں دیتی تو وہ کسی تندرست شخص کو اپنی طرف سے حج کروا سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حجۃ الوداع کے موقع پر ایک عورت آئی اور اس نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ کا فریضہ حج جو اس کے بندوں پر عائد ہے اس نے میرے بوڑھے باپ کو پالیا ہے مگر وہ سواری پر بیٹھنے کے قابل نہیں ہے تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا

---

[1] ابو داود، الصلوٰۃ: ٦٥٠۔

ہاں تو اس کی طرف سے حج کرسکتی ہے۔ ❶ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ معذور آدمی اگر چاہے تو کسی کو اپنا نائب مقرر کر کے حج کرواسکتا ہے، اسے حج بدل کہتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ جسے حج بدل کے لیے بھیجا جائے وہ پہلے خود اپنا فریضہ حج ادا کر چکا ہو، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو کہا تھا کہ پہلے اپنی طرف سے حج کرو پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرنا۔ ❷ صورت مسؤلہ میں سائل کے والد کے پاس حج کے اخراجات تو موجود تھے لیکن وہ خود سفر حج کرنے کے قابل نہ تھے اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا، اب اگر مرحوم کی اولاد اس کی طرف سے حج بدل کرانا چاہتی ہے تو شرعاً اس کی اجازت ہے لیکن اس کے لیے کسی ایسے نیک شخص کا انتخاب کیا جائے جو پہلے اپنا حج کر چکا ہے اور اس سلسلہ میں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر مرحوم نے حج کے لیے کچھ رقم مختص کی تھی اور وہ وفات کے وقت موجود تھی تو اسے اب حج کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اب وہ رقم اس کا ''ترکہ'' شمار ہوگی جسے ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا اگر تمام ورثاء بطیب خاطر رضا مند ہوں تو اس رقم کو حج کی مد میں استعمال کیا جاسکتا ہے یا پھر اولاد میں کوئی یا سب مل کر باپ کی طرف سے حج بدل کرانے کا بندوبست کریں، مختصر یہ کہ ان کے ورثاء پر حج کا حکم لاگو نہیں ہے ہاں اگر چاہیں تو اس کی طرف سے حج بدل کر سکتے ہیں اور جس نے حج بدل کرنا ہے پہلے وہ اپنا حج کر چکا ہو۔ (واللہ اعلم)

دسویں ذوالحجہ کو طواف کرنے کے بعد حیض آنا

سوال ایک عورت کو دسویں ذوالحجہ کو طواف کرنے کے بعد اگر حیض آجائے تو وہ کیا کرے، کیا وہ طواف وداع کے لیے اپنے پاک ہونے کا انتظار کرے یا طواف کے بغیر ہی واپس اپنے وطن آجائے، قرآن وحدیث کے مطابق ایسی عورت کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب طواف وداع کا مطلب یہ ہے کہ حج کرنے والا اپنے آخری لمحات بھی بیت اللہ کے پاس بصورت طواف گزارے لیکن جس عورت کو حیض آجائے اس کے لیے طواف وداع ضروری نہیں ہے، وہ طواف وداع کے بغیر مکہ مکرمہ سے اپنے وطن واپس آجائے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

> ''لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے وطن لوٹنے سے پہلے مکہ مکرمہ میں اپنا آخری وقت بیت اللہ کے پاس (بصورت طواف) گزاریں البتہ حائضہ عورت سے طواف وداع کے متعلق تخفیف کی جاتی تھی۔'' ❸

لیکن اس رخصت کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ دسویں ذوالحجہ کو طواف افاضہ کر چکی ہو، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حائضہ عورت کو مکہ مکرمہ سے نکلنے سے پہلے طواف وداع کے متعلق رخصت دی تھی، بشرطیکہ وہ افاضہ کر چکی ہو۔ ❹

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سیدہ صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا طواف افاضہ کے بعد حائضہ ہو گئیں، میں نے رسول

---

❶ صحیح بخاری، الحج: ١٥١٣۔ ❷ ابو داود، المناسك: ١٨١١۔ ❸ صحیح بخاری، الحج: ١٧٥٥۔
❹ صحیح مسلم، الحج: ١٣٢٨۔

اللہ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا: ''وہ تو ہمیں روکے رکھے گی۔'' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اس نے جب طواف افاضہ کرلیا تھا تب اسے حیض آیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تو وہ مکہ سے روانہ ہو اور ہمارے ساتھ چلے۔'' ❶

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا پہلے مؤقف یہ تھا کہ حائضہ عورت مکہ میں ٹھہرے اور جب پاک ہو جائے تو طواف وداع کر کے وطن واپس آئے، پھر انہوں نے اس موقف سے رجوع کرلیا تھا اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے حائضہ عورت کو طواف وداع کے متعلق رخصت دی ہے۔ ❷

بہر حال حائضہ عورت کو طواف وداع کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ جب اس نے طواف افاضہ کرلیا ہے تو طواف وداع کیے بغیر وہ اپنے گھر واپس آسکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

معذوروں کا رات کو کنکریاں مارنا

سوال اگر معذور یا کمزور حضرات رات کے وقت ہی مزدلفہ سے واپسی منیٰ آجائیں تو کیا رات کے وقت وہ کنکریاں مار سکتے ہیں؟ ایسے افراد کے متعلق شرعی ہدایات کیا ہیں؟ وضاحت کریں۔

جواب حج کرنے والے کو چاہیے کہ وہ نویں ذوالحجہ کے بعد والی رات مزدلفہ میں گزارے پھر طلوع آفتاب سے قبل ہی منیٰ کو روانہ ہو جائے، پھر دسویں ذوالحجہ کو طلوع آفتاب کے بعد جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارے البتہ کمزور، بوڑھے، بچے اور خواتین وغیرہ مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر بھی منیٰ جاسکتے ہیں اور طلوع آفتاب سے پہلے کنکریاں مار سکتے ہیں جیسا کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے رات کو کنکریاں ماریں پھر واپس آگئیں اور صبح کی نماز اپنے ڈیرے پر ادا کی۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یہ عمل کیا کرتے تھے۔ ❸ ایسا کرنا جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ وہ طلوع آفتاب کے بعد کنکریاں ماریں، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کمزور افراد کو رات کے وقت ہی مزدلفہ سے منیٰ روانہ کر دیا تھا لیکن انہیں حکم دیا تھا کہ وہ طلوع آفتاب کے بعد کنکریاں ماریں۔ ❹

ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ فجر سے پہلے کنکریاں نہیں مارنا چاہئیں، البتہ کوئی عذر یا ضعیف و ناتواں بوڑھے یا خواتین کو اجازت ہے کہ وہ فجر سے پہلے رات میں بھی کنکریاں مارلیں۔ اگرچہ ان کے لیے بھی افضل اور بہتر ہے کہ وہ طلوع آفتاب کے بعد کنکریاں ماریں۔ (واللہ اعلم)

جمرہ عقبہ کو جوتے مارنا

سوال حج کے موقع پر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جمرہ عقبہ (بڑے شیطان) کو کنکریاں مارنے کی بجائے بڑے بڑے پتھر یا جوتے مارے جاتے ہیں، بعض لوگ وہاں تھوکتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں، کیا کنکریاں مارتے وقت ایسا کرنا جائز ہے؟

---

❶ مسند امام احمد، ص: ۳۷۰، ج ۱۔ ❷ صحیح بخاری، الحج: ۱۷۶۱۔

❸ ابوداود، المناسك: ۱۹۴۳۔ ❹ ابوداود، الناسك: ۱۹۴۱۔

جواب: حاجی کو چاہیے کہ وہ منیٰ پہنچنے سے پہلے ہی جمرات کو مارنے کے لیے راستہ سے کنکریاں اٹھائے، وہ مزدلفہ، منیٰ یا کسی اور جگہ سے بھی اٹھائی جاسکتی ہیں اوران کا حجم لوبیے کے برابر چنے کے دانے سے ذرا بڑا ہونا چاہیے۔ کنکریوں کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ رمی جائز نہیں ہے، چنانچہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس ذوالحجہ کو اپنی سواری پر بیٹھے بیٹھے حکم دیا: ''مجھے کنکریاں چن دو'' میں نے سات کنکریاں چن دیں جو انگلیوں کے پوروں میں آسکتی تھیں۔ آپ انہیں ہاتھ میں لے کر حرکت دینے لگے اوران کی مٹی جھاڑنے لگے پھر آپ نے فرمایا: 'پس کنکریاں مارو اوراے لوگو! دین میں غلو کرنے سے بچو، بے شک پہلے لوگوں کو دین میں غلو نے تباہ کر دیا تھا۔ [1]

اس حدیث کی روشنی میں بڑے شیطان کو جوتے مارنا، اس پر تھوکنا اوراسے گالیاں دینا جائز نہیں ہے، اسی طرح اسے بڑے بڑے پتھر مارنا بھی جائز نہیں، یقیناً اگر کوئی ایسا کام کرتا ہے تو وہ شیطان کو خوش کرتا ہے، کس قدر قسمتی کی بات ہے کہ اسے رمی کرتے وقت اس کی خوشی کا سامان مہیا کیا جارہا ہے، مذکورہ حدیث کی روشنی میں حاجی کو چاہیے کہ وہ صرف کنکریں مارنے پر اکتفاء کرے اور دین میں غلو سے اجتناب کرے۔ (واللہ اعلم)

نابالغ بچہ کا حج

سوال: ہم دونوں میاں بیوی امسال حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کررہے ہیں اور ہمارے ساتھ چھ سال کا بیٹا بھی ہے کیا نابالغ بچہ بھی حج کرسکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب: حج کی شرائط میں سے مسلمان کا بالغ ہونا بھی ہے، تاہم نابالغ بچہ بھی حج کرسکتا ہے لیکن بلوغت کے بعد اسے یہ حج کافی نہیں ہوگا بلکہ فرض کی ادائیگی کے لیے اسے دوبارہ حج کرنا پڑے گا۔ حدیث میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک عورت اپنے بچے کو اٹھا کر لائی اور عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اس کے لیے حج ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں! اس کے لیے حج ہے البتہ اس کا ثواب تمہیں ملے گا۔'' [2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بچہ حج کرے پھر وہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ فرض کی ادائیگی کے لیے دوسرا حج کرے۔'' [3]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ بچہ حج کرسکتا ہے لیکن یہ حج فرضیت کی ادائیگی کے لیے کافی نہیں ہوگا، بلوغت کے بعد اگر اس پر حج فرض ہوا تو اسے ازسرنو حج کے لیے رخت سفر باندھنا ہوگا۔ (واللہ اعلم)

عورت کا بغیر محرم حج پر جانا

سوال: میرا اس سال اپنے خاوند کے ہمراہ حج پر جانے کا ارادہ تھا، ہماری درخواست بھی نکل آئی ہے لیکن اچانک کسی حادثہ کی وجہ سے میرا شوہر میرے ساتھ جانے کے قابل نہیں رہا۔ وقتی طور پر کوئی دوسرا محرم میرے ساتھ نہیں جاسکتا، کیا میں اکیلی حج

---

[1] سنن نسائی، المناسك: ۳۰۵۹۔ [2] مسلم، الحج: ۳۲۱۳۔

[3] بیھقی، ص: ۳۲۵، ج ٤۔

پر جاسکتی ہوں، قرآن وحدیث کے مطابق میرے لیے کیا حکم ہے؟ وضاحت سے لکھیں۔

جواب عورت پر وجوب حج کے لیے دیگر شرائط کے ساتھ محرم کا ساتھ ہونا بھی شرط ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والی کسی بھی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ بغیر کسی محرم رشتہ دار کے ایک دن اور ایک رات کا سفر کرے۔'' [1]

ایک روایت میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری بیوی حج کے لیے جارہی ہے جبکہ میرا نام فلاں فلاں غزوہ کے لیے لکھ دیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاؤ، تم اپنی بیوی کے ہمراہ حج کرو۔'' [2]

صورت مسئولہ میں میاں بیوی دونوں کا حج پر جانے کا پروگرام تھا لیکن ناگہانی طور پر خاوند اپنی بیوی کے ہمراہ جانے کے قابل نہیں رہا، اب وقتی طور پر کسی دوسرے محرم کا بندوبست بھی نہیں ہوسکتا، ایسے حالات میں شرعی طور پر بیوی کو بغیر محرم کے حج کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ قانون بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی عورت اکیلی حج کو جائے، عورت کو چاہیے کہ اپنے خاوند کی خبرگیری کرے، اگر اللہ کو منظور ہوا تو آئندہ دونوں میاں بیوی حج کی سعادت سے بہرہ ور ہوں گے۔ (واللہ اعلم)

دوران احرام عورت کا پردہ کرنا

سوال ہم نے اپنے علماء سے سنا ہے کہ دورانِ احرام عورت کو پردہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، کیا یہ بات صحیح ہے، جبکہ پردہ کے احکام سرزمین حجاز میں نازل ہوئے ہیں، اگر عورت کو وہاں پردے کی اجازت نہیں تو وہ کہاں پردہ کرے گی؟ وضاحت کریں۔

جواب عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ستر وحجاب کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت اور سستی کا شکار نہ ہو، خواہ وہ احرام کی حالت میں ہی کیوں نہ ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ﴾ [3]

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور اہل ایمان کی خواتین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی چادروں کے پلو اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔''

پھر چہرہ ہی وہ چیز ہے جو مرد کے لیے عورت کے تمام بدن سے زیادہ پرکشش ہوتا ہے، اگر اسے ننگا رکھنا ہے تو حجاب کے باقی احکام بے سود ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی پر پیچھے رہ گئیں تو انہوں نے حضرت صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فوراً اپنا چہرہ اپنی چادر سے ڈھانپ لیا۔ [4]

البتہ دوران حج احرام کی حالت میں عورت پر یہ پابندی ہے کہ وہ نقاب نہ پہنے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''احرام والی عورت نقاب نہ پہنے اور نہ ہی دستانے استعمال کرے۔'' [5]

---

[1] بخاری، تقصیر الصلوٰۃ: ۱۰۸۸۔ [2] صحیح مسلم، الحج: ۱۳۴۱۔ [3] ۳۳/الاحزاب: ۵۹۔
[4] صحیح بخاری، المغازی: ۴۱۴۱۔ [5] مسند امام احمد، ص: ۲۲، ج۲۔

نقاب نہ پہننے کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ احرام والی عورت غیر محرموں سے چہرہ بھی نہیں چھپائے گی بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسا مخصوص سلا ہوا کپڑا جو پردہ کے لیے بنایا جاتا ہے استعمال میں نہ لائے۔نقاب میں عورت اپنے چہرے کو باندھ لیتی ہے، اپنے ناک کے اوپر سے کپڑا گزار کر پردہ کیا جاتا ہے،صرف آنکھیں کھلی ہوتی ہیں،اس قسم کا پردہ کرنے کی ممانعت ہے،وہ بھی احرام کی حالت میں،لیکن جب اجنبی آدمی سامنے آجائے تو اپنی چادر کے ساتھ چہرہ چھپانا ہوگا جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حالتِ احرام میں تھیں اور قافلے ہمارے سامنے سے گزرتے تھے جب وہ ہمارے سامنے آتے تو ہم اپنی چادریں چہرے پر لٹکا لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو چہرہ کھول لیتیں۔ [1]

ان احادیث کی روشنی میں ہمارا مؤقف ہے کہ عورت احرام کی حالت میں نقاب نہ پہنے البتہ اپنی چادر سے چہرے کو ضرور چھپائے جب کوئی اجنبی آدمی سامنے ہو،بصورت دیگر منہ کھلا رکھے۔ (واللہ اعلم)

طلائی زیورات کے مالک پر حج کی فرضیت

سوال میرے پاس نقد رقم نہیں ہے لیکن اس قدر مالیت کے طلائی زیورات ہیں کہ حج کر سکتا ہوں،کیا ایسے حالات میں مجھ پر حج کرنا فرض ہے؟

جواب حج ارکانِ اسلام سے ہے اور اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک حق بھی ہے اور یہ صرف اس شخص پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے جو اس کی استطاعت رکھتا ہو،ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ [2]

''اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ جو شخص اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔''

مذکورہ آیت میں استطاعت سے مراد بیت اللہ جانے اور وہاں سے واپس آنے کا خرچ اس کے پاس موجود ہو اور اس میں کھانے پینے کے اخراجات بھی شامل ہیں،اس سفر حج میں اپنے گھر سے غیر موجودگی کے دوران اہل خانہ کو حسب معمول خرچہ دیا جائے نیز راستہ پرامن ہو اور جسمانی طور پر بھی وہ صحت مند ہو کہ حج اور سفر حج کی صعوبتوں اور مشکلات کو برداشت کر سکتا ہو۔اگر کسی کے پاس حج اور اپنے اہل خانہ کے اخراجات موجود ہیں اور راستہ بھی پر خطر نہیں لیکن جسمانی صحت اس کا ساتھ نہ دے رہی ہو تو وہ کسی دوسرے کو اپنی طرف سے حج کے لیے بھیج سکتا ہے بشرطیکہ جسے وہ اپنی طرف سے حج کے لیے بھیجے وہ پہلے خود اپنا فریضہ حج ادا کر چکا ہو،اسے شرعی اصطلاح میں حج بدل کہا جاتا ہے۔عورت کے لیے مزید ایک شرط ہے کہ اس کے ساتھ محرم موجود ہو،جو خواتین غیر محرم کو اپنا محرم ظاہر کر کے حج کے لیے جاتی ہیں ان کا یہ کردار محل نظر ہے۔صورت مسئولہ میں سائل کے پاس نقد رقم نہیں ہے لیکن اس قدر مالیت کے طلائی زیورات ہیں کہ وہ آسانی کے ساتھ حج کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ انسان زیورات اپنے استعمال کے لیے نہیں بناتا بلکہ اپنی دولت کو سنبھالنے کے لیے زیورات بناتا ہے تاکہ اس کی رقم محفوظ رہے،اگر اس قدر زیورات اہل خانہ کے ہیں تو وہ اس کی ملکیت میں نہیں۔ان کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ زیورات سائل کی ملکیت ہیں،

---

[1] ابوداود، المناسک: ۱۸۳۳۔ [2] ۳/آل عمران:۹۷۔

اہل خانہ خواتین کے نہیں ہیں۔لہٰذا ایسے حالات میں ان زیورات کو فروخت کرے اور فریضۂ حج کی ادائیگی میں سستی کا مرتکب نہ ہو اور بصورت دیگر کتاب وسنت میں اس کے متعلق سخت وعید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص حج کرنے کی ہمت اور استطاعت رکھتا ہے، اس کے پاس زادسفر اور سواری موجود ہے جو اسے بیت اللہ تک پہنچا سکے لیکن وہ حج نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پروانہیں کہ ایسا شخص یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر۔'' [1]

اس حدیث کی سند میں اگرچہ محدثین نے کلام کیا ہے تاہم درج ذیل آیت کریمہ سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے:

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ [2]

''جو شخص اس حکم (حج) کا انکار کرے تو اللہ تعالیٰ تمام اہل دنیا سے بے نیاز ہے۔''

بہر حال اس قدر زیورات سائل کی ملکیت ہیں اور وہ کاروبار کے لیے نہیں ہیں تو وہ انہیں ٹھکانے لگا کر ان کی قیمت سے بیت اللہ کا حج کرنے کی سعادت حاصل کرے۔ (واللہ اعلم)

بلا عذر رمی نہ کرنا

سوال ایک عورت تندرست وتوانا ہے لیکن وہ جمرات کی رمی کے لیے اپنے بیٹے کو کہتی ہے حالانکہ وہ خود رمی کر سکتی ہے، ایسے حالات میں اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب جمرات کو کنکریاں مارنا مناسک حج سے ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خود کنکریاں ماری ہیں اور اس کا حکم بھی دیا ہے پھر یہ ایک عبادت بھی ہے جسے انتہائی خشوع سے ادا کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''بیت اللہ، صفا مروہ کا طواف اور رمی جمار کو اللہ کا ذکر قائم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔'' [3]

کنکریاں مارنے میں مرد اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، شدید ہجوم کے وقت انہیں آگے پیچھے تو کیا جا سکتا ہے لیکن بلاوجہ نیابت جائز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل خانہ کے کمزور افراد کو اجازت دی تھی کہ وہ رات کے آخری حصہ میں مزدلفہ سے منیٰ چلے جائیں تاکہ انہیں اس ہجوم کی وجہ سے تکلیف نہ ہو جو طلوع فجر کے بعد سب لوگوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اس بناء پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ رمی جمار کے لیے کسی کو بلاوجہ وکیل نہیں بنانا چاہیے بلکہ خود یہ فریضہ ادا کیا جائے، البتہ اگر کوئی مرد یا عورت بیمار ہو یا کوئی عورت حاملہ ہو اور اس کے حمل کو ہجوم کی وجہ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسے حالات میں کسی کو وکیل بنایا جا سکتا ہے۔صورت مسئولہ میں وکالت صحیح نہیں ہے اگر ایسا کیا گیا ہے تو فدیہ کا جانور ذبح کر کے مکہ کے فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

بحالت احرام سرمہ یا دوائی آنکھوں میں ڈالنا

سوال کیا احرام کی حالت میں آنکھوں میں سرمہ ڈالنا یا کوئی دوسری دوا استعمال کرنا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی

---

[1] ترمذی، الحج: ۸۱۲۔ [2] ۳/آل عمران: ۹۷۔ [3] مسند امام احمد، ص: ٦٤، ج٦۔

میں وضاحت کریں۔

جواب احرام کی حالت میں سرمہ ڈالنا یا کوئی دوسری دوا آنکھوں میں استعمال کرنا جائز ہے اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آدمی کے متعلق فرمایا: ''جس کی آنکھوں میں درد ہو کہ وہ احرام کی حالت میں اپنی آنکھوں پر مصبّر یعنی ایلوا کا لیپ کرے۔'' [1]

اختتام تلبیہ کا وقت

سوال عمرہ یا حج کرنے والے کو تلبیہ کب بند کر دینا چاہیے؟

جواب عمرہ کرنے والا جب بیت اللہ کا طواف شروع کرے تو اسے تلبیہ بند کر دینا چاہیے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عمرہ میں تلبیہ سے اس وقت رُک جاتے جب وہ حجراسود کو بوسہ دیتے۔ [2]

اور حجراسود کو طواف کے آغاز میں بوسہ دیا جاتا ہے، اسی طرح حج کرنے والا اس وقت تلبیہ بند کر دے جب وہ عید کے دن بڑے شیطان کو کنکریاں مارے۔ چنانچہ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک تلبیہ کہتے رہتے۔ [3]

بہر حال عمرہ کرنے والے کو طواف کے آغاز میں اور حج کرنے والے کو دسویں ذوالحجہ کو کنکریاں مارنے سے پہلے تلبیہ بند کر دینا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

بہن کی موجودگی میں بہنوئی کا محرم بننا

سوال کیا کوئی عورت اپنے بہنوئی کے ساتھ حج پر جا سکتی ہے جب کہ اس عورت کی بہن یعنی بہنوئی کی بیوی بھی ہمراہ ہے؟ ہماری اس سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں۔

جواب اسلام نے عورت کی پاکدامنی اور عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے دوران سفر محرم کی شرط عائد کی ہے تاکہ وہ غلط کار لوگوں سے محفوظ رہے اور سفر میں اگر کوئی مشکل آئے تو وہ اس کی مدد کر سکے۔ شرعی اعتبار سے عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں ہے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی بھی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔'' [4]

ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں نے تو فلاں جنگ میں جانے کے لیے اپنا نام لکھوا دیا ہے جب کہ میری بیوی حج پر جا رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم جہاد کے بجائے اپنی بیوی کے ہمراہ حج پر جاؤ۔'' [5]

اہل علم نے محرم کے لیے پانچ شرطیں لگائی ہیں:

❶ مرد ہو، ❷ مسلمان ہو، ❸ بالغ ہو، ❹ عاقل ہو ❺ وہ اس عورت پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو۔

---

[1] صحیح مسلم، الحج: ۲۰۸۹۔ [2] ابو داود، المناسك: ۱۸۱۷۔ [3] صحیح بخاری، الحج: ۱۵٤۳۔
[4] صحیح بخاری، الجهاد: ۲۰۰٦۔ [5] صحیح بخاری حدیث نمبر ۳۰۰٦۔

مثلاً: والد، بھائی، بیٹا، چچا، ماموں اور سسر وغیرہ، واضح رہے کہ جن رشتہ داروں سے وقتی طور پر نکاح حرام ہے مثلاً بہنوئی وغیرہ وہ محرم نہیں بن سکتے، صورت مسئولہ میں کوئی بھی عورت اپنے بہنوئی کے ہمراہ سفر پر نہیں جا سکتی خواہ وہ حج کا ہی سفر کیوں نہ ہو اوراس کے ساتھ اس کی بہن بھی کیوں نہ ہو۔ واضح رہے کہ عورت کا دیور، اس کا چچازاد اور ماموں زاد بھی اس کا محرم نہیں بن سکتا۔ لہٰذا ان کے ساتھ بھی سفر پر جانا جائز نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے مقدس سفر میں شرعی شرائط کو ملحوظ رکھیں۔ (واللہ اعلم)

۴۵ سال سے زائد عمر عورت کا بغیر محرم حج کرنا

سوال کیا پینتالیس سال سے زائد عمر کی عورتیں محرم کے بغیر حج یا عمرہ ادا کر سکتی ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب وجوب حج کے لیے دیگر شرائط کے ساتھ عورت کے لیے ایک اضافی شرط بھی ہے کہ اس مبارک سفر میں اس کے ساتھ محرم کا ہونا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والی کسی بھی عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی محرم رشتہ دار کے بغیر ایک دن یا ایک رات کا سفر کرے۔ [1]

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں وضاحت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میری بیوی حج کے لیے جانا چاہتی ہے جبکہ میرا نام فلاں فلاں جنگ کے لیے لکھ دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔'' [2]

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ عورت اپنے محرم کے بغیر حج نہیں کر سکتی، اس میں عمر کی کوئی پابندی نہیں، بلکہ ہر عمر کی عورت کے لیے یہ پابندی کرنا ضروری ہے، لہٰذا پینتالیس سال کی عمر سے زائد خواتین بھی اس امر کی پابند ہیں کہ وہ اپنے محرم رشتہ دار کے ہمراہ حج کریں، اس کے بغیر سفر حج صحیح نہیں ہے۔

میت کی طرف سے عمرہ کرنا

سوال کیا میت کی طرف سے عمرہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب میت کی طرف سے ایصال ثواب کی وہی صورتیں مشروع ہیں، جن کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے، ہر عمل صالح کے ذریعے سے ایصالِ ثواب صحیح نہیں ہے، عمرہ بھی ایک ایسا عمل ہے جس کے ایصال ثواب کا ثبوت کسی صحیح حدیث سے نہیں ملتا، میت کی طرف سے صدقہ کرنا، حج کرنا اور دعا کرنا ایسے اعمال کیے جا سکتے ہیں اوران کا فائدہ حدیث کی رو سے میت کو پہنچتا ہے، میت کی طرف سے حج تو کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں اپنی ماں کی طرف سے حج کر سکتی ہوں جبکہ اس نے حج کرنے کی نذر مانی تھی اور وہ حج کیے بغیر ہی فوت ہو گئی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! تو اس کی طرف سے حج کر سکتی ہے۔'' [3]

---

[1] صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ: ۱۰۸۸۔ [2] مسلم الحج: ۱۳۴۱۔ [3] بخاری، الحج: ۱۸۲۲۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''میت کی طرف سے نذر حج کی ادائیگی۔'' [1]

لیکن کسی کی طرف سے حج کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ انسان نے پہلے اپنا فریضہ حج ادا کر لیا ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے کہا تھا: ''پہلے اپنی طرف سے حج کرو پھر شبرمہ کی طرف سے ادا کرنا۔'' [2]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ میت کی طرف سے حج تو کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ حج کرنے والا پہلے اپنا فریضہ حج ادا کر چکا ہو لیکن میت کی طرف سے عمرہ کا ثبوت ہمیں قرآن و حدیث سے نہیں ملا، اگرچہ کچھ اہل علم حج پر قیاس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میت کی طرف سے عمرہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

بیت اللہ کے چاروں کونے چھونا

سوال عمرہ کرنے کے دوران اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ بیت اللہ کے چاروں کونوں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور انہیں چومتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں، کیا بیت اللہ کے چاروں کونوں کو ہاتھ لگانا چاہیے؟

جواب بیت اللہ کے چار کونے ہیں: ❶ حجر اسود، ❷ رکن یمانی، ❸ رکن شامی، ❹ رکن عراقی۔

حجر اسود کا استلام درج ذیل تین طریقوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کیا جا سکتا ہے:

❶ حجر اسود کو بوسہ دینا۔ ❷ چھڑی کے ذریعے حجر اسود کو چھونا پھر چھڑی کو چوم لینا۔ ❸ اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو چھونا اور پھر ہاتھ کو بوسہ دینا۔

رکن یمانی کو صرف ہاتھ لگانا چاہیے، اسے چومنا حدیث سے ثابت نہیں ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر طواف میں رکن یمانی اور حجر اسود کا استلام کرتے تھے۔ [3]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رکن یمانی اور حجر اسود کو چھونا خطاؤں کو گرا دیتا ہے۔'' [4]

دوران طواف رکن شامی اور رکن عراقی کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے دیکھا، آپ دوران طواف صرف حجر اسود اور رکن یمانی کو ہاتھ لگاتے تھے۔ [5] البتہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ بیت اللہ کے تمام کونوں کو ہاتھ لگاتے تھے اور فرماتے تھے کہ بیت اللہ کی کوئی چیز بھی متروک نہیں ہے۔ البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مؤقف ہے کہ دوران طواف صرف رکن یمانی اور حجر اسود کو ہاتھ لگانا چاہیے۔ [6]

ہمارے رجحان کے مطابق دوران طواف صرف رکن یمانی اور حجر اسود کو ہی ہاتھ لگانا چاہیے اور اگر بوسہ دینے کا موقع ملے تو صرف حجر اسود کو چوما جائے وہ بھی اس عقیدہ کے ساتھ کہ وہ ہمارے نفع یا نقصان کا مالک نہیں ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بخاری

---

[1] صحیح بخاری، الحج، باب نمبر: ٢٢۔
[2] ابو داود، المناسك: ١٨١١۔
[3] نسائی، مناسك: ٢٩٤٧۔
[4] مسند امام احمد، ص:٣، ج٢۔
[5] صحیح بخاری، الحج: ١٦٠٩۔
[6] صحیح بخاری، الحج: ١٦٠٩۔

شریف میں مروی ہے۔ ❶ (واللہ اعلم)

عمرہ کرنے والے کا طواف وداع کرنا

سوال کیا عمرہ کرنے والے پر طواف وداع کرنا ضروری ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے طواف وداع کا حکم حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا، وضاحت فرمائیں۔

جواب اگر کوئی آدمی مکہ مکرمہ میں آیا اور عمرہ کرنے کے فوراً بعد واپس نہیں ہوا بلکہ اس نے مکہ میں قیام کیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ واپسی کے وقت طواف وداع کرے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کوئی شخص کوچ نہ کرے حتیٰ کہ وہ آخر وقت بیت اللہ میں نہ گزار لے۔'' ❷ اس حدیث کا عموم عمرہ کو شامل ہے، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اپنے عمرہ میں بھی تم اسی طرح کرو جس طرح تم اپنے حج میں کرتے ہو۔'' ❸

یہ حکم بھی عام ہے، اس میں عمرہ کا طواف وداع بھی شامل ہے شریعت میں عمرہ بھی حج کی طرح ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے حج اصغر کہا ہے چنانچہ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عمرہ، حج اصغر ہے۔'' ❹

اس بناء پر اگرچہ طواف وداع کا حکم حجۃ الوداع کے موقع پر دیا گیا تھا لیکن عمرہ کرنے کے بعد بھی طواف وداع کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی مروی ہے ''جو شخص اس گھر کا حج کرے اسے اپنا آخری وقت بیت اللہ میں گزارنا چاہیے۔'' ❺

اگرچہ یہ ایک راوی حجاج بن ارطاۃ کی وجہ سے ضعیف ہے لیکن اسے تائید کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

احرام باندھ کر دو رکعتیں پڑھنا

سوال ہمارے ہاں عام طور پر احرام باندھنے کے بعد دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، میں نے کچھ علماء سے سنا ہے کہ احرام کی مخصوص دو رکعت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہیں؟ اس کے متعلق وضاحت درکار ہے۔

جواب احرام کے لیے دو رکعت پڑھنے کی مشروعیت کسی صحیح حدیث میں منقول نہیں ہے، ہمارے ہاں یہ غلط طور پر مشہور ہو چکا ہے کہ احرام باندھنے کے بعد دو رکعت پڑھنی چاہئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے احرام باندھ کر جو دو رکعت ادا کی تھی وہ احرام کی نہیں بلکہ نماز عصر کی دو رکعت (قصر) تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے احرام باندھتے وقت کوئی نماز مشروع قرار دی ہو، اس کی وضاحت کسی حدیث میں نہیں ہے، اس کے متعلق نہ تو آپ کا کوئی قول مروی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی عملی ثبوت ملتا ہے، اگر احرام باندھتے وقت کسی نماز کا وقت ہو جائے تو اسے ادا کیا جا سکتا ہے لیکن اس نماز کا احرام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں خالص کتاب و سنت پر عمل کرنے کی توفیق دے اور ثبوت کے بغیر کوئی بھی کام کرنے سے ہمیں باز رکھے۔ (آمین یارب العالمین)

---

❶ صحیح بخاری، الحج: ۱۶۱۰۔ ❷ مسلم، الحج: ۱۳۲۷۔

❸ صحیح بخاری، الحج: ۱۵۳۶۔

❹ دارقطنی، ص: ۲۸۵، ج۲۔ ❺ ترمذی، الحج: ۲۰۰۲۔

خاوند کے منع کرنے کے باوجود حج کرنا

سوال میں عمر رسیدہ خاتون ہوں اور میرے پاس اتنا مال بھی ہے کہ میں حج کرسکتی ہوں لیکن میرا خاوند مجھے حج کرنے سے روکتا ہے، اس سال میرا بڑا بھائی حج پر جانا چاہتا ہے کیا میں اس کے ساتھ حج پر جاسکتی ہوں یا اپنے خاوند کی اطاعت کرتے ہوئے حج پر نہ جاؤں؟

جواب ایک عورت کے لیے حج کرنے کی جو شرائط ہیں وہ آپ میں پائی جاتی ہیں یعنی مکلّف، قدرت اور محرم کی موجودگی، لہٰذا بلاوجہ خاوند کا آپ کو اس فریضہ کی ادائیگی سے روکنا حرام اور ناجائز ہے۔ صورت مسئولہ میں شرعی طور پر عمر رسیدہ خاتون کو اجازت ہے کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ حج پر چلی جائے، اگر اس کا خاوند اس کی موافقت نہ بھی کرے تب بھی اس پر اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ فرض نماز اور فرض روزوں کی ادائیگی میں رکاوٹ پیدا کرنا خاوند کے لیے جائز نہیں' اسی طرح خاوند کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو حج کرنے سے روکے جب کہ اس میں حج ادا کرنے کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں۔ اللہ کا حق بندوں کے حق سے مقدم ہے باقی رہی خاوند کی اطاعت تو اس کی کچھ حدود ہیں، ان حدود سے تجاوز کرنا قطعی طور پر جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا جائز نہیں ہے، اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے۔''[1]

لہٰذا سائلہ اپنے بھائی کے ساتھ حج کرنے کے لیے جاسکتی ہے خواہ اس کا خاوند اس کی اجازت نہ بھی دے۔ (واللہ اعلم)

میقات کا بیان

سوال ہوائی جہاز کے ذریعے عمرہ کا سفر کرنے والے حضرات احرام کیسے اور کہاں سے باندھیں؟ کیونکہ اس طرح وہ میقات کے اوپر سے گزرتا ہے، ایسے حالات میں کس مقام سے عمرہ کی نیت کی جائے، کیا جدہ پہنچ کر احرام باندھا جاسکا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب جس مقام سے حج یا عمرہ کی نیت کی جاتی ہے اسے میقات کہا جاتا ہے، احادیث میں مختلف مقامات کا ذکر ہے جن کی میقات کے طور پر تعیین کی گئی ہے مثلاً: ❶ ذوالحلیفہ، ❷ جحفہ، ❸ یلملم، ❹ قرن منازل، ❺ ذاتِ عرق۔

برصغیر میں رہنے والے حضرات کی میقات یلملم ہے جو یمن سے مکہ کے راستے پر ایک پہاڑ کا نام ہے، اسے آج کل سعدیہ کہا جاتا ہے، اگر کوئی انسان حج یا عمرہ کی نیت سے بذریعہ ہوائی جہاز مکہ مکرمہ آرہا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جب میقات کے اوپر سے گزرے تو وہاں سے عمرہ وغیرہ کی نیت کرکے تلبیہ کہنا شروع کردے۔ اس کے لیے جدہ پہنچنے تک احرام مؤخر کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ جدہ میقات سے آگے ہے، اس کے بالمقابل نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ اہل کوفہ اور بصرہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا، اے امیر المومنین! رسول اللہ ﷺ نے اہل نجد کے لیے قرنِ منازل کو میقات قرار دیا ہے اور یہ میقات ہمارے راستے سے

---

[1] صحیح بخاری، الآحاد: ۷۲۵۷۔

بہت دور ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم دیکھو کہ اس کے بالمقابل تمہارے راستہ میں کون سا مقام ہے، چنانچہ آپ نے ان کے لیے ذات عرق میقات مقرر کر دی۔ ❶

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اثر سے معلوم ہوا کہ میقات کے بالمقابل جگہ کا وہی حکم ہے جو میقات کا ہے، اس بنا پر اگر کوئی میقات کے اوپر سے گزر رہا ہو تو اس کے بالمقابل اوپر والے مقام سے تلبیہ شروع کر دے کیونکہ اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ عمرہ کرنے والا میقات کے بالمقابل خشکی میں ہو یا ہوا میں، یا سمندر میں، یہی وجہ ہے کہ بحری جہاز سے آنے والے حضرات یلملم یا رابغ کے بالمقابل آتے ہیں تو احرام باندھ لیتے ہیں، بہر حال بذریعہ ہوائی جہاز سفر کرنے والے کے احرام کی درج ذیل صورتیں ہیں:

☆ گھر میں غسل کر کے، اپنے معمول کے کپڑے زیب تن کرے اور اگر چاہے تو وہ گھر ہی سے احرام پہن لے۔

☆ گھر میں احرام نہ باندھا ہو تو ہوائی جہاز میں اس وقت احرام باندھ لے جب ہوائی جہاز کا عملہ اس کے متعلق اعلان کرتا ہے، وہ تقریباً بالمقابل پہنچنے سے پندرہ منٹ پہلے اعلان کرتا ہے۔ جب ہوائی جہاز میقات کے بالمقابل پہنچے اور عملہ اس امر کا اعلان کر دے تو حج یا عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ کہنا شروع کر دے۔

☆ کوئی شخص غفلت یا بھول کے اندیشے کے پیش نظر از راہ احتیاط میقات پر آنے سے پہلے احرام باندھ لے اور اس کی نیت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بہر حال عمرہ کرنے والے کو خبردار رہنا چاہیے کہ جب بھی ہوائی جہاز کا عملہ اعلان کرے کہ ہم پندرہ منٹ بعد میقات کے بالمقابل پہنچ جائیں گے تو اسے بروقت حج یا عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ شروع کر دینا چاہیے، بہتر ہے سوار ہوتے وقت ہی احرام کی نیت کرے اور تلبیہ کہنا شروع کر دے۔ (واللہ اعلم)

احرام کی حالت میں مکہ پہنچنے سے پہلے ایام آجانا

سوال میں اور میری بیوی دونوں عمرہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ جا رہے تھے جب کہ ہم دونوں نے احرام بھی باندھا تھا، لیکن مکہ آنے سے پہلے میری بیوی کو ایام آ گئے، چنانچہ میں نے تو اپنا عمرہ مکمل کر لیا، اب میری بیوی کے متعلق شرعی طور پر کیا حکم ہے؟

جواب جس عورت نے احرام کی نیت کی ہو اور عمرہ کرنے مکہ جا رہی ہو، لیکن عمرہ کرنے سے پہلے ہی اس کو ایام آ جائیں تو اس کے متعلق یہ حکم ہے کہ وہ مکہ میں رہے اور پاک ہونے کے بعد عمرہ ادا کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے متعلق فرمایا تھا جبکہ انہیں ایام آ گئے تھے: ''کیا یہ ہمیں یہاں روکے رکھے گی؟'' دیگر اہل خانہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انہوں نے طواف افاضہ کر لیا ہے، آپ نے فرمایا: ''تب کوئی حرج نہیں وہ ہمارے ساتھ مدینہ چلی آئے۔'' ❷

---

❶ صحیح بخاری، الحج: ۱۵۳۱۔ ❷ صحیح بخاری، الحج: ۱۷۵۷۔

رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد ''کیا یہ ہمیں یہاں روکے رکھے گی'' کا مطلب یہ ہے کہ جب عورت طواف افاضہ سے قبل حائضہ ہوجائے تو اس کا ادھر حرم میں باقی رہنا ضروری ہے حتیٰ کہ طہارت کے بعد طواف کرے، عمرہ کے طواف کی بھی یہی حیثیت ہے یعنی وہ حج کے طواف افاضہ کی طرح ہے کیونکہ یہ طواف عمرے کا رکن ہے، اس لیے جو عورت، عمرہ کی نیت سے آئے اور اس نے عمرہ کا احرام بھی باندھ رکھا ہو پھر اسے ایام آجائیں تو اسے طہارت تک انتظار کرنا ہوگا، اس کے بعد وہ طواف اور سعی کر کے عمرہ مکمل کرے گی۔ (واللہ اعلم)

بعد از ایام مکہ سے احرام باندھنا

سوال میں اپنے خاوند کے ہمراہ عمرہ کے لیے جارہی تھی، میقات سے پہلے مجھے حیض آگیا، اس لیے میں نے احرام کی نیت نہیں کی اور اس کے بغیر مکہ میں آگئی، پھر پاک ہونے کے بعد میں نے مکہ ہی سے احرام باندھا اور عمرہ کیا، اس کے متعلق معلوم کرنا ہے کیا میرا یہ عمل درست ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب جو مرد یا عورت عمرہ کے لیے آئے اس کے لیے احرام کے بغیر میقات سے گزرنا جائز نہیں ہے، عورت اگرچہ ایام میں ہی کیوں نہ ہو، ایام حیض میں احرام کی نیت کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے ایک بچے کو جنم دیا جبکہ رسول اللہ ﷺ ذوالحلیفہ میں تھے اور حجۃ الوداع کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیجا کہ اب میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا: ''تو غسل کرنے کے بعد مضبوطی سے کپڑا باندھ لے اور احرام کی نیت کر لے۔'' [1]

حیض کا خون بھی نفاس کی طرح ہے، اس حدیث کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ جو حائضہ عورت عمرہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہو تو میقات سے گزرتے وقت وہ غسل کر کے احرام کی نیت کرے لیکن مکہ پہنچ کر وہ بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گی اور نہ ہی صفا مروہ کی سعی کرے گی حتیٰ کہ وہ پاک ہوجائے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا جب وہ عمرے کے دوران حائضہ ہو گئی تھیں کہ ''تم وہی کچھ کرو جو حاجی کرتا ہے لیکن بیت اللہ کا طواف مت کرنا حتیٰ کہ تم پاک ہوجاؤ۔'' [2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں یہ بھی وضاحت ہے کہ جب وہ پاک ہوگئیں تو انہوں نے بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا مروہ کی سعی بھی۔ [3]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حائضہ عورت عمرے کا احرام باندھ لے اور طواف کرنے سے قبل اسے حیض آجائے تو اسے نہ تو بیت اللہ کا طواف کرنا چاہیے اور نہ ہی صفا مروہ کی سعی کرنا اس کے لیے جائز ہے حتیٰ کہ وہ پاک ہوجائے اور اگر اس نے پاکی کی حالت میں بیت اللہ کا طواف کرلیا ہو اور اس کے بعد سعی کرنے سے پہلے اسے حیض آجائے یا سعی کے دوران اسے حیض آجائے تو وہ حسب معمول اپنی سعی مکمل کرے گی پھر سر کے بال کاٹ کر اپنے عمرے کو پورا کرے گی کیونکہ صفا مروہ کی سعی کے لیے حیض سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں سائلہ کو چاہیے تھا کہ وہ حالت حیض میں احرام کی نیت کرلیتی اور

---

[1] صحیح مسلم، الحج: ۱۲۱۸۔ [2] صحیح بخاری، الحج: ۱۶۵۰۔ [3] صحیح بخاری، الحج: ۱۵۵۶۔

اس کے بغیر میقات سے نہ گزرتی، لیکن مکہ پہنچ کر اعمال عمرہ کرنے سے رُکی رہتی پھر جب پاک ہو جاتی تو غسل کر کے بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی کرنے کے بعد اپنے عمرے کو مکمل کرتی۔ (واللہ اعلم)

حجر اسود کو بوسہ دینا

سوال ہم نے دوران طواف دیکھا ہے کہ کچھ لوگ دھکم پیل کر کے حجر اسود کا بوسہ لیتے ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ عورتیں بھی رش میں گھس کر حجر اسود کو چومنے کی کوشش کرتی ہیں، اس کے متعلق وضاحت کریں کہ حجر اسود کو بوسہ دینے کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

جواب سوال میں ذکر کردہ صورت حال جہالت پر مبنی ہے کیونکہ حجر اسود کو بوسہ دینا اور رکن یمانی کو چھونا صرف دوران طواف مشروع ہے، یہ بھی اس صورت میں ہے جب اس سے کسی دوسرے طواف کرنے والے یا کسی دوسرے انسان کو اذیت نہ پہنچے اگر حجر اسود کا بوسہ لینے میں کسی دوسرے کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے تو پھر ایک دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو حدیث سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ طواف کرنے والا حجر اسود کو صرف ہاتھ سے چھولے پھر اپنے ہاتھ کو بوسہ دے لے۔ [1] اگر اس سے بھی کسی کو اذیت پہنچے یا اس کے لیے باعث مشقت ہو تو پھر ہمیں تیسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا جس کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم دونوں ہاتھوں سے نہیں بلکہ ایک ہاتھ سے حجر اسود کی طرف اشارہ کر دیں، اس صورت میں اپنے ہاتھ کو چومنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایسا کرنا سنت سے ثابت نہیں ہے۔ [2]

خواتین کو اس موقع پر انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے، انہیں مردوں میں گھس کر حجر اسود کا بوسہ لینا کسی صورت میں مشروع نہیں ہے، انہیں تو عام حالات میں مردوں سے الگ رہنے کا حکم ہے لیکن طواف جیسے مقدس فریضہ کی ادائیگی کے وقت اس امر کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ اجنبی آدمی سے ان کا کوئی حصہ مس نہ کرے، جب اللہ تعالیٰ نے حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے وسعت رکھی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور خود پر سختی کر کے اللہ کی سختی کو دعوت نہیں دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

بوجہ شرم مسجد حرام میں بحالت حیض نماز ادا کرنا

سوال میں اس سال حج پر گئی، دوران حج مجھے حیض آ گیا لیکن میں نے شرم کے مارے کسی کو نہ بتایا بلکہ ایسی حالت میں مسجد حرام کے اندر نمازیں ادا کیں، طواف کعبہ بھی کیا اور صفا و مروہ کی سعی بھی کی۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں میری راہنمائی کریں۔

جواب شریعت کا اہل اسلام سے مطالبہ ہے کہ کم از کم ضروریات دین کے متعلق معلومات حاصل کریں، جس مرد یا عورت نے حج کرنا ہے اسے چاہیے کہ حج سے پہلے اس کے متعلق واقفیت حاصل کرے۔ مکمل معلومات لینے کے بعد حج پر جائے، محکمہ مذہبی امور اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ حجاج کرام کو حج کی ٹریننگ دی جائے تاکہ وہ مکہ جا کر اندھیرے میں تیر اندازی نہ

---

[1] صحیح بخاری، الحج: ۱۶۱۱۔ [2] صحیح مسلم، الحج: ۱۲۷۲۔

کریں، صورت مسئولہ کس قدر تعجب انگیز ہے، اس طرح کی شرم شرعی طور پر قطعاً مستحسن نہیں ہے کیونکہ عورت جب حالت حیض میں ہوتی ہے تو اس کے لیے نماز ادا کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ مکہ میں ہو یا کسی دوسری جگہ پر۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کے متعلق فرمایا ہے: ''کیا امر واقعہ نہیں ہے کہ جب وہ حائضہ ہوتی ہے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے۔'' ❶

تمام اہل اسلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت حالت حیض میں ہو تو اسے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن سائلہ نے بحالت حیض مسجد حرام میں نمازیں ادا کی ہیں اور بیت اللہ کا طواف بھی کیا ہے۔ صفا مروہ کی سعی بھی کر ڈالی ہے، اس طرح مسجد حرام کا تقدس بھی مجروح ہوا ہے۔ بہر حال اسے چاہیے کہ وہ اپنے کیے ہوئے پر توبہ واستغفار کرے اور اللہ کے حضور اس پر اظہار ندامت کرے، حیض کی حالت میں اس کا طواف صحیح نہیں ہے، اگرچہ منیٰ، عرفات، مزدلفہ جانے اور رمی کرنے میں چنداں حرج نہیں، سائلہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ طواف زیارت کا اعادہ کرے اور صفاہ مروہ کی سعی بھی کرے، کیونکہ طواف افاضہ تو حج کا رکن ہے اس کے بغیر حج نہیں ہوتا۔ (واللہ اعلم)

سردی میں دوران حج موزے پہننا

سوال کیا سردی کے موسم میں دوران حج موزے پہنے جا سکتے ہیں؟ ہم نے عرب علماء سے سنا ہے کہ موزوں کو کاٹنے کی ضرورت نہیں بلکہ انہیں بغیر کاٹے پہنا جا سکتا ہے، اس کے متعلق وضاحت کریں۔

جواب اس سلسلہ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف یہ ہے کہ دوران احرام اگر جوتا نہ ملے تو موزوں کو پہنا جا سکتا ہے اور انہیں کاٹنے کی ضروت نہیں ہے، عرب علماء اس کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ ''جس شخص کے پاس جوتے نہ ہوں وہ موزے پہن لے۔'' ❷

ان حضرات کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے موزے کاٹنے کا حکم نہیں دیا، ان کے ہاں اس حدیث کے پیش نظر انہیں کاٹنے کا حکم منسوخ ہے جبکہ جمہور فقہاء اور محدثین کا مؤقف یہ ہے کہ جوتوں کی عدم دستیابی کی صورت میں موزے پہنے جا سکتے ہیں بشرطیکہ انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دیا جائے، محدثین کی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے جس میں موزوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ کر انہیں ننگے کر کے پہننے کا ذکر ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کو جوتے نہ ملیں تو وہ موزے پہن لے اور انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے۔'' ❸

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مؤقف معلوم ہوتا ہے، انہوں نے اس حدیث کو کتاب الحج میں بیان کیا ہے، یہ حدیث مطلق نہیں بلکہ اس میں موزوں کے متعلق ٹخنوں کے نیچے سے کاٹنے کی قید موجود ہے، اس بناء پر ہمارے رجحان کے مطابق موزوں کو کاٹے بغیر پہننا درست نہیں ہے، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ تمام فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مطلق حدیث کو مقید پر محمول کیا جائے اور

---

❶ صحیح بخاری، الحیض: ٣٠٤۔ ❷ صحیح بخاری: ١٣٤٣۔ ❸ صحیح بخاری، الحج: ١٥٤٢۔

جب احادیث میں جمع ممکن ہو تو وہاں ناسخ اور منسوخ کا ضابطہ نہ جاری کیا جائے ممکن ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی مقید حدیث نہ ملی ہو۔ (واللہ اعلم)

عورتوں کا احرام باندھنا

سوال عورتوں کو کس قسم کا احرام پہننا چاہیے، احرام کے سلسلے میں ان پر کیا پابندی عائد ہوتی ہے؟

جواب عورت جس لباس میں چاہے احرام باندھ سکتی ہے، اس کے لیے دوران احرام کوئی خاص لباس پہننے کی پابندی نہیں ہے البتہ بہتر ہے کہ وہ جاذب نظر کپڑوں میں احرام باندھنے کی بجائے سادہ کپڑوں میں احرام باندھے۔ چونکہ دوران حج مردوں کا عورتوں کے ساتھ اختلاط رہتا ہے لہٰذا ایسے کپڑے زیب تن نہ کیے جائیں جو جاذب نظر، بھڑکیلے اور فتنے کا باعث ہوں، عورت کو دوران احرام دستانے پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ جیسا کہ صراحت کے ساتھ حدیث میں آیا ہے چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''احرام والی عورت نقاب اور دستانے استعمال نہ کرے۔'' [1]

لیکن نقاب نہ پہننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احرام والی عورت غیر محرم سے اپنا چہرہ نہیں چھپائے گی بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا مخصوص سلا ہوا کپڑا جو پردہ کے لیے بنایا جاتا ہے اسے استعمال نہ کیا جائے لیکن غیر محرم لوگوں سے وہ اپنا چہرہ چھپانے کی پابند ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حالت احرام میں تھیں اور قافلے سامنے سے گزرتے تھے، جب وہ ہمارے سامنے آتے تو ہم اپنی چادریں منہ پر لٹکا لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو منہ کھول لیتی تھیں۔ [2]

بہرحال عورت کو چاہیے کہ وہ سادہ کپڑوں میں احرام باندھے، جاذب نظر لباس سے اجتناب کرے۔ (واللہ اعلم)

دوران احرام خوشبو دار صابن لگانا

سوال دوران احرام خوشبودار صابن سے غسل کرنا شرعاً کیسا ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب محرم کے لیے ہر خوشبودار چیز استعمال کرنے پر پابندی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محرم آدمی کی وفات پر حکم دیا تھا کہ اسے خوشبو نہ لگائی جائے۔ [3]

اس لیے محرم کو چاہیے کہ وہ دوران غسل خوشبودار صابن استعمال نہ کرے، بلکہ سادہ صابن سے غسل کرے، البتہ حالت احرام سے پہلے خوشبو لگائی جا سکتی ہے اگرچہ اس کے اثرات احرام کے بعد بھی باقی رہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو لگاتی تھی اور احرام کھولتے وقت بھی ایسا کرتی تھی۔ [4]

بہرحال دوران احرام خوشبودار صابن استعمال کرنے سے گریز کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

دس اور گیارہ ذی الحجہ کو رمی کرنا

سوال ہمارے ہاں ایک عالم دین نے فرمایا کہ اگر کوئی دس اور گیارہ ذوالحجہ کو کنکریاں مار کر واپس آ جاتا ہے تو قرآن

---

[1] بخاری: ۱۸۳۸۔ [2] ابوداود، المناسک: ۱۸۳۳۔ [3] نسائی، الحج: ۲۸۵۶۔
[4] صحیح بخاری، الحج: ۱۵۳۹۔

کریم نے اس کی اجازت دی ہے انہوں نے اس سلسلہ میں درج ذیل آیت کا حوالہ دیا ہے:

﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ﴾ ❶

''پھر جس نے دو دنوں میں جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔''

کیا حجاج کرام کو ایسا کرنا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب محترم عالم دین کا یہ مفہوم بیان کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ قبل ازیں آیت کا آغاز بایں الفاظ ہے:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ﴾ ❷

''گنتی کے دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔''

اس آیت کریمہ میں گنتی کے دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں، جن میں پہلا دن گیارہویں اور آخری دن تیرہویں تاریخ ہے، دوران حج منیٰ میں تین راتیں گزارنا اور جمرات کو کنکریاں مارنا افضل عمل ہے، لیکن اگر کوئی منیٰ میں دو دن گیارہویں اور بارہویں رات منیٰ میں گزارے اور زوال آفتاب کے بعد کنکریاں مار کر واپس چلا آئے تو اس کی اجازت ہے، آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ ایام تشریق کے دو دنوں میں جلدی کر لے اور دوسرا دن بارہویں تاریخ کا دن ہے، اس دن اگر زوال آفتاب کے بعد کنکریاں مار کر واپس آجائے تو اس کے لیے جائز ہے، جو شخص گیارہویں تاریخ کو کنکریاں مار کر واپس آجاتا ہے اور بارہویں رات منیٰ میں نہیں گزارتا اس نے دو واجبات کو ترک کیا ہے۔

☆ بارہویں رات منیٰ میں بسر کرنا۔ ☆ بارہویں دن زوال آفتاب کے بعد رمی جمار کرنا۔

جو انسان ایسا کرتا ہے اسے ہر واجب کے ترک کرنے پر مکہ مکرمہ میں جانور ذبح کرنا اور وہاں کے فقراء میں تقسیم کرنا ضروری ہے، اگر کوئی اپنے وطن واپس آگیا ہے، تو وہاں کسی کو اپنا وکیل مقرر کرے جو اس کام کو سرانجام دے، اس آیت کریمہ کا یہ مفہوم قطعاً نہیں ہے کہ وہ گیارہویں دن کنکریاں مار کر منیٰ سے نکل جائے تو اس کے لیے اجازت ہے یعنی وہ دو دنوں سے مراد عید کا دن اور گیارہویں تاریخ کا دن مراد لیتا ہے، بہرحال حاجی کو چاہیے کہ اگر وہ جلدی واپس آنا چاہتا ہے تو گیارہویں اور بارہویں تاریخ کو زوال آفتاب کے بعد کنکریاں مار کر واپس مکہ جائے لیکن اگر تیرہویں رات کا منیٰ میں قیام کرنا ہے اور اگلے دن زوال آفتاب کے بعد کنکریاں مار کر واپس آنا ہے تو ایسا کرنا اس کے لیے ثواب واجر میں اضافے کا باعث ہے۔ ان شاء اللہ۔

عمرہ کرنے والے کا طواف وداع کرنا

سوال کیا عمرہ کرنے والے پر بھی طواف وداع ضروری ہے، اگر ضروری ہے تو قرآن وحدیث سے اس کی کیا دلیل ہے؟

جواب عمرہ اور حج کے احکام ایک جیسے ہیں صرف وقوف عرفہ، مزدلفہ اور منیٰ میں راتیں بسر کرنا اور رمی جمرات اس

---

❶ ۲/البقرۃ: ۲۰۳۔ ❷ ۲/البقرۃ: ۲۰۳۔

سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ بالاتفاق ان احکام کا تعلق حج سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا تھا ”تم اپنے عمرہ میں بھی اس طرح کرو جس طرح تم اپنے حج میں کرتے ہو۔“ ❶

یہ حکم عام ہے، صرف ذکر کردہ احکام اس سے مستثنیٰ ہیں، ان کے علاوہ دیگر احکام عمرہ کے لیے وہی ہیں جو حج کے لیے ہیں، نیز رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کو حج اصغر کہا ہے جیسا کہ حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے۔ ❷

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”مکہ سے کوئی آدمی کوچ نہ کرے حتیٰ کہ وہ آخری وقت بیت اللہ میں گزارے۔“ ❸

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرہ کرنے والے کو چاہیے کہ جب وہ اپنے گھر واپس آنے کا ارادہ کرے تو پہلے طواف وداع کرے، اس کے بعد دوسرے کسی کام میں مشغول ہونے کے بغیر رخت سفر باندھ لے۔ (واللہ اعلم)

احرام باندھ کر مخصوص نماز پڑھنا

سوال عام طور پر ہمارے ہاں حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد دو رکعت پڑھی جاتی ہیں، کیا احرام کی کوئی مخصوص نماز ہے جس کا کتاب وسنت میں ثبوت ہو؟

جواب کتاب وسنت میں کوئی ایسی نماز نہیں ہے جو احرام حج یا عمرہ کے لیے مخصوص ہو، رسول اللہ ﷺ نے ذوالحلیفہ میں احرام کے بعد جو دو رکعت پڑھی تھیں وہ فرض نماز کی تھیں، ان کا احرام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس بنا پر افضل یہ ہے کہ کسی فرض نماز کے وقت احرام باندھے اور اس کے بعد فرض نماز ادا کرے، اس طرح اگر نماز چاشت کا وقت ہو تو نماز چاشت کی دو رکعت پڑھ لے، اگر چاشت کا وقت نہ ہو تو وضو کی دو رکعت پڑھ لے، لیکن ایسی نماز جس کا تعلق احرام سے ہو اور احرام کی وجہ سے اسے پڑھا جاتا ہو، کتاب وسنت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

احرام باندھنے کے بعد غسل کے وقت بالوں کا اترنا

سوال کیا احرام باندھنے کے بعد بوقت ضرورت غسل کیا جا سکتا ہے؟ اس دوران اگر کوئی بال وغیرہ اکھڑ جائیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب احرام کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ پہلے اچھی طرح غسل کرے، خوشبو لگائے اور احرام کی چادریں پہن لے، نیت کے ساتھ حج یا عمرہ کا تلبیہ بآواز بلند پڑھے۔ اگر احرام باندھنے کے بعد نہانے کی ضرورت پڑ جائے تو غسل کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے البتہ احتلام ہونے کی صورت میں غسل کرنا ضروری ہے، ٹھنڈک یا صفائی کے لیے بھی غسل کیا جا سکتا ہے، لیکن ہر قسم کے غسل میں خوشبودار صابن سے اجتناب کرے کیونکہ محرم آدمی کو خوشبو استعمال کرنے کی ممانعت ہے، اگر غسل کرتے وقت مردہ بال گر جاتے ہیں تو اس پر کوئی فدیہ یا تاوان نہیں ہوگا البتہ دانستہ طور پر بالوں کو کاٹنا یا اکھاڑنا منع ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحيح بخاري، الحج: ١٥٣٦۔ ❷ دارقطني، ص: ٢٨٥، ج٢۔ ❸ مسلم، الحج: ١٣٢٧۔

مسنون تلبیہ

سوال رسول اللہ ﷺ سے کون سا تلبیہ ثابت ہے؟ نیز حج یا عمرہ میں کس وقت تلبیہ ختم کرنا چاہیے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب رسول اللہ ﷺ سے تلبیہ کے لیے حسب ذیل الفاظ ثابت ہیں: **لبيك اللهم لبيك، لبيك لا شريك لك لبيك، ان الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك** [1]

''میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بلاشبہ تمام تعریفیں اور نعمتیں تیری ہی ہیں اور سارا ملک بھی تیرا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔'' ایک روایت کے مطابق اس تلبیہ میں یہ الفاظ بھی ہیں: **لبيك إله الحق** [2] ''اے معبود حقیقی! میں حاضر ہوں۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مزید الفاظ بھی منقول ہیں، لیکن بہتر ہے کہ حج یا عمرہ کرنے والا مذکورہ الفاظ پر ہی اکتفا کرے اور ان میں کسی اور لفظ کا اضافہ نہ کرے، عمرہ کرنے والا جب طواف شروع کرے تو تلبیہ کو بند کر دے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت تلبیہ سے رک جاتے تھے جب حجر اسود کا استلام کرتے۔ [3]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''عمرہ میں کس وقت تلبیہ ختم کیا جائے۔'' اور حج کرنے والا اس وقت تلبیہ بند کر دے جب دسویں ذوالحجہ کو جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارے کیونکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک تلبیہ کہتے رہے۔ [4]

واضح رہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ عرفہ سے مزدلفہ تک رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سواری پر تھے پھر مزدلفہ سے منیٰ تک حضرت فضل رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے سوار کر لیا تھا، ان دونوں حضرات نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ عمرہ کرنے والے کو طواف شروع کرنے اور حج کرنے والے کو جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک تلبیہ کہتے رہنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

طواف کے چکروں میں مخصوص دعا پڑھنا

سوال مناسک حج کے متعلق جو کتب بازار سے دستیاب ہیں، ان میں طواف کے ہر چکر کی الگ دعا لکھی ہے اور وہ دعائیں بہت لمبی لمبی ہیں، ایک عام حاجی کے لیے ان کا یاد کرنا اور انہیں پڑھنا بہت مشکل ہے، کیا واقعی صحیح احادیث سے یہ دعائیں ثابت ہیں؟

جواب حج وعمرہ کے لیے رسول اللہ ﷺ سے کوئی خاص دعا منقول نہیں ہے صرف رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان درج ذیل قرآنی دعا کا پڑھنا ثابت ہے: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾ ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں نعمتیں عطا فرما اور آخرت میں بھی اپنی عنایات سے مالا مال فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ

---

[1] صحیح بخاری، الحج: ۱۵۴۹۔ [2] نسائی، المناسك: ۲۷۵۳۔
[3] ابوداود، المناسك: ۱۸۱۷۔ [4] صحیح بخاری، الحج: ۱۵۴۳۔

رکھے۔"[1]

اسی طرح صفا مروہ اور مقام عرفہ پر کچھ اذکار کتب حدیث میں صحیح اسناد سے منقول ہیں حج یا عمرہ کرنے والے کو چاہیے کہ کتاب وسنت میں جو دعائیں منقول ہیں، انہیں پڑھتا رہے، خود ساختہ اور بناوٹی دعاؤں کے پڑھنے سے اجتناب کرے، بازار سے دستیاب کتب میں جو طواف کے ہر چکر کی خاص دعا لکھی ہوتی ہے، ان میں سے کوئی بھی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، انہیں پڑھنے سے کئی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ لوگ اسے مسنون دعائیں خیال کر کے پڑھتے ہیں حالانکہ سنت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، پڑھنے والے ہر چکر کے لیے ایک دعا مخصوص کر لیتے ہیں اور اگر چکر ختم ہونے سے پہلے دعا ختم ہو جائے تو چکر کے باقی حصہ میں خاموش رہتے ہیں اور اگر دعا کے پورا ہونے سے پہلے چکر ختم ہو جائے تو باقی دعا ترک کر دیتے ہیں، یہ سب نقصانات بدعت کے اختیار کرنے کی وجہ سے ہیں، رسول اللہ ﷺ جب مقام ابراہیم کے پاس آئے تو آپ نے وہاں ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾[2] پڑھا ہے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں کتابچے ہوتے ہیں وہ اس مقام پر ایک لمبی چوڑی دعا باآواز بلند پڑھتے ہیں اور وہاں نماز پڑھنے والوں کی نماز میں خلل ڈالتے ہیں، ہمیں چاہیے کہ اس قسم کے تمام مفاسد سے اجتناب کریں۔ (واللہ اعلم)

حجر اسود کو بوسہ دینا

سوال دوران حج ہم نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ نماز سے سلام پھیرتے ہی حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، اس طرح حجر اسود کو بوسہ دینے کی کیا حیثیت ہے، کیا ایسا کرنا درست ہے؟

جواب حجر اسود کا بوسہ، بیت اللہ کے طواف کے آغاز میں لیا جاتا ہے، طواف کے بغیر حجر اسود کا بوسہ لینا کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے وہ بھی اس صورت میں مسنون ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے، اگر دوسروں کو ضرر رسائی کا اندیشہ ہے تو بوسہ کے بجائے دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے جو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے مشروع کیا ہے، لیکن نماز باجماعت سے سلام پھیرتے ہی حجر اسود کی طرف بوسہ کے لیے دوڑنا اسلاف سے ثابت نہیں ہے، لوگ جہالت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں، افسوس تو اس امر پر ہے کہ بعض لوگ سلام سے پہلے ہی حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اس طرح ایک غیر واجب کی خاطر اپنے واجب کو خراب کر لیتے ہیں یعنی نماز جو انسان پر فرض ہے ایک ایسے کام کی وجہ سے باطل کر لیتے ہیں جو واجب نہیں، حجر اسود کا بوسہ صرف طواف کے لیے مشروع ہے، اس کے بغیر اس کا ثبوت محل نظر ہے۔

دسویں ذوالحجہ کے ضروری امور

سوال حج کے موقع پر تلبیہ کب ختم کیا جائے گا نیز دسویں ذوالحجہ کو کون کون سے کام کرنا ہیں، اگر ان میں تقدیم یا تاخر ہو جائے تو کیا دم پڑتا ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب دسویں تاریخ کو جب جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماری جاتی ہیں تو اس عمل سے تلبیہ ختم ہو جاتا ہے، چنانچہ حضرت فضل

---

[1] ابوداود المناسک: ۱۸۹۳۔ [2] ۲/البقرۃ: ۱۲۵۔

بن عباس اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم سے روایت ہے، ان دونوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک تلبیہ کہتے رہے۔ ❶ علما کرام نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ پہلی کنکری مارنے پر ہی تلبیہ ختم ہو جائے گا یا جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنے سے فراغت کے بعد تلبیہ ختم ہوگا، ہمارے رجحان کے مطابق آخری کنکری سے فراغت کے بعد تلبیہ ختم ہوگا جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری کنکری پھینکتے ہی تلبیہ ختم کر دیا۔ ❷

اس مقام پر امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کے متعلق عمدہ بحث کی ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ واضح رہے کہ دسویں ذوالحجہ کو حاجیوں نے چار کام کرنے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

❶ طلوع آفتاب کے بعد جمرہ عقبہ کو سات کنکریاں مارنا۔ ❷ قربانی کرنا۔ ❸ سر منڈوانا۔ ❹ طواف افاضہ کرنا۔

اگر ان اعمال میں تقدیم و تاخیر ہو جائے تو شرعاً کوئی مواخذہ نہیں ہے جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

① حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں ایک مقام پر کھڑے ہو گئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے سوالات کرنا شروع کر دیئے، کسی نے کہا مجھے علم نہیں تھا کہ میں نے قربانی سے پہلے حجامت بنوالی، آپ نے اسے فرمایا: ''قربانی کرو، کوئی حرج نہیں ہے۔''

ایک دوسرے آدمی نے کہا مجھے علم نہیں تھا میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کر لی، آپ نے اسے فرمایا: ''اب کنکریاں مارلو کوئی حرج نہیں ہے۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس عمل کی تقدیم و تاخیر کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: ''جاؤ، اب کر لو کوئی حرج نہیں ہے۔'' ❸

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کرنے، سر منڈوانے، کنکریاں مارنے اور ان میں تقدیم و تاخیر کے متعلق سوال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی حرج نہیں ہے۔'' ❹

③ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قربانی کے دن ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے سر منڈوانے سے پہلے طواف افاضہ کر لیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اب سر منڈوا لو، کوئی حرج نہیں ہے۔'' ❺

بہر حال دسویں ذوالحجہ کو اعمال بجالانے کی مندرجہ بالا ترتیب ہے لیکن اگر کوئی بھول کر ان میں تقدیم و تاخیر کا مرتکب ہوتا ہے تو شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحیح بخاری، الحج: ١٦٨٦-١٦٨٧۔ ❷ صحیح ابن خزیمہ، ص: ٢٨٢، ج ٤۔
❸ صحیح بخاری، الحج: ١٧٣٦۔ ❹ صحیح بخاری، الحج: ١٧٣٤۔ ❺ جامع ترمذی، الحج: ٨٨٥۔

روزہ واعتکاف

روزہ واعتکاف
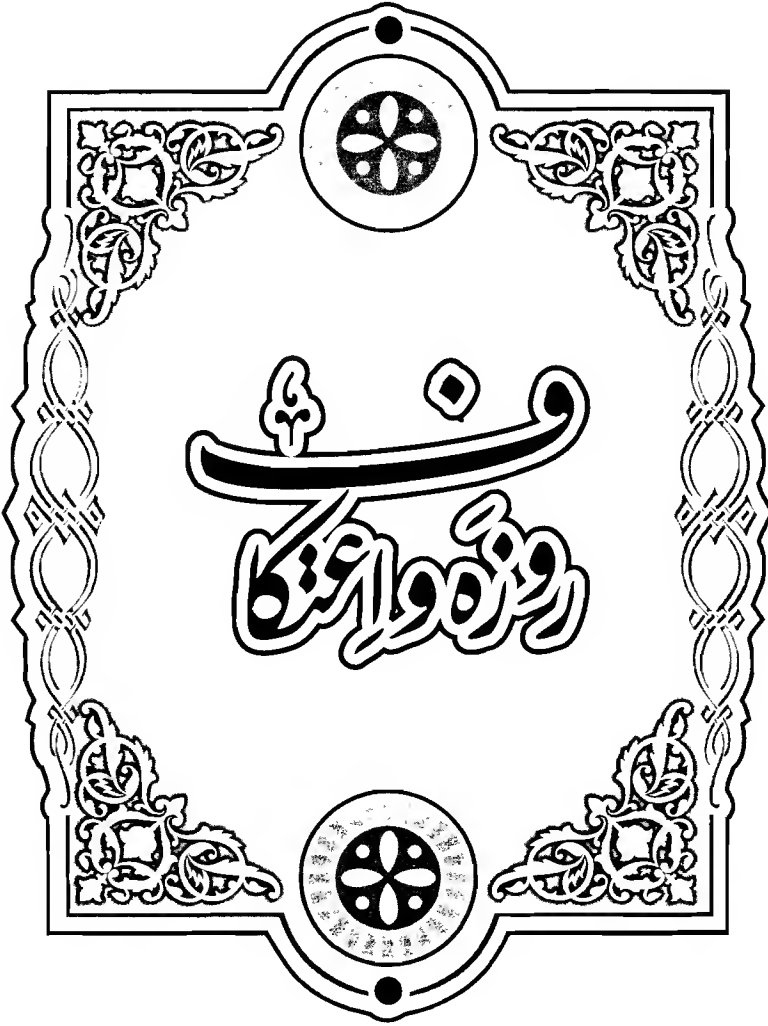
کمزوری کی بناپر روزہ ترک کرنا

سوال میری بیوی طبعی طور پر بہت کمزور ہے، وہ روزہ نہیں رکھ سکتی جبکہ میری مالی حالت اس قدر کمزور ہے کہ میں اس کی طرف سے کسی کو روزے بھی نہیں رکھوا سکتا، ایسے حالات میں میری بیوی کے متعلق کیا شرعی حکم ہے؟

جواب روزوں کے متعلق حکم الٰہی یہ ہے کہ انہیں بروقت رکھا جائے، اگر کوئی عذر ہے تو انہیں بعد میں رکھ لیا جائے اگر بروقت یا بعد میں رکھنے کی ہمت نہیں ہے تو کسی مسکین کو روزے رکھوا دیئے جائیں، لیکن اگر روزے رکھوانے کی ہمت نہیں ہے۔ مالی حالت واقعی کمزور ہے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے انسان سے باز پرس نہیں کریں گے کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾ [1]

''اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

چونکہ مفلوک الحال انسان اپنی بیوی کی طرف سے فدیہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور وہ عورت خود روزہ رکھنے کی ہمت نہیں رکھتی، ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ ان سے معافی کا معاملہ فرمائے گا۔ (ان شاء اللہ)

روزے کو ترک کرنے والے امور

سوال وہ کون کون سے عذر ہیں جن کی وجہ سے روزہ ترک کیا جا سکتا ہے، نیز جب عذر ختم ہو جائے تو باقی دن کھانے پینے کی اجازت ہے یا وہ شام تک کوئی چیز کھائے اور نہ ہی کوئی چیز پیئے، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کیا ہدایات ہیں؟

جواب قرآن کریم نے دو عذر ایسے بیان کیے ہیں جن کی بنا پر روزہ چھوڑا جا سکتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ﴾ [2]

''تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ اور دنوں میں گنتی کو پورا کر لے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر اور بیماری ایسے عذر ہیں جن کی بنا پر روزہ چھوڑا جا سکتا ہے لیکن مسافر اور مریض کو بعد میں روزہ رکھنا ہوگا۔ اس طرح حدیث میں ہے کہ حاملہ عورت اگر روزہ رکھنے کی صورت میں اپنے یا اپنے بچے کے متعلق خطرہ محسوس

---

[1] ۲/البقرۃ:۲۸۶۔ [2] ۲/البقرۃ:۱۸۵۔

کرے تو اس کا عذر بھی قابل قبول ہے نیز جو عورت بچے کو دودھ پلاتی ہو اور روزہ رکھنے کی صورت میں اسے اپنے بچے کے متعلق کمزوری کا اندیشہ ہو تو اسے روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مسافر سے روزہ اور نصف نماز ساقط کر دی ہے، اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی خاتون سے روزہ ساقط کر دیا ہے۔'' [1]

جہاد فی سبیل اللہ میں بھی طاقت اور قوت کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے بھی روزہ ترک کرنا جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے وقت فرمایا تھا:

''تم اپنے دشمن کے قریب پہنچ چکے ہو، اب روزہ نہ رکھنا تمہارے لیے باعث قوت ہے۔'' [2]

لہٰذا جب کوئی ایسا سبب موجود ہو جس کی وجہ سے روزہ ترک کرنا جائز ٹھہرے اور انسان اس عذر کی بنا پر روزہ چھوڑ دے تو دن کے باقی حصہ میں اس کے لیے کھانے پینے سے باز رہنا ضروری نہیں ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق اگر کوئی مریض دن کے وقت صحت یاب ہو جائے یا کوئی مسافر اپنی گھر پہنچ جائے اور اس نے روزہ چھوڑا ہوا ہو تو شام تک اس کے لیے کھانے پینے سے باز رہنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے ایک جائز سبب کی وجہ سے روزہ چھوڑا تھا، ان کے لیے اس دن کی حرمت باقی نہیں ہے، وہ شام تک کھا پی سکتا ہے، اسے پابند کرنا کہ وہ شام تک نہ کچھ کھائے اور نہ پیئے ناروا پابندی ہے۔ (واللہ اعلم)

شب قدر کا تعین

سوال قرآن و حدیث کے مطابق شب قدر کے متعلق کیا معلومات ہیں اور کیا اس رات کی تعیین ممکن ہے؟ اگر اس رات کا احساس ہو تو کیا پڑھا جائے؟

جواب شب قدر ایسی رات ہے جس میں عبادت کرنا ہزار مہینوں کی عبادت سے بڑھ کر ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ؕ﴾ [3]

''لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو شخص ایمان کے ساتھ طلبِ ثواب کی نیت سے شب قدر کا قیام کرے گا اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔'' [4] پہلے اس رات کی تعیین کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا گیا تھا لیکن پھر آپ کو بھلا دی گئی، اس کا سبب بھی احادیث میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کے متعلق آگاہ کرنے کے لیے تشریف لا رہے تھے، اچانک آپ نے دیکھا کہ دو مسلمان آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں تو آپ ان کے پاس کھڑے ہو گئے، ان کی باتیں سننے کے دوران آپ کے ذہن سے اس رات کی تعیین کا علم محو کر دیا گیا۔ [5]

حدیث میں مزید وضاحت ہے کہ اس کی تعیین کا محو ہو جانا تمہارے لیے بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اب اسے

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۲٤۷، ج ۳۔ [2] صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۲۰۔
[3] ۹۷/القدر: ۳۔ [4] صحیح بخاری، فضل لیلۃ القدر: ۲۰۱٤۔ [5] صحیح بخاری، فضل لیلۃ القدر: ۲۰۲۳۔

انتیسویں، ستائیسویں اور پچیسویں رات میں تلاش کرو۔'' [1] ایک روایت میں ہے کہ'' آخری عشرہ کی طاق راتوں میں اسے تلاش کیا جائے۔ [2] رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک دفعہ تئیسویں رات، شب قدر آئی تھی۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مجھے لیلۃ القدر دکھائی گئی پھر مجھے بھلا دی گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اس صبح کو پانی اور مٹی میں سجدہ کر رہا ہوں۔ [3]

حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تئیسویں رات ہم پر بارش نازل ہوئی، جب رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھا کر فارغ ہوئے تو آپ کی پیشانی اور ناک پر پانی اور مٹی کے نشانات نمایاں تھے۔ [4]

بہرحال احادیث کی صراحت کے مطابق شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آتی ہے تاہم بعض روایات میں ہے کہ ان طاق راتوں میں سے ستائیسویں رات میں شب قدر کا زیادہ امکان ہے۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ قسم اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ رات رمضان میں آتی ہے اور آخری عشرہ کی ستائیسویں رات کو آتی ہے۔ [5]

اس طرح حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لیلۃ القدر ستائیسویں رات کو ہوتی ہے۔'' [6]

ہمارے رجحان کے مطابق آخری عشرہ کی تمام طاق راتوں میں شب قدر تلاش کی جائے، خاص طور پر ستائیسویں رات کو اس کے متعلق زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، ان راتوں میں یہ دعا بکثرت پڑھی جائے۔ **اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي** ''اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند کرتا ہے لہٰذا مجھے بھی معاف کر دے۔''

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اگر مجھے احساس ہو جائے کہ یہ لیلۃ القدر ہے تو اس میں کیا پڑھوں تو آپ نے انہیں مذکورہ دعا پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ [7]

رمضان المبارک میں مانع حیض گولیوں کا استعمال

سوال رمضان المبارک میں پورے مہینہ کے روزے رکھنے کے لیے بعض عورتیں مانع حیض گولیاں استعمال کرتی ہیں، اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

جواب عورت کے لیے یہی بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں جو لکھ دیا ہے، اس پر راضی اور خوش رہے، رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے سال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو وہ رو رہی تھیں اور انہوں نے عمرہ کا احرام باندھ رکھا تھا، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''انہیں کیا ہوا ہے، شاید انہیں حیض آ گیا ہے، انہوں نے عرض کیا: ہاں ''یا رسول اللہ ﷺ'' رسول اللہ ﷺ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ''یہ تو ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں پر لازم قرار دیا ہے۔'' [8]

---

[1] صحیح بخاری، حدیث نمبر ۲۰۲۳۔ [2] صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۰۱۸۔
[3] صحیح بخاری، فضل لیلۃ القدر: ۲۰۱۶۔ [4] صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۰۶۸۔
[5] صحیح مسلم، الصیام، باب لیلۃ القدر۔ [6] ابو داود، حدیث نمبر: ۱۳۸۶۔ [7] جامع ترمذی، حدیث نمبر ۳۵۱۳۔
[8] صحیح بخاری، الحیض: ۲۹۴۔

اس حدیث کے پیش نظر خواتین کو چاہیے کہ وہ صبر سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید رکھیں، جب حیض کی وجہ سے نماز اور روزہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے تو غیر فطری راستہ اختیار نہ کریں، ایسے حالات میں اللہ کے ذکر کا دروازہ تو کھلا رہتا ہے، انہیں چاہیے کہ اللہ کا ذکر کریں، صدقہ وخیرات کریں، ان کے لیے یہ افضل ترین کام ہیں۔

طبی لحاظ سے یہ گولیاں نقصان سے خالی نہیں ہوتیں کیونکہ حیض کا خون طبعی طور پر خارج ہوتا ہے، جب کسی طبعی چیز کو زبردستی روکنے کی کوشش کی جائے تو جسم میں اس کا منفی ردعمل ہوتا ہے، ایسی ادویات کا یہ بھی نقصان ہے کہ ان کے استعمال سے خواتین کی ماہانہ عادت خراب ہو جاتی ہے، جس بنا پر وہ اضطراب و پریشانی کا شکار رہتی ہیں، بہرحال اگر صحت کے حوالہ سے کوئی نقصان کا اندیشہ نہ ہو اور خاوند سے اجازت لے کر انہیں استعمال کیا جائے تو جواز کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے، لیکن ہم ذاتی طور پر ان مانع حیض گولیوں کے استعمال کو پسند نہیں کرتے کیونکہ اس میں نقصان کا اندیشہ اور ایک فطری راستے کو روکنے کا ذریعہ ہے۔ (واللہ اعلم)

دعائے قنوت میں طویل دعا

سوال بعض علماء کرام نماز وتر میں دعائے قنوت پڑھتے وقت بڑی طویل دعا پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، اس سے کچھ مقتدی حضرات میں اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، کتاب وسنت کے اعتبار سے اس کی کیا حیثیت ہے؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب نماز وتر اگر باجماعت ادا ہو تو امام کو قنوت وتر پڑھنا چاہیے، اس کے ساتھ مزید دعائیں شامل کی جا سکتی ہیں اور اسے قنوت وتر کے بجائے قنوت نازلہ بھی بنایا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایسا کرنا منقول ہے، لیکن دعا اس قدر طویل نہیں ہونی چاہیے جو مقتدیوں پر گراں گزرے یا جس سے وہ اکتا جائیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران نماز اس عمل سے منع فرمایا ہے چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب اپنی قوم کو نماز پڑھاتے تھے تو طویل قراءت کرتے تھے، کچھ لوگوں نے شکایت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے لگے ہو۔ [1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران نماز ہر اس عمل سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے مقتدی حضرات میں اکتاہٹ پیدا ہو، اس بنا پر نماز وتر میں لمبی لمبی دعاؤں سے پرہیز کرنا چاہیے، ہاں اگر مقتدی حضرات اس کی طوالت محسوس نہ کریں اور ان کی اکتاہٹ کا باعث نہ ہو تو ایسا کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

روزے کا فدیہ

سوال رمضان کے روزوں کا فدیہ کتنا ہے اور یہ کن لوگوں پر فرض ہے؟ براہ کرم تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر رمضان کے روزے فرض قرار دیئے ہیں، جو حضرات معذور نہیں ہیں وہ ان روزوں کو بروقت ادا کریں اور جنہیں روزہ رکھنے سے کوئی عذر مانع ہے جیسا کہ مریض اور مسافر شخص ہے، ایسے افراد بعد میں قضا دیں۔ بشرطیکہ دوسرے دنوں میں وہ قضا کی طاقت رکھتے ہوں، ایک تیسری قسم بھی ہے جو روزہ بروقت نہیں رکھ سکتے اور نہ ہی بعد میں قضا

---

[1] صحیح بخاری، الاذان: ۷۰۵۔

دے سکتے ہیں مثلاً بہت بوڑھا شخص یا مریض جس کے تندرست ہونے کی امید نہ ہو۔ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ تخفیف فرمائی ہے کہ وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ 1

''اور جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے وہ بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا دیں۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت کا حکم اس بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے ہے جو روزہ نبھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ 2

لیکن جس نے کسی عارضی عذر کی بنا پر روزہ چھوڑا، جب وہ عذر زائل ہو جائے تو رمضان کے بعد ان روزوں کی قضاء ضروری ہے ایسے لوگ فدیہ نہیں بلکہ روزے رکھیں گے اور جن لوگوں نے دوسروں کو روزے رکھوانے ہیں وہ سحری اور افطاری دو وقت کا کھانا دیں یا اس پر اٹھنے والے اخراجات کے حساب سے انہیں پیسے دے دیں۔ (واللہ اعلم)

روزے کی نیت کرنا

سوال روزے کی نیت سے کیا مراد ہے؟ ہمارے ہاں روزے کی نیت کے لیے یہ الفاظ بتائے جاتے ہیں: ''وبصوم غد نويت من شهر رمضان'' اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

جواب روزے دو طرح کے ہوتے ہیں: 1 فرض روزہ: جیسے رمضان کا روزہ، نذر کا روزہ، کفارہ کا روزہ وغیرہ۔فرض روزے کے لیے رات کو نیت کرنا ضروری ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزہ رکھنے والا رات کے وقت اپنے دل میں ارادہ کرے کہ وہ صبح رمضان یا نذر یا کفارہ یا قضاء کا روزہ رکھے گا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''جس شخص نے طلوع فجر سے پہلے رات کو روزہ رکھنے کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں۔'' 3

یہ حدیث بھی اس امر کا ثبوت ہے: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔'' 4 ان روایات کی روشنی میں فرض روزے کی نیت رات کو کرنا ضروری ہے اگر کوئی دن چڑھے بیدار ہوا اور اس نے طلوع فجر کے بعد کچھ نہ کھایا پیا پھر اس نے روزے کی نیت کر لی تو اس کا روزہ نہیں ہوگا، کیونکہ رات کے وقت طلوع فجر سے پہلے نیت کرنا ضروری تھا۔

1 روزہ کی دوسری قسم نفلی روزہ ہے، اس کی نیت دن چڑھے بھی کی جا سکتی ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ایک روز میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور پوچھا: ''کیا تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟'' میں نے عرض کیا جی نہیں، آپ نے فرمایا: ''تب میں روزہ رکھ لیتا ہوں۔'' 5 اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آپ پہلے بحالت روزہ نہ تھے کیونکہ آپ نے کھانا طلب کیا، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نفلی روزے کی نیت میں دن چڑھے تک تاخیر کرنا جائز ہے، واضح رہے کہ نفلی روزے کی نیت دن میں اس وقت جائز ہے جب نیت سے پہلے روزے کے منافی کام یعنی فجر ثانی کے بعد کچھ کھایا پیا نہ ہو، بصورت دیگر روزہ

---

1 ٢/البقرة:١٨٤۔ 2 بخاري، التفسير: ٤٥٠٥۔ 3 بيهقي، ص:٢٠٣، ج:٤۔

4 صحيح بخاري، بدء الوحى:١۔ 5 صحيح مسلم، الصيام: ١١٥٤۔

صحیح نہیں ہوگا۔

واضح رہے کہ نیت محض دل کے ارادے کا نام ہے، اس لیے زبان سے کوئی الفاظ ادا کرنا شرعاً ثابت نہیں ہیں، اس بنا پر ہمارے ہاں مشہور نیت جو سوال میں ذکر کی گئی ہے خود ساختہ اور بے اصل ہے، یہ الفاظ بنانے والے نے عقل سے کام نہیں لیا، کیونکہ اس میں کل کے روزے کی نیت کا ذکر ہے جبکہ روزہ آج رکھا جا رہا ہوتا ہے، بہرحال روزہ کے لیے زبان سے مخصوص الفاظ ادا کرنا شرعاً ثابت نہیں ہیں۔

آغاز رمضان کی تصدیق

سوال ماہ رمضان کی آمد آمد ہے، میرا سوال یہ ہے کہ ماہ رمضان کا کیسے پتہ چلایا جا سکتا ہے، تاکہ ہم اس کی سعادت سے کسی صورت میں محروم نہ رہیں؟

جواب بلاشبہ روزہ ایک مسلمان کے لیے بہت بڑی سعادت ہے، اس سے آخرت کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے اور یہ دنیوی خواہشات میں کمی کا باعث ہے نیز اس کے ذریعے مساکین کے ساتھ ہمدردی اور ان کے دکھ درد کا احساس پیدا ہوتا ہے، جب ماہ رمضان کے آغاز کا علم ہو جائے تو اس کے روزوں کی فرضیت شروع ہو جاتی ہے اور اس کے آغاز کا علم تین طرح سے ممکن ہے۔

☆ رمضان کا چاند دیکھ کر اس کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''رمضان کا چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر عید الفطر کرو۔'' [1]

قرآن کریم کی درج ذیل آیت کریمہ سے اسی بات کا ارشاد ملتا ہے۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ﴾ [2]

''جو شخص اس مہینہ کو پائے تو وہ اس کا روزہ رکھے۔''

☆ چاند کو کوئی شخص خود نہ دیکھ سکے لیکن چاند دیکھنے کی گواہی سے اس کا آغاز کر دے اس کے متعلق ایسے شخص کی گواہی قابل قبول ہے جو عاقل، بالغ اور قابل اعتبار ہو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے ماہ رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے چاند نظر آ گیا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر دی، میری شہادت پر آپ نے خود روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ [3]

☆ اگر کوئی خود نہ دیکھ سکے اور نہ ہی اسے دیکھنے کی شہادت ملے تو ماہ شعبان کے تیس دن مکمل ہو جانے کے بعد ماہ رمضان کا آغاز ہو جاتا ہے کیونکہ اسلامی مہینہ تیس دنوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے، جب چاند دیکھو تو روزے رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنا چھوڑ دو، اگر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کر لو۔''

بہرحال جب ہر سہ طریقوں سے رمضان کا آغاز ہو جائے تو روزہ رکھنا فرض ہو جاتا ہے اور روزہ ہر اس شخص پر فرض ہے جو

---

[1] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۰۹۔ [2] ۲/البقرۃ: ۱۸۵۔

[3] ابو داود، الصیام: ۲۳۴۲۔

عاقل، بالغ اور اس کی طاقت رکھتا ہو، ہاں عاجز، مریض اور مسافر پر روزہ فرض نہیں ہے۔ جب مرض اور سفر کی حالت ختم ہو جائے تو چھوٹ جانے والے روزوں کی ادائیگی ضروری ہے۔ (واللہ اعلم)

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو روزے کی رخصت

سوال اللہ تعالیٰ نے مجھے دو بچیاں دی ہیں اور میں انہیں دودھ پلاتی ہوں، اگر میں روزہ رکھوں تو اس سے دودھ متاثر ہوتا ہے، شریعت مطہرہ میں میرے متعلق کیا گنجائش ہے، کیا میں فدیہ دے سکتی ہوں یا مجھے موقع ملنے پر روزے رکھنا ہوں گے؟

جواب حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے متعلق حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مسافر سے روزہ اور نصف نماز کو ساقط کر دیا ہے، اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی خاتون سے روزہ ساقط کر دیا ہے۔'' [1]

اس حدیث کے پیش نظر اگر دودھ پلانے والی عورت کو اپنے بچے کے متعلق کمزوری کا اندیشہ ہو تو اسے روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے لیکن دوسرے دنوں میں ترک کردہ روزوں کی قضا ضروری ہے لیکن اگر آیندہ رمضان سے پہلے پہلے اسے ترک شدہ روزوں کی قضا کا وقت نہیں ملتا اور وہ اس کی طاقت نہیں رکھتی تو اس صورت میں اسے ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا ہوگا، ایسی عورت کو روزہ کی بالکل معافی نہیں ہے اور نہ ہی اسے قضا کے ساتھ فدیہ دینے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ بعض علما کا مؤقف ہے، بہرحال دودھ پلانے والی عورت جتنے روزے چھوڑے گی، ان کی بعد میں قضا دے اگر اس کی طاقت نہیں تو فدیہ دے کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتی ہے۔

احتلام کی وجہ سے روزے کا حکم

سوال کیا احتلام آنے سے روزہ ختم ہو جاتا ہے؟ قرآن و حدیث کے مطابق جواب دیں۔

جواب اختیاری حالت میں مادہ منویہ خارج کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے البتہ غیر اختیاری حالت میں اگر ایسا ہو جائے تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ اس بنا پر احتلام سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے اور حالت نیند میں ایسا ہوتا ہے، جبکہ انسان مرفوع القلم ہوتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ رمضان المبارک میں بھی شرم و حیا سے کام نہیں لیتے اور وہ رات کو ٹی وی یا وی سی آر پر فحش مناظر دیکھتے رہتے ہیں، صبح کے وقت وہ روزہ رکھ کر پھر سو جاتے ہیں، گندے مناظر دیکھنے کی وجہ سے بحالت روزہ انہیں احتلام ہو جاتا ہے ایسے لوگوں کے متعلق نرم گوشہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ لوگ بحالت روزہ احتلام کے اسباب خود پیدا کرتے ہیں، ہمارے رجحان کے مطابق اس قسم کے احتلام سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس قسم کے روزے کا، روزے دار کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ روزہ تو انسان کو پرہیز گار بناتا ہے، اگر روزے رکھنے سے ایسے کاموں سے پرہیز نہیں کیا جاتا جو اس کے منافی ہیں تو ایسے روزے کا کیا فائدہ؟ بہرحال عام انسان کو اگر روزے رکھنے کے بعد احتلام ہو جائے تو

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۲٤۷، ج ۳۔

اس سے روزہ خراب نہیں ہوتا البتہ فحش مناظر دیکھنے کی وجہ سے احتلام روزے کے فساد کا باعث ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

سفر میں روزے کی رخصت

سوال دور حاضر میں آمد رفت کے ایسے ذرائع ایجاد ہو چکے ہیں، جن کے باعث مسافر کو کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، کیا ایسی حالت میں دوران سفر روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے؟ قرآن و حدیث کے مطابق فتویٰ دیں؟

جواب سفر خواہ کسی نوعیت کا ہو، مسافر کو دوران سفر روزہ رکھنے اور روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ سے دوران سفر روزے کے متعلق فرمایا: ''اگر تم چاہو تو دوران سفر روزہ رکھو اور اگر تم چاہو تو چھوڑ دو۔'' [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ سفر کرتے تھے، اس دوران نہ تو روزہ رکھنے والا روزہ چھوڑنے والے پر عیب لگاتا اور نہ ہی روزہ چھوڑنے والا روزہ رکھنے والے کو کچھ کہتا۔ [2]

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دوران سفر روزہ چھوڑنا اللہ کی طرف سے رخصت ہے جو اسے اختیار کرے تو بہتر ہے اور جو شخص روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ [3]

ہاں اگر دورانِ سفر روزہ رکھنے میں شدید مشقت کا سامان کرنا پڑے تو پھر روزہ نہ رکھا جائے، کیونکہ ایک سفر میں جب لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کے لیے روزہ بہت مشکل ہو گیا ہے تو آپ نے روزہ افطار کر دیا، پھر رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا کہ کچھ حضرات نے ابھی تک روزہ رکھا ہوا ہے تو آپ نے فرمایا: ''یہ لوگ نافرمان ہیں، یہ لوگ نافرمان ہیں۔'' [4]

جن لوگوں کے لیے دوران سفر روزہ رکھنے میں کوئی مشقت نہ ہو تو ان کے لیے افضل ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرتے ہوئے روزہ رکھیں کیونکہ آپ دوران سفر روزہ رکھا کرتے تھے چنانچہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ سخت گرمی کے دنوں میں سفر پر روانہ ہوئے، ہم میں رسول اللہ ﷺ اور عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کوئی روزہ دار نہیں تھا۔ [5]

دورِ حاضر میں اگرچہ سفر میں سہولیات میسر ہیں تاہم ہماری طبیعتیں بھی بہت نازک ہو چکی ہیں، سفر خواہ ہوائی جہاز کا ہو طبیعت میں گرانی اور تھکاوٹ ہوتی ہے، سفر اپنا حق ضرور وصول کر لیتا ہے۔ اس لیے مسافر اگر گرانی محسوس کرے تو روزہ چھوڑ دے اگر طبیعت ساتھ دے تو روزہ رکھنے میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء ہے اور انسان اس فریضہ سے بروقت سبکدوش ہو جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

رمضان میں فوت شدہ شخص کا فدیہ

سوال ایک آدمی بیمار تھا اور رمضان میں ہی فوت ہو گیا تو ایسے شخص کی طرف سے روزے رکھے جائیں گے یا اس کا فدیہ ادا کرنا ہوگا؟ قرآن و حدیث کے مطابق فتویٰ دیا جائے۔

---

[1] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۴۳۔ [2] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۴۷۔ [3] صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۲۱۔
[4] صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۴۔ [5] صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۲۲۔

جواب بیماریاں دوطرح کی ہوتی ہیں ایک یہ کہ ان سے شفایابی کی امید نہیں ہوتی، وہ مستقل روگ کی صورت اختیار کر جاتی ہیں، ایسے مریض کو چاہیے کہ وہ فدیہ ادا کرے، اگر فدیہ ادا کیے بغیر فوت ہوگیا ہے تو جتنے روزے وہ نہیں رکھ سکا، ان کا حساب کر کے اس کے مال سے فدیہ ادا کر دیا جائے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اسے اتفاقی طور پر بیماری لاحق ہوگئی اور وہ بیماری جاری رہی حتیٰ کہ وہ فوت ہوگیا، اس صورت میں اس کی طرف سے روزے نہیں رکھے جائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ [1]

''جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہوتو دوسرے دنوں میں ان کا شمار کرے۔''

لیکن صورت مسئولہ میں مریض کو قضا شدہ روزے رکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی اور وہ فوت ہو گیا، لہٰذا اس سے قضا کی ادائیگی ساقط ہو جائے گی، کیونکہ اسے وہ وقت ہی نہیں ملا جس میں اس پر روزہ فرض تھا وہ ایسے ہے جیسے وہ ماہ شعبان میں فوت ہو گیا ہو۔ (واللہ اعلم)

شرعی عذر کی بنا پر دو سال روزے نہ رکھ سکا

سوال ایک شخص بیمار تھا اور وہ رمضان میں روزے نہیں رکھ سکا، اللہ تعالیٰ نے اسے صحت عطا فرمائی لیکن وہ روزے نہیں رکھ سکا، حتیٰ کہ دوسرا رمضان شروع ہوگیا، اب اس کے لیے کیا حکم ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب رمضان کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ [2]

''تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں موجود ہو، اسے چاہیے کہ وہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں ان کا شمار کرے۔''

وہ شخص جس نے کسی شرعی عذر کی وجہ سے روزے ترک کیے تھے، اس کے لیے ضروری تھا کہ اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دوسرے رمضان سے پہلے پہلے قضاء شدہ روزوں کو رکھ لیتا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے: رمضان کے روزے میرے ذمے ہوتے تھے تو میں ان کی قضاء کرنے کی شعبان کے علاوہ کسی دوسرے مہینے میں اس کی استطاعت نہ رکھتی تھی۔ [3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس فرمان اور عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا رمضان شروع ہونے سے پہلے پہلے قضاء کے روزے رکھ لینا ضروری ہیں، اگر کوئی انہیں دوسرے رمضان تک مؤخر کر دے تو اس سے قضاء شدہ روزے ساقط نہیں ہوں گے۔ اسے چاہیے کہ وہ اللہ کے حضور توبہ استغفار کرے اور اپنے اس فعل پر شرمسار ہو اور رمضان کے بعد اپنے چھوڑے ہوئے روزوں کو ضرور رکھے، چھوڑے ہوئے روزوں کا رکھنا ضروری ہے خواہ وہ دوسرے رمضان کے بعد ہی رکھے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ۲/البقرة: ۱۸٤۔ [2] ۲/البقرة: ۱۸۵۔

[3] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۵۱۔

اگر روزے دار مریضہ اندام نہانی میں دوائی رکھ لے

سوال میرا طبابت کا پیشہ ہے، کچھ عورتیں سیلانِ رحم کا شکار ہوتی ہیں، انہیں اندام نہانی میں دوا رکھنا ہوتی ہے، اس سے مواد خشک ہو جاتا ہے، کیا روزے کی حالت میں عورت کو اس طرح اندام نہانی میں دوا رکھنا جائز ہے۔ اس سے روزہ تو متاثر نہیں ہوتا؟

جواب روزے رکھنے کے بعد قصداً کھانے پینے اور جماع کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس طرح سینگی لگوانے فصد کروانے، دانستہ قے کرنے اور ناک میں دوا ڈالنے سے بھی روزہ متاثر ہوتا ہے۔ صورت مسؤلہ میں دوا رکھنے سے روزہ متاثر نہیں ہوتا کیونکہ ایسا کرنے سے دوائی معدہ میں نہیں جاتی بلکہ صرف مواد کو خشک کرتی ہے، جیسا کہ گہرے زخم میں دوائی بھری جاتی ہے تاکہ اسے خشک کیا جائے، بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق ہر اس چیز سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے جو کسی بھی طریقہ سے معدہ تک پہنچ جائے جیسا کہ ڈرپ وغیرہ سے غذا معدہ تک پہنچائی جاتی ہے، اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی دوا معدہ کو متاثر نہیں کرتی، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے لہٰذا اگر کسی مریضہ کو اپنی اندام نہانی میں دوا رکھنے کی ضرورت پڑے تو ایسا کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، اسے چاہیے کہ وہ اپنے روزے کو پورا کر لے۔ (واللہ اعلم)

اعتکاف گاہ میں کب داخل ہونا چاہیے

سوال معتکف کو اعتکاف گاہ میں کب داخل ہونا چاہیے اور کن صورتوں میں مسجد سے نکلنا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اعتکاف کرنے والے کو چاہیے کہ وہ بیس رمضان المبارک کی شام کو مسجد میں پہنچ جائے اور رات بھر مسجد میں مصروف عبادت رہے اور اگلے روز صبح کی نماز پڑھ کر اپنی اعتکاف گاہ میں داخل ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے۔ [1] آخری عشرہ کا آغاز بیس رمضان کی شام کو ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعتکاف کا آغاز بیس رمضان کی شام کی بعد ہونا چاہیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو نماز فجر ادا کر کے اپنی اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جاتے۔ [2] اکثر ائمہ نے اسی مؤقف کو اختیار کیا ہے، پھر معتکف کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی، نوافل، تلاوت قرآن اور ذکر الٰہی میں مشغول رہے کیونکہ اعتکاف بیٹھنے کا یہی مقصد ہے، اپنے ساتھیوں سے بات چیت بھی کر سکتا ہے، بالخصوص جب گفتگو کرنے میں کوئی فائدہ ہو، فضول باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اعتکاف کرنے والے کے لیے مسجد سے نکلنے کی حسب ذیل تین اقسام بیان کی گئی ہیں:

1. کسی ایسے امر کے لیے باہر نکلنا جس کے بغیر چارۂ کار نہ ہو مثلاً کھانے پینے کے لیے نکلنا جبکہ گھر سے کوئی کھانا لانے والا نہ ہو، اس طرح بول وبراز اور وضو وغسل کے لیے مسجد سے نکلنا، ایسا کرنا جائز ہے لیکن کسی مسجد میں جمعہ پڑھانے کے لیے معتکف کا

---

[1] بخاری، فضائل قرآن: ٤٩٩٩۔ [2] ترمذی، الصوم: ٧٩١۔

مسجد سے نکلنا محل نظر ہے، موبائل اعتکاف کی شرعاً گنجائش نہیں ہے۔

❷ کسی ایسے نیک کام کے لیے مسجد سے نکلنا جو معتکف کے لیے واجب نہ ہو مثلاً بیمار کی تیمارداری یا نماز جنازہ کی ادائیگی کے لیے مسجد سے نکلنا، ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے معتکف کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ نہ مریض کی عیادت کرے اور نہ جنازے میں شرکت کے لیے جائے، نہ عورت کو چھوئے اور نہ ہی اس سے مباشرت کرے۔[1]

ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ اگر اعتکاف بیٹھتے وقت اس نے شرط لگائی تھی یا وہ بھول گیا تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں۔[2]
ہمارے رجحان کے مطابق ایسے کاموں کے لیے مسجد سے نکلنا کسی صورت میں درست نہیں ہے۔

❸ کسی ایسے کام کے لیے مسجد سے نکلنا جو اعتکاف کے منافی ہو مثلاً بلا وجہ گھر جانے کے لیے، خرید و فروخت کرنے کے لیے، بیوی سے جماع کرنے کے لیے نکلنا جائز نہیں ہے خواہ اس نے اعتکاف بیٹھتے وقت ان امور کی شرط ہی کیوں نہ عائد کی ہو، ان کاموں سے اعتکاف باطل ہو جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

ایک روزے میں فرض اور نفل روزے کی نیت کرنا

سوال میرے کچھ فرض روزے رہ گئے تھے، کیا عاشورا کے روزہ میں فرض روزہ کی نیت ہو سکتی ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب وہ عورت جس کے فرض روزے کسی وجہ سے رہ گئے ہوں، ان کا رکھنا ضروری ہے، نفل روزہ اگر رہ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن ایک روزہ میں دونوں طرح کی نیت کرنا درست نہیں ہے، البتہ عاشورا کا روزہ بعد میں نہیں رکھا جا سکتا، اسے پہلے رکھ لیا جائے، اس کے بعد اپنے فرضی روزے رکھے جائیں، ایک روزہ میں فرض اور نفل روزے کی نیت کرنا محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

احتلام کی صورت میں روزے کا فاسد ہونا

سوال احتلام کی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ نیز بتائیں کہ احتلام ہونے سے غسل کرنا ضروری ہے یا متاثرہ جگہ کا دھو لینا ہی کافی ہے؟

جواب احتلام ہونے کی صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ قرآن و سنت میں جن اشیاء سے روزہ ٹوٹنے کا ذکر ہے، احتلام ان میں نہیں ہے۔ شارع علیہ السلام نے اسے مفسد روزہ قرار نہیں دیا ہے البتہ احتلام ہونے سے صرف متاثرہ جگہ دھونا ہی نہیں بلکہ غسل کرنا چاہیے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو تری کو تو دیکھتا ہے لیکن اسے احتلام یاد نہیں پڑتا آپ نے فرمایا وہ غسل کرے گا، پھر ایک ایسے شخص کے متعلق سوال ہوا جسے اتنا تو معلوم ہے کہ اسے احتلام ہوا ہے لیکن وہ تری نہیں پاتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کے ذمے کوئی غسل نہیں ہے۔''[3]

---

[1] ابوداود، الصوم: ۲۴۷۳۔ [2] مغنی، ص: ۴۷۲، ج ۴۔ [3] ابوداود، الطهارة: ۲۳٦۔

اسی طرح حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ جب عورت کو احتلام ہو جائے تو کیا اس پر غسل فرض ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں فرض ہے جب وہ پانی دیکھے۔'' [1] ان احادیث سے معلوم ہوا کہ احتلام کی صورت میں اگر وہ تری دیکھے تو غسل کرنا ضروری ہے، متاثرہ جگہ دھونے سے کام نہیں چلے گا۔ (واللہ اعلم)

عاشورا محرم کے روزوں کی تعداد

سوال اس سال ہمارے ہاں عاشورا محرم کے روزے کے متعلق اختلاف ہوا کہ یہ صرف نویں محرم کا رکھنا چاہیے، جبکہ ہم اس سے پہلے نویں اور دسویں محرم کا روزہ رکھتے تھے براہ کرم اس کے متعلق وضاحت کریں۔

جواب اس سال عاشورا محرم کے موقع پر ہمیں متعدد مقامات سے فون آئے اور کچھ حضرات نے زبانی استفسار کیا کہ عاشورا محرم کے روزہ کی کیا حیثیت ہے؟ اور اسے کس دن رکھا جائے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ صرف نویں محرم کو رکھنا چاہیے، دسویں محرم کا روزہ نہیں ہے وغیرہ وغیرہ، اس لیے ضروری ہے کہ ذرا تفصیل سے اس کے متعلق وضاحت کر دی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ رمضان کے بعد کس مہینے کے روزے افضل ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے مہینے محرم کے روزے رمضان کے بعد فضیلت والے ہیں۔'' [2] پہلی امتیں بھی اس دن کا احترام کرتی تھیں اور روزہ رکھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے یہود مدینہ کو اس دن کا روزہ رکھتے ہوئے دیکھا، آپ نے ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ وہ دن ہے جس میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر لنگرانداز ہوئی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کے حضور شکرانے کے طور پر روزہ رکھا۔ [3] اس کا مطلب یہ ہے کہ محرم کی دس تاریخ کو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ کی چوٹی پر ٹھہری تھی اور انہیں بہت بڑے طوفانی سیلاب سے نجات ملی تھی، اس بنا پر حضرت نوح علیہ السلام نے عاشورا کے دن اللہ کے حضور روزے کا نذرانہ پیش کیا۔ یہودی بھی اس دن کا روزہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ یہ دن بڑا بابرکت ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن فرعون سے نجات دی، اس بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شکریہ کے طور پر اس دن ایک روزہ رکھا۔ [4] یہود مدینہ اس دن کو قومی جشن کے طور پر مناتے اور فرحت و انبساط کا اظہار کرتے تھے، حدیث میں ہے کہ اہل خیبر اس دن عید مناتے اس دن عورتوں کو زیور پہناتے اور سامان زینت سے آراستہ کرتے تھے۔ [5] اس دن اظہار مسرت کے لیے عیسائی بھی یہود کے ساتھ شریک ہوتے اور اس دن کی عظمت کو بجالاتے، حدیث میں اس مشترکہ عظمت کا اظہار بایں الفاظ بیان ہوا ہے کہ اس دن کو یہودی اور عیسائی بڑا عظیم خیال کرتے تھے۔ [6] ایام جاہلیت میں قریش بھی اس دن کو عظیم سمجھتے تھے اور اس کی عظمت کے پیش نظر کعبہ شریف کو غلاف پہناتے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں قریش سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہو گیا جو ان کے دلوں میں کانٹے کی حیثیت اختیار کر گیا،

---

[1] صحیح بخاری، الغسل: ۲۸۲۔ [2] صحیح مسلم، الصیام: ۲۷۴٦۔

[3] مسند احمد، ص: ۳٦۰، ج۲۔ [4] صحیح بخاری، الصوم: ۲۰۰٤۔

[5] صحیح مسلم، الصیام: ۲٦٦۱۔ [6] صحیح مسلم، الصیام: ۲٦٦٦۔

انہیں بتایا گیا کہ عاشورا کی تعظیم اور اس کا روزہ رکھنے سے اس گناہ کی تلافی ہوسکتی ہے۔ 1 صحیح احادیث کے مطابق قریش بھی اس دن کا روزہ رکھتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قریش زمانہ جاہلیت میں اس دن کا روزہ رکھتے تھے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس دن کا روزہ رکھتے تھے۔ 2 عین ممکن ہے کہ یہود مدینہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قریش نے بھی اس دن کی تعظیم کو اپنے ہاں برقرار رکھا ہو بہرحال تصریحات بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشورہ کا دن بڑی تاریخی حیثیت کا حامل ہے، زمانہ قدیم سے اس کی تعظیم کے پیش نظر روزہ رکھنے کا رواج تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں اس رواج کو برقرار رکھا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ قریش مکہ جاہلیت میں عاشورا کا روزہ رکھتے تھے اور مکہ میں رہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس دن ایک روزہ رکھا۔ 3 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عاشورا کا خود بھی روزہ رکھتے اور دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے تاآنکہ رمضان کے روزے فرض کر دیئے گئے۔ 4

چنانچہ حدیث میں صراحت ہے کہ تمام مسلمان اس دن کا روزہ رکھتے تھے 5 یہودی و نصاریٰ بھی اس دن کا روزہ رکھتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن روزہ رکھنے کی وجہ دریافت کی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم تمہاری نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قرب رکھتے ہیں اور ان کی اتباع کے زیادہ حق دار ہیں، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس روزہ کی مزید تاکید فرمائی۔ 6 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اعلان کر دیا کہ اس دن کا روزہ رکھا جائے، حتیٰ کہ اگر کسی نے صبح سحری نہیں کھائی اور روزہ نہیں رکھا وہ بھی بقیہ دن روزے کی حالت میں پورا کرے۔ 7 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورا کے دن مدینہ طیبہ کی مضافاتی بستیوں میں بھی اعلان کرایا کہ جس نے اس دن روزہ رکھا ہے وہ اپنے روزے کو رات تک پورا کرے اور جس نے نہیں رکھا وہ شام تک کچھ نہ کھائے پیئے بلکہ بقیہ دن روزے کی حالت میں گزارے۔ 8 اس تاکید در تاکید کا یہ اثر ہوا کہ صحابیات مبشرات رضی اللہ عنہن اپنے چھوٹے بچوں کو بھی کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیتیں بلکہ جب وہ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر روتے تو انہیں روئی اور اون کے بنے ہوئے کھلونے دے دیتیں تاکہ وہ ان کھلونوں سے کھیلتے رہیں اور شام تک اپنے روزے کو پورا کریں جیسا کہ حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان کے بعد ہم خود بھی روزہ رکھتیں اور اپنے چھوٹے بچوں کو بھی روزہ رکھواتیں، ہم اپنے بچوں کو کھلونوں سمیت مسجد میں لے جاتیں وہ شام تک ان سے کھیلتے رہتے۔ 9 ہجرت کے دوسرے سال رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورا کے روزہ میں نرمی کر دی گئی البتہ اس کے استحباب کو باقی رکھا اور انسان کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عاشورا اللہ کے ایام میں سے ایک دن ہے جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے چھوڑ دے۔'' 10

---

1 فتح الباری، ص: ٢٤٦، ج ٤۔ 2 صحیح مسلم، الصیام: ٢٦٣٧۔ 3 صحیح مسلم، الصیام: ٢٦٣٧۔
4 صحیح مسلم، الصیام: ٢٦٤٠۔ 5 صحیح مسلم الصیام: ٢٦٣٧۔ 6 صحیح بخاری، الصوم: ٢٠٠٤۔
7 صحیح بخاری، الصوم: ٢٠٠٧۔ 8 صحیح مسلم، الصیام: ٢٦٦٩۔ 9 صحیح مسلم، الصیام: ٢٦٧٠۔
10 صحیح مسلم، الصیام: ٢٦٤٢۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح مروی ہے ❶ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں عاشورا کے دن روزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے، شوق دلواتے اور اس کی پابندی کراتے تھے، جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ ﷺ نے اس کے متعلق نرمی کردی، ہمیں نہ تو اس کے متعلق حکم دیتے اور نہ ہی منع کرتے نیز اس سلسلہ میں ہماری نگہداشت بھی نہیں کرتے تھے۔ ❷ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی اس سے ملتی جلتی روایات ملتی ہیں۔ ❸

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ عاشورا کا روزہ پہلے فرض تھا، رمضان کے بعد اس کی فرضیت ختم ہوچکی ہے اگر روزہ رکھنا ہے تو بہتر بصورت دیگر اسے ترک بھی کیا جاسکتا ہے۔ ❹

فتح مکہ سے پہلے پہلے آپ اہل کتاب کی موافقت کو پسند کرتے تھے لیکن فتح مکہ کے بعد مذہبی شعار میں ان کی ممانعت کا حکم ہوا تو آپ ﷺ نے بیشتر احکام میں ان کی ممانعت کا حکم دیا چنانچہ عاشورا کا روزہ بھی ان کا مذہبی شعار تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اس امر میں بھی اہل کتاب کی مخالفت کا حکم دیا اور امت کو بایں الفاظ تلقین کرتے ہوئے فرمایا: ''عاشورا کے دن کا روزہ ضرور رکھو لیکن اس میں یہود کی مخالفت کرو جس کی یہ صورت ہے کہ تم عاشورا کے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا بھی روزہ رکھو۔ ❺

اس روایت کی سند میں کچھ ضعف ہے لیکن دیگر متابعات وشواہد کے پیش نظر یہ ضعف نقصان دہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود اس بات کا اظہار فرمایا چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے محرم کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھا اور دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس دن کو یہود ونصاریٰ بھی عظیم خیال کرتے ہیں اور اس کا روزہ رکھتے ہیں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آیندہ سال اگر اللہ نے چاہا تو ہم نویں محرم کا روزہ رکھیں گے۔'' ❻ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''اگر میں آیندہ سال زندہ رہا تو نویں محرم کا روزہ رکھوں گا۔'' ❼ لیکن رسول اللہ ﷺ آیندہ ماہ محرم آنے سے پہلے ماہ ربیع الاول میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور نویں محرم کا روزہ رکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ❽

بہر حال رسول اللہ ﷺ نے عاشورا کا اس طرح روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی اور اس کی فضیلت کو بایں الفاظ بیان کیا کہ عاشورا کا روزہ رکھنے سے گزشتہ ایک سال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ ❾

افسوس ہے کہ آج کل بلاوجہ عاشورا کے روزہ کو ایک اختلاف اور نزاعی مسئلہ بنا دیا گیا ہے اور دسویں محرم کے روزے کا سرے سے انکار کیا جارہا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خواہش کے پیش نظر اب صرف نویں محرم کا روزہ رکھنا چاہیے، بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ اب عاشورا نویں تاریخ کو ہے، دسویں تاریخ کی قطعی طور پر کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان حضرات کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی درج ذیل روایت ہے: حضرت حکم بن اعرج کہتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ چاہ زمزم کی پاس اپنی چادر لپیٹ کر بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ مجھے عاشورہ

---

❶ صحیح بخاری، الصوم: ۲۰۰۱۔ ❷ صحیح مسلم، الصیام: ۲۶۵۲۔ ❸ صحیح بخاری، الصوم: ۲۰۰۳۔
❹ صحیح مسلم، الصیام: ۲۶۵۰۔ ❺ مسند امام احمد، ص: ۲۴۱، ج ۱۔ ❻ صحیح مسلم، الصیام: ۲۶۶۶۔
❼ صحیح مسلم، الصیام: ۲۶۶۷۔ ❽ صحیح مسلم، الصیام: ۲۶۶۶۔ ❾ صحیح مسلم، الصیام: ۲۷۴۶۔

کے روزہ کی متعلق بتایئے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا جب محرم کا چاند نظر آئے تو اس کے دن شمار کرتے رہو، جب نویں محرم ہو تو اس دن روزہ رکھو، سائل نے دریافت کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح اس دن کا روزہ رکھتے تھے۔ فرمایا: ہاں۔ [1] اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری خواہش سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دس محرم کی بجائے نو محرم کا روزہ رکھا جائے اور یہی عاشورا کا دن ہے جس کی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ تائید کے لیے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ عاشورا کا دن نو محرم کا دن ہے۔ [2]

یہ کل کائنات ہے جس کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ عاشورا کا روزہ نو محرم کو رکھنا چاہیے، دسویں محرم کا روزہ منسوخ ہے۔

قارئین کرام! ہماری عافیت اسی میں ہے کہ ہم قرآن وسنت کی نصوص کو اپنے اسلاف کی فہم کے مطابق انہیں عمل میں لائیں، اس کے مقابلہ میں کوئی انفرادی رائے قائم نہ کریں، چنانچہ نویں تاریخ کو روزہ رکھنے کے متعلق بیان کرنے والے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں، ان کا ذاتی فتویٰ یہ ہے کہ جو اس روایت کو بیان کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا ہے کہ نو اور دس محرم کا روزہ رکھو، اس لیے کہ یہود کی مخالفت کرو۔ [3] علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے سائل کی رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا کہ نویں محرم کا روزہ رکھو، جواب میں یوم عاشورہ کی تعیین نہیں کی کہ وہ دسویں تاریخ ہے کیونکہ اس کے متعلق سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ وابستہ تھا۔ [4] علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق بہت وضاحت سے لکھا ہے، فرماتے ہیں کہ اکثر احادیث میں نو اور دس کے روزے کا ذکر ہے، رہا صرف نو کا روزہ رکھنا تو روایات کو نہ سمجھنے کے باعث ایسا کہا جاتا ہے، نیز احادیث کے الفاظ اور ان کی تمام اسناد کی جانچ پڑتال نہ کرنے کی وجہ سے یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے حالانکہ یہ مؤقف لغت اور شریعت دونوں کے خلاف ہے۔ [5]

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میں آیندہ سال نویں محرم کا روزہ رکھوں گا، اس کا مقصد یہ تھا کہ میں دس محرم کے ساتھ نو محرم کا روزہ رکھوں گا تاکہ یہود کے ساتھ مشابہت باقی نہ رہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ یہود کی مخالفت کرو نو اور دس محرم کا روزہ رکھو، اس کے علاوہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورا کے متعلق فرمایا کہ اس کا روزہ رکھو، اس سے پہلے ایک دن یا اس کے بعد ایک دن کا روزہ بھی ساتھ رکھو، یہود کی مشابہت اختیار کرو، ہمارے مؤقف کی صریح دلیل ہے۔ [6] مولانا عبید اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے عاشورا محرم کا روزہ رکھنے کے متعلق تین درجات ترتیب دیے ہیں۔

❶ سب سے نچلا درجہ یہ ہے کہ صرف دس محرم کا روزہ رکھا جائے۔ ❷ اس سے اوپر دس اور گیارہ کا روزہ رکھنا ہے۔ ❸ سب سے اوپر کا درجہ نو اور دس محرم کا روزہ رکھنا ہے کیونکہ اکثر احادیث میں نو اور دس محرم کا روزہ رکھنے کا تذکرہ ہے۔ [7]

---

[1] صحیح مسلم، الصیام: ٢٦٦٤۔ [2] فتح الباری، ص: ٣١١، ج ٤۔ [3] بیھقی، ص: ٢٨٧، ج ٤۔
[4] نیل الاوطار، ص: ٢٣٨، ج ٤۔ [5] زاد المعاد، ص: ٧٢، ج ٢۔ [6] شرح معانی الآثار، ص: ٣٣٨، ج ١۔
[7] مرعاۃ المفاتیح: ٢٧٢، ج ٤۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نو محرم کے روزہ کی دو وجوہ لکھی ہیں۔

❶ احتیاط کے پیش نظر نویں کا روزہ بھی رکھ لیا جائے کیونکہ چاند دیکھنے میں غلطی لگ سکتی ہے، دس کو نو سمجھا جا سکتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ دس محرم کے ساتھ نو کا روزہ بھی رکھ لیا جائے۔

❷ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کے پیش نظر کیونکہ وہ صرف ایک دن کا روزہ رکھتے تھے، پہلے معنی کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خود اپنے عمل سے ہوتی ہے آپ دو دن کا متواتر روزہ رکھتے تھے۔ مبادا عاشورہ کا روزہ رہ جائے اور دوسرے معنی کی تائید امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے ہوتی ہے، اس میں ہے کہ نو اور دس کا روزہ رکھو اور یہود کی مشابہت سے احتراز کرو۔ ❶

ہمارے رجحان کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا عقیدہ یہ تھا کہ جو انسان عاشورا کا روزہ رکھنا چاہتا ہے وہ نویں محرم سے ابتداء کرے اور دس محرم کا اس کے ساتھ روزہ رکھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی موقوف اور مرفوع روایات اسی بات پر دلالت کرتی ہیں، اس قدر جلیل القدر ائمہ کی تصریحات کے بعد اس مسئلہ میں کوئی شک نہیں رہتا کہ نو محرم کو عاشورا قرار دینا کسی صورت میں صحیح نہیں ہے نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ذاتی فتویٰ، ان کے عمل اور مرفوع روایات میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں ہے ان حضرات پر اعتراض کر کے اپنے لیے ایک الگ راستہ اختیار کرنا غیر سبیل المومنین ہے جس کی قرآن اجازت نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق پر چلنے اور اسے بطور منہج اختیار کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

نذر کا روزہ رکھنے کا اُصول

سوال میری بہن نے نذر مانی تھی کہ اگر والدہ صحت یاب ہو گئی تو وہ ایک ہفتہ کے روزے رکھے گی، اللہ تعالیٰ نے میری والدہ کی صحت سے نوازا، لیکن میری بہن نے نذر کے روزے نہیں رکھے، اب وہ فوت ہو چکی ہے، کیا ہمیں اس کے روزے رکھنا ہوں گے، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمے نذر کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور اس کے ذمے نذر کے روزے تھے تو کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟ آپ نے فرمایا: ''اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو نے ادا کرنا تھا تا کہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا؟'' اس عورت نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے فرمایا: ''پھر تو اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھ۔'' ❷

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کی طرف سے نذر کے روزے اس کے ولی کو رکھنے چاہئیں لیکن اگر اصلی فرض روزے اس کے ذمے ہوں تو انہیں رکھنا ضروری نہیں، کیونکہ نذر ماننا اس کے ذمے نہ تھا بلکہ اس عورت نے خود ہی اپنے ذمہ ضروری قرار دے لیا تھا جو قرض کا درجہ حاصل کر چکی تھی اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قرض سے تشبیہ دی۔ فرض روزے شروع ہی سے اس کے

---

❶ تلخیص الحبیر، ص:٢١٤، ٢١٣، ج٢۔ ❷ بخاری، الصوم: ١٩٥٣۔

ذمہ تھے اس میں نیابت صحیح نہیں ہے، جس طرح کلمہ شہادت اور نماز وغیرہ میں نیابت صحیح نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی مؤقف کو اختیار کیا ہے۔ [1]

وصال کے روزے کی حقیقت

سوال وصال کے روزے کیا ہوتے ہیں، احادیث میں ان کی ممانعت کس وجہ سے ہے؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود یہ روزے رکھتے تھے۔

جواب وصال سے مراد یہ ہے کہ آدمی ارادی طور پر دو یا اس سے زیادہ دونوں تک اپنا روزہ افطار نہ کرے بلکہ مسلسل روزے رکھتا چلا جائے نہ رات کو کچھ کھائے اور نہ سحری کے وقت کچھ تناول کرے، شریعت میں ایسے روزے رکھنے کی ممانعت ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کے روزوں سے منع فرمایا ہے۔ [2] ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ عمل تو عیسائی کرتے ہیں۔'' [3]

البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود وصال کے روزے رکھا کرتے تھے لیکن یہ عمل آپ کے ساتھ خاص تھا، امت کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں میرے جیسا کون ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا، پلاتا رہتا ہے۔'' [4]

بہرحال شریعت میں وصال کے روزے رکھنے کی ممانعت ہے اور اسے نصاریٰ کا عمل بتایا گیا ہے۔

روزے دار کا قے کرنا

سوال ہمارے خطیب نے مسئلہ بیان کیا تھا کہ قے آنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کا حوالہ دیا تھا، اس سلسلہ میں صحیح موقف کیا ہے، کیا واقعی قے آنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا؟

جواب قے آنے کی دو صورتیں ہیں۔ ❶ ازخود قے آجائے۔ ❷ دانستہ قے کی جائے۔

پہلی حالت میں روزہ نہیں ٹوٹتا جبکہ دوسری حالت میں روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور اس کی قضا دینا پڑتی ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے روزے کی حالت میں خود بخود قے آجائے اس پر قضا نہیں ہے اور اگر کوئی جان بوجھ کر قے کرے تو وہ قضا دے گا۔'' [5]

اس مسئلہ کے متعلق علماء امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سوال میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مطلق طور پر قے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا لیکن یہ قول صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، اس قول کے درج ذیل الفاظ ہیں: ''تین چیزیں روزہ فاسد نہیں کرتیں: قے کرنا، سینگی لگوانا اور احتلام ہو جانا۔'' [6]

---

[1] مجموع الفتاویٰ۔ [2] بخاری، الصوم: ۱۹۶۲۔ [3] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۶۱۔
[4] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۶۵۔ [5] مسند امام احمد، ص: ۴۹۸، ج ۲۔ [6] جامع ترمذی، الصیام: ۷۱۹۔

لیکن اس کی سند میں عبد الرحمن بن زید بن اسلم نامی راوی ضعیف ہے۔ ❶

اس بنا پر یہ قول قابل حجت نہیں ہے، اس وضاحت کے بعد ہمارا رجحان یہ ہے کہ خطیب صاحب کا مؤقف مبنی بر حقیقت نہیں بلکہ صحیح روایات کے پیش نظر راجح مؤقف یہ ہے کہ ازخود قے آنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا جبکہ دانستہ قے کرنے سے روزہ خراب ہو جاتا ہے، اس کے بعد روزے دار کو اس کی قضا دینا ہوگی۔ (واللہ اعلم)

باجماعت نماز تراویح کی حقیقت

سوال ہمارے ہاں نماز تراویح باجماعت ادا کرنے کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف تین یا چار دن اس نماز تراویح کو باجماعت ادا کیا ہے، وہ بھی لوگ اتفاق سے جمع ہو گئے تو آپ نے انہیں باجماعت نماز تراویح پڑھائی، ایسی حالت میں اس نماز کے متعلق اس قدر اہتمام چہ معنی دارد؟

جواب محدثین عظام کا اس امر میں اختلاف ہے کہ نماز تراویح مسجد میں باجماعت ادا کرنا افضل ہے یا گھر میں اکیلے پڑھنا بہتر ہے، ہمارے رجحان کے مطابق نماز تراویح مسجد میں باجماعت ادا کرنا افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے یہی افضل ثابت ہے۔ اگرچہ بعد ازاں آپ نے ان کے فرض ہونے کے اندیشے سے انہیں باجماعت ادا کرنا ترک کر دیا تھا لیکن جب آپ کی وفات کے بعد یہ اندیشہ نہ رہا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا، اس کے بعد یہ عمل آج تک امت میں رائج ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں اس کی وضاحت ہے، آپ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن آدھی رات مسجد میں تشریف لے گئے اور وہاں نماز ادا کی، لوگوں نے بھی آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی، اگلے دن لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا تو لوگ پہلے سے زیادہ جمع ہو گئے اور انہوں نے رات کے وقت آپ کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ اگلی صبح اس امر کا لوگوں میں چرچا ہوا تو تیسری رات اہل مسجد کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی، ان تمام حاضرین نے آپ کے ساتھ نماز ادا کی۔ جب چوتھی رات ہوئی تو اس قدر لوگ جمع ہو گئے کہ مسجد کی وسعت تنگ پڑ گئی لیکن رسول اللہ ﷺ اس رات تشریف نہ لائے۔ جب صبح کی نماز کا وقت ہوا تو آپ نے نماز فجر پڑھائی، نماز سے فراغت کے بعد لوگوں سے متوجہ ہو کر فرمایا: ''آپ حضرات کا شوق وذوق مجھ سے مخفی نہیں تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ مبادا یہ نماز فرض ہو جائے پھر تم لوگ اس کی ادائیگی سے عاجز آ جاؤ۔'' ❷

ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ رمضان المبارک میں پیش آیا۔ ❸ بخاری کی روایت میں ہے کہ ''پھر رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی لیکن یہ معاملہ اسی طرح رہا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران بھی معاملہ اسی طرح رہا، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور حکومت میں اسی طرح چلتا رہا۔ ❹ اس کے بعد کیا ہوا اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں ہے، چنانچہ عبد الرحمن بن عبد القاری فرماتے ہیں: میں ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد میں گیا، وہاں دیکھا کہ سب لوگ منتشر و متفرق تھے، کوئی اکیلا نماز پڑھ رہا تھا اور کوئی کسی کے پیچھے کھڑا تھا، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ اگر میں تمام لوگوں کو

---

❶ میزان الاعتدال، ص: ٥٦٤، ج،٢۔ ❷ صحیح بخاری، الجمعة: ٩٢٤۔

❸ صحیح بخاری، التهجد: ١١٢٩۔ ❹ صحیح بخاری، صلوٰة التراویح: ٢٠٩۔

ایک قاری کے پیچھے جمع کردوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

چنانچہ انہوں نے اسی عزم وارادہ کے ساتھ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو ان کا امام مقرر کردیا پھر ایک رات میں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلا تو دیکھا کہ تمام لوگ اپنے امام کے پیچھے نماز تراویح پڑھ رہے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ نیا طریقہ بہت بہتر اور مناسب ہے اور رات کا وہ حصہ جس میں یہ لوگ سو جاتے ہیں اس حصے سے بہتر ہے جس میں یہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ کی مراد رات کے آخری حصے کی تھی کیونکہ لوگ یہ نماز رات کے شروع میں ہی پڑھ لیتے تھے۔ [1]

مذکورہ روایات سے معلوم ہوا کہ قیام رمضان یعنی صلوٰۃ تراویح با جماعت مشروع ہے اور رسول اللہ ﷺ نے محض اس اندیشے کی وجہ سے چوتھی رات جماعت سے گریز کیا تھا کہ یہ نماز مسلمانوں پر فرض نہ کردی جائے، شاید بعد میں یہ لوگ بار خاطر خیال کر کے ترک کردیں، پھر جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو جس چیز سے رسول اللہ ﷺ خائف تھے، اس سے امن ہوگیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سنت کو زندہ کرتے ہوئے نماز تراویح با جماعت ادا کرنے کا اہتمام فرمایا اور اسے با جماعت ادا کرنے کا حکم دیا، اس بنا پر سوال میں جو مفروضہ قائم کیا گیا ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

عالم اسلام کا ایک ہی وقت میں نماز پڑھنا

سوال کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وحدت امت کے پیش نظر عالم اسلام میں عید ایک ہی دن ہونی چاہیے، اس کے لیے وہ تمام عالم اسلام کے مطالع کو مکہ مکرمہ کے مطلع کے ساتھ مربوط کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ مرکز اسلام ہے، اس کے متعلق وضاحت کریں۔

جواب ماہرین فلکیات کے مطابق چاند کے مطالع مختلف ہیں، اس اختلاف مطالع کی وجہ سے وحدت امت کے بہانے عالم اسلام میں ایک ہی دن عید کرنا عقل و نقل کے خلاف ہے بلکہ چاند دیکھنے کے متعلق ہر علاقے کا اپنا لحاظ کیا جائے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''چاند دیکھ کر ہی روزہ رکھنا ترک کرو۔'' [2]

اس حدیث کے پیش نظر اگر اہل مکہ نے چاند دیکھ لیا تو مشرق میں رہنے والوں کو روزہ رکھنے یا عید الفطر کرنے کا کیونکر پابند کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ انہوں نے ابھی چاند نہیں دیکھا کیونکہ اہل مشرق کے افق پر ابھی چاند طلوع نہیں ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے روزے کو چاند کو دیکھ لینے کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہر علاقہ کی اپنی رؤیت کا اعتبار کیا جائے کیونکہ زمین کی مشرقی جہت میں فجر مغربی جہت سے پہلے طلوع ہوتی ہے، اس بنا پر جب مشرقی جہت میں فجر طلوع ہوجائے تو کیا مغربی جہت میں رہنے والوں کو پابند کیا جاسکتا ہے کہ کھانے پینے سے رُک جائیں جب کہ وہاں ابھی رات ہوگی اور فجر طلوع نہیں ہوگی۔ اس طرح جب مشرقی جہت میں سورج غروب ہوجائے تو کیا اہل مغرب کے لیے روزہ افطار کردینا ضروری ہے جب کہ وہاں سورج غروب نہیں ہوا، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، اس طرح چاند بھی سورج کی طرح ہے۔ بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق روزہ رکھنے اور عید

---

[1] صحیح بخاری، التراویح: ۲۰۱۰۔

[2] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۰۹۔

منانے کے لیے ہر علاقہ کی رؤیت کو مدار قرار دیا جائے۔ عقل ونقل کا یہی تقاضا ہے۔ (واللہ اعلم)

دور حاضر میں مسافر کا روزہ رکھنا

سوال عصر حاضر کے جدید ذرائع آمد و رفت نے مسافر کے لیے بہت سی سہولیات مہیا کر دی ہیں، جن کی بنا پر روزہ رکھنا دشوار نہیں ہے، کیا ایسے حالات میں بھی روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں؟

جواب سفر ہر صورت میں اپنا حق وصول کرتا ہے خواہ کتنی بھی سہولیات میسر ہوں، بہرحال مسافر کو روزہ رکھنے اور چھوڑ دینے کے متعلق اختیار ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ [1]

''اور جو شخص بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں ان کا شمار کر لے۔''

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب سفر میں ہوتے تو کچھ روزہ رکھتے اور اکثر چھوڑ دیتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی دوسرے پر عیب نہیں لگاتا تھا، بہرحال اس کے متعلق قاعدہ یہ ہے کہ اگر دوران سفر روزہ رکھنے میں مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے کیونکہ اس میں تین فوائد ہیں۔

1. اس میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء ہے جیسا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ سخت گرمی میں ایک مہم پر گئے، ہم میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی علاوہ اور کوئی روزہ دار نہیں تھا۔
2. اس میں سہولت ہے کیونکہ انسان جب دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر روزہ رکھے تو اس میں طبعی طور پر آسانی ہوتی ہے، اکیلے انسان کو روزہ رکھنا قدرے دشوار اور گراں ہوتا ہے۔
3. دوران سفر روزہ رکھنے سے انسان اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتا ہے کیونکہ زندگی کے ایام مستعار کا پتہ نہیں کہ کب آخرت کے لیے بلاوا آ جائے۔

اگر روزہ رکھنے میں دشواری ہو تو روزہ نہ رکھنا افضل ہے کیونکہ ایسی حالت میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ دوران سفر ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے گرد لوگوں کا ہجوم ہے اور اس پر کپڑے کا سایہ کیا گیا ہے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یہ ایک روزہ دار ہے جو نڈھال ہو چکا ہے، رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: ''سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔'' [2]

نیز ایک دفعہ دوران سفر لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! روزہ رکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے تو آپ ﷺ نے روزہ افطار کر دیا اور لوگوں نے بھی چھوڑ دیا، آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ کچھ لوگوں نے ابھی تک روزہ رکھا ہوا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ لوگ

---

[1] ۲/البقرۃ: ۱۸۵۔ [2] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹٤٦۔

نافرمان ہیں، یہ لوگ نافرمان ہیں۔'' ❶

بہر حال ہمارا رجحان یہ ہے کہ دوران سفر روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے، اگر روزہ رکھنے میں گرانی اور دشواری نہ ہو جیسا کہ آج کل سفر کرنے میں مسافر کو سہولیات میسر ہوتی ہیں تو ایسے حالات میں روزہ رکھ لینا بہتر ہے اور اگر روزہ رکھنے میں دشواری ہو تو روزہ ترک کر دینا بہتر ہے۔ (واللہ اعلم)

روزے دار کا A.C چلا کر سونا اور بار بار غسل کرنا

سوال کچھ لوگ روزے کی حالت میں گرمی کی شدت کی وجہ سے بار بار غسل کرتے ہیں یا A.C چلا کر سوئے رہتے ہیں، ایسی حالت میں ان کا روزہ تو متاثر نہیں ہوتا؟

جواب اگر روزہ دار بھوک اور پیاس کی شدت کی بنا پر بار بار غسل کرتا ہے یا ٹھنڈے کمرہ میں سو جاتا ہے تو اس سے روزے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، روزہ دار کے لیے ٹھنڈک حاصل کرنا جائز ہے خواہ کسی بھی طریقہ سے ہو، رسول اللہ ﷺ روزہ کی حالت میں گرمی یا پیاس کی وجہ سے اپنے سر مبارک پر پانی ڈال لیا کرتے تھے، چنانچہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ ﷺ گرمی کی وجہ سے اپنے سر پر پانی بہا رہے تھے جب کہ آپ ﷺ روزے کی حالت میں تھے۔ ❷

اس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ وہ روزے کی حالت میں شدت حرارت یا پیاس کم کرنے کے لیے اپنے کپڑے کو گیلا کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح کی رطوبت سے روزہ متاثر نہیں ہوتا کیونکہ یہ پانی نہیں جو معدے تک پہنچ جائے بلکہ امید ہے کہ پیاس اور گرمی کی شدت روزے میں اجر و ثواب کے زیادہ ہونے کا باعث ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: ''اس (حج) کا ثواب تمہارے خرچ یا تکلیف برداشت کرنے کے بقدر ہوگا۔'' ❸

بہر حال اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی میں انسان کو جس قدر تھکاوٹ ہو اسی قدر زیادہ اجر و ثواب ملے گا۔ اس کے ساتھ وہ ایسا کام بھی کر سکتا ہے جس سے روزے کی شدت میں کمی آ جائے مثلاً وہ پانی سے ٹھنڈک حاصل کر سکتا ہے اور نہا سکتا ہے، اس سلسلہ میں دو چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ جو حسب ذیل ہیں:

سارا دن سو کر نہ گزارے بلکہ اللہ کا ذکر اور تلاوت قرآن میں خود کو مصروف رکھے کیونکہ روزے سے تعلق باللہ گہرا ہوتا ہے، اس تعلق کو مزید مستحکم کرنے کی کوشش کرے۔

نماز پنجگانہ کی پابندی کرے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ٹھنڈے کمرے میں سو کر نمازوں سے غافل ہو جائے کیونکہ اگر اس قسم کی سہولیات سے نماز باجماعت رہ گئی تو ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ (واللہ اعلم)

---

❶ صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۱٤۔ ❷ ابو داود، الصیام: ۲۳٦٥۔

❸ بخاری، العمرۃ، باب نمبر ۸، حدیث نمبر: ۱۷۸۷۔

روزے دار کا بھول کر کھانا پینا

سوال کیا بھول کر کھانے پینے سے روزہ خراب ہو جاتا ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں؟

جواب طلوع فجر سے غروب آفتاب تک دانستہ کھانے پینے اور تعلقات زن وشوئی سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے جب کہ بھول کر کھانے پینے سے روزہ خراب نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو روزہ دار بھول کر کچھ کھا پی لے تو اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔'' [1] ایک روایت میں ہے کہ یہ ایسا رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے پہنچایا ہے۔ [2] ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کوئی بھول کر رمضان میں روزہ کھول لے تو اس پر کسی قسم کی قضا یا کفارہ نہیں ہے۔'' [3]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر بھول کر کوئی ایسا عمل کر لیا جائے جو روزہ کو باطل کر دینے والا ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور نہ ہی قضا یا کفارہ واجب ہوتا ہے، البتہ دانستہ ایسا کام کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

دیر سے روزہ افطار کرنا

سوال کچھ لوگ احتیاط کے طور پر سورج غروب ہونے کے بعد چند منٹ تاخیر سے روزہ افطار کرتے ہیں اس قسم کی احتیاط کا شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب سورج غروب ہونے کے بعد روزہ جلدی افطار کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے ایسی حالت میں احتیاط کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ جب تک افطار کرنے میں جلدی کریں گے ہمیشہ خیر و عافیت سے رہیں گے۔'' [4]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں یہ عمل ایک دوسرے انداز سے بیان ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''لوگ روزہ افطار کرنے میں جب تک جلدی کرتے رہیں گے دین ہمیشہ غالب رہے گا کیونکہ یہودی اور عیسائی روزہ تاخیر سے افطار کرتے ہیں۔'' [5]

ان احادیث کے پیش نظر سورج غروب ہونے کے بعد روزہ جلدی افطار کرنا چاہیے، مزید احتیاط کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

بحالتِ روزہ آنکھ میں دوائی ڈالنا

سوال روزہ کی حالت میں آنکھ میں دوائی ڈالنا یا سرمہ لگانا کیا حکم رکھتا ہے؟ اس سلسلہ میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ روزہ دار کو سرمہ نہیں لگانا چاہیے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

---

[1] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۳۳۔ [2] ترمذی، الصوم: ۷۱۷۔ [3] مستدرك حاكم، ص: ۴۳۰، ج ۱۔
[4] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۵۷۔ [5] ابو داود، الصوم: ۲۳۵۳۔

جواب روزے کی حالت میں آنکھ میں دوائی ڈالی جاسکتی ہے اور سرمہ بھی لگایا جاسکتا ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بحالت روزہ اپنی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ ❶

اس حدیث سے واضح طور پر دوران روزہ سرمہ لگانے کا جواز نکلتا ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، اس کے باوجود کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سرمہ لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اس کی ممانعت کے متعلق ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روزے دار کو سرمہ لگانے سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔ ❷ لیکن اس حدیث کے متعلق امام ابوداؤد نے وضاحت کی ہے کہ امام یحییٰ بن معین نے مجھ سے کہا: ''یہ حدیث ضعیف ہے۔'' ❸

بہرحال روزہ دار کو آنکھ میں دوائی ڈالنے اور سرمہ لگانے کی اجازت ہے، اس کے متعلق کوئی ممانعت احادیث میں نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

بحالت روزہ ناک میں دوا ڈالنا

سوال میری ناک میں تکلیف ہے، اگر میں ناک میں دوائی نہ ڈالوں تو تکلیف زیادہ ہوجاتی ہے، کیا روزہ رکھنے کے بعد ناک میں دوائی ڈالنا جائز ہے؟

جواب روزہ دار کو ناک میں دوائی ڈالنے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ کروالا یہ کہ تم روزہ دار ہو۔'' ❹ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزہ دار کو ناک میں دوائی نہیں ڈالنی چاہیے، اگر کسی کو تکلیف ہے اور ناک میں دوائی ڈالنا ضروری ہے تو وہ کسی دوسرے کو روزے رکھوا دے اور اگر بیماری سے افاقہ کی امید ہو تو روزے رکھوانے کے بجائے رمضان کے بعد روزے خود رکھ لے۔ (واللہ اعلم)

ترک روزہ کی وجوہات

سوال وہ کون کون سے عذر ہیں جن کی بنا پر روزہ چھوڑا جاسکتا ہے اور کیا اگر دن کے کسی حصہ میں عذر ختم ہوجائے تو باقی دن میں کھانے پینے سے پرہیز کرنا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں وضاحت کریں۔ قرآن وحدیث کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب قرآن کریم نے روزہ ترک کرنے کے دو عذر بیان کیے ہیں، ایک بیماری اور دوسرا سفر، ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ﴾ ❺ ''پھر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرے۔'' روزہ چھوڑ دینے کی رعایت حیض یا نفاس والی عورت کے لیے بھی ہے اور دودھ پلانے والی عورت بھی اس رخصت سے فائدہ اٹھاسکتی ہے بشرطیکہ روزہ رکھنے کی صورت میں اسے اپنے یا اپنے بچے کے متعلق کوئی اندیشہ لاحق ہو، حاملہ عورت کے لیے بھی یہی حکم ہے، اس لیے یہ عذر بھی روزہ ترک کردینے کا باعث ہے کہ کوئی انسان کسی معصوم کو تباہی سے بچانے کے لیے

---

❶ ابن ماجه، الصيام: ١٦٧٨۔ ❷ بيهقي، ص: ٢٦٢، ج٤۔ ❸ ابوداود، الصوم: ٢٣٧٧۔
❹ ترمذي، الصيام: ٧٨٨۔ ❺ ٢/البقرة: ١٨٤۔

روزہ چھوڑنے پر مجبور ہو مثلاً کوئی آدمی ایسی عمارت میں پھنسا ہوا ہے جسے آگ لگ چکی ہے یا وہ دیکھے کہ کوئی شخص دریا میں ڈوب رہا ہے اور وہ اسے بچانے کے لیے روزہ ترک کر دے تو اس کے لیے جائز ہے کہ دوسرے کی جان بچانے کے لیے روزہ چھوڑ دے نیز جہاد فی سبیل اللہ میں طاقت حاصل کرنے کے لیے روزہ ترک کر دینا بھی جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا:

''تم اپنے دشمن کے قریب پہنچ چکے ہو اور ایسی حالت میں روزہ نہ رکھنا تمہارے لیے موجب طاقت وقوت ہے۔'' [1]

ایسی حالت میں اگر کوئی روزہ ترک کر دیتا ہے تو عذر ختم ہونے پر دن کے بقیہ حصہ میں کھانے پینے سے پرہیز کرنا ضروری نہیں کیونکہ روزہ چھوڑنے کے جائز سبب کی وجہ سے اس دن کی حرمت زائل ہو چکی ہے، اس بنا پر ہمارا رجحان ہے کہ اگر حائضہ عورت دن کے وقت پاک ہو جائے تو اس کے لیے بھی باقی دن کھانا پینا جائز ہے، اس سے رکنا جائز نہیں، اگر اس کے برعکس کسی کو دن کے وقت ماہ رمضان کے آغاز کا علم ہو جائے تو اسے باقی دن میں کھانا پینا ترک کر دینا ہوگا کیونکہ جب دن میں دلیل کے ساتھ رمضان کا آغاز ثابت ہو گیا تو باقی دن میں کھانے پینے سے پرہیز کرنا ضروری ہے، قبل ازیں وہ جہالت کی وجہ سے معذور تھا اور اب اس کا عذر ختم ہو چکا ہے، لیکن قبل ازیں جن لوگوں کا بیان تھا ان کے لیے علم کے باوجود روزہ چھوڑنا جائز ہے، لہٰذا دونوں صورتوں میں فرق واضح ہے، بہرحال جہالت کے عذر کے علاوہ کوئی دوسرا عذر روزہ چھوڑنے کا باعث ہے تو عذر ختم ہونے کے بعد اسے باقی دن کے حصہ میں کھانا پینا جائز ہے۔ البتہ جہالت کے عذر کی بنا پر دن کے باقی حصہ میں کھانے پینے کی اجازت نہیں ہے اس لیے جہالت کا عذر اب ختم ہو چکا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

فوت شدہ آدمی کے متروکہ روزے

سوال میرا بھائی سابقہ رمضان میں فوت ہوا، مرض کے دوران اس کے کچھ روزے رہ گئے تھے، وہ روزے ہمیں رکھنے ہوں گے یا ان کی طرف سے فدیہ دے دیا جائے؟ اس کے متعلق تفصیل درکار ہے، وضاحت کر دیں تاکہ ہماری پریشانی دور ہو جائے۔

جواب فوت شدہ روزوں کو رکھنے کا اگر موقع ملے تو انہیں رکھنا چاہیے، لیکن اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمے رمضان کے روزے ہوں تو اس کے سرپرست یا ولی کو وہ روزے رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
کوئی شخص دوسرے کی طرف سے روزہ نہ رکھے۔ [2]

البتہ میت نے اگر روزے رکھنے کی نذر مانی ہو اور وہ اپنی نذر کے روزے نہ رکھ سکا ہو تو اس کے قریبی رشتہ دار کو وہ روزے رکھنے ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور اس کے ذمے کچھ نذر کے روزے تھے تو کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! ضرور رکھو۔'' [3]

---

[1] صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۲۰۔ [2] مؤطا امام مالك، کتاب الصیام۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الصیام۔

میت کی طرف سے روزہ رکھنے کے متعلق جو احادیث آتی ہیں، انہیں بھی اسی امر پر محمول کیا جائے گا، صورت مسئولہ میں کسی سرپرست کو میت کی طرف سے روزے رکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کی طرف سے فدیہ دینا ضروری ہے، اگر وہ تندرست ہو جاتا اور وہ روزے نہ رکھتا تو اور معاملہ تھا۔ (واللہ اعلم)

روزہ کی نیت کرنا

سوال روزہ کی نیت کے متعلق شرعی حکم کیا ہے، کیا ہر روزہ کی الگ نیت کرنا چاہیے یا پورے ماہ کے روزوں کی ایک ہی مرتبہ نیت کر لی جائے، نیز روزے کے لیے زبان سے نیت کرنا ضروری ہے جیسا کہ ہمارے ہاں مطبوعہ کتب میں الفاظ ملتے ہیں؟

جواب روزے کی نیت کرنا ضروری ہے، کیونکہ یہ ایک عمل ہے اور عمل کے لیے نیت کرنا فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔'' [1]

واضح رہے کہ فرض روزے کی نیت فجر سے پہلے ہونی چاہیے، اس کے بعد نیت کا اعتبار نہیں ہوگا، جیسا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے فجر یعنی صبح صادق سے پہلے روزہ کی نیت نہ کی، اس کا روزہ نہیں۔'' [2]

بہرحال فرض روزے کی نیت صبح صادق سے پہلے کرنی چاہیے جب کہ نفلی روزے کی نیت زوال سے پہلے بھی کی جا سکتی ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''کیا تمہارے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز ہے؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے پاس تو کچھ نہیں، یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب میں روزہ سے ہوں۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفلی روزہ کی نیت موقع پر بھی کی جا سکتی ہے، واضح رہے کہ ہر روزے کے لیے الگ نیت کرنا ضروری ہے، پورے مہینہ کے لیے ایک مرتبہ نیت کافی نہیں ہوگی، کیونکہ روزہ ایک مستقل عبادت ہے اور ہر مرتبہ آغاز عبادت سے اس کی دوبارہ نیت کرنا اس لیے ضروری ہے۔ کہ کوئی بھی عبادت نیت کے بغیر معتبر نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ نیت دل کے عزم اور ارادے کا نام ہے، اس کے لیے زبان سے ادائیگی ضروری نہیں ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر روزہ کی نیت کے لیے یہ الفاظ بتائے جاتے ہیں۔ **وبصوم غدٍ نویت من شھرِ رمضان** یہ الفاظ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہیں، لہٰذا اس قسم کے الفاظ کی ادائیگی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نیت روزہ کے مذکورہ الفاظ عربی لغت سے نابلد انسان کے خود ساختہ ہیں کیونکہ نیت آج کے روزہ کی ہے جب کہ مذکورہ الفاظ کل کے روزہ کے لیے ہیں۔ (واللہ اعلم)

شک اور وصال کے روزے کی حقیقت

سوال حدیث میں شک اور وصال کا روزہ رکھنے کی ممانعت ہے، ان سے کون سا روزہ مراد ہے کیا احادیث میں اس کی

---

[1] صحیح بخاری، بدء الوحی: ۱۔ [2] ابو داود، الصوم: ۲۴۵۴۔

[3] صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۵۴۔

وضاحت موجود ہے؟

جواب شک کے دن روزہ سے مراد شعبان کی تیسویں کا روزہ رکھنا ہے، جب شعبان کی انتیس تاریخ کو مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آ سکے اور شک پڑ جائے کہ آیا رمضان ہے یا نہیں؟ اس شک کو بنیاد بنا کر اگلے دن تیسویں شعبان کا روزہ رکھنا شک کے دن کا روزہ رکھنا ہے۔ اس کی حدیث میں سخت ممانعت ہے۔ چنانچہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ جس نے مشکوک دن کا روزہ رکھا اس نے ابو القاسم حضرت محمد ﷺ کی نافرمانی کی ہے۔ [1]

اس بنا پر اگر انتیس شعبان کو مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے تیس دن پورے کر لیے جائیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی عید الفطر کرو، اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند چھپ جائے تو شعبان کے تیس دن پورے کر لو۔ [2]

اسی طرح حدیث میں وصال کے روزے سے ممانعت ہے چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وصال سے منع فرمایا ہے۔ [3] ایک دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ نے اس ممانعت کی وجہ بایں الفاظ بیان فرمائی ہے: ''یہ عمل تو عیسائی کرتے ہیں۔'' [4]

وصال یہ ہے کہ آدمی ارادی طور پر دو یا اس سے زیادہ دن تک روزہ افطار نہ کرے، مسلسل روزہ رکھے نہ رات کو کچھ کھائے اور نہ سحری کرے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ خود وصال کیا کرتے تھے اور یہ عمل آپ ﷺ کے لیے خصوصیت کا حامل ہے جیسا کہ خود آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی ہے: ''تم میں میرے جیسا کون ہے؟ میں تو اس حالت میں رات گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔'' [5]

بہر حال احادیث میں شک کے دن روزہ رکھنے اور وصال کرنے کی سخت ممانعت ہے، ایک مسلمان اطاعت گزار کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

روزے کو باطل کرنے والے امور

سوال کیا روزہ رکھنے کے بعد کسی کی غیبت یا دیگر حرام گفتگو سے روزہ باطل ہو جاتا ہے، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب قرآن کریم نے روزے کا مقصد حصول تقویٰ قرار دیا ہے اور تقویٰ کا معنی اللہ کی طرف سے حرام کردہ امور کو ترک کرنا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص روزہ کی حالت میں جھوٹی بات اور اس پر عمل کو ترک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے روزے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا ترک کرے۔'' [6]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزہ دار کو حرام اقوال واعمال سے اجتناب کرنا چاہیے، ان کے متعلق بہت سخت وعید ہے، اسے

---

[1] مسند امام احمد، ص: ٤١٥، ج٢۔ [2] صحیح بخاری، الصوم: ١٩٠٩۔ [3] صحیح بخاری، الصوم: ١٩٦٢۔
[4] صحیح بخاری، الصوم: ١٩٦١۔ [5] بخاری، الصوم: ١٩٦٥۔ [6] صحیح بخاری، الصوم: ١٩٠٣۔

چاہیے کہ روزے کی حالت میں دوسرے لوگوں کی غیبت نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، چغلی نہ کرے اور دیگر حرام امور سے اجتناب کرے۔ اگر روزہ دار ایک ماہ اس امر کی مشق کرے کہ ان احکام کو بجالائے جن کے بجالانے کا حکم دیا گیا ہے اور ان امور کو ترک کر دے جن سے منع کیا گیا ہے تو امید ہے کہ سارا سال امن وسلامتی سے گزارے گا لیکن افسوس ہے کہ اکثر روزے دار روزوں اور اس کے علاوہ دوسرے دنوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ وہ اپنی عادت کے مطابق جھوٹ، دھوکے، فراڈ اور حرام باتوں اور حرام کاموں کا شغل جاری رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کاموں سے روزے کا وقار اور احترام مجروح ہو جاتا ہے لیکن ان کے ارتکاب سے روزہ باطل نہیں ہوتا البتہ اجر وثواب میں بہت حد تک کمی آ جاتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو اس کا ثواب بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنی محنت کو ثمر آور بنانے کی کوشش کرے اور ایسے کاموں سے اجتناب کرے جن سے اس کے اجر میں کمی یا ثواب کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ (واللہ اعلم)

مسجد کے بجائے مقام افطار پر جماعت کروانا

سوال اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی افطار پارٹی کا اہتمام کرتا ہے تو مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کی بجائے مقام افطار پر ہی جماعت کا اہتمام کر دیا جاتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق وضاحت کریں۔

جواب روزہ داروں کی افطاری کا اہتمام بہت بڑی فضیلت کا باعث ہے، حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی روزے دار کا روزہ افطار کرایا، اسے بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اجر روزے دار کے لیے ہوگا اور روزے دار کے اجر سے کوئی چیز کم نہ ہوگی۔'' [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے داروں کی افطاری کا اہتمام کرنا بہت بڑی فضیلت ہے لیکن اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے دو چیزوں کا اہتمام کرنا انتہائی ضروری ہے۔

☆ افطاری سے مقصود رضائے الٰہی ہو، اسے نمائش اور ریاکاری کا ذریعہ نہ بنایا جائے اور نہ ہی اس افطاری کو کسی دوسرے ''کام'' کے لیے استعمال کرنا چاہیے جیسا کہ عام طور پر آج کل کیا جاتا ہے۔

☆ مسجد میں نماز باجماعت کا اہتمام ہونا چاہیے، افطاری کے بہانے مقام افطار پر نماز باجماعت کا اہتمام کرنا مسجد کی نماز کو نیچا دکھانا ہے، اس سلسلہ میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

1. افطاری کا اہتمام ہی مسجد میں کیا جائے تاکہ مسجد میں نماز باجماعت ادا ہو سکے۔
2. ہلکی پھلکی افطاری کر کے مسجد میں نماز باجماعت ادا کی جائے پھر نماز سے فراغت کے بعد کھانا وغیرہ تناول کیا جائے۔

بہرحال افطاری کے بہانے مسجد میں نماز باجماعت ترک کرنا مستحسن امر نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

بذریعہ جہاز چاند دیکھنا

سوال ہمارے ہاں برطانیہ میں ایک ہی دن عید کرنے کے لیے یہ فارمولہ طے ہوا ہے کہ پندرہ آدمی جہاز پر بیس ہزار

---

[1] ترمذی، الصوم: ۸۰۷۔

فٹ کی بلندی پر جا کر اگر چاند دیکھ لیں تو نماز عید ایک دن ادا کی جا سکتی ہے، قرآن وحدیث کے مطابق کیا ایسا کرنا درست ہے؟

جواب ہمارے رجحان کے مطابق یہ فارمولہ محض تکلف ہے کیونکہ سحری وافطاری اور عید کا اہتمام زمین کے لحاظ سے ہونا چاہیے، بیس ہزار فٹ کی بلندی پر جا کر چاند دیکھنا اور پھر اسے عید الفطر کے لیے وجہ جواز قرار دینا صحیح نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے افطاری کے متعلق فرمایا ہے: ''جب تم دیکھو کہ رات ادھر سے آ گئی ہے تو روزہ دار اپنا روزہ افطار کرے۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ کا مذکورہ ارشاد زمین کے اعتبار سے ہے، بصورت دیگر اگر جہاز پر بیٹھ کر انسان بیس ہزار فٹ کی بلندی پر جائے تو وہاں اسے سورج نظر آ جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے روزہ افطار نہیں کرنا چاہیے، حالانکہ ایسا کرنا عقل ونقل کے خلاف ہے، اس طرح چاند مطلع پر موجود رہتا ہے لیکن زمین کے اعتبار سے اس کا طلوع غروب ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اتنی بلندی پر جا کر چاند دریافت کرنا شریعت کے منشا کے خلاف ہے، اس بنا پر مذکورہ فارمولا صحیح نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

ایام کی حالت کے روزے مسلسل یا متفرق رکھیں

سوال ایام کی حالت میں جو روزے رہ جائیں، انہیں رمضان کے بعد کس حد تک مؤخر کیا جا سکتا ہے؟ کیا انہیں مسلسل رکھنا ہوتا ہے یا متفرق طور پر بھی رکھے جا سکتے ہیں؟ قرآن وحدیث میں ان کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب ایام کے دوران جو روزے رہ جائیں ان کی قضا ضروری ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: ہمیں روزوں کی قضاء کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ [2]

اگر روزے کے دوران حیض شروع ہو جائے تو اس سے بھی روزہ ختم ہو جاتا ہے، جس کی قضاء بعد میں دینا ہوگی، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کیا ایسا نہیں ہے کہ جب عورت حائضہ ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے۔'' [3]

قضاء شدہ روزوں کے متعلق بہتر ہے کہ انہیں آئندہ رمضان سے پہلے پہلے پورا کر لیا جائے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میرے ذمہ رمضان کے روزے ہوتے تھے تو میں ماہ شعبان کے علاوہ ان کی قضاء کے متعلق طاقت نہ رکھتی تھی۔ [4]

راوی حدیث نے اس کی وجہ بایں الفاظ بیان کی ہے:

میں رسول اللہ ﷺ سے مصروفیت کی وجہ سے ایسا نہ کر پاتی تھی۔ [5]

ہمارے رجحان کے مطابق حق بات یہ ہے کہ اگر استطاعت ہو تو جلدی قضا دینا ضروری ہے کیونکہ زندگی کے ایام مستعار ہیں، ان کے ختم ہونے کا علم نہیں، اس لیے اس قسم کا قرض چکانے میں جلدی کرنی چاہیے، نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَسَارِعُوٓا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ﴾ [6]

''اپنے رب کی مغفرت کی طرف جلدی کرو۔''

قضا شدہ روزوں کو مسلسل رکھنا ضروری نہیں بلکہ انہیں متفرق طور پر بھی رکھا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے

---

[1] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹٤۱۔ [2] صحیح مسلم، الحیض: ۳۳۵۔ [3] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۵۱۔
[4] مسند امام احمد، ص ۱۲٤، ج:٦۔ [5] صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۵۰۔ [6] ۳/آل عمران: ۱۳۳۔

مروی ہے: رمضان میں قضاء شدہ روزوں کو الگ الگ رکھ لیا جائے تو چنداں حرج نہیں ہے۔ ❶ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اس قسم کا فتویٰ مروی ہے۔ ❷ مسلسل رکھنے کے متعلق جو روایت پیش کی جاتی ہے وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

دوران اذان روزہ رکھنا

سوال میں جب صبح بیدار ہوا تو اذان ہو رہی تھی، میں نے جلدی جلدی کھانا کھا کر روزہ رکھ لیا اور بیوی نے تو اذان کے بعد پانی پی کر روزہ رکھا، ایسی حالت میں ہمیں کیا حکم ہے کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب قرآن کریم نے روزے دار کے لیے کھانے پینے کی حد بایں الفاظ بیان کی ہے:

﴿وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ ❸

’’تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے نمایاں ہو جائے پھر رات تک اپنے روزے کو پورا کرو۔‘‘

اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد کھانا پینا روزے کو باطل کر دیتا ہے، ہاں اگر کھانے کے دوران اذان شروع ہو جائے تو اپنا کھانا وغیرہ پورا کر لینے میں چنداں حرج نہیں ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جب تم میں سے کوئی اذان سنے اور کھانے کا برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو اسے اپنی حاجت کو پورا کر لینا چاہیے۔ ❹

یہ بھی اس صورت میں ہے جب مؤذن نے صحیح وقت پر اذان دی ہو، اگر مؤذن نے دیر سے اذان دی ہے تو اس رخصت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے، لیکن اذان مکمل ہونے کے بعد جلدی جلدی کھانا پینا یا صرف پانی پی کر روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، ایسے انسان کو چاہیے کہ وہ اگر ہمت رکھتا ہے تو کھائے پیئے بغیر روزہ رکھ لے کیونکہ روزہ کے لیے سحری مستحب عمل ہے اگر کبھی سحری کے بغیر روزہ رکھ لیا جائے تو اس سے روزہ میں کوئی نقص نہیں پڑتا جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

’’سحری بابرکت کھانا ہے لیکن واجب نہیں۔‘‘

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود یہ ہے کہ اگرچہ سحری کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر مروی ہے لیکن یہ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کرنے والوں کو تنبیہ تو کی ہے لیکن ان کے روزے کو باطل قرار نہیں دیا، بہرحال اذان کے بعد کچھ کھا پی کر روزہ رکھنا صحیح نہیں ہے بلکہ اذان ہوتے ہوئے بھی کھانے پینے کی ابتداء کرنا محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ بخاری، معلقا۔ ❷ دارقطنی، ص: ۱۹۳، ج: ۲۔ ❸ ۲/البقرۃ: ۱۸۷۔

❹ مسند احمد، ص: ۵۱۰، ج ۲۔

خرید و فروخت

خرید و فروخت

مشترکہ کاروبار کرنا

سوال ایک پارٹی کو ہم نے کچھ رقم کاروبار کے لیے دی ہے وہ اس سے زرعی ادویات اور کھاد وغیرہ کا نقد اور ادھار پر کاروبار کرتے ہیں، اس پارٹی نے بینک سے سودی قرض بھی لے رکھا ہے، تاہم وہ ہماری رقم سے جو نفع کماتے ہیں اس سے نصف ہمیں دیتے ہیں، کیا یہ نفع ہمارے لیے جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب اگر کوئی آدمی کسی دوسرے کو رقم دیتا ہے کہ وہ اس رقم سے کاروبار کرے اور وہ کاروبار بھی جائز اور حلال ہو پھر منافع آپس میں تقسیم کرلیا جائے تو ایسا کرنا جائز ہے، اس کاروبار میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ فقہی اصطلاح میں اس قسم کے کاروبار کو مضاربت کہا جاتا ہے، لیکن کاروبار کرنے والا کاروبار میں اپنی ایسی رقم بھی لگاتا ہے جو شرعاً حلال نہیں ہے تو اس کا جرم کاروبار کرنے والے کے لیے ہے، حلال ذرائع سے رقم حاصل کرنے والے کو کوئی گناہ نہیں ہوگا، وہ تو اپنی حلال کمائی کا نفع لیتا ہے، بینک سے قرض لینا اور پھر سود کے ساتھ واپس کرنے کا معاہدہ کرنا شرعاً ناجائز ہے کیونکہ اس طرح سودی کاروبار کو رواج دینا ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، ہمارے نزدیک تو بینک سے سود کے بغیر بھی رقم لینا محل نظر ہے کیونکہ گندے اور نجس پانی کو فلٹر سے صاف کرکے استعمال کرنا کسی صاحب عقل وشعور کے نزدیک صحیح نہیں ہے، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ بینک کے ساتھ کسی صورت میں لین دین نہ کیا جائے کیونکہ اس کی بنیاد سود کے لینے دینے پر ہے جس کی شریعت نے کسی صورت میں اجازت نہیں دی ہے بہرحال صورت مسئولہ میں اگر کسی نے حلال ذرائع سے کمایا ہوا پیسہ کسی دوسرے کو مضاربت کے لیے دیا ہے وہ اس سے حلال کاروبار کرتا ہے تو اس کا نفع روپیہ دینے والے کے لیے جائز اور حلال ہے اگرچہ کاروبار کرنے والا اس میں بینک کا قرض بھی شامل کرے، بینک سے سود پر قرض لینے کا گناہ کاروبار کرنے والے کو ہوگا، روپیہ دینے والا اس سے بری الذمہ ہے۔ (واللہ اعلم)

عمارت بنا کر بینک کو کرایہ پر دینا

سوال میرے ایک دوست نے عمارت تعمیر کرکے بینک کو کرایہ پر دے دی ہے، میں نے اسے سمجھایا کہ ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں، اس کے متعلق کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں کہ عمارت بنا کر بینک کو کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں پر ایسا وقت آنے والا ہے کہ وہ اس

میں سود کھائیں گے، عرض کیا گیا سب کے سب اس بیماری میں مبتلا ہو جائیں گے فرمایا کہ جو نہیں کھائے گا اسے بھی سود کی گرد وغبار پہنچ جائے گی۔'' [1]

اس حدیث کے پیش نظر دور حاضر میں کوئی بھی اس وبائی مرض سے محفوظ نہیں ہے، کسی نہ کسی حوالہ سے سود سے اجتناب کرنے والے کو بھی اس کی گرد وغبار سے ضرور واسطہ پڑ جاتا ہے، ہمارے نزدیک صورت مسئولہ میں بھی اس قسم کا معاملہ ہے کیونکہ کرایہ وغیرہ کی رقم اس سودی کاروبار کی پیداوار ہوگی، جس پر بینک کے معاملات کی بنیاد کھڑی ہے، یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کوئی بینک بھی سودی معاملات سے محفوظ نہیں ہے خواہ وہ اپنے نام کے ساتھ ''اسلامی'' ہونے کا لیبل ہی کیوں نہ لگا لے، کیونکہ پاکستان میں جتنے بینک ہیں یہ حکومتی بینک (اسٹیٹ بینک) کے ماتحت ہوتے ہیں اور حکومتی بینک سے انہیں کاروبار اور لین دین کرنا پڑتا ہے، اسے بھاری رقوم بھی پرکشش شرح سود پر دی جاتی ہیں، پھر حکومتی بینک کا تعلق ورلڈ (عالمی) بینک سے ہوتا ہے، حکومتی بینک، ورلڈ بینک کے ماتحت ہوتے ہیں اور اسے بھاری سرمایہ بھاری شرح سود پر فراہم کرتے ہیں، اس طرح ورلڈ بینک سے جو سود ملتا ہے وہ حصہ رسدی کے طور پر پاکستان کے تمام بینکوں کو پہنچ جاتا ہے، بینک کے معاملات کی یہ مختصر وضاحت ہے، ایسے بینکوں کو سودی کاروبار کے لیے جگہ فراہم کرنا کہ وہ خود عمارت تعمیر کر لیں یا انہیں عمارت بنا کر کرایہ پر دینا شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنا ان کے حرام کاروبار میں ان کی معاونت کرنا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪﴾ [2]

''تم نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور سرکشی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔''

اس آیت کریمہ کی روشنی میں مسلم یا غیر مسلم اگر وہ نیکی اور تقویٰ کا کام کرتا ہے تو اس کا ساتھ دینا چاہیے اور اگر گناہ کا کام خواہ کوئی مسلمان کر رہا ہو اس سے کسی قسم کا تعاون نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک عمارت تعمیر کر کے سودی کاروبار کرنے والے ادارے کو کرایہ پر دینا ایسا ہی جیسا کہ وہ عمارت کسی بدکاری کا اڈہ چلانے یا شراب کشید کرنے کے لیے کرایہ پر دی ہے، ایسا کرنا ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

زمیندار کا آڑھتی سے فصل سے پہلے رقم لینا

سوال ہمارے ہاں آڑھتی حضرات کا یہ طریقہ ہے کہ زمیندار حضرات ان سے رقم لے لیتے ہیں اور فصل کے موقع پر انہیں پیداوار دینے کا وعدہ کرتے ہیں، اس طرح آڑھتی حضرات ایک لاکھ روپے دے کر تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ کما لیتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ کتاب وسنت کا حوالہ دیں۔

جواب کسی چیز کی آئندہ ادائیگی کے وعدے پر اس کی نقد قیمت وصول کرنا جائز ہے۔ شرعی طور پر اسے بیع سلم یا بیع سلف کہا جاتا ہے، اس طرح کی خرید وفروخت جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اس طرح کی خرید وفروخت ہوا کرتی تھی، خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے لیکن اس کی چند ایک شرائط ہیں۔ جو چیز بطور قیمت ادا کی جا رہی ہے اس کی مقدار

---

[1] مسند امام احمد، ص: ٤٩٤، ج٢۔ [2] ٥/المائدہ: ٢۔

معلوم ہو اور اسے مجلس عقد میں ادا کر دیا جائے، نیز جو چیز آیندہ لینی ہو اس کا ایسا وصف بیان کیا جائے جس سے اس کی مقدار اور نوع ممتاز ہو جائے تاکہ دھوکے اور تنازعہ کا امکان نہ رہے نیز ادائیگی کی مدت معلوم ہونی چاہیے، اس کے لیے تاریخ طے کر لی جائے، صحیح بخاری میں ہے: ''جو شخص کسی بھی چیز میں بیع سلم کرنا چاہے وہ مقررہ وزن اور مقررہ مدت ٹھہرا کر کرے۔'' [1]

بہر حال اس قسم کی خرید و فروخت کے لیے ضروری ہے کہ جنس معین ہو، ماپ یا وزن بھی معلوم ہو، بھاؤ بھی طے ہو اور ادائیگی کی تاریخ بھی معین ہو۔ دراصل اس قسم کی خرید و فروخت اشیا کے معدوم ہونے کی وجہ سے ناجائز تھی لیکن اقتصادی مصالح کے پیش نظر لوگوں کے لیے نرمی کرتے ہوئے اسے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، معاملہ طے کرتے وقت اس چیز کا موجود ہونا لازمی نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ اس قسم کی خرید و فروخت کرتے تھے تو لوگوں نے ان سے دریافت کیا آیا اس وقت ان کے پاس کھیتی موجود ہوتی تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ان سے اس کے متعلق نہیں پوچھا کرتے تھے۔'' [2]

صورت مسئولہ میں اگر آڑھتی حضرات زمیندار سے خرید و فروخت کا معاملہ کرتے ہیں کہ انہیں پیشگی رقم دے کر آیندہ جنس لینے کا اہتمام کرتے ہوں اور اس کا بھاؤ، تاریخ ادائیگی جنس اور نوع نیز بھاؤ کا تعین کر لیا جائے تو جائز ہے اور اگر روپیہ دے کر آیندہ فصل کے موقع پر ان سے روپیہ ہی لینا ہے تو ایسا کرنا سود ہے جو بہت سنگین جرم ہے۔ (واللہ اعلم)

سونے اور چاندی کا نصاب

سوال سونے اور چاندی کا نصاب موجودہ حساب سے کیا بنتا ہے؟

جواب سونے کا نصاب بیس مثقال ہے جو ساڑھے سات تولے یا پچاسی گرام کے مساوی ہے، اسی طرح چاندی کا نصاب ایک سو چالیس مثقال ہے جو ساڑھے باون تولے یا ۶۱۲ گرام بنتے ہیں، جس انسان یا عورت کی ملکیت میں نصاب کے مطابق سونا یا چاندی ہو یا زیورات ہوں، اسے چاہیے کہ اس سے زکوٰۃ ادا کرے، خواہ اس کی قیمت بنا کر کرنسی کی صورت میں ادا کرے یا سونا یا چاندی دے دے، یہ اس کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے، اس سے کم مقدار میں زکوٰۃ ضروری نہیں اگر اپنی مرضی سے دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

طے شدہ منافع کے عوض رقم دینا

سوال میرے ایک دوست نے مجھ سے کچھ رقم کا مطالبہ کیا ہے کہ میں آپ کو کاروبار میں تو شریک نہیں کر سکتا البتہ ہر چھ ماہ بعد کل رقم کا پانچ فیصد ادا کرتا رہوں گا، کیا میرے لیے جائز ہے کہ طے شدہ منافع کے عوض میں اسے کاروبار کے لیے کچھ رقم دوں، کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں، کیا ایسا کرنا سود تو نہیں؟

جواب کاروبار کی کئی ایک صورتیں رائج ہیں، ایک یہ ہے کہ کوئی آدمی دوسرے کو سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اس سرمایہ سے کاروبار کرتا ہے، پھر ایک خاص شرح کے مطابق منافع میں دونوں شریک ہوتے ہیں، کاروبار کی اس شکل کو مضاربت کہتے

---

[1] صحیح مسلم، السلم: ٢٢٤۔ [2] صحیح بخاری، السلم: ٢٢٥٥۔

ہیں، اس کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن صورت مسئولہ میں کاروبار کی جو صورت بیان کی گئی ہے اس میں اور بینک کے سود میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ بینک صارفین کو رقم جمع کرانے کے بعد ایک طے شدہ شرح کے مطابق سود دیتا ہے جسے وہ منافع کا نام دیتے ہیں۔ کسی چیز کا نام بدل دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدل جاتی، جس آدمی نے رقم فراہم کی ہے اسے چاہیے کہ کاروبار کے نفع اور نقصان میں برابر کا شریک ہو لیکن دی ہوئی رقم پر ایک خاص شرح کے مطابق ''نفع'' لینا خالص سود ہے۔ مثلاً اگر اس نے مبلغ پچاس ہزار روپیہ دیا ہے اور طے پایا ہے کہ چھ ماہ بعد اس رقم پر پانچ فیصد ''نفع'' دیا جائے گا، اس طرح چھ ماہ بعد پچاس ہزار کے ساتھ پانچ ہزار مزید شامل ہو جائے گا، اب اس کاروبار میں اور بینک کے سود میں کیا فرق ہے؟ ہمارے نزدیک اس انداز سے اپنی رقم پر خاص شرح فی صد کے اعتبار سے نفع لینا خالص سود ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت کو حلال اور سود کو حرام کہا ہے۔'' [1] نیز فرمایا: ''اگر تم اس کاروبار سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر اس سے توبہ کر لو تو تم صرف اپنے اصل زر کے حقدار ہو۔'' [2] بہر حال تجارت اور سود میں بہت فرق ہے، دو چیزیں تو بہت نمایاں ہیں۔

1. سود میں طے شدہ شرح کے مطابق منافع یقینی ہوتا ہے جبکہ تجارت میں نفع کے ساتھ نقصان کا بھی احتمال ہوتا ہے۔
2. مضاربت کی شکل میں فریقین کو ایک دوسرے سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے کیونکہ اس میں مفاد مشترکہ ہوتا ہے جبکہ تجارتی سود میں سود خور کو محض اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے۔

صورت مسئولہ میں طے شدہ شرح کے مطابق نفع لینا صریح سود ہے ایک مسلمان شخص کو اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

مقررہ وقت تک ادھار دینا

سوال میں نے ایک موٹر سائیکل نقد قیمت پر مبلغ پچاس ہزار روپے میں خریدی۔ پھر میں نے اسے چھ ماہ کے ادھار پر مبلغ ستر ہزار روپے میں فروخت کر دیا ہے، اس کے متعلق بتائیں کہ ایسا کرنا جائز ہے؟ بعض لوگ اسے سود کہتے ہیں۔

جواب معاملات میں اصل اباحت ہے الا یہ کہ اس کی حرمت پر واضح نص آ جائے اور عبادات میں اصل حرمت ہے الا یہ کہ اس کے جواز پر واضح دلیل موجود ہو، اس اصل کی بنیاد پر ادھار کی وجہ سے قیمت زیادہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اس کے عدم جواز پر ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ایک بیع میں دو بیع کرتا ہے، اس کے لیے دونوں میں سے کم قیمت ہے یا پھر وہ سود ہے۔ [3]

حالانکہ اس صورت میں بھاؤ دو ہوتے ہیں، بیع نہیں کی جاتی ہے کہ موجودہ صورت کو حرام قرار دیا جائے۔ ہمارے نزدیک موجودہ حدیث کا مصداق بیع عینہ ہے جس کی حرمت دیگر دلائل سے ثابت ہے۔ بیع عینہ یہ ہے کہ آدمی کوئی چیز مقررہ قیمت پر معین وقت تک کے لیے فروخت کرے، پھر خریدار سے وہی چیز کم قیمت پر خرید لے کہ زائد رقم اس کے ذمے رہ جائے۔ اس کی مزید

---

[1] ۲/البقرۃ: ۲۷۵۔ [2] ۲/البقرۃ: ۲۷۹۔ [3] ابو داود، البیوع: ۳٤٦۱۔

وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ میں نے آٹھ سو درہم ادھار کے عوض زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ایک غلام کی بیع کی، پھر میں نے اس غلام کو چھ سو درہم نقد کے بدلے خرید لیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تم نے بہت بری خرید و فروخت کی ہے۔ [1]

یہ اس لیے حرام ہے کہ چھ صد درہم نقد دے کر ادھار آٹھ سو درہم لیتا ہے، خرید و فروخت کردہ چیز بعینہ درمیان میں رکھ دی گئی ہے، اس صورت مسئولہ میں اگر کسی چیز کو نقد پچاس ہزار میں خریدا ہے اور ادھار ستر ہزار میں فروخت کر دیا ہے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک کاروبار ہے جس کی بنیاد اباحت پر ہے الا یہ کہ اس کے حرام ہونے کی واضح دلیل ہو، واضح رہے کہ اس موضوع پر ہمارا تفصیلی فتویٰ اہلحدیث میں شائع ہو چکا ہے جسے فتاویٰ اصحاب الحدیث میں پڑھا جا سکتا ہے۔ جو مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد۔ لاہور سے دستیاب ہے۔ (واللہ اعلم)

غیر مملوکہ چیز فروخت کرنا

سوال آج کل ہماری منڈیوں میں یہ سودے عام ہوتے ہیں کہ ان کے پاس مال نہیں ہوتا، اس کے باوجود خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب جو چیز انسان کی ملکیت میں نہ ہو اسے آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایک شخص میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے کسی چیز کا سودا کر لیتا ہے جبکہ وہ چیز اس وقت میرے پاس نہیں ہوتی، میں اسے بازار سے لا کر دے دیتا ہوں تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو چیز تمہارے پاس نہیں تم اسے فروخت کرنے کے مجاز نہیں ہو۔'' [2]

ایک دوسری روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو چیز تیرے پاس نہیں ہے اس کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ [3]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ منڈیوں میں اس طرح کا جو کاروبار ہوتا ہے وہ جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

گروی چیز کو اپنے استعمال میں لانا؟

سوال میں نے کسی سے قرض وصول کرنا ہے، اس نے میرے پاس اپنا مکان رکھا ہے جس کی مالیت تقریباً دس لاکھ ہے، جبکہ قرض پانچ لاکھ ہے، کیا میں اس گروی شدہ مکان کو اپنے استعمال میں لا سکتا ہوں؟

جواب اگر گروی رکھی جانے والی چیز خرچے وغیرہ کی محتاج نہیں ہے تو کسی حالت میں اس سے فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا اور اگر وہ ایسی چیز ہے جو خرچے کی محتاج ہے تو خرچ کے عوض اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رہن رکھے ہوئے جانور پر اخراجات کے عوض سواری کی جا سکتی ہے اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ بھی پیا جا سکتا ہے اور جو شخص

---

[1] بیھقی، ص: ۳۳۰، ج۵۔ [2] مسند امام احمد، ص: ۴۰۲، ج۳۔

[3] مستدرك حاكم، ص: ۱۷، ج۲۔

سواری کرتا ہے یا دودھ پیتا ہے وہی اخراجات کا ذمہ دار ہے۔ ❶

اس حدیث کی بنا پر مکان، پلاٹ اور زمین وغیرہ خرچے کی محتاج نہیں ہے، اس لیے ان چیزوں کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے، ہاں اگر وہ اجازت دے دے تو اسے اپنے استعمال میں لایا جا سکتا ہے کیونکہ گروی رکھی ہوئی چیز کا اصل مالک تو وہی ہے جس نے قرض لیا ہے اور اس کے منافع کا بھی وہی مالک ہے، کسی دوسرے کے لیے اس سے منافع لینا جائز نہیں ہے الا یہ کہ وہ خود اس کی اجازت دے دے تو جس کے پاس گروی رکھا گیا ہے وہ اسے استعمال کر سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی صورت یہ ہونی چاہیے کہ اگر مکان کا ماہانہ کرایہ پانچ ہزار ہے تو سال کے بعد ساٹھ ہزار اس کے قرض سے منہا کر دیا جائے، اس طرح دونوں کو فائدہ ہوگا، قرض لینے کا بوجھ بھی ہلکا ہوگا اور دینے والے کو ایک سہولت میسر ہوگی، بہر حال صورت مسئولہ میں ہمارے نزدیک یہی صورت ہونی چاہیے کہ مکان کا کرایہ طے کر لیا جائے اور گروی شدہ مکان میں رہائش رکھ لی جائے، جب قرض کی ادائیگی ہو تو قرض سے اتنی رقم منہا کر دی جائے جس قدر اس نے مکان کو استعمال کیا ہے اور معروف طریقہ کے مطابق اس کا کرایہ اس صورت میں ادا کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

بیعانہ ادا کر کے پلاٹ آگے فروخت کر دینا

سوال ہمارے پلاٹوں کی خرید وفروخت اس طرح کی جاتی ہے کہ صرف بیعانہ کی ادائیگی کر کے پلاٹ کو آگے بیچ دیا جاتا ہے اور اصل مالک تیسرے آدمی کے نام رجسٹری کرا دیتا ہے، جس نے بیعانہ ادا کیا ہوتا ہے وہ صرف بیعانہ کی ادائیگی پر اس سے نفع کما لیتا ہے کیا اس صورت میں یہ کاروبار جائز ہے؟

جواب کاروبار کی ذکر کردہ صورت شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ شریعت نے ایسی چیز کی خرید وفروخت سے منع کیا ہے جو فروخت کرتے وقت اس کے پاس موجود نہ ہو یا اس کی ملکیت نہ ہو جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو چیز تیرے پاس نہیں اس کا فروخت کرنا جائز نہیں۔'' ❷

اس کی مزید وضاحت ایک دوسری حدیث میں ہے، حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس ایک شخص آتا ہے۔ وہ مجھ سے کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے، میں سودا کر لیتا ہوں اور وہ چیز اسے بازار سے خرید کر دے دیتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو چیز تمہارے پاس موجود نہیں اسے فروخت نہ کرو۔'' ❸

اس حدیث میں وضاحت ہے کہ کسی ایسی چیز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے جو فروخت کے وقت بائع کی ملکیت نہ ہو اس طرح اگر کسی نے کوئی چیز خریدی ہے تو جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے اسے آگے کسی کو فروخت نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم کوئی چیز خریدو تو اسے قبضے میں لینے سے پہلے آگے فروخت نہ کرو۔'' ❹

---

❶ صحیح بخاری، الرھن: ۲۵۱۲۔ ❷ مسند امام احمد، ص: ۱۸۷، ج۲۔
❸ ابو داود، البیوع: ۳۵۰۳۔ ❹ مسند امام احمد، ص: ۴۰۳، ج۳۔

اسی طرح حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کردہ سودے کو اسی جگہ بیچنے سے منع فرمایا ہے جہاں اسے خریدا گیا ہے حتی کہ تجار حضرات اسے اپنے گھروں میں لے جائیں، یعنی اس پر قبضہ کرنے کے بعد اسے آگے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ [1]

صورت مسئولہ میں خریدار، مالک کو پلاٹ کا زر بیعانہ ادا کرتا ہے، جو صرف اعتماد کی علامت ہے کہ میں اس کا خریدار ہوں، آپ اسے آگے فروخت نہ کریں، پھر طے شدہ مدت پر پوری رقم ادا کر کے اسے خریدا جاتا ہے اور اس کی رجسٹری یا انتقال سے اس کی ملکیت میں آتا ہے، جب تک وہ پلاٹ، خریدار کی ملکیت نہیں ہوتا اور وہ اس پر قبضہ نہیں کر لیتا وہ اسے آگے فروخت کرنے کا مجاز نہیں ہے، اس لیے پیش کردہ صورت میں صرف بیعانہ ادا کر کے اسے آگے فروخت کر دینا شرعاً جائز نہیں ہے، پہلے وہ اس پلاٹ کو اپنے نام کرائے اور اس پر قبضہ کر کے پھر اسے آگے فروخت کرے، اس طرح فیکٹری سے کھل بنولہ خریدا جاتا ہے۔ رقم ادا کر کے اس پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ فیکٹری میں رہنے دیا جاتا ہے مالک سے صرف پرچی یا رسید لی جاتی ہے، خریدار اس پرچی کو ایک تیسرے آدمی کو فروخت کر دیتا ہے اس طرح اس رسید کی ہی خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے، جبکہ اصل مال فیکٹری میں پڑا ہے، اسے نہ کسی نے دیکھا اور نہ ہی اس پر قبضہ کیا، اس طرح کا کاروبار، احادیث بالا کی روشنی میں ناجائز ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

سیونگ کھاتے میں رقم سے منافع لینا

سوال بینک والے سیونگ کھاتے میں رکھے ہوئے سرمایہ پر منافع دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ اسے کاروبار میں لگاتے ہیں، کیا یہ منافع سود کے ضمن میں آتا ہے، اس کے متعلق تفصیلی فتویٰ درکار ہے۔

جواب بینک میں عام طور پر ہر دو قسم کے کھاتے ہوتے ہیں، ایک کرنٹ کھاتہ اور دوسرا سیونگ کھاتہ، کرنٹ میں رکھی گئی رقم پر بینک کسی قسم کا نفع دیتا اور نہ ہی اس سے زکوٰۃ کی رقم کاٹی جاتی ہے، البتہ بینک اس رقم کو اپنے استعمال میں ضرور لاتا ہے اور اسے دوسروں کو سود پر دیتا ہے، ہمارے رجحان کے مطابق اس کھاتے کے ذریعے گناہ اور ظلم پر بینک کا تعاون کیا جاتا ہے جس کی قرآن میں ممانعت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ ﴾ [2]

''نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو، ظلم اور گناہ میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔''

اگرچہ کرنٹ کھاتے میں رکھی ہوئی رقم پر اس کے اصل مالک کو کچھ نہیں دیا جاتا تاہم اس رقم کو سودی کاروبار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بینک میں دوسرا کھاتہ سیونگ کہلاتا ہے، اس رقم پر اصل مالک کو سود بھی دیا جاتا ہے جسے بینک والے منافع کا نام دیتے ہیں لیکن نام کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدل جاتی، لوگوں کو پھانسنے کے لیے اس کھاتے کے مختلف نام ہیں مثلاً شراکتی کھاتہ، نفع اور نقصان کی بنیاد پر شراکت داری، اس کا مشہور نام P.L.S ہے، اس کھاتے میں رکھی ہوئی رقم کو آگے بھاری سود پر دوسروں کو دیا

---

[1] مستدرك حاكم، ص: ٤٠، ج٢۔ [2] ٥/المائدة: ٢۔

جاتا ہے پھر اس سود کو ایک خاص شرح سے اصل مالک کے کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے، اگر چہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کھاتے میں جمع شدہ رقم کو کاروبار میں لگایا جاتا ہے اور اکاؤنٹ ہولڈر کی حیثیت ایک شریک کی ہوتی ہے لیکن زمینی حقائق اس دعویٰ کے منافی ہیں، کیونکہ اس میں سودی رقم کو مارک اپ جیسے حسین الفاظ کا نام دیا گیا ہے، بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق سیونگ کھاتے میں رکھی ہوئی رقم پر ملنے والا ''منافع'' سود ہی ہے، ایک مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، اگر حکومت واقعی سودی نظام ختم کرنا چاہتی ہے تو نیک نیتی کے ساتھ اس پورے نظام کو بدلنے کا تہیہ کرے جو خالص سود پر مبنی ہے تا کہ مسلمان پوری یکسوئی کے ساتھ غیر سودی بینکاری کو کامیاب بنانے میں حصہ لیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ (آمین)

قبضہ کیے بغیر چیز آگے بیچنا

سوال منڈیوں میں خرید وفروخت کی اکثر یہ صورت سامنے آتی ہے کہ آدمی کوئی چیز خریدتا ہے اور اسے مالک کے پاس ہی چھوڑ دیتا ہے، اسی حالت میں اس کو آگے فروخت کر دیا جاتا ہے، کیا اس طرح خرید وفروخت کرنا جائز ہے، اگر ناجائز ہے تو کیوں؟

جواب تمام فقہاء عظام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کسی چیز کو خریدنے کے بعد اس پر قبضہ کرنے سے پہلے پہلے اسے فروخت کرنا ناجائز ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے اناج خریدا وہ اس وقت تک فروخت نہ کرے جب تک اسے ناپ تول کر پورا نہ کر لے۔'' [1]

ایک روایت میں وضاحت ہے کہ اسے اپنے قبضے میں لیے بغیر آگے فروخت نہ کرے۔ [2] اس حدیث میں اناج اور غلے کا حکم بیان ہوا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کھانے کی اشیاء کے علاوہ ہر چیز کا یہی حکم ہے۔ [3] بلکہ رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر فرمایا ہے:

''تم جب بھی کوئی چیز خریدو تو اس پر قبضہ کیے بغیر آگے فروخت نہ کرو۔'' [4]

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی جگہ میں جہاں سے سامان خریدا ہے وہیں پر بیچنے سے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ تاجر حضرات اپنا سودا اٹھا کر اپنے اپنے گھروں میں لے جائیں۔ [5] امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ''خریدی ہوئی چیز کو قبضے میں لینے سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ خریدار ایسی صورت میں اسے قبضے میں لینے سے عاجز ہوتا ہے، ممکن ہے فروخت کنندہ اس چیز کو اس کے حوالے کرے یا نہ کرے، خاص طور پر جب وہ دیکھ رہا ہو کہ خریدار کو اس سے بہت نفع ہو رہا ہے تو وہ اس بیع کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا، خواہ انکار کرے یا فسخ بیع کے لیے کوئی حیلہ تلاش کرے۔'' [6]

بہر حال آج کل منڈیوں میں جس طرح خرید وفروخت ہوتی ہے کہ ایک چیز خرید کر وہیں اسے آگے فروخت کر دیا جاتا ہے،

---

[1] بخاری، البیوع: ۲۱۲٦۔ [2] مسلم، البیوع: ۱۵۲۵۔ [3] جامع ترمذی، البیوع: ۱۲۹۱۔
[4] مسند امام احمد، ص: ۴۰۲، ج۲۔ [5] ابو داود، البیوع: ۳۴۹۸۔ [6] اعلام الموقعین، ص: ۱۳۴، ج۳۔

خریدار اس پر قبضہ نہیں کرتا، یا اصل مالک سے پرچی حاصل کر کے اسے فروخت کر دیا جاتا ہے، شرعی طور پر ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

کسی کی کتاب اجازت کے بغیر شائع کرنا

سوال ایک آدمی کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے، کیا اس کتاب کو کوئی ناشر اس کی اجازت کے بغیر طبع کر سکتا ہے یا نہیں، کیا وہ اس کتاب کی کسی ناشر سے قیمت وصول کر سکتا ہے؟

جواب کسی شخص کوئی کاوش پر جو حقوق حاصل ہوتے ہیں انہیں حقوق ایجاد کہا جاتا ہے، دوسرا کوئی شخص اس کاوش کو اپنی طرف منسوب نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی نقل تیار کرنے کا مجاز ہے، اس کے مالی فوائد، اس موجد کو حاصل ہوں گے، وہ خود اپنے حق ایجاد کو فروخت بھی کر سکتا ہے اور کسی کو ہبہ بھی دے سکتا ہے۔ کسی ناشر کو اجازت نہیں کہ وہ اس کی کاوش کو طبع کرے، حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا ''کون سی کمائی بہتر ہے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور اخلاص پر مبنی ہر خرید و فروخت'' [1]

اگر کوئی مصنف محنت سے کتاب لکھتا ہے تو وہ اس کے ذہن اور ہاتھوں کی کمائی ہے، اور وہ اس کا مالک ہے، اس میں کسی دوسرے کو تصرف کا حق نہیں ہے، وہ اسے فروخت کرنے، ہبہ دینے یا وقف کرنے کا مجاز ہے۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اس قسم کے حقوق اپنے لیے محفوظ کرنا کتمان علم ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا ہر ناشر کو اس کے طبع کرنے کی اجازت ہونی چاہیے، نیز علم ایک عبادت ہے جس کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ مصنف اگر کتاب پر یہ عبارت لکھتا ہے: ''حقوق طبع محفوظ ہیں'' تو اس کا مطلب علم کو چھپانا نہیں بلکہ اس کے ذریعے ناشر کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ خود ہی اس کے مالی فوائد حاصل نہ کرے بلکہ اس سلسلہ میں مصنف کا بھی خیال رکھے، یہ کتمان علم کی صورت نہیں ہے جو ناجائز ہو اور یہ کہنا کہ یہ اطاعات وعبادات پر معاوضہ لینا درست نہیں، یہ مفروضہ بھی محل نظر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند سورتوں کی تعلیم بطور حق مہر مقرر کی ہے جو مالی معاوضہ کے قائم مقام ہے پھر قرآنی سورت پڑھ کر دم کرنا اور اس پر معاوضہ لینا بھی حدیث سے ثابت ہے، اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''سب سے زیادہ حقدار جس پر تم اجرت لو وہ اللہ کی کتاب ہے۔'' [2]

ایک مصنف جب کوئی کتاب لکھتا ہے تو وہ راتوں کو بیدار رہتا ہے، اپنے دماغ کو صرف کرتا ہے، محنت کرتا ہے، کیا اسے اپنی فکری اور عملی محنت کا معاوضہ لینے کی اجازت نہیں؟

ہمارے نزدیک اس کی محنت قابل انتفاع ہے اور وہ اس پر معاوضہ لینے کا پورا پورا حق رکھتا ہے لیکن اس محنت کو اجازت کے بغیر چوری چھپے طبع کرنا، اس کی محنت پر شبخون مارنا ہے، شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے، بہر حال ناشرین کو چاہیے کہ وہ جب کسی کی فکری کاوش سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس فائدہ میں مصنفین کو بھی شامل کریں، یا پھر ان کے ساتھ کوئی معاملہ طے کر لیا جائے کہ وہ

---

[1] مسند امام احمد، ص: ١٤١، ج٤۔ [2] بخاری، الطب: ٥٧٣٧۔

کسی ادارہ کے لیے کتاب لکھیں اور انہیں طے شدہ معاوضہ یا حق الخدمت دے دیا جائے، اس کے بعد اس ادارہ کو اجازت ہے کہ وہ جب چاہے جتنی چاہے کتب طبع کرے۔ (واللہ اعلم)

بولی لگانا

سوال سبزی منڈیوں میں سبزیوں اور فروٹ وغیرہ کی بولی ہوتی ہے، کیا اس طرح خرید وفروخت جائز ہے؟ آڑھتی حضرات فروخت کار اور خریدار دونوں سے کمیشن لیتے ہیں، اس کی حیثیت کیا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب بولی دے کر خرید وفروخت کرنا جائز ہے، اسے نیلامی کی بیع کہا جاتا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواز کے متعلق مستقل ایک عنوان کے تحت باب قائم کیا ہے، انہوں نے عطاء بن ابی رباح کا قول نقل کیا ہے کہ اسلاف مال غنیمت کو نیلام کرنے میں کوئی حرج نہیں خیال کرتے تھے۔ جو قیمت زیادہ لگاتا وہ اسے خرید لیتا [1] البتہ اس میں شرط یہ ہے کہ مال لینے کی نیت ہو، محض بھاؤ بڑھانا مقصود نہ ہو اگر ایسا ہے تو نیلامی ناجائز ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں تجارتی منڈیوں میں تاجر حضرات ایسے ایجنٹ مقرر کر دیتے ہیں، جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر ممکن خریدار کو دھوکہ دے کر زیادہ قیمت دینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ایسے ایجنٹ بعض اوقات خریدار کی موجودگی میں مطلوبہ چیز کی قیمت بڑھا کر خریدار بنتے ہیں حالانکہ یہ لوگ خریدار نہیں ہوتے بلکہ محض بھاؤ بڑھانے کے لیے نیلامی میں حصہ لیتے ہیں۔ شریعت اس طرح کی دھوکہ دہی کو جائز قرار نہیں دیتی البتہ سودا لینے کی نیت سے نیلامی میں حصہ لینا جائز ہے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرانا ٹاٹ اور پیالہ نیلام کیا، ایک شخص نے ان کی بولی ایک درہم لگائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوبارہ اعلان کرنے پر دوسرے شخص نے دو درہم بولی لگائی۔ پھر آپ نے وہ دونوں چیزیں دو درہم کے عوض اس کے حوالے کر دیں۔ [2]

اس سلسلہ میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے جس میں نیلامی کی ممانعت کا ذکر ہے لیکن وہ صحیح نہیں ہے جیسا کہ امام بخاری کے عنوان سے یہ اشارہ ملتا ہے۔ [3]

آڑھتی حضرات چونکہ فروخت کار اور خریدار دونوں کو سہولیات فراہم کرتے ہیں، اس لیے ان کا دونوں طرف سے کمیشن لینا بھی جائز ہے لیکن اس سلسلہ میں درج ذیل قباحتوں سے اجتناب کیا جائے۔

① آڑھتی حضرات خریداری سے پہلے یا فروخت ہونے کے بعد سبزی یا فروٹ سے کچھ اٹھا لیتے ہیں، یہ سراسر ناجائز اور زیادتی ہے جب انہوں نے دونوں طرف سے کمیشن لینا ہے تو یہ سبزی اور پھل کس چیز کے عوض لیا جاتا ہے۔ اگر نیلامی سے قبل اٹھایا جائے تو فروخت کار کی حق تلفی اور اگر نیلامی کے بعد فروخت شدہ مال سے کچھ رکھا جائے تو ایسا کرنا خریدار سے زیادتی کرنا ہے۔

② بعض دفعہ کسی رفاہی کام کے لیے کمیشن کے علاوہ پانچ دس روپے فی صد کے حساب سے لیے جاتے ہیں، مثلاً مسجد بنانا یا کوئی پمپ لگانا ہے تو اس کے لیے اس طریقہ سے چندہ جمع کیا جاتا ہے، ایسا کرنا بھی جائز نہیں ہے البتہ اس قسم کے کار خیر میں حصہ لینے کی

---

[1] صحیح بخاری، باب البیوع: ٥٩۔ [2] جامع ترمذی، البیوع۔ [3] فتح الباری، ص: ٤٤٨، ج٤۔

ترغیب تو دی جا سکتی ہے، کہ اپنی مرضی سے ہر کوئی جتنا چاہے اس رفاہی کام میں حصہ ڈال دے لیکن طے شدہ رقم کاٹ لینا جائز نہیں ہے۔

③ دھوکہ اور فراڈ بھی نہیں کرنا چاہیے، بعض دفعہ فروٹ کی پیٹی کے اوپر اچھا پھل ہوتا ہے لیکن اس کے نیچے ناقص پھل اور پتے وغیرہ بھرے ہوتے ہیں، آڑھتی حضرات کو اس کا علم ہوتا ہے۔ ہر قسم کے عیب کو ظاہر کر دیا جائے۔ یا پھل وغیرہ کی ڈھیری لگا کر نیلامی کی جائے تاکہ لینے والے پر اس کے عیوب ظاہر ہو جائیں۔

④ بعض دفعہ آڑھتی حضرات اپنا مال منڈی میں نیلامی پر فروخت کرتے ہیں اور بولی کے وقت کچھ ایجنٹ چھوڑے ہوتے ہیں جو بھاؤ کو زیادہ کرنے کے لیے بولی زیادہ لگاتے ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، اس قسم کی بولی ناجائز اور حرام ہے کیونکہ اس میں دھوکہ دہی اور فراڈ ہے جس کی اسلام میں اجازت نہیں ہے۔ اگر مذکورہ خرابیوں سے اجتناب کیا جائے تو نیلامی کی خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں ہے، شریعت نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ (واللہ اعلم)

زندہ جانور کے بدلے گوشت خریدنا

سوال زندہ جانور کے بدلے گوشت خریدنا جائز ہے یا نہیں، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب زندہ جانور دے کر گوشت خریدنا جائز نہیں ہے، اس کے متعلق ایک حدیث میں ممانعت ہے، رسول اللہ ﷺ نے زندہ جانور کے بدلے گوشت کی خرید وفروخت کو منع فرمایا ہے۔ (مستدرک حاکم، ص: ۳۵، ج ۲) اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں: میرے نزدیک اس حدیث کا بہترین معنی یہ ہے کہ کوئی شخص قصاب سے کہے اس بکری سے کتنا گوشت نکلے گا، قصاب نے جواب دیا بیس کلو، دریافت کرنے والا اسے کہے بیس کلو گوشت کے عوض یہ بکری رکھ لو، اگر اس سے زیادہ نکل آیا تو وہ تمہارا ہوگا اور اگر اس سے کم نکلا تو یہ نقصان تم نے خود برداشت کرنا ہوگا، میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں (اور یہ جوئے کی ایک قسم ہے) [1] اس حدیث اور وضاحت کے پیش نظر زندہ جانور دے کر گوشت خریدنا جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

گروی مکان دے کر قرضہ حاصل کرنا

سوال ہم نے ایک لاکھ روپیہ کسی سے قرض لیا ہے اور اس کے عوض اپنا مکان گروی رکھا ہے، ہمیں رہنے کے لیے کوئی مکان نہیں ملتا، اس لیے ہم اس مکان میں رہتے ہیں اور جس سے قرض لیا ہے اسے ہر ماہ اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب کوئی چیز گروی رکھ کر قرض یا کوئی اور چیز آئندہ کی ادائیگی پر ادھار لی جا سکتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے چند وسق جو لیے اور اس کے پاس اپنی زرہ گروی رکھی۔ [2] لیکن اس گروی شدہ چیز سے صرف اتنا فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے جس قدر اس پر اخراجات اٹھتے ہوں مثلاً بکری کو اگر چارہ ڈالنا ہے تو اس کا دودھ حاصل کر لیا جائے اور اگر سواری کا

---

[1] الروضة الندية، ص: ٢٤٠، ج٢۔ [2] صحيح بخاری، الرهن: ٢٥٠٩۔

جانور ہے تو چارہ وغیرہ ڈالنے کے عوض اس پر سواری کر لی جائے۔ دور حاضر میں اگر کسی نے گاڑی گروی رکھی ہے تو اپنا پٹرول ڈال کر اس پر سفر کیا جا سکتا ہے لیکن گروی میں زمین لے کر اسے کاشت کرنا اور پیداوار اٹھانا یا مکان کے عوض خود رہائش رکھنا یا کسی کو کرایہ پر دے کر خود کرایہ وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں جس شخص کا مکان ہے وہ خود ہی کرایہ دار کی حیثیت سے اس مکان میں رہائش رکھے ہوئے ہیں، ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اگر اس کے کرایہ کو اصل قرض سے منہا کر دیا جائے تو جائز ہے۔ اسی طرح زمین کی پیداوار کو بقدر حصہ اگر قرض سے منہا ادا کر دیا جائے تو گروی شدہ زمین کو کاشت کیا جا سکتا ہے بصورت دیگر گروی چیز سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا شرعاً جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال میرے والد گرامی جیل میں ہیں، ان کی رہائی کے لیے ایک لاکھ روپیہ درکار ہے اگر یہ رقم نہیں دی جاتی تو مزید دو سال قید بڑھ سکتی ہے، میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے اور مجھے کوئی قرض بھی نہیں دیتا، ایک شخص اس شرط پر قرض دینے کے لیے تیار ہے کہ تین سال کے بعد اسے دو لاکھ روپے واپس کیے جائیں، کیا اس قسم کی مجبوری کے پیش نظر سود پر قرض لیا جا سکتا ہے؟

جواب سودی کاروبار یا لین دین اس قدر سنگین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے کام کرنے والے کو سخت وارننگ دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ج﴾ [1]

"اگر تم اس (سودی لین دین) سے باز نہیں آؤ گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اور احادیث میں سود لینے اور دینے کو اپنی ماں کے ساتھ منہ کالا کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے، لہٰذا ایک مسلمان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اسے کسی صورت میں اختیار نہ کرے، صورت مسئولہ میں کوئی ایسا عذر نہیں جس کی بنیاد پر سود پر قرض لینے کو جائز قرار دیا جائے، جان بچانے کے لیے مردار کھانے کی اجازت قرآن نے دی ہے، لیکن صورت مسئولہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے رجحان کے مطابق کسی مالدار سے قرض لے کر اپنے باپ کو رہائی دلائی جا سکتی ہے لیکن اس رہائی کے لیے سود پر قرض لینا شرعاً درست نہیں ہے، ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ دو سال تک مزید قید برداشت کر لی جائے لیکن اس حرام کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

شفعہ کا حق دار کون ہے؟

سوال کیا شفعہ صرف زمین یا مکان میں ہوتا ہے؟ نیز شفعہ کا حقدار کون ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب شریک کے اس حصے کو مقررہ معاوضہ کے بدلے شریک کی طرف منتقل کرنا جو اجنبی کی طرف منتقل ہو گیا تھا، شفعہ کہلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس چیز میں شفعہ کا فیصلہ دیا ہے جو تقسیم نہ ہوئی ہو۔ [2]

---

[1] ۲/البقرة:۲۷۹۔ [2] صحیح بخاری، الشفعہ: ۲۲۵۷۔

شفعہ کا سبب صرف شراکت ہے اور وہ ہر چیز میں عام ہے، زمین ہو یا گھر یا پانی کی ندی ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر چیز میں شفعہ کا فیصلہ فرمایا ہے۔ [1]

احادیث کی رو سے پڑوسی کے لیے شفعہ کا حق بشرطیکہ ان کے گھر کا راستہ ایک ہو جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمسایہ اپنے ہمسائے کا شفعہ میں زیادہ حقدار ہے، شفعہ کی وجہ سے اس کا انتظار کیا جائے گا اگرچہ وہ غائب ہو بشرطیکہ دونوں کا راستہ ایک ہو۔'' [2]

یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ مجرد ہمسائیگی کے ذریعے حق شفعہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے مشترک راستہ ہونا ضروری ہے، اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے: ''جب حد بندی ہو جائے اور راستے جدا جدا ہو جائیں تو پھر شفعہ کا استحقاق نہیں ہوتا۔'' [3]

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب گھر تقسیم کر دیا جائے اور اس کی حد بندی کر دی جائے تو اس میں کوئی حق شفعہ نہیں ہے۔'' [4] ہمارے ہاں یہ غلط رواج ہے کہ اگر کسی نے گھر یا پلاٹ خریدا ہے تو کھیوٹ کھتونی میں شراکت رکھنے والا کوئی بھی شفعہ کر سکتا ہے اگرچہ وہ اس کا ہمسایہ نہ ہو، بہرحال اگر گھر یا پلاٹ کی حد بندی ہو چکی ہو اور راستے متعین ہوں تو اس میں شفعہ نہیں ہو سکتا۔ (واللہ اعلم)

قسم اُٹھا کر مال فروخت کرنا

سوال میرے ایک دوست کی عادت ہے کہ وہ قسم اٹھا کر اپنا مال فروخت کرتا ہے، کیا اس کی کمائی حلال ہے، میں اس کے ہاں کھا پی سکتا ہوں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب کاروبار میں قسم اٹھا کر سودا فروخت کرنا بہت مذموم حرکت ہے، اس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تجارت میں زیادہ قسمیں اٹھانے سے اجتناب کرو کیونکہ قسم اٹھانے سے سودا تو فروخت ہو جاتا ہے لیکن اس کی برکت ختم کر دی جاتی ہے۔'' [5]

قسم اٹھا کر کمائی کرنے سے اگرچہ برکت اٹھالی جاتی ہے تاہم وہ حرام نہیں ہوتی، اسے استعمال میں لانا جائز ہے، اس کے حصول کا گناہ اپنی جگہ پر رہے گا تاہم وہ کمائی حلال ہے بشرطیکہ اس میں اور کوئی خرابی نہ ہو، ایسے آدمی کو وعظ و نصیحت کے ذریعے زیادہ قسمیں اٹھانے سے باز رکھنا چاہیے۔

---

[1] ابوداود، البیوع: ۳۵۱۳۔ [2] ابوداود، البیوع: ۳۵۱۸۔ [3] بخاری الشفعہ: ۲۲۵۷۔

[4] ابوداود، البیوع: ۳۵۱۵۔ [5] صحیح مسلم، البیوع: ۱۶۰۸۷۔

وصیت و وراثت

وصیت و وراثت

سوال ہمارا بھائی فوت ہوا ہے، اس کے والدین، بیوی، ایک بیٹا اور دو بھائی زندہ ہیں، اس کی جائیداد کیونکر تقسیم ہوگی؟ کتاب وسنت کی روشنی میں ہمارا مسئلہ حل فرمائیں۔

جواب والدین میں ہر ایک کو چھٹا، چھٹا حصہ، بیوی کو آٹھواں اور باقی بیٹے کو ملے گا، اس صورت میں بھائی محروم ہیں، کل جائیداد کے چوبیس حصے کر لیے جائیں، پھر درج ذیل تفصیل سے اسے تقسیم کر لیا جائے۔

❶ والد چھٹا حصہ:4 ❷ والدہ چھٹا حصہ: 4 ❸ بیوی آٹھواں حصہ :3

❹ بیٹا۔ باقی ماندہ 13 ❺ بھائی محروم

بیٹے کو عصبہ کی حیثیت سے دیا جائے گا، اس کی موجودگی میں بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ (واللہ اعلم)

ناجائز جائیداد کی تقسیم

سوال میرے بیٹے نے میری اجازت کے بغیر میرا مکان چوری چھپے اپنے نام ہبہ کروالیا تھا، وہ اس کے نام منتقل بھی ہو چکا ہے، اب میرا بیٹا فوت ہو چکا ہے، اس کے پس ماندگان میں والد، اس کی بیوی، پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟ اگر میں قانونی طور پر اپنا مکان واپس لے لوں تو پھر اس مکان کی کیا پوزیشن ہوگی؟

جواب مرحوم نے سائل کی اجازت کے بغیر جو مکان اپنے نام ہبہ کرایا ہے وہ ناجائز ہے، اگر سائل اسے اپنی خوشی سے معاف کر دیتا ہے تو اس کی جملہ جائیداد کو درج ذیل طریقہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

والد کا چھٹا حصہ، بیوی کا آٹھواں حصہ اور باقی جائیداد، اس کی اولاد میں اس طرح تقسیم ہوگی کہ ایک لڑکے لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ ملے گا آسانی کے لیے اس کی جائیداد کے دوسو چونسٹھ ۲۶۴ حصے بنا لیے جائیں۔

والد کا حصہ: ۲۶۴÷۶=۴۴

بیوی کا حصہ: ۲۶۴÷۸=۳۳ باقی: ۲۶۴۔(۳۳+۴۴)=۱۸۷

ہر ایک لڑکے کا حصہ: ۳۴ لڑکوں کا مجموعی حصہ ۳۴×۵=۱۷۰

لڑکی کا حصہ: ۱۷ (اولاد کا مجموعی حصہ: ۱۷۰+۱۷=۱۸۷)

کل حصے: ۴۴+۳۳+۱۸۷=۲۶۴

اگر سائل اسے معاف نہیں کرتا تو مکان کے علاوہ دیگر جائیداد کو درج بالا تفصیل کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔ مکان کا مالک خود سائل ہے جو بعد میں موجود ورثاء کو ملے گا، اس سے وصیت کے ذریعے غیر ورثاء مثلاً نواسوں وغیرہ کو دیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

لاولد کی جائیداد کی تقسیم

سوال عمر علی لاولد فوت ہوا ہے۔ پسماندگان میں اس کی والدہ، تین مادری بھائی، حقیقی چچا کی اولاد اور پدری چچا موجود ہے، اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟

جواب بشرط صحت سوال عمر علی جو لاولد ہے، اس کی والدہ کو اس کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے چھٹا حصہ ملے گا کیونکہ اس کے متعدد بھائی زندہ موجود ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ﴾ [1]

''اگر میت کے بہن بھائی (متعدد) ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔''

تین مادری بھائیوں کو کل ترکہ سے ایک تہائی ملے گا اور وہ سب اس حصہ میں برابر کے شریک ہوں گے فرمان الٰہی ہے:

﴿فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ﴾ [2]

''اور اگر (مادری) بہن بھائی زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔''

ماں کا چھٹا حصہ اور مادری بھائیوں کا ایک تہائی حصہ نکال کر باقی جائیداد کا مالک مرحوم کا پدری چچا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کے حصے دے کر جو جائیداد باقی بچے وہ میت کے مذکر قریب رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [3]

صورت مسئولہ میں میت کے مذکر قریبی رشتہ دار اس کے پدری چچا ہیں، حقیقی چچا کی اولاد اس سے محروم ہوگی کیونکہ پدری چچا کے مقابلہ میں حقیقی چچا کی اولاد کا تعلق دور کا ہے، اس لیے ان کی موجودگی میں حقیقی چچا کی اولاد کو کچھ نہیں ملے گا سہولت کے پیش نظر جائیداد کے بارہ حصے کر لیے جائیں، پھر درج ذیل تفصیل کے مطابق اسے تقسیم کر دیا جائے۔

ماں کا حصہ: 12 کا 1/6=2

مادری بھائیوں کا حصہ: 12 کا 1/3=4

میزان: 6

باقی 12+6+6 باقی 6 حصے پدری چچا کے ہیں۔

بیوی، بچوں کے حصص

سوال ایک آدمی فوت ہوا ہے اس کی نقدی رقم اسّی ہزار روپیہ ہے، پس ماندگان میں بیوی، ایک لڑکی اور تین لڑکے ہیں، ان کے درمیان اسّی ہزار روپیہ کیسے تقسیم ہوگا؟

---

[1] ٤/النساء:١١۔ [2] ٤/النساء:١٢۔

[3] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٦۔

جواب صورت مسئولہ میں بیوی کو ۸/۱ ملے گا کیونکہ مرنے والے کی اولاد زندہ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ 1

''اگر مرنے والے کی اولاد ہو تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

باقی ترکہ اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ﴾ 2

''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے متعلق تاکیدی حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔''

صورت مسئولہ میں جائیداد کے آٹھ حصے کر لیے جائیں ایک حصہ بیوہ کو اور باقی اولاد میں اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ دو حصے ایک لڑکے کو اور ایک حصہ لڑکی کو دیا جائے چنانچہ کل جائیداد اسی ہزار ہے اور اس کے آٹھ حصے کیے جائیں تو ایک حصہ دس ہزار کا ہو گا۔ بیوہ کو دس ہزار دیا جائے پھر ہر لڑکے کو بیس بیس ہزار روپیہ اور لڑکی کو دس ہزار روپیہ دے دیا جائے۔

بیوی کا حصہ: 10000 روپے

لڑکی کا حصہ: 10000 روپے

ہر ایک لڑکے کا حصہ 20000 روپے

بیوی، بیٹیاں اور بہن وارث ہوں تو اس کے حصص

سوال میرے نانا فوت ہو گئے ہیں ان کے پس ماندگان میں سے بیوہ، دو بیٹیاں، ایک حقیقی بھائی، ایک حقیقی بہن زندہ ہیں، ان ورثاء میں ان کی وراثت کس طرح تقسیم ہوگی؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں بیوہ کے لیے کل جائیداد کا آٹھواں حصہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ 3

''اور اگر اولاد ہے تو پھر ان بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

دو بیٹیوں کو کل جائیداد سے دو تہائی ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ﴾ 4

''اور اگر لڑکیاں (دو یا) دو سے زائد ہوں تو ان کو ترکہ سے دو تہائی حصہ ملے گا۔''

مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے گا وہ میت کے مذکر قریبی رشتہ دار کے لیے ہے جیسا کہ رسول

---

1 ٤/النساء:١٢۔ 2 ٤/النساء:١١۔

3 ٤/النساء:١٢۔ 4 ٤/النساء:١١۔

اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دو اور جو باقی بچے وہ میت کے مذکر قریبی رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [1]

اس صورت میں میت کا مذکر قریبی رشتہ دار حقیقی بھائی، لیکن اس کے ساتھ اس کی حقیقی بہن بھی موجود ہے لہٰذا وہ بھی باقی کے ساتھ ترکہ کی حقدار ہے البتہ ان میں تقسیم اس طرح ہوگی کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں دوگنا حصہ دیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ﴾ [2]

''اور اگر میت کے کئی بہن بھائی ہوں یعنی مرد اور عورتیں ملے جلے ہوں تو مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔''

سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے چوبیس حصے کر لیے جائیں، ان میں سے آٹھواں حصہ یعنی تین حصے بیوہ کو اور دو تہائی یعنی سولہ حصے دونوں بیٹوں کو پھر باقی پانچ حصے حقیقی بھائی اور بہن کے ہیں لیکن یہ پانچ حصے بہن بھائی میں پورے پورے تقسیم نہیں ہوتے ہیں اس کے لیے حصوں کو زیادہ کر لیا جائے اور تین سے ضرب دے کر چوبیس کے بجائے ۷۲ حصے بنا لیے جائیں۔ پھر ہر ایک کے حصے کو تین سے ضرب دی تو درج ذیل صورت بن جائے گی۔

بیوہ = 3×3=9، دو بیٹیاں 3×16=48 چوبیس حصے فی بیٹی، بہن بھائی 3×5=15 بھائی کو 10 اور بہن کے لیے پانچ حصے ہوں گے۔ (واللہ اعلم)

غیر مسلم کا وارث مسلمان ہو سکتا ہے؟

سوال میرے والدین غیر مسلم ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نعمتِ اسلام سے نوازا ہے، میرے والد فوت ہو چکے ہیں، کیا مجھے ان کے ترکہ سے اپنا حصہ لینے کا حق ہے؟ اس کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں میری راہنمائی فرمائیں۔

جواب اللہ تعالیٰ کا آپ پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے آپ کو نعمتِ اسلام عطا فرمائی ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے استقامت کی دعا کرتے ہیں، دین اسلام وہ دولت ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا اور اس کے ساز و سامان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو اس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ اگر امر واقعہ اسی طرح ہے تو کفر پر مرنے والے شخص کی مسلمان اولاد وارث نہیں ہوگی۔

چنانچہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کافر کا اور کافر، مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔'' [3]

اس حدیث کی رو سے آپ اپنے غیر مسلم باپ کی جائیداد کے قطعاً حقدار نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے عوض آپ کو بہت کچھ دے گا۔ (واللہ اعلم)

رخصتی سے قبل فوت ہو جانے والی کے حق مہر سے خاوند کا حصہ

سوال ایک عورت کا کسی شخص سے نکاح ہوا، لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ وہ فوت ہو گئی، اس کے کچھ زیورات ہیں

---

[1] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٥۔ [2] ٤/النساء:١٧٦۔ [3] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٦٤۔

جو خاوند نے اسے بطور حق مہر دیئے تھے، کیا اس کے ترکہ سے خاوند کو حصہ ملے گا یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب جب کسی عورت کا نکاح ہو جاتا ہے تو وہ بیوی بن جاتی ہے خواہ اس کی رخصتی نہ ہوئی ہو، اس کے لیے بیوی کے حقوق ثابت ہو جاتے ہیں، اسی طرح جس سے نکاح ہوا ہے وہ اس کا خاوند بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی فوت ہو جائے تو ایک کو دوسرے کا وارث بنایا جائے گا۔ صورت مسئولہ میں خاوند نے جو زیورات بطور حق مہر دیئے ہیں ان میں سے نصف کا حقدار اس کا خاوند ہے اگرچہ رخصتی نہیں ہوئی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ﴾ [1]

''تمہاری بیویاں جو مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو تمہارے لیے ان کے ترکہ سے نصف ہے۔''

اگر مرنے والی لڑکی کا کوئی وارث ہے تو باقی ماندہ مال اسے دیا جائے گا، بصورت دیگر اسے بیت المال میں جمع کرا دیا جائے کیونکہ جس مال کا کوئی معین مالک نہ ہو اسے بیت المال میں جمع کرا دیا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

دیور اور دوسری بیوی کی بیٹی کی موجودگی میں لاولد عورت کا حصہ

سوال ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، ایک تو اس کی زندگی میں فوت ہو گئی، اس کے بطن سے پیدا ہونے والی ایک بیٹی زندہ ہے، اس کی دوسری بیوی لاولد ہے، اب وہ آدمی فوت ہو چکا ہے اور اس کا ایک بھائی بھی زندہ ہے، جائیداد کی تقسیم کیسے کی جائے گی، کیا بیوی کو لاولد ہونے کی وجہ سے چوتھا حصہ ملے گا؟

جواب علم فرائض میں جو حصص میں کمی بیشی ہوتی ہے وہ میت کے ساتھ پسماندگان کی نسبت کی وجہ سے ہے، یعنی خاوند جو فوت ہوا ہے اگر وہ صاحب اولاد تھا تو اس کی بیوی یا بیویوں کو آٹھواں حصہ ملتا ہے اور اگر وہ لاولد ہے تو ایک بیوی یا متعدد بیویوں کو چوتھا حصہ دیا جاتا ہے، اس صورت میں بیوی کے صاحب اولاد یا لاولد ہونے سے ان کے حصص پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، اسی طرح جو وارث متوفی کی زندگی میں فوت ہو جائے وہ بھی ترکہ سے کچھ حصہ نہیں پاتا، اس وضاحت کے بعد صورت مسئولہ میں جائیداد کی تقسیم حسب ذیل طریقہ سے ہوگی۔

☆ میت کی بیٹی کو نصف ترکہ ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ﴾ [2]

''اگر ایک بیٹی ہے تو اسے ترکہ سے نصف ملے گا۔''

☆ لاولد بیوی کو کل جائیداد سے آٹھواں حصہ دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ [3]

---

[1] ٤/النساء:١٢۔ [2] ٤/النساء:١١۔ [3] ٤/النساء:١٢۔

''اگر تمہاری اولاد ہے تو بیویوں کو ترکہ سے آٹھواں حصہ دیا جائے۔''

☆ جو بیوی، خاوند کی وفات سے پہلے فوت ہو چکی ہے، اسے کچھ بھی نہیں ملے گا بلکہ وہ محروم ہے۔ آسانی کے پیش نظر کل جائیداد کے چوبیس حصے کر لیے جائیں، ان میں نصف یعنی بارہ حصے لڑکی کے لیے ہیں اور کل جائیداد کا آٹھواں حصہ یعنی تین حصے اس کی لاولد بیوی کو دیئے جائیں، بارہ اور تین کے مجموعہ پندرہ کو چوبیس سے منہا کر کے باقی نو حصے بھائی کو مل جائیں گے، اگر میت کے ذمہ قرض ہے یا اس نے وصیت کی ہے تو قرض کی ادائیگی اور وصیت کا اجراء تقسیم سے پہلے ہو گا جب کہ وصیت کسی صورت میں ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو، مذکورہ تفصیل کے مطابق جائیداد کو تقسیم کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

پھوپھی کا حصہ؟

سوال ایک لڑکی کی شادی اس کے چچا زاد سے ہوئی، عرصہ بیس سال سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی، اب وہ فوت ہو گئی ہے اس کے ورثاء میں سے صرف ایک خاوند ہے اور اس کی پھوپھی بھی زندہ ہے، اس صورت میں اس کے ترکہ کا کون حقدار ہو گا، کیا پھوپھی کو کچھ ملے گا یا نہیں؟

جواب صورت مسئولہ میں فوت ہونے والی لڑکی لاولد ہے، اس کا خاوند نصف ترکہ کا حقدار ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَكُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَكَ اَزۡوَاجُكُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهُنَّ وَلَدٌ﴾ [1]

''اور تمہارے لیے نصف ہے اس ترکہ سے جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو۔''

خاوند کو نصف دے کر جو باقی بچا ہے اس کا حقدار بھی خاوند ہے کیونکہ وہ اس کا قریبی مذکر رشتہ دار ہے، عصبہ ہونے کی حیثیت سے وہ باقی جائیداد کا حقدار ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''مقرر حصہ حقداروں کو دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کا ہے۔'' [2]

اس صورت میں خاوند نے دو جہتوں سے حصہ لیا ہے ایک جہت مقررہ حصہ لینے کی ہے اور دوسری جہت باقی ماندہ ترکہ لینے کی ہے، کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا قریبی رشتہ دار نہیں ہے، پھوپھی کو کچھ نہیں ملے گا، شریعت میں اس کا کوئی حصہ نہیں لہٰذا وہ محروم ہے، مختصر یہ کہ مرنے والی عورت کا تمام ترکہ خاوند لے گا۔ واللہ اعلم)

نواسا، نواسی کا وارث ہونا

سوال ایک آدمی کی زندگی میں اس کی شادی شدہ صاحب اولاد بیٹی فوت ہو گئی، اس کے بعد وہ خود بھی فوت ہو گیا، اس کی پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا زندہ ہے جب کہ فوت شدہ بیٹی کا ایک بیٹا اور بیٹی بھی موجود ہے بیوی بھی حیات ہے، اس صورت میں فوت ہونے والے کی جائیداد کس طرح تقسیم ہو گی؟ اس کا نواسا اور نواسی بھی دعویدار ہیں کہ ہمیں بھی اس جائیداد سے حصہ دیا جائے۔ کتاب وسنت کے مطابق اس کا حل بتائیں۔

---

[1] ٤/النساء:١٢۔ [2] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٧٢۔

جواب قرآن وحدیث کے مطابق جائیداد کی تقسیم کا ایک اصول یہ ہے کہ میت کے ساتھ اگر کسی کا قریبی رشتہ ہے تو اس کی موجودگی میں دور والا رشتہ دار محرم ہوتا ہے مثلاً بیٹے کی موجودگی میں اس کا پوتا اور بیٹی کی موجودگی میں اس کا نواسا وغیرہ محروم ہوتے ہیں، چونکہ صورت مسئولہ میں میت کے قریبی رشتہ دار بیٹا اور بیٹیاں موجود ہیں اس لیے ان کی موجودگی میں نواسا اور نواسی محروم ہیں، ہاں اگر ان کی والدہ مرحوم کی وفات کے بعد فوت ہوتی تو نواسے اور نواسی کو اپنی ماں کا حصہ ملنا تھا لیکن وہ اپنے باپ کی زندگی میں فوت ہوگئی لہٰذا اسے یا اس کی اولاد کو محروم کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا، سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کی وفات کے بعد اس کی بیوی، بیٹا اور بیٹیاں زندہ ہیں، انہیں حسب ذیل تفصیل سے حصہ دیا جائے گا۔

☆ خاوند اگر صاحب اولاد ہو تو اس کی جائیداد سے ایک بیوی یا متعدد بیویوں کو آٹھواں حصہ ملتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ [1]

’’اگر تمہاری اولاد ہے تو بیویوں کے لیے آٹھواں حصہ ہے۔‘‘

☆ بیوی کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد باقی جائیداد اولاد میں اس طرح تقسیم کی جائے کہ بیٹے کو بیٹی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ ملے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ﴾ [2]

’’اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔‘‘

☆ آسانی کے پیش نظر کل جائیداد کے آٹھ حصے کر لیے جائیں، ان میں سے ایک بیوی کو، دو حصے بیٹے کو اور ایک حصہ ہر بیٹی کو دے دیا جائے، نواسا اور نواسی کو اس جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا، اگر مرحوم کی اولاد اپنی طرف سے کچھ دینا چاہیں تو الگ بات ہے۔ (واللہ اعلم)

میت کا صرف ایک بھتیجا اور اس کی بہن کی اولاد ہے ترکہ سے انہیں کیا ملے گا؟

سوال ایک آدمی فوت ہوا ہے اس کے والدین، بہن بھائیوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں، صرف بھائی کا ایک بیٹا اور اس کی بہن کی اولاد بھانجے اور بھانجیوں کی صورت میں موجود ہے کیا اس کے ترکہ میں سے بہن کی اولاد کو کچھ ملے گا یا نہیں؟

جواب صورت مسئولہ میں مرنے والے کی کوئی اولاد، والدین اور بہن بھائی نہیں ہیں، صرف ایک بھتیجا اور اس کی بہن کے بچے ہیں، اس صورت میں اس کی جائیداد کا مالک صرف اس کا بھتیجا ہوگا، کیونکہ وہ عصبہ ہے، عصبہ وارث اگر اس کے ساتھ مقررہ حصہ لینے والے موجود ہوں تو مقررہ حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ اسے دیا جاتا ہے اگر مقررہ حصہ لینے والے کوئی نہ ہو تو وہ ساری جائیداد کا مالک ہوتا ہے، اس میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ’’مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دو، اور جو باقی بچے وہ میت کے مذکر قریبی رشتہ دار کا ہے۔

---

[1] ٤/النساء:١٢۔ [2] ٤/النساء:١١۔

صورت مسئولہ میں میت کا مذکر قریبی رشتہ دار بھتیجا ہے لہٰذا وہ ساری جائیداد کا مالک ہوگا، اور بہن کی اولاد ذوی الارحام سے ہے، عصبات کی موجودگی میں انہیں جائیداد سے کچھ نہیں ملتا۔ (واللہ اعلم)

دو بہنیں اور بھتیجا وارث ہو تو تقسیم

سوال ایک آدمی فوت ہوا ہے، اس کی دو بہنیں اور ایک بھتیجا ہے، والدین پہلے سے فوت شدہ ہیں، چھ ایکڑ زرعی زمین کو ان کے درمیان کیسے تقسیم کیا جائے؟

جواب زندگی میں فوت ہونے والے رشتہ دار جائیداد سے محروم رہتے ہیں، انہیں کسی کے ترکہ سے کچھ نہیں ملتا، البتہ کسی کی وفات کے بعد جو ورثاء زندہ ہوں انہیں جائیداد سے بقدر حصہ وراثت ملتی ہے۔ صورت مسئولہ میں والدین مرنے والے کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے لہٰذا انہیں کچھ نہیں ملے گا، البتہ مرتے وقت ایک ایک بھتیجا اور دو بہنیں زندہ تھیں، انہیں ترکہ سے درج ذیل تفصیل کے مطابق حصہ دیا جائے گا:

دو بہنوں کو کل جائیداد سے دو تہائی ملتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ﴾ [1]

''اور اگر بہنیں دو ہوں تو ان کو ترکہ کا دو تہائی ملے گا۔''

جائیداد سے دو تہائی نکالنے کے بعد جو باقی بچے وہ بھتیجے کا حق ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دو اور جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [2]

میت کا قریبی رشتہ دار اس کا بھتیجا ہے، آسانی کے پیش نظر جائیداد کے تین حصے کیے جائیں، دو حصے میت کی بہنوں کے لیے اور ایک حصہ اس کے بھتیجے کے لیے ہے، چونکہ اس کا ترکہ چھ ایکڑ زرعی زمین ہے، اس لیے چار ایکڑ دو بہنوں کے لیے یعنی دو بہنیں دو، دو ایکڑ کی حقدار ہیں، اور باقی دو ایکڑ اس کے بھتیجے کو دیے جائیں۔ (واللہ اعلم)

نابالغ بچوں کے مال سے زکوٰۃ دینا

سوال میرے بھائی فوت ہوئے تو انہوں نے اپنے بچوں کے لیے کچھ مال چھوڑا ہے جو میرے پاس محفوظ ہے، بچے ابھی نابالغ ہیں، کیا اس مال سے زکوٰۃ دینا ضروری ہے؟

جواب کچھ اہل علم کا موقف ہے کہ نابالغ بچے کے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے کیونکہ بلوغ سے قبل وہ شرعی احکام کا پابند نہیں ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''تین آدمیوں کا گناہ نہیں لکھا جاتا، سونے والے کا تا آنکہ وہ بیدار ہو جائے، بچے کا جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے اور پاگل کا حتیٰ کہ اسے افاقہ ہو جائے۔'' [3]

ان حضرات کا کہنا ہے کہ نابالغ کے مال سے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔ لیکن ہمارے رجحان کے مطابق نابالغ کے مال میں بھی

---

[1] ٤/النساء: ١٧٦۔ [2] بخاری، الفرائض: ٦٧٣٦۔ [3] مسند امام احمد، ص: ١١٤، ج٦۔

زکوٰۃ فرض ہے کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے وہ کسی نابالغ کی بنا پر ساقط نہیں ہوتا، چونکہ غرباء اور مساکین کو فائدہ پہنچانا ہے لہٰذا مال کسی کا بھی ہو اس سے ان کا حق نکالنا ضروری ہے، ایک مشہور حدیث میں ہے کہ ان کے دولتمندوں سے زکوٰۃ لی جائے۔ یہ الفاظ عام ہیں، ان میں بالغ یا نابالغ کی کوئی تخصیص نہیں ہے اس لیے بچوں کے مال سے زکوٰۃ دینا ہوگی بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے اور اس زکوٰۃ کی ادائیگی بچوں کے سرپرست کی ذمہ داری ہے۔ (واللہ اعلم)

ورثاء بیوہ، بہن اور مادری بھائی ہوں تو تقسیم؟

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کی بیوہ، دو حقیقی بہنیں اور ایک مادری بھائی زندہ ہے، اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟ واضح رہے کہ فوت ہونے والا لاولد تھا۔

جواب بشرط صحت سوال فوت ہونے والا لاولد تھا، اس بنا پر اس کی بیوی کو کل جائیداد سے چوتھا حصہ ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ﴾ [1]

''اور جو ترکہ تم چھوڑ جاؤ، اس میں سے بیویوں کے لیے چوتھائی ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو۔''

دو حقیقی بہنیں کل جائیداد سے دو تہائی کی حقدار ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ﴾ [2]

''اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس کے لیے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے اور وہ بھائی اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کی اولاد نہ ہو، اگر بہنیں دو ہوں تو انہیں کل ترکہ سے دو تہائی ملے گا۔''

مادری بھائی کو مرحوم کی جائیداد سے چھٹا حصہ ملے گا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ﴾ [3]

''جن کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو یعنی اس کا باپ بیٹا نہ ہو اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔''

واضح رہے کہ آیت کریمہ میں بہن بھائی سے مراد مادری بہن بھائی ہیں، کیونکہ حقیقی یا پدری بہن بھائیوں کی وراثت کا بیان اس سورت کے آخر میں بیان ہوا ہے، صورت مسئولہ میں میت کی جائیداد کے بارہ حصے کیے جائیں، ان میں سے تین حصے بیوہ کو، آٹھ حصے حقیقی بہنوں کو اور دو حصے مادری بھائی کو دیے جائیں، جب ان حصص کو جمع کیا تو یہ تیرہ حصے بن جاتے ہیں جب کہ مرحوم کی جائیداد کے کل بارہ حصے تھے، اب تمام ورثاء کے حصوں میں تھوڑی تھوڑی کمی کر کے کل جائیداد کو تیرہ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ علم

---

[1] ٤/النساء:١٢۔ [2] ٤/النساء:١٧٦۔ [3] ٤/النساء:١٢۔

فرائض کی اصطلاح میں اسے عول کہتے ہیں، عول کے مسئلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہے، صورت مسئولہ اس طرح ہوگی:

میت 13/12 بیوی 1/4=3 دو حقیقی بہنیں 2/3=8 ایک مادری بھائی 1/6=2 (واللہ اعلم)

قاتل کا مقتول کا وارث بننا

سوال بیوی نے خاوند کو قتل کر دیا اور مرنے والے کا ایک بیٹا اور والدہ موجود ہے، عورت نے آگے نکاح کر لیا ہے۔ کیا اسے مرحوم خاوند کی جائیداد سے حصہ ملے گا، نیز بتائیں کہ اس صورت میں ماں کو کل ترکہ سے کیا ملے گا؟

جواب شریعت اسلامیہ میں قاتل، مقتول کی جائیداد سے محروم ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''قاتل کسی چیز کا وارث نہیں بن سکتا۔'' [1]

ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ ''قاتل کو مقتول کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔'' [2]

ان احادیث کی روشنی میں علمائے امت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قتل، وراثت کے حصول میں رکاوٹ ہے اور قاتل، مقتول کا وارث نہیں ہوگا، اگرچہ کچھ اہل علم نے یہ تفریق کی ہے کہ اگر قتل خطا ہو تو وارثت سے محرومی کا باعث نہیں ہے لیکن ہمارے رجحان کے مطابق اس تفریق کی کوئی دلیل نہیں ہے لہٰذا ہر حال میں قاتل کو مقتول کی جائیداد سے محروم کیا جائے گا، صورت مسئولہ میں اپنے خاوند کو قتل کرنے والی بیوی کو خاوند کی جائیداد سے محروم کیا جائے گا خواہ وہ آگے شادی کر لے یا ویسے بیٹھی رہے، مقتول کے ورثاء ایک بیٹا اور اس کی والدہ ہیں، اولاد کی موجودگی میں ماں کو چھٹا حصہ ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ﴾ [3]

''اگر میت کی اولاد بھی ہو اور والدین بھی تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔''

جائیداد سے ماں کا چھٹا حصہ نکالنے کے بعد جو 5/6 بچا ہے وہ اس کے بیٹے کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''مقررہ حصہ، حقداروں کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کا ہے۔'' [4]

صورت مسئولہ میں میت کا قریبی مذکر رشتہ دار اس کا بیٹا ہے، لہٰذا ماں کا حصہ نکالنے کے بعد باقی ترکہ کا وارث اس کا بیٹا ہوگا۔ (واللہ اعلم)

وصیت پوری کرنا

سوال ایک آدمی کے تین وارث زندہ ہیں، بیوی، بیٹی اور پوتا۔ اس نے ان کے حق میں وصیت نامہ لکھا ہے کہ میری کل جائیداد سے 33% بیوی کو، 33% بیٹی کو اور 44% پوتے کو دے دیا جائے، کیا یہ وصیت جائز ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں

---

[1] ابوداود، الدیات: ٤٥٦٣۔ [2] بیهقی، ص: ٢٢٠، ج٦۔

[3] ٤/النساء: ١١۔ [4] بخاري، الفرائض: ٦٧٣٢۔

وضاحت کریں؟

جواب کسی انسان کو ورثاء کی موجودگی میں اپنے سارے مال کی وصیت کرنا نا جائز ہے، مال کی تقسیم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ضابطہ میراث نازل فرمایا ہے، مرنے کے بعد اس ضابطہ میراث کے مطابق اس کا مال تقسیم ہوگا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ صدقہ کیا ہے کہ تم اپنے مال سے ایک تہائی کی وصیت کر سکتے ہو تاکہ تمہاری نیکیوں میں اضافہ کا باعث ہو نیز تمہارے نیک اعمال زیادہ ہونے کا باعث ہو۔'' [1]

اس حدیث کے پیش نظر انسان اپنے مال سے زیادہ سے زیادہ تیسرے حصہ تک وصیت کر سکتا ہے لیکن وہ وصیت بھی کسی غیر وارث کے لیے ہو۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے اب کسی وارث کے لیے کوئی وصیت جائز نہیں۔ [2]

صورت مسئولہ میں دو غیر شرعی چیزیں ہیں: ایک تو اپنے تمام مال کی وصیت کی ہے جو کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ دوسری شرعی ورثاء کو وصیت کی گئی ہے جو مندرجہ بالا حدیث کی خلاف ورزی ہے۔ ان دو غیر شرعی باتوں کی وجہ سے یہ وصیت کالعدم ہوگی اس کی اصلاح ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ [3]

''اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو وہ اگر وارثوں کے درمیان صلح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔''

چونکہ اس وصیت میں اپنے ورثاء کے متعلق طرفداری اور حق تلفی کی گئی ہے لہٰذا اس کی اصلاح ضروری ہے، اس کی اصلاح یہ ہے کہ اسے کالعدم قرار دیا جائے اور مرنے کے بعد درج ذیل شرح کے مطابق اس کی جائیداد تقسیم ہوگی۔

☆ اولاد کی موجودگی میں اس کی بیوی کو کل جائیداد سے آٹھواں حصہ دیا جائے گا۔

☆ اس کی بیٹی چونکہ ایک ہے اس لیے وہ اس کی جائیداد سے نصف کی حقدار ہوگی۔

☆ پوتا عصبہ ہے لہٰذا ورثاء سے جو مال بچے گا وہ پوتے کو مل جائے گا۔ سہولت کے پیش نظر اس کی جائیداد کے کل چوبیس حصے ہوں گے، ان میں سے آٹھواں یعنی تین حصے بیوی کو، آدھا یعنی بارہ حصے بیٹی کو اور باقی نو حصے پوتے کو مل جائیں گے۔ یہ تقسیم اس صورت میں ہوگی جب صاحب جائیداد کی وفات کے وقت اس کے مذکورہ بالا ورثاء زندہ ہوں، اگر کوئی رشتہ دار اس کی زندگی میں فوت ہو گیا تو وہ خود بخود اس کی جائیداد سے محروم ہو جائے گا۔ (واللہ اعلم)

مشترکہ مال سے حاصل ہونے والے پلاٹ کی تقسیم

سوال میرے بھائی کے ساتھ ہمارے علاقہ کے پٹواری کا لڑکا پڑھتا تھا، اس نے اپنے والد سے سفارش کی کہ انہیں

---

[1] ابن ماجہ، الوصایا: ۲۷۰۹۔ [2] ترمذی، الوصایا: ۲۱۲۱۔ [3] ۲/البقرۃ: ۱۸۲۔

رہائش کے لیے ایک پلاٹ دے دیا جائے، اس طرح میرے بھائی کو سفارش سے ایک پلاٹ رہائش کے لیے مل گیا اور ہمارے والد گرامی کے نام ہو گیا، ہم تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ہمارے وہ بھائی فوت ہو چکے ہیں جن کی سفارش سے پلاٹ ملا تھا، اب اس کی اولاد کا دعویٰ ہے کہ مذکورہ پلاٹ ہمارے باپ کی محنت اور کوشش کا ثمرہ ہے لہٰذا ہم اس کے حقدار ہیں، واضح رہے کہ جب پلاٹ ہمارے باپ کے نام ہوا تھا اس وقت ہمارے بھائی کی شادی نہیں ہوئی تھی، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب والد کی زندگی میں اس کے چھوٹے بڑے لڑکے جو کمائی کرتے ہیں وہ باپ کی ہی شمار ہوتی ہے ہاں اگر کسی لڑکے کی شادی ہو جائے اور وہ اپنے بال بچوں کو الگ رکھتا ہو اور علیحدہ طور پر کھاتا پیتا ہو تو اس صورت میں اس کی کمائی اپنی شمار ہو گی، اگر شادی سے پہلے اپنے باپ کے ہمراہ جو کمائی کرتا ہے تو وہ سب باپ کے لیے ہو گا اور اس کی ملکیت شمار کیا جائے گا، صورت مسئولہ میں بھائی کے بچوں کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ یہ پلاٹ ہمارے باپ کی سفارش سے حاصل ہوا تھا، یہ ہمارا ہے اور ہم ہی اس کے حقدار ہیں، ایک حدیث میں اس امر کی صراحت ہے: ''تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے۔'' [1]

اس حدیث کے پیشِ نظر بچوں کی کمائی شرعی اور معاشرتی طور پر باپ کی شمار ہو گی، اگر اس کی بیوی زندہ نہیں ہے تو باپ کی جائیداد کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ان میں دو، دو حصے ہر لڑکے کو اور ایک ایک حصہ لڑکیوں کے لیے ہو گا، اپنے دادا کی جائیداد سے اس کے پوتے اور پوتیاں محروم ہوں گے جب کہ مرحوم کی حقیقی اولاد موجود ہے، ہمارے رجحان کے مطابق اس طرح کے معاملات کو وجہ نزاع نہ بنایا جائے بلکہ افہام و تفہیم کے ذریعے حل کیا جائے۔ بچوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہوئے انہیں کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے تاکہ یتیم بچے کس مپرسی کا شکار نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (واللہ اعلم)

مقتول کی وراثت

سوال ہمارے ہاں ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کر دیا، قاتل کے علاوہ اس کے دو بھائی، ایک بہن اور ماں زندہ ہے، مقتول کی وراثت کیسے تقسیم کی جائے گی؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ قاتل جائیداد سے محروم ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قاتل کسی چیز کا بھی وارث نہیں بن سکتا۔'' [2] مقتول کے شرعی وارث دو بھائی، ایک بہن اور والدہ ہیں۔ والدہ کو اس کی جائیداد سے چھٹا حصہ ملے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَهُۥٓ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ ٱلسُّدُسُ﴾ [3]

''اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔''

ماں کا چھٹا حصہ نکال کر باقی ترکہ کو دو بھائیوں اور ایک بہن میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ ملے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] ابوداود، البیوع: ٣٥٣٠۔ [2] ابوداود، الدیات: ٤٥٦٤۔ [3] ٤/النساء:١١۔

﴿ وَإِنْ كَانُوٓا۟ إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ ٱلْأُنثَيَيْنِ ۗ ﴾ ❶

''اگر میت کے پیچھے کئی بھائی اور بہنیں ہیں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔''

سہولت کے پیش نظر مقتول کی جائیداد کے چھ حصے کر لیے جائیں، ایک حصہ ماں کو، دو دو حصے بھائیوں کو اور ایک حصہ بہن کو دے دیا جائے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

بھائی کی وراثت سے حصہ لینا

سوال ہمارے بڑے بھائی فوت ہوئے ہیں پسماندگان میں ایک بیوی، ایک بیٹی، والدہ، دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ اس کی جائیداد کو شرعی طور پر کیسے تقسیم کیا جائے گا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں سب سے پہلے مرحوم کے ذمے اگر کوئی قرض وغیرہ ہے تو اس کی ادائیگی ضروری ہے پھر وصیت کا اجراء کیا جائے بشرطیکہ وہ کسی وارث کے لیے نہ ہو اور جائز کام کے لیے کل ترکہ کا 1/3 سے زیادہ نہ ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِى بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ ﴾ ❷

''ان حصوں کی تقسیم اس وصیت کے بعد ہے جو مرنے والا کر گیا ہو یا ادائے قرض کے بعد ہے۔''

ادائے قرض اور نفاذ وصیت کے بعد تقسیم ترکہ حسب ذیل طریقہ کے مطابق ہوگی۔

☆ بیوہ کو کل ترکہ سے آٹھواں حصہ دیا جائے، کیونکہ میت کی اولاد موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ ٱلثُّمُنُ ﴾ ❸

''اگر تمہاری اولاد ہے تو ان بیویوں کو تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا۔''

☆ ایک بیٹی کو کل ترکہ کا نصف دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن كَانَتْ وَٰحِدَةً فَلَهَا ٱلنِّصْفُ ۚ ﴾ ❹

''اور اگر ایک لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے۔''

☆ اولاد کی موجودگی میں ماں کو چھٹا حصہ ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَٰحِدٍ مِّنْهُمَا ٱلسُّدُسُ ﴾ ❺

''اور میت کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے اس کے ترکہ سے چھٹا حصہ ہے اگر اس کی اولاد موجود ہے۔''

☆ مقررہ حصص دینے کے بعد جو باقی بچے گا وہ بہن بھائیوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ ملے،

---

❶ ٤/النساء:١٧٦۔ ❷ ٤/النساء:١١۔ ❸ ٤/النساء:١٢۔

❹ ٤/النساء:١١۔ ❺ ٤/النساء:١١۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ ❶

''اگر مرحوم کے بہن بھائی مرد اور عورتیں ہیں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیا جائے۔''

چنانچہ دو بھائی اور ایک بہن ہے، اس لیے باقی ترکہ پانچ حصوں میں تقسیم ہوگا پھر دو حصے ہر بھائی کو اور ایک حصہ بہن کو دیا جائے گا۔ سہولت کے پیش نظر مرحوم کے ترکہ کو چوبیس حصوں میں تقسیم کرلیا جائے، پھر حسب ذیل تقسیم سے ورثاء میں ترکہ بانٹ دیا جائے۔

بیوی: 24 کا 1/8 = 3 بیٹی: 24 کا 1/2 = 12 والدہ: 24 کا 1/6 = 4 باقی 5 حصے بہن بھائیوں میں اس طرح تقسیم کریں کہ ایک بھائی کو بہن سے دوگنا ملے۔ چنانچہ باقی پانچ حصص میں سے چار حصے دونوں بھائیوں کو اور ایک حصہ بہن کو دے دیا جائے۔ بیوی: 3، والدہ: 4، بیٹی: 12 بھائی: 2 بھائی: 2 بہن: 1 مجموعی تعداد 24۔ (واللہ اعلم)

بیوہ اور بچوں کے حصص

سوال ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں اس کی بیوہ، چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، اس کا ترکہ ایک لاکھ ڈالر ہے، اس ترکہ کی تقسیم کیسے ہوگی؟

جواب کفن ودفن کے اخراجات، قرض کی ادائیگی اور وصیت کے نفاذ کے بعد اس کے ترکہ کی تقسیم حسب ذیل طریقہ سے ہوگی: سب سے پہلے اس کی بیوہ کا آٹھواں حصہ نکالا جائے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ ❷

''اگر تمہاری اولاد ہے تو تمہاری بیویوں کو تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا۔''

اس لیے ایک لاکھ ڈالر سے آٹھواں حصہ بارہ ہزار پانچ صد ڈالر بیوہ کو دے دیا جائے پھر باقی ماندہ ترکہ جو ستاسی ہزار پانچ صد (۸۷۵۰۰) ڈالر ہے اسے دس حصوں میں تقسیم کیا جائے دو، دو حصے فی لڑکا اور ایک ایک حصہ فی لڑکی تقسیم کر دیا جائے، واضح رہے کہ باقی ماندہ ترکہ کو دس پر تقسیم کرنے سے آٹھ ہزار سات سو پچاس ڈالر حصہ نکلتا ہے، یہ حصہ ایک لڑکی کا ہے اور اس سے دوگنا یعنی سترہ ہزار پانچ صد (۱۷۵۰۰) ڈالر ہر لڑکے کو دے دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ ❸

''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔''

(واللہ اعلم بالصواب)

---

❶ ٤/النساء: ١٧٦۔ ❷ ٤/النساء: ١٢۔
❸ ٤/النساء: ١١۔

اجتماعی اموات میں ترکہ کی تقسیم

سوال ایک گاڑی میں ماں، بیٹا اور اس کی بیوی سوار تھے، کار کو حادثہ پیش آ گیا، نتیجہ میں تینوں فوت ہو گئے۔ اب ان کے ترکہ کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ کیا مرنے والے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے یا زندہ کو ہی ان کا وارث بنایا جائے گا؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس کا حل پیش کریں۔

جواب ہمارے ہاں اجتماعی اموات کے واقعات عام طور پر وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں، مثلاً چند افراد دیوار کے نیچے آ گئے یا پانی میں ڈوب گئے یا آگ میں جل گئے یا کسی معرکہ میں کام آ گئے یا کہ بس، ہوائی جہاز اور ریل گاڑی کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ ایسے حالات میں جب دو یا دو سے زیادہ ایک دوسرے کا ترکہ لینے والے یکبار اکٹھے فوت ہو جائیں تو پتہ نہ چل سکے کہ ان میں پہلے کون فوت ہوا اور بعد میں کس کو موت آئی ہو تو اس صورت میں فوت شدگان آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے بلکہ ان میں سے ہر ایک کا ترکہ ان کے زندہ ورثاء کو دیا جائے گا اور ان کے درمیان ہی تقسیم ہو گا کیونکہ کسی کو وارث بنانے کے لیے یہ بنیادی شرط ہے کہ وہ دوسرے کی موت کے وقت زندہ موجود ہو لیکن اجتماعی اموات میں یہ شرط مفقود ہے ہاں اگر یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ ایک شخص دوسرے سے پہلے فوت ہوا تھا، اس میں کوئی بھول اور شک نہ ہو تو بعد میں فوت ہونے والا پہلے مرنے والے کا وارث ہو گا کیونکہ مورث کی موت کے وقت وارث کا زندہ ہونا یقینی طور پر معلوم ہے بصورت دیگر اگر ایک دوسرے کی موت کا پہلے یا بعد میں ہونا معلوم نہ ہو سکے تو ایسے حالات میں اجتماعی حادثہ میں مرنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جنگ یمامہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے طاعون عمواس میں مرنے والوں کے متعلق حکم دیا کہ: ''زندوں کو فوت شدہ حضرات کا وارث بنائیں اور انہیں آپس میں ایک دوسرے کا وارث بنائیں۔''[1]

بہر حال اجتماعی حادثہ میں فوت ہونے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے بلکہ زندہ ورثاء میں ان کا ترکہ تقسیم کیا جائے گا اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے طاعون عمواس میں مرنے والے کو ایک دوسرے کے وارث بنایا تھا لیکن امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی روایات کو منقطع قرار دیا ہے جو نا قابل اعتبار ہیں۔[2]

بہنوں اور بھائیوں میں تقسیم؟

سوال ایک عورت نے اپنی زندگی میں چھ مرلہ پلاٹ فروخت کر کے اس کی قیمت استعمال کر لی ہے لیکن وہ خریدنے والوں کے نام انتقال نہیں کرا سکی، اب وہ فوت ہو گئی ہے اور اس کا ایک مکان ہے جو اس نے ترکہ میں چھوڑا ہے، اس کی سات بیٹیاں اور دو بہن بھائی ہیں جو باپ کی طرف سے ہیں، متروکہ جائیداد کی تقسیم کس طرح ہو گی؟ جب کہ اس کے بہن بھائی اس کے پلاٹ سے بھی حصہ مانگتے ہیں جو فروخت ہو چکا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا حل بتائیں۔

---

[1] البیہقی، ص: ۲۲۲، ج٦۔ [2] بیہقی، ص: ۲۲۲، ج٦۔

جواب انسان اپنی زندگی میں جو چیز فروخت کر دیتا ہے وہ اس کا مالک نہیں رہتا، پلاٹ کا بھی یہی معاملہ ہے وہ اس نے فروخت کر کے اس کی قیمت استعمال کر لی ہے، اگر اس کا انتقال نہیں ہوا تو یہ ایک قانونی معاملہ ہے۔ شرعی ورثاء کو چاہیے کہ وہ فروخت شدہ پلاٹ سے اپنا حصہ مانگنے کی بجائے خریدار کے نام اس کا انتقال کرائیں، کیونکہ وہ پلاٹ مرحومہ کا نہیں ہے بلکہ اس نے اپنی زندگی میں اسے فروخت کر کے اس کی قیمت استعمال کر لی ہے اور اسے اپنی ملکیت سے نکال دیا ہے، اب صرف وہ جائیداد تقسیم ہوگی جو مرنے کے وقت اس کے قبضہ میں تھی اور اس کی مالک تھی۔ سوال سے معلوم ہوا ہے کہ مرحومہ کا ترکہ صرف ایک مکان ہے جس میں وہ رہائش پذیر تھی، اب وہی مکان شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے: مرحومہ کی سات بیٹیوں کو مکان کا 2/3 ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ﴾ [1]

''اگر میت کی صرف لڑکیاں ہی ہیں اور وہ دو سے زیادہ ہیں تو انہیں مال متروکہ کا دو تہائی ملے گا۔''

لڑکیوں کو حصہ دینے کے بعد جو 1/3 باقی بچے گا وہ پدری بہن بھائیوں میں تقسیم ہوگا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ كَانُوٓا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۗ﴾ [2]

''اگر میت کے بہن بھائی مرد اور عورتیں دونوں قسم کے ہیں تو مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیا جائے گا۔''

سہولت کے پیش نظر متروکہ جائیداد کے تریسٹھ (٦٣) حصے کیے جائیں، ان میں سے دو تہائی یعنی بیالیس حصے سات بیٹیوں کے ہیں، ہر بیٹی کو چھ چھ حصے دیئے جائیں۔ باقی اکیس حصے اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ بھائی کو بہن کے مقابلہ میں دو حصے ملیں یعنی بھائی کو چودہ اور بہن کو سات دینا ہوں گے۔ بہرحال وہ پلاٹ جو مرحومہ نے اپنی زندگی میں فروخت کر کے اس کی قیمت استعمال کر لی ہے، اس میں شرعی ورثاء کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

بیوی، بچوں کے حصص

سوال ہمارے والد محترم جب فوت ہوئے تو ان کی بیوہ، تین بیٹے اور چار بیٹیاں موجود تھیں، ترکہ میں انہوں نے ایک مکان چھوڑا جس کی مالیت تقریباً دو کروڑ ہے، اس ترکہ کو پس ماندگان میں کیسے تقسیم کیا جائے گا؟

جواب مرحوم کی اولاد موجود ہے، اس لیے بیوہ کو کل ترکہ سے آٹھواں حصہ دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ [3]

''اگر تمہاری اولاد ہو تو بیویوں کو تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا۔''

بیوہ کو حصہ دینے کے بعد باقی ترکہ کو اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ ایک لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] ٤/النساء:١١۔ [2] ٤/النساء:١٧٦۔ [3] ٤/النساء:١٢۔

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ ﴾ [1]

''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔''

مرحوم کے ترکہ مکان کی مالیت دو کروڑ ہے اس کا آٹھواں حصہ پچیس لاکھ بیوہ کو دیا جائے، باقی ایک کروڑ پچھتر لاکھ کو تین بیٹوں اور چار بیٹیوں میں تقسیم کرنے کے لیے باقی ماندہ ترکہ کے دس حصے کیے جائیں، ایک حصہ سترہ لاکھ پچاس ہزار فی لڑکی اور پینتیس لاکھ فی لڑکے کے حساب سے اسے تقسیم کر دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

بہن اور بھتیجے، بھتیجیاں ورثا ہوں تو تقسیم

سوال ایک عورت فوت ہوئی ہے، اس کی ایک حقیقی بہن، چار بھتیجے اور تین بھتیجیاں زندہ ہیں، اس کا کل ترکہ 47 کنال 10 مرلے زرعی رقبہ ہے، ان ورثاء میں یہ جائیداد کس طرح تقسیم ہو گی؟ اولین فرصت میں جواب دیں۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ مرحومہ کے ترکہ سے نصف جائیداد اس کی حقیقی ہمشیرہ کو ملے گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ ﴾ [2]

''اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس کے لیے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے۔''

بہن کو مقررہ حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ مرحومہ کے چار بھتیجوں کے لیے ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حصہ دے کر جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [3]

سوال میں ذکر کردہ صورت میں میت کے قریبی مذکر رشتہ دار اس کے بھتیجے ہیں، بھتیجیوں کو کچھ نہیں ملے گا اور وہ میت کے بھتیجوں کے ساتھ عصبہ نہیں بنیں گی، علم میراث کی رو سے صرف چار آدمی اپنی بہنوں کو عصبہ بناتے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

بیٹا اپنی بہن کو عصبہ بناتا ہے۔ پوتے کی موجودگی میں پوتی عصبہ بنتی ہے۔ حقیقی بھائی، اپنی حقیقی بہن کو عصبہ بنائے گا۔ پدری بھائی اپنی پدری بہن کو عصبہ بناتا ہے۔ بھتیجا اور چچا اپنی بہنوں کو عصبہ نہیں بناتے، اس بنا پر میت کی بھتیجیوں کو کچھ نہیں ملے گا، میت کا کل ترکہ 950 مرلے زرعی زمین ہے جو 47 کنال 10 مرلے کے برابر ہے ان کا نصف حقیقی بہن کو اور باقی نصف میت کے بھتیجوں میں تقسیم ہو گا، یعنی 475 مرلے بہن کو اور 118:75 مرلے ہر بھتیجے کو ملیں گے۔ (واللہ اعلم)

رخصتی سے قبل منکوحہ کا حصہ

سوال ایک آدمی نے کسی عورت سے نکاح کیا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی اب وہ وفات پا چکا ہے کیا منکوحہ اس کے ترکہ کی حقدار ہے؟ اگر ہے تو کس قدر؟ نیز اس کے پس ماندگان میں سے دو حقیقی بہنیں اور ایک چچا زاد بھائی ہے، ان کے علاوہ اس کی پھوپھی بھی زندہ ہے۔ ایسے حالات میں اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہو گی؟ کتاب و سنت کے مطابق فتویٰ دیں۔

---

[1] ٤/النساء:١١۔ [2] ٤/النساء:١٧٦۔ [3] صحیح بخاری، الفرائض:٦٧٣٥۔

جواب جب عورت سے نکاح ہو جائے تو وہ اس کی بیوی بن جاتی ہے خواہ رخصتی عمل میں نہ آئے، رخصتی کا نہ ہونا مہر وغیرہ پر اثر انداز ہوتا ہے، البتہ وراثت میں وہ پوری پوری حقدار ہے۔ اگر چہ وہ عقد ثانی بھی کر لے، اگر مرنے والے کی اولاد نہیں ہے تو منکوحہ کو چوتھا حصہ ملے گا، سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لا ولد ہی فوت ہوا ہے۔ مرحوم کے منقولہ اور غیر منقولہ ترکہ کی تقسیم حسب ذیل تفصیل کے مطابق ہوگی۔

☆ منکوحہ غیر مدخولہ کو چوتھا حصہ دیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ﴾ [1]

''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو بیویوں کے لیے چوتھا حصہ ہے۔''

☆ دو حقیقی بہنوں کو دو تہائی دیا جائے گا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ﴾ [2]

''اگر بہنیں دو ہوں تو انہیں ترکہ سے دو تہائی ملے گا۔''

☆ مقررہ حصے لینے والوں کے حصص نکال کر جو باقی بچے وہ چچا زاد بھائی کا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصے لینے والوں کو ان کا حق دے دو اور جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کا ہے۔'' [3]

سہولت کے پیش نظر مرحوم کی جائیداد کو بارہ حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، ان میں ۱/۴ یعنی تین حصے منکوحہ غیر مدخولہ کے ہیں اور ۲/۳ یعنی آٹھ حصے دونوں حقیقی بہنوں کو دیے جائیں وہ انہیں برابر برابر تقسیم کر لیں گی، پھر ایک حصہ جو باقی بچا ہے وہ میت کے چچا زاد بھائی کا حق ہے، میت کی پھوپھی وارثت سے محروم ہے، اسے کچھ نہیں ملے گا۔ (واللہ اعلم)

بہن کو حصہ نہ دینا

سوال تقسیم وراثت کے وقت کیا کسی بہن کو غریب اور کمزور سمجھتے ہوئے جائیداد سے محروم کرنا جائز ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب دورِ جاہلیت میں عورتوں کو میراث میں شامل کرنے کا دستور نہ تھا بلکہ عورت خود ترکہ شمار ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق حکم امتناعی جاری فرمایا کہ

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا﴾ [4]

''اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔''

بلکہ عورتوں کا مرنے والے کی جائیداد سے حصہ مقرر فرمایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا

---

[1] ٤/النساء:١٢۔ [2] ٤/النساء:١٧٦۔ [3] صحيح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٢۔ [4] ٤/النساء:١٩۔

قَلَّ مِنۡهُ اَوۡ كَثُرَ ؕ نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ۝ ﴾ [1]

''مردوں کے لیے اس مال سے حصہ جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں خواہ یہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ، ہر ایک کا طے شدہ حصہ ہے۔''

اس آیت سے درج ذیل احکام معلوم ہوتے ہیں:

☆ ترکہ میں عورتوں کے لیے باقاعدہ حصہ ہے انہیں محروم نہیں کیا جا سکتا۔

☆ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ، منقولہ ہو یا غیر منقولہ، بہرحال وہ تقسیم ہوگا۔

☆ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور والے رشتہ دار محروم ہوں گے۔

بہرحال اسلام نے میت کی جائیداد میں عورتوں کو شریک کیا ہے، صورت مسئولہ بہت ہی تکلیف دہ ہے کہ باپ کی جائیداد سے ایک بیٹی کو صرف غریب اور کمزور ہونے کی وجہ سے محروم کیا گیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ورثاء کے حصے مقرر فرمائے ہیں، وہاں آخر میں تنبیہ بھی کی ہے:

﴿ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝ وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ يُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِيۡهَا ۖ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ۝ ﴾ [2]

''یہ اللہ کی حدود ہیں، جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں داخل کریں گے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا نیز اسے رسوا کن عذاب ہوگا۔''

بہن کو کمزور اور غریب خیال کر کے جائیداد سے محروم کرنا اللہ کی حدود سے تجاوز کرنا ہے، اس پر بہت سخت وعید ہے، خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جنت سے محروم کر دیں گے۔ (واللہ اعلم)

کنواری لڑکی کا ترکہ

سوال: ایک لڑکی کنواری فوت ہوئی ہے پس ماندگان میں سے والدہ، دو بھائی اور ایک بہن ہے، اس کا ترکہ زیورات وغیرہ کیسے تقسیم ہوں گے؟ قرآن وحدیث کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب: شرعی ضابطہ میراث کے مطابق مرنے والے کے جب بہن بھائی موجود ہوں تو والدہ کو چھٹا حصہ ملتا ہے۔ ارشاد

---

[1] ٤/النساء:٧۔ [2] ٤/النساء:١٣، ١٤۔

باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ﴾ [1]

''اگر میت کے بہن بھائی موجود ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔''

چھٹا حصہ نکالنے کے بعد باقی ترکہ بہن بھائیوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ بھائی کو بہن سے دوگنا ملے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ [2]

''اگر کئی بہن بھائی یعنی مرد اور عورتیں ملے جلے ہوں تو مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ میت کی جائیداد کو چھ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ان میں ایک حصہ والدہ کو، دو بھائیوں میں سے ہر بھائی کو دو، دو حصے اور بہن کو ایک حصہ دیا جائے، مثال کے طور پر اگر زیورات ۶ تولہ ہیں تو ایک تولہ والدہ کو دو، دو تولے ہر بھائی کو اور ایک تولہ بہن کو دے دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

نابالغ بچے کے مال سے زکوۃ ادا کرنا

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کا ایک بچہ بہت چھوٹا تھا، اور اسے وراثت میں ڈھیروں مال ملا، کیا بچے کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب شرعی احکام اس انسان پر لاگو ہوتے ہیں جو عاقل، بالغ اور مسلمان ہو اور فرضیت زکوٰۃ کے لیے اس کا صاحب نصاب ہونا بھی ضروری ہے، بچے کے مال میں سے زکوٰۃ دینے یا نہ دینے کے متعلق فقہاء کا بہت اختلاف ہے لیکن ہمارے رجحان کے مطابق بچے کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ﴾ [3]

''ان کے اموال میں سے آپ زکوٰۃ وصول کریں اور اس کے ذریعے انہیں پاک کریں۔''

اس آیت کریمہ میں بالغ اور غیر بالغ کی کوئی قید نہیں ہے نیز زکوٰۃ سے مقصود غرباء و مساکین کا فائدہ کرنا ہے لہٰذا ان کا حصہ نکالنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل روایات بھی بطور تائید پیش کی جا سکتی ہیں اگرچہ سند کے اعتبار سے ان میں کچھ ضعف پایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی یتیم کا کفیل ہو اسے چاہیے کہ وہ اس کے مال کو تجارت میں لگائے اسے یونہی نہ چھوڑے رکھے کہ اسے زکوٰۃ ختم کر دے۔'' [4]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یتیموں کے اموال کو تجارت میں لگاؤ، مبادا انہیں زکوٰۃ ختم کر دے۔'' [5]

---

[1] ٤/النساء:١١۔ [2] ٤/النساء:١٧٦۔ [3] ٩/التوبة:١٠٣۔

[4] ترمذی، زکوٰۃ: ٦٤١۔ [5] بیهقی، ص: ٤، ٩، ١٠٧۔

یہ دونوں روایات اگرچہ ضعیف ہیں تاہم بطور تائید انہیں پیش کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔

لڑکیوں کو وراثت سے محروم رکھنا

سوال عموماً لڑکیوں کو وراثت سے محروم کیا جاتا ہے، اس کے لیے بہانہ سازی کی جاتی ہے کہ انہیں جہیز کی صورت میں جائیداد کا حصہ دے دیا گیا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ نیز کیا لڑکی کے معاف کر دینے سے وراثتی حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بیس کنال زمین چار بھائیوں اور چار بہنوں میں کس طرح تقسیم ہوگی؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب جاہلیت قدیم میں وراثت کا حقدار صرف ان لڑکوں کو خیال کیا جاتا تھا جو دشمنوں سے لڑنے اور ان سے انتقام لینے کی ہمت رکھتے تھے، اس بنا پر عورتوں اور چھوٹی اولاد کو وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا عورتوں کو وراثت میں حصہ دار ٹھہرانے کے بجائے انہیں ورثہ شمار کیا جاتا تھا، اسے ترکہ کا مال خیال کیا جاتا، اس کا وارث سوتیلا بیٹا یا میت کا بھائی ہوتا، جیسا کہ درج ذیل حدیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عربوں کے دستور کے مطابق جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کی بیوی پر میت کے وارثوں کا زور چلتا تھا وہ چاہتے تو اس سے نکاح کر لیتے، چاہتے تو کسی دوسرے سے نکاح کر دیتے اور اگر چاہتے تو اسے بلا نکاح ہی رہنے دیتے، الغرض اس پر خاوند کے وارثوں کا اختیار ہوتا، عورت کے ورثاء کا کچھ بھی اختیار نہ ہوتا پھر درج ذیل آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا﴾ [1]

''اے ایمان والو! تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔''

اس سے عورتوں کو پوری آزادی مل گئی۔ [2]

وراثت سے محروم کرنے کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا اور درج ذیل حکم نازل فرمایا:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا﴾ [3]

''مردوں کے لیے اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، اسی طرح عورتوں کے لیے اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، خواہ یہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ، ہر ایک کا طے شدہ حصہ ہے۔''

اللہ نے اس حکم کے ذریعے عورت کو ذلت کے مقام سے نکال کر وراثت میں حصہ دار بنا دیا، لیکن افسوس کہ موجودہ جاہلیت جدیدہ میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے، اسے جہیز کی آڑ میں وراثت سے محروم کیا جاتا ہے یا اس پر دباؤ ڈال کر اس کا حصہ معاف کرا لیا جاتا ہے، ہمارے نزدیک اسے وراثت سے محروم کرنا یا حصہ دینے سے قبل معاف کرا لینا سنگین جرم ہے، جس کے متعلق قیامت کے دن باز پرس ہوگی، بیٹی یا بہن کو اس کا پورا پورا حصہ دے دیا جائے پھر اگر وہ معاف کر دے تو اسے اختیار ہے، جہیز ناجائز نہیں لیکن اس کے متعلق کچھ تحفظات ہیں جنہیں ہم کسی اور موقع پر بیان کریں گے۔ بہر حال عورتیں، وراثت میں پوری پوری حصے دار ہیں خواہ ان کو

---

[1] ٤/النساء:١٩۔ [2] صحیح بخاری، التفسیر: ٤٥٧٩۔ [3] ٤/النساء:٧۔

جہیز دے دیا گیا ہو، اس کی آڑ میں اسے وراثت سے محروم کرنا روشن خیالی کا ہی شاخسانہ ہے۔ سوال میں ۲۰ کنال کی تقسیم کا بھی دریافت کیا گیا ہے، اس کے متعلق عرض ہے کہ منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کے بارہ حصے کر لیے جائیں پھر ان سے دو، دو حصے فی لڑکا اور ایک، ایک حصہ لڑکی کو دے دیا جائے۔ اس کے بعد پٹواری کا کام ہے کہ وہ زمین کو مذکورہ حصص کے مطابق تقسیم کرے، ویسے ایک لڑکے کا حصہ ۳ کنال ۶ مرلے اور ۶ سرساہی ہے۔ جب کہ لڑکی کا حصہ ایک کنال تیرہ مرلے اور تین سرساہی ہے۔ (واللہ اعلم)

وصیت کی موجودگی میں ترکہ کی تقسیم

سوال ہمارے ہاں ایک لڑکی فوت ہوئی ہے، اس کی تین بہنیں اور دو بھائی ہیں، اس نے کچھ رقم اور زیورات ترکہ چھوڑا ہے اس نے وصیت کی تھی کہ رقم مسجد کو دے دیں اور زیورات میری بہنوں کو دے دیں، بھائیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس کی رقم جو سات لاکھ اور زیورات چودہ لاکھ روپیہ مالیت کے ہیں، اس کے متعلق شرعی کیا حکم ہے؟

جواب شرعی طور پر وصیت کے کچھ اصول وضوابط ہیں، پہلا اصول یہ ہے کہ کسی وارث کو نقصان پہنچانے کے لیے وصیت جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''آدمی یا عورت ساٹھ سال تک اللہ کی عبادت کرتے رہتے ہیں لیکن جب موت آتی ہے تو وصیت کر کے اپنے ورثاء کو نقصان پہنچا جاتے ہیں، اس وجہ سے ان پر جہنم کی آگ واجب ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو راوئ حدیث ہیں، نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصَىٰ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ غَيۡرَ مُضَآرّٖۚ...... ذَٰلِكَ ٱلۡفَوۡزُ ٱلۡعَظِيمُ ۝١٣﴾ [1]

''اس وصیت کے بعد جو کی جائے اور قرض کے بعد جب کہ دوسرے کو نقصان نہ کیا گیا ہو یہ اللہ کی طرف سے ایک تاکیدی حکم ہے اور اللہ دانا وبینا اور نرم خو ہے، یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا اُسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔'' [2]

یہ روایت شہر بن حوشب کی وجہ سے اگرچہ ضعیف ہے تاہم مسئلہ کے ثبوت کے لیے مذکورہ آیت ہی کافی ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ وصیت ایسے وارث کے لیے نہ ہو جسے اس کی جائیداد سے حصہ ملنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے لہٰذا اب ہر کسی وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے۔'' [3]

اگر دوسرے ورثاء اس قسم کی وصیت کو برداشت کر لیں تو وارث کو وصیت کی جا سکتی ہے جیسا کہ ایک روایت میں اس کی صراحت ہے۔ [4] تیسرا اصول یہ ہے کہ وصیت تہائی مال سے زائد نہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنے ترکہ سے ایک تہائی وصیت کرنے کی اجازت دی تھی۔ [5]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ وصیت کو ایک تہائی سے کم کر کے ایک چوتھائی تک کر لیں تو مجھے زیادہ پسند

---

[1] ٤/النساء:١٢۔ [2] ابوداود، الوصايا: ٢٨٦٧۔ [3] ابن ماجه، الوصايا: ٢٧١٢۔

[4] بيهقي، ص: ٢٦٣، ج٦۔ [5] صحيح بخاري، الجنائز: ٢١١٦۔

ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''ایک ثلث کی وصیت کر دو لیکن تہائی بھی بہت زیادہ ہے۔'' [1]

صورت مسئولہ میں اگر فوت ہونے والی لڑکی کی وصیت ایک تہائی مال سے ہے تو اس پر عمل کیا جائے بصورت دیگر اسے کم کر کے ایک تہائی کر دیا جائے چونکہ کل ترکہ اکیس لاکھ ہے جس کی ایک تہائی سات لاکھ بنتی ہے اس لیے سات لاکھ روپیہ وصیت کے مطابق مسجد کو دے دیا جائے۔ اس کا وصیت کے ذریعہ ترکہ میں بھائیوں کو شریک نہ کرنا شرعاً جائز نہیں بلکہ وصیت سے باقی ترکہ دو بھائیوں اور تین بہنوں میں تقسیم ہوگا، چونکہ بھائی کو ایک بہن سے دوگنا حصہ ملتا ہے اس لیے باقی جائیداد کے سات حصے کر لیے جائیں پھر ہر بھائی کو دو حصے اور ہر بہن کو ایک ایک حصہ دیا جائے، وصیت نکال کر باقی جائیداد چودہ لاکھ ہے اس لیے چار، چار لاکھ ہر بھائی کو اور دو، دو لاکھ ہر بہن کو دیا جائے، تمام زیورات بہنوں کو دینا اور بھائیوں کو محروم کرنا شرعاً جائز نہیں۔ (واللہ اعلم)

بھائی، بہن اور بیوی کا حصہ

سوال جمیلہ نامی لڑکی کا نکاح اسلم نامی شخص سے ہوا، نکاح کے بعد اسلم کے والد شوکت علی فوت ہو گئے، جب کہ والدہ پہلے سے فوت شدہ تھیں، شوکت علی کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، جائیداد چونکہ شوکت علی کے نام تھی اور تقسیم سے پہلے اس کے بیٹے اسلم کا انتقال ہو گیا، پس ماندگان میں بیوہ، ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں، شوکت علی کی جائیداد تین مرلہ ہیں، اس سے اسلم کی بیوہ جمیلہ کو کتنا حصہ ملے گا؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب علم فرائض میں تقسیم در تقسیم کو مناسخہ کہتے ہیں، صورت مسئولہ بھی اسی قسم سے ہے، اس میں متروکہ جائیداد کو دو مرتبہ تقسیم کیا جائے گا پہلی مرتبہ شوکت علی کی جائیداد تین مرلہ تقسیم ہوں گے پھر اس کے بیٹے محمد اسلم کا حصہ دوبارہ تقسیم ہوگا، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلی تقسیم: شوکت علی کے ورثاء دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں شریعت میں بیٹے کو بیٹی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ دیا جاتا ہے، اس لیے جائیداد کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، ان میں سے دو، دو حصے بیٹے کو اور ایک، ایک بیٹی کو ملے گا، تین مرلہ سے ایک، ایک مرلہ دونوں بیٹوں کے لیے اور نصف نصف مرلہ ہر دو لڑکیوں کو دیا جائے گا۔

دوسری تقسیم: محمد اسلم کو اپنے باپ کی جائیداد ایک مرلہ ملا ہے، اس کی وفات کے بعد اس کے ورثاء بیوہ جمیلہ، ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں، اسلم چونکہ لاولد تھا اس لیے قرآن کریم کی وضاحت کے مطابق بیوہ جمیلہ کو اس کی جائیداد سے چوتھا اور باقی 3/4 اس کے بہن بھائیوں میں اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ ملے۔ اس بنا پر محمد اسلم کا حصہ ایک مرلہ حسب ذیل تفصیل سے تقسیم ہوگا:

بیوہ جمیلہ: 1/4 مرلہ بھائی 3/8 مرلہ بہنیں 3/16 بہن 3/16

بھائی بہنوں کو والد سے بھی حصہ ملا تھا اس لیے ان کا مجموعی حصہ حسب ذیل ہوگا۔

---

[1] صحیح بخاری الوصایا: ۲۷۴۳۔

بھائی: 1+3/8=11/8 مرلہ بہن 1/2+3/16=11/16

دوسری بہن: 1/2+3/16=11/16 بیوہ جمیلہ 1/4

آسانی کے لیے شوکت علی مرحوم کے تین مرلوں کو اڑتالیس حصوں میں پھیلا دیا جائے، ان اڑتالیس حصوں سے چار حصے محمد اسلم کی بیوہ جمیلہ کو، بائیس حصے اس کے بھائی اور گیارہ حصے اس کی ایک بہن اور گیارہ حصے ہی دوسری بہن کو دے دیئے جائیں۔ مرلوں کی تقسیم کے لیے پٹواری کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔ (واللہ اعلم)

ورثا، بھائی اور بہن ہوں تو حصص

سوال ہمارے بڑے بھائی لا ولد فوت ہوئے ہیں، اس کے شرعی ورثاء بیوہ، چار بھائی اور ایک بہن ہے، انہوں نے رہائش کے لیے ایک مکان بنایا تھا جو اپنی بیوی کے نام کر دیا تھا، ملازمت کے دوران انہوں نے ایک پلاٹ بھی خریدا۔ انہوں نے مکان اور پلاٹ فروخت کر کے ایک تعمیر شدہ مکان ۳۳ لاکھ میں خریدا، اس نئے مکان میں چار سال رہائش رکھنے کے بعد وہ فوت ہو گئے ہیں۔ اب ان کی بیوی کا مطالبہ ہے کہ نئے مکان کا نصف مجھے دیا جائے کیونکہ اس کی خریداری میں میرے نام مکان کی قیمت شامل ہے جو اس کی نصف مالیت کے برابر ہے، اس کے بعد باقی نصف سے میرا شرعی حصہ دیا جائے، کیا بیوہ کا موقف درست ہے نیز شرعی طور پر ورثاء کو کتنا، کتنا حصہ آتا ہے؟

جواب مرحوم نے اپنا پہلا رہائشی مکان تعمیر کر کے اپنی بیوی کے نام کر دیا اس کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ انہوں نے ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لیے اس مکان کو اپنی بیوی کے نام کر دیا ہو اور اس کی وضاحت بیوی کے سامنے کر دی ہو تو اس صورت میں تو وہ مکان مرحوم کی ملکیت ہو گا اور صرف قانونی طور پر بیوی کے نام تصور کیا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ انہوں نے حقیقی طور پر بیوی کو ہبہ کر دیا ہو اور اس کے نام حکومت کے کاغذات میں رجسٹری کرا دیا ہو۔ اس صورت میں بیوی اس مکان کی مالکہ ہو گی، دوسرا کوئی اس میں شریک نہیں ہے لیکن اس امر کا بدستور احتمال ہے کہ جب بیوی کے نام مکان کو فروخت کیا گیا تو بیوی نے وہ رقم خاوند کو ہبہ کے طور پر دے دی ہو جس طرح مرحوم نے مکان اسے ہبہ کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ دوسرا خرید کردہ مکان خاوند کے نام ہے، رجسٹری وغیرہ میں بیوی کا کوئی نام نہیں ہے، اگر بیوی کو اس میں شریک کرنا چاہتا تو آدھا مکان بیوی کے نام کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنے نام پر ہی نیا مکان خریدا ہے، اگر بیوی نے اپنے مکان کی قیمت بطور قرض خاوند کو دی اور پھر اس نے پلاٹ کی قیمت ملا کر نیا مکان خریدا تو تقسیم سے پہلے بیوہ کا سولہ لاکھ قرض اتارنا ہو گا اور وہ مکان کی موجودہ قیمت سے الگ کیا جائے، اس صورت میں وہ سولہ لاکھ کی واپسی کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے، مکان میں صرف حصہ لینے کا دعویٰ درست نہیں کیونکہ وہ مرحوم نے اپنے نام پر خریدا ہے اور تا حال اسی کے نام پر ہے، اس وضاحت کے بعد پہلی صورت میں نیا خرید کردہ مکان مرحوم کا ترکہ شمار ہو گا اور اسے تمام ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا اور دوسری صورت میں بھی مکان تو شرعی ورثاء میں تقسیم ہو گا البتہ اس کے ذمہ ۱۶ لاکھ قرض اس کی متروکہ جائیداد سے ادا کرنا ہو گا، دونوں صورتوں میں تقسیم کا طریقہ درج ذیل ہے:
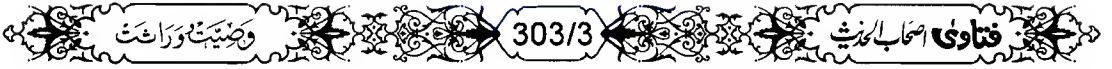
چونکہ مرحوم لاولد ہے اس لیے کل جائیداد سے بیوہ کو چوتھا حصہ دیا جائے اور باقی ماندہ ترکہ کو بہن بھائی اس طرح تقسیم کریں کہ ایک بھائی کو بہن سے دوگنا ملے، سہولت کے پیش نظر جائیداد کے چھتیس حصے کر لیے جائیں۔ ان میں چوتھا یعنی نو حصے بیوہ کے لیے اور باقی ستائیس حصے اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ چھ، چھ حصے ایک بھائی کو اور تین حصے بہن کو مل جائیں۔ بہرحال مرحوم کے بہن بھائیوں کو چاہیے کہ وہ دنیا کے مال و متاع کی خاطرہ بیوہ پر ناجائز دباؤ نہ ڈالیں بلکہ اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں اور بیوہ کو بھی چاہیے کہ وہ بگاڑ کی کوئی صورت اختیار نہ کرے بلکہ رواداری کو پیش نظر رکھتے ہوئے باہمی اتفاق کی روش اختیار کرے۔ (واللہ اعلم)

بیوہ، بھائی اور بہن کا حصہ نکالنا

سوال ہمارے ایک عزیز فوت ہوئے ہیں، پس ماندگان میں بیوہ، ایک بھائی اور ایک بہن ہے، اس نے اپنے پیچھے ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کی مالیت چھوڑی ہے، شرعی طور پر اسے کیسے تقسیم کیا جائے گا؟

جواب صورت مسئولہ میں بیوہ اصحاب الفروض سے ہے اور بہن بھائی عصبہ ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوہ کا حصہ مقرر ہے اور باقی ماندہ ترکہ بہن بھائی کو ملے گا وضاحت کے بعد بیوہ کو ۴/۱ ملے گا کیونکہ میت کی اولاد نہیں ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ ﴾ [1]

"اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو ان (بیویوں) کے لیے تمہارے ترکہ سے چوتھا (۴/۱) حصہ ہے۔"

باقی ترکہ بہن بھائی اس طرح تقسیم کریں گے کہ بھائی کو بہن کے مقابلہ میں دوگنا حصہ دیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۗ ﴾ [2]

"اگر میت کے بہن بھائی موجود ہوں تو مذکر سے مؤنث کی بہ نسبت دو حصے ہوں گے۔"

سہولت کے پیش نظر کل ترکہ کے چار حصے کر لیے جائیں، اس میں سے ایک حصہ بیوہ کو، بھائی کو دو حصے اور بہن کو ایک حصہ دیا جائے، سوال میں بیان کردہ تفصیل کے پیش نظر جب ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کو چار پر تقسیم کیا تو ایک حصہ بیالیس لاکھ پچاس ہزار بنتا ہے، اس لیے ترکہ کی تقسیم حسب ذیل ہوگی:

بیوہ: بیالیس لاکھ پچاس ہزار روپیہ: (42,50,000)

بھائی: پچاسی لاکھ روپے: (85,00,000)

بہن: بیالیس لاکھ پچاس ہزار روپیہ: (42,50,000)

پدری بھائیوں کا حصہ

سوال ہمارا پدری بھائی محمد حسین فوت ہوا اور وہ لاولد تھا، پسماندگان میں حسب ذیل ورثاء ہیں، والدہ، بیوہ، دو حقیقی

---

[1] ٤/النساء ١٢۔ [2] ٤/النساء: ١٧٦۔

بہنیں اور دو پدری بھائی، قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کس کو کیا ملے گا؟

جواب لاولد فوت ہونے کی صورت میں بیوہ کو چوتھا حصہ ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ﴾ ❶

''اور اگر تمہاری اولا د نہ ہو تو بیویوں کا چوتھا حصہ ہے۔''

متعدد بہن بھائیوں کی موجودگی میں والدہ کو چھٹا حصہ ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ﴾ ❷

''اور اگر میت کے بہن بھائی ہیں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔''

صورت مسئولہ میں میت کلالہ ہے، دو یا دو سے زیادہ بہنوں کو دو تہائی دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ﴾ ❸

''اور اگر بہنیں دو ہوں تو ان کو ترکہ کا دو تہائی ملے گا۔''

پدری بھائی عصبہ ہیں، اگر مقررہ حصہ لینے والوں سے کچھ پس انداز ہوا تو انہیں مل جائے گا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کے حصے اور جو بچ جائے وہ میت کے مذکر قریبی رشتہ دار کا ہے۔ ❹

واضح رہے کہ میت کے پدری بھائی، اس کی حقیقی بہنوں کو عصبہ نہیں بنائیں گے کیونکہ علم فرائض کی رو سے صرف چار رشتہ دار اپنی بہنوں کو عصبہ بناتے ہیں اور وہ خود بھی عصبہ ہوتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں: ① حقیقی بیٹا اپنی بہن کو عصبہ بنائے گا، ② پوتا اپنی بہن کو عصبہ بناتا ہے۔ ③ حقیقی بھائی اپنی بہن کو عصبہ بناتا ہے۔ ④ پدری بھائی اپنی بہن کو عصبہ بناتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی رشتہ دار اپنی بہن کو عصبہ نہیں بناتا مثلاً:

چچا خود عصبہ ہوتا ہے لیکن اپنی بہن یعنی میت کی پھوپھی کو عصبہ نہیں بناتا، اسی طرح بھتیجا خود عصبہ بنتا ہے لیکن اپنی بہن یعنی میت کی بھتیجی کو عصبہ نہیں بناتا، صورت مسئولہ میں حقیقی دو بیٹوں کا رشتہ میت کے ساتھ زیادہ مضبوط ہے لہٰذا پدری بھائی میت کی حقیقی بہنوں کو عصبہ نہیں بنائیں گے بلکہ صرف وہی عصبہ کی حیثیت سے بچا ہوا مال لیں گے۔ درج بالا مسئلہ میں ترکہ کے کل بارہ حصے کر لیے جائیں ان میں چوتھائی یعنی ۳ حصے بیوہ کو، ۲ حصے والدہ کو اور دو تہائی یعنی آٹھ حصے دو بہنوں کو دیئے جائیں جب ان حصوں کو جمع کیا تو یہ تیرہ بنتے ہیں جب کہ مسئلہ بارہ سے بنا ہے لہٰذا تقسیم کے لیے بارہ کے بجائے تیرہ کو بنیاد بنایا جائے گا اسے علم فرائض میں عول کہا جاتا ہے، دو پدری بھائیوں کے لیے کچھ نہیں بچا لہٰذا وہ محروم ہیں، تقسیم بایں طور پر ہوگی: والدہ ۲، بیوہ ۳، دونوں حقیقی بہنیں ۸ اور دونوں پدری بھائی محروم ہوں گے۔

---

❶ ٤/النساء:١٢۔ ❷ ٤/النساء:١١٠۔

❸ ٤/النساء:١٧٦۔ ❹ صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٢۔

کفریہ نظریات رکھنے والے کو وراثت سے حصہ دینا

سوال زید فوت ہوا، اس کے ورثاء میں سے ایک حقیقی بیٹی، ایک نوربخشی بھائی اور ایک بھتیجا ہے، نوربخشی بھائی اپنا حصہ لینے سے انکار کرتا ہے کہ میرے مسلک کے مطابق یہ حصہ مجھے نہیں ملتا، کیا اب وہ حصہ میت کے بھتیجے کو ملے گا یا بیٹی کو بحیثیت رد دیا جائے گا؟ قرآن وحدیث کے مطابق ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب نوربخشی فرقہ بلتستان کے علاقہ میں پایا جاتا ہے، ان کے عقائد ونظریات اہل اسلام کے خلاف ہیں، بلکہ ان کے اعمال بھی مسلمانوں سے نہیں ملتے، حدیث میں اس امر کی صراحت ہے کہ مسلمان آدمی، کافر کا اور کافر انسان، مسلمان کا وارث نہیں بنتا۔ اس بنا پر نوربخشی بھائی اپنے بھائی کا وارث نہیں ہوگا، اسے مسلمان بھائی کے ترکہ سے حصہ دینے کا تکلف نہ کیا جائے، علم فرائض میں ترکہ لینے سے رکاوٹ کی دو اقسام ہیں:

① انسان کے کسی وصف کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو جائے مثلاً وہ دین بدل لیتا ہے یا میت کو قتل کر دیتا ہے، ایسا انسان اپنے مذکورہ وصف کی وجہ سے ترکہ سے محروم ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لیے رکاوٹ کا باعث نہیں بنتا گویا یہ معدوم ہے، اس وصف کو مانع کہا جاتا ہے۔

② انسان ذاتی طور پر محروم ہو جیسے قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور والا رشتہ دار محروم ہوتا ہے مثلاً بیٹے کی موجودگی میں پوتا محروم ہوتا ہے، اسے حجب ذات کہا جاتا ہے۔ صورت مسئولہ میں نوربخشی بھائی رکاوٹ کی پہلی قسم کی زد میں آتا ہے یہ خود تو محروم ہے لیکن اس کی موجودگی، بھتیجے کو محروم نہیں کرے گی یہ گویا کالمعدوم ہے، اس وضاحت کے بعد زید کا ترکہ دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، نصف کی حقدار اس کی حقیقی بیٹی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ [1]

’’اگر ایک ہے تو اسے میت کے ترکہ سے نصف دیا جائے۔‘‘

بیٹی کا حصہ دینے کے بعد جو باقی نصف ہے وہ میت کے بھتیجے کو دیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

’’مقررہ حصہ لینے والوں کا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کو دیا جائے۔‘‘ [2]

نوربخشی بھائی، اسلام سے متضاد عقائد ونظریات کا حامل ہونے کی وجہ سے مسلمان میت کے ترکہ سے محروم ہے، نیز اس کا وجود دوسروں کے لیے رکاوٹ کا باعث نہیں ہوگا، اس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ (واللہ اعلم)

مقتول کے مال کی تقسیم

سوال ہمارے ہاں ایک قتل ہوا، مقتول کے ورثاء نے مبلغ دو لاکھ پچاس ہزار دیت لے کر قاتل معاف کر دیا، مقتول کے ورثاء میں والدہ، بیوہ، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ اب کیا دیت کی رقم وراثت کی طرح تقسیم ہوگی یا صرف بچوں کے لیے ہے؟

---

[1] ٤/النساء:١١۔ [2] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٥۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب دیت لے کر قاتل کا خون معاف کر دینا اچھی بات ہے۔ قرآن کریم نے اس کی صراحت کی ہے۔ اب دیت کی رقم ورثاء میں بطور ترکہ تقسیم ہوگی، صرف اولاد کے لیے مخصوص نہیں کی جائے گی، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک دیت کی رقم مقتول کے ورثاء کے درمیان تقسیم کر دی جائے گی کیونکہ وہ قرابت دار ہیں، قرابت داروں سے جو بچ جائے وہ عصبہ رشتہ داروں کے لیے ہوگا۔'' [1]

اس طرح حدیث میں ہے کہ اشیم ضبابی رضی اللہ عنہ قتل ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی دیت سے اس کی بیوی کو وارث بنایا تھا۔ [2]

ان مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ مقتول کی دیت بطور وراثت ہوگی، البتہ اگر قاتل قرابت داروں سے ہے تو اسے وراثت سے کچھ حصہ نہیں دیا جائے گا، کیونکہ اس نے اقدام قتل سے خود کو محروم کر لیا ہے، صورت مسئولہ میں بیوہ کو آٹھواں، ماں کو چھٹا حصہ اور باقی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا ملے۔ سہولت کے پیش نظر دیت کی رقم کو چوبیس میں تقسیم کر دیا جائے، ایک حصہ دس ہزار چار صد سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے ہے، تین حصے بیوہ کے لیے یعنی -/31250 روپے حصے والدہ کے لیے یعنی -/41666 روپے اور باقی سترہ حصے یعنی -/177084 روپے اولاد کے لیے ہیں۔ اس رقم کو اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصے ملے یعنی -/29514 روپے فی لڑکی اور -/59028 روپے فی لڑکا تقسیم کر دیئے جائیں۔ مقتول کی دیت کے علاوہ باقی جائیداد بھی مذکورہ حصص کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔ (واللہ اعلم)

بیوہ، بہن اور بیٹوں کا حصہ

سوال ایک آدمی فوت ہوا اس کا زرعی رقبہ بائیس کنال تھا، پسماندگان میں سے بیوہ، بہن اور چار بیٹیاں ہیں، ہر ایک کو مرحوم کی زمین سے کتنا حصہ ملے گا؟

جواب اولاد کی موجودگی میں بیوہ کو آٹھواں حصہ ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ [3]

''اور اگر میت کی اولاد ہو تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

میت کے ترکہ سے بیٹیوں کے لیے دو تہائی 2/3 ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ج﴾ [4]

''اور اگر اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو سے زائد ہوں تو ان کا ترکہ سے دو تہائی ہے۔''

---

[1] ابو داود، الدیات: ٤٥٦٤۔ [2] ابن ماجه، الدیات: ٢٦٤٢۔

[3] ٤/النساء: ١٢۔ [4] ٤/النساء: ١١۔

بیٹیوں کی موجودگی میں بہن عصبہ ہوتی ہے یعنی مقررہ حصہ والوں سے بچا ہوا ترکہ پاتی ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹی، پوتی، اور بہن کی موجودگی میں فیصلہ فرمایا، بیٹی کو آدھا دیا جائے، پوتی کو چھٹا حصہ تاکہ ان کا 2/3 پورا ہو جائے پھر جو باقی بچے وہ بہن کا ہے۔ [1]

سہولت کے پیش نظر ہم کل ترکہ کو 24 حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں، ان میں 1/8 یعنی تین حصے بیوہ کو 2/3 یعنی سولہ حصے چار بیٹیوں کو اور باقی پانچ حصے بہن کو دیئے جائیں۔ میت کی جائیداد بائیس کنال زرعی زمین ہے جس کے 440 مرلے بنتے ہیں، انہیں چوبیس پر تقسیم کیا تو ایک حصہ نکل آئے گا جو 18.33 ہے اس حساب سے بیوہ کا حصہ 55 مرلے، چار لڑکیوں کا حصہ 294 مرلے، ہر لڑکی کو 73.5 مرلے ملیں گے، باقی 91.65 مرلے بہن کو مل جائیں گے۔ (واللہ اعلم)

بیٹے اور بہو میں مال کی تقسیم

سوال مرحوم محمد علی نے وفات کے بعد ایک مکان چھوڑا، جو اس کی دو بیٹوں کے پاس رہا، اس دوران ایک بیٹا فوت ہو گیا، جس کی کوئی حقیقی اولاد نہ تھی، صرف بیوی اور ایک لے پالک بیٹی زندہ ہے، مرحوم محمد علی کا دوسرا بیٹا صاحب اولاد زندہ موجود ہے، واضح رہے کہ مرحوم محمد علی کی ایک شادی شدہ صاحب اولاد بیٹی اس کی زندگی میں فوت ہو گئی تھی، اب سوال یہ ہے کہ زندہ بیٹے اور مرحوم بیٹے کی بیوہ کو ترکہ (مکان) سے کتنا حصہ ملے گا، نیز مرحوم بیٹے اور مرحومہ کی اولاد کو اس ترکہ (مکان) سے کچھ ملے گا یا نہیں؟ کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے۔

جواب صورت مسئولہ میں مندرجہ ذیل علم الفرائض کے قواعد کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

1. کسی کے ترکہ کا وہ رشتہ دار وارث ہوتا ہے جو صاحب ترکہ کی وفات کے وقت زندہ ہو، اس کی وفات سے پہلے فوت شدگان وارث نہیں ہوں گے، اس قاعدے کے پیش نظر مرحوم محمد علی کی شادی شدہ بیٹی جو اس سے پہلے وفات پا چکی ہے ترکہ سے حصہ نہیں پائے گی۔
2. قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور والے رشتہ دار محروم ہوتے ہیں، اس بنا پر بیٹیوں کی موجودگی میں مرحومہ بیٹی کی اولاد محروم ہو گی، انہیں ترکہ سے کچھ نہیں ملے گا۔
3. وراثت لینے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ وہاں خونی رشتہ قائم ہو، اس بنا پر لے پالک، جائیداد سے محروم ہوتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد مرحوم محمد علی کے ترکہ (مکان) کے حقدار اس کے دو بیٹے تھے۔ ان میں وہ مکان آدھا، آدھا تقسیم ہو گا، جب مرحوم محمد علی کا بیٹا فوت ہوا تو وہ اپنے باپ کے آدھے مکان کا حقدار بن چکا تھا، اس کی وفات کے وقت، اس کی بیوہ، اس کا بھائی اور لے پالک بیٹی زندہ تھے، لے پالک تو محروم ہے اور مکان سے اس کا حصہ...... 1/2 اس کی بیوہ اور بھائی میں تقسیم ہو گا، بیوہ کو 1/2 کا 1/4 ملے گا۔ یعنی 1/2 کا 1/4=1/8 کی حقدار ہو گی اور 1/2 سے بیوہ کا حصہ نکال کر (1/2-1/8) باقی 3/8 بھائی کا

---

[1] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٦۔

حق ہے، زندہ بھائی کو 1/2 باپ کے ترکہ سے اور 3/8 بھائی کے ترکہ سے ملا، اس طرح وہ 7/8=3/8+1/2 کا حقدار ہے اور 1/8 مرحوم کی بیوہ کو ملے گا، سہولت کے پیش نظر مکان کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ بیوہ کو اور باقی سات حصے زندہ بھائی کے ہیں۔ مرحوم بہن کی اولاد اور مرحوم بھائی کی لے پالک بیٹی محروم ہے، انہیں مکان سے کچھ نہیں ملے گا۔ اگر مرحوم محمد علی یا اس کے مرحوم بیٹے نے کوئی وصیت کی ہو تو اسے تقسیم سے پہلے نافذ کیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

چچا، دادی اور نانی وارث ہوں تو؟

سوال ہمارے رشتہ داروں میں سے ایک شخص فوت ہوا ہے اس کا چچا، دادی اور نانی زندہ ہیں، اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہو گا؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب حدیث میں اس طرح کا ایک واقعہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے حضرت قبیصہ بن ذویب فرماتے ہیں کہ ایک دادی نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر اپنی وراثت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: ''تمہارے لیے اللہ کی کتاب میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے اور نہ ہی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے تمہارے لیے کسی چیز کا علم ہے، تم جاؤ میں لوگوں سے اس سلسلہ میں مشورہ کروں گا۔ پھر آپ نے لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا آپ نے دادی کو چھٹا حصہ دیا تھا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی اس وقت تھا؟ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اس امر کی گواہی دی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے نافذ کر دیا، پھر ایک دوسری جدہ (نانی) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور اس نے اپنی وراثت کا سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تمہارے لیے اللہ کی کتاب میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے لیکن یہی چھٹا حصہ ہے، اگر تم جمع ہو جاؤ یعنی دادی کے ساتھ نانی بھی ہو تو یہی چھٹا حصہ تمہارے درمیان تقسیم کیا جائے گا اور اگر تم میں سے کوئی اکیلی رہ جائے تو یہ حصہ اس کا ہے۔ [1]

اسی طرح حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دادیوں کی وراثت کے متعلق دونوں کے درمیان چھٹا حصہ تقسیم کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ [2] چھٹا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے چچا کے لیے ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے شریعت کے مقررہ حصے ان کے حقداروں کو دو، پھر باقی بچ جائے وہ میت کے سب سے قریبی مرد رشتہ دار کو دے دیا جائے۔ [3] چونکہ میت کے چچا کے علاوہ دوسرا کوئی رشتہ دار صورت مسئولہ میں مذکور نہیں ہے لہٰذا دادی اور نانی کا چھٹا حصہ نکال کر باقی پانچ حصے چچا کو ملیں گے۔ (واللہ اعلم)

بہنوں اور چچا کا حصہ؟

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کی آٹھ بہنیں اور دو چچا ہیں، اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہو گا؟ قرآن وحدیث کے مطابق فتویٰ دیں۔

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۲۲۵، ج ۴۔ [2] مسند امام احمد: ۳۲۶، ج ۵۔ [3] صحیح بخاری، الفرائض: ۶۷۴۶۔

جواب: جب آدمی فوت ہو جائے اور اس کے اصول وفروغ میں سے کوئی نہ ہو اور اس کی متعدد بہنیں ہوں تو انہیں ترکہ سے دو تہائی ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ﴾ [1]

''اگر بہنیں دو ہوں تو ان کا ترکہ کا دو تہائی ملے گا۔''

اور باقی ایک تہائی دونوں چچا عصبہ ہونے کی حیثیت سے لے لیں گے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کے حصے دو اور جو باقی بچے وہ قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [2]

مذکورہ بالا قرآن وحدیث کی تصریحات کے پیش نظر کل جائیداد کے بارہ حصے کر لیے جائیں۔ ان میں سے دو تہائی یعنی آٹھ حصے بہنوں کے لیے ہیں، ان کو ایک حصہ دے دیا جائے اور باقی چار حصے دو چچاؤں کو دے دیئے جائیں۔ (واللہ اعلم)

والدین اور بچوں کے حصص

سوال: ایک آدمی فوت ہوا، اس کے والدین، پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں زندہ ہیں، اس کا ترکہ دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ ہے، ہر وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟

جواب: مرنے والے کی اگر اولاد ہو تو والد اور والدہ ہر ایک کو چھٹا چھٹا حصہ ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ﴾ [3]

''اور والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا ہے اگر میت کی اولاد ہے۔''

والدین کو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکہ اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دو گنا حصہ ملے، سہولت کے پیش نظر جائیداد کے بیالیس حصے کر لیے جائیں، ان میں سے سات، سات حصے والدین کو اور باقی اٹھائیس اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ لڑکے کو لڑکی سے دو گنا ملے یعنی ہر لڑکے کو چار حصے اور ہر لڑکی کو دو حصے دیئے جائیں۔

دو لاکھ پچاس ہزار کی تقسیم حسب ذیل ہوگی:

والد کا حصہ: 41,666.66	والدہ کا حصہ: 41,666.66
میزان: 83333.33	باقی: 166666.67
ایک لڑکی کا حصہ: 11904.76	چار لڑکیوں کا حصہ 47619.04
ایک لڑکے کا حصہ: 23809.33	پانچ لڑکوں کا حصہ 119047.62

تمام حصص کا مجموعہ: 83333.33+476191.4+119047.62=249999.99

---

[1] ٤/النساء:١٧٦۔ [2] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٢۔

[3] ٤/النساء:١١۔

بھتیجیوں کا وارث بننا

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کے دو بھتیجے اور دو بھتیجیاں زندہ ہیں، اس کے وارث صرف بھتیجے ہوں گے یا بھتیجیاں بھی اس سے حصہ لیں گی؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب صورت مسئولہ میں صرف بھتیجے ہی وارث ہوں گے، بھتیجیوں کو جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ بھتیجے عصبہ کی حیثیت سے لیتے ہیں، جب کہ بھتیجیاں عصبہ نہیں کیونکہ، شرعی طور پر صرف چار وارث ایسے ہیں جو اپنی بہنوں کو عصبہ بناتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

① اگر میت کا بیٹا اور بیٹی ہے تو بیٹا اور بیٹی دونوں وارث ہوں گے، کیونکہ بیٹا عصبہ ہے اور اس نے اپنی بہن کو عصبہ بنا کر جائیداد میں شریک کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ﴾ [1]

''اللہ تمہیں اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ ترکہ سے لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا جائے۔''

② اگر میت کا پوتا اور پوتی ہے تو پوتا اپنی بہن کو عصبہ بنائے گا کیونکہ یہ بیٹے کے قائم مقام ہے۔

③ اگر میت کا حقیقی بھائی اور حقیقی بہن زندہ ہے تو حقیقی بھائی اپنی بہن کو عصبہ بنا کر جائیداد میں شریک کر لے گا۔

④ اگر میت کا پدری بھائی اور پدری بہن زندہ ہے تو پدری بھائی اپنی بہن کو عصبہ بنا کر جائیداد میں شریک کر لے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۗ﴾ [2]

''اگر میت کے بہن بھائی ہوں تو مذکر کو مؤنث کے مقابلہ میں دوگناہ حصہ دیا جائے گا۔''

بیوہ، والدین اور بہن بھائیوں کے حصص

سوال ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں سے بیوی، ماں، باپ، دو بہنیں اور دو بھائی ہیں، اس کی کوئی اولاد نہیں، ہر ایک وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟

جواب صورت مسئولہ میں چونکہ میت لاولد ہے اس لیے اس کی بیوی کو 1/4 حصہ ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ﴾ [3]

''اگر تمہاری اولاد نہیں ہے تو تمہاری بیویوں کو جائیداد سے چوتھا حصہ ملے گا۔''

والدہ کو چھٹا حصہ دیا جائے گا کیونکہ میت کے متعدد بہن بھائی موجود ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ﴾ [4]

---

[1] ٤/النساء:١١۔ [2] ٤/النساء:١٧٦۔ [3] ٤/النساء:١٢۔ [4] ٤/النساء:١١۔

''اگر میت کے متعدد بہن بھائی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔''

باقی ترکہ کا حقدار اس کا باپ ہے کیونکہ وہ قریبی مذکر رشتہ دار ہے، حدیث میں ہے کہ مقررہ حصہ حقداروں کو دینے کے بعد باقی ترکہ قریبی مذکر رشتہ دار کو دیا جائے۔ [1]

نیز قرآن کریم کے حکم کے مطابق اولاد نہ ہونے کی صورت میں والدین کو وارث بنایا جائے، پھر ماں کا حصہ بیان کر دیا گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی ماندہ ترکہ باپ کا ہے، میت کے بہن بھائی محروم ہیں کیونکہ قرآن کریم میں میت کے کلالہ ہونے کی صورت میں بہن بھائیوں کو ترکہ سے حصہ دیا گیا ہے اور کلالہ کی تعریف یہ ہے کہ جس کا اصل اور فرع موجود نہ ہو، چونکہ صورت مسئولہ میں میت کا اصل باپ موجود ہے۔ لہٰذا وہ کلالہ نہیں، اس بنا پر بہن بھائی محروم ہوں گے۔ سہولت کے پیش نظر ترکہ کے بارہ حصے کر لیے جائیں ان میں سے 1/4 یعنی تین حصے بیوہ کو اور 1/6 یعنی دو حصے والدہ کو اور باقی سات حصے والد کو دیئے جائیں گے۔ (واللہ اعلم)

بلا عذر شرعی وراثت سے محروم کرنا

سوال ایک آدمی اپنے حقیقی بیٹے کو اپنی جائیداد سے محروم کرنے کے لیے اپنے مرحوم بیٹے اور اس کے بیٹے، بیٹیوں کو معمولی رقم بطور حیلہ لے کر اپنی جائیداد میں شریک کر لیتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے کسی مرد یا عورت کو یہ اختیار نہیں دیا کہ اپنے ورثاء میں سے کسی کو مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعے اپنی جائیداد سے محروم کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۝ ﴾ [2]

''مردوں کے لیے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور اوروں کے لیے بھی اس مال میں سے حصہ ہے جو اس کے ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ وہ مال تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ اللہ کی طرف سے طے شدہ ہے۔''

اس آیت کے پیش نظر کسی وارث کو بلا عذر شرعی وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا، احادیث میں بھی اس کی وضاحت ہے کہ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی جائیداد سے حقیقی وارث کو محروم کرے۔ اگر ایسا کرتا ہے تو اس کے لیے بہت سخت وعید ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو کسی کی وراثت کو ختم کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کے لیے مقرر کی ہے۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی وراثت کو ختم کر دیں گے۔'' [3]

اس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنے وارث کو حصہ دینے سے راہ فرار اختیار کرتا

---

[1] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٥۔ [2] ٤/النساء:٧۔

[3] شعب الایمان للبیهقی، ص: ١١٥، ج ١٤۔

ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کا حصہ ختم کر دیں گے۔ [1] اگرچہ مؤخر الذکر روایت ضعیف ہے تاہم اسے تائید کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے، الغرض باپ نے حیلے کے ذریعے ایک غیر وارث کو اپنی جائیداد میں شریک کیا ہے اور ایک وارث کو اس کی جائیداد سے محروم کیا ہے، اس کا یہ اقدام انجام کے اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے۔

بیوی، بیٹی، بہن اور چچا میں ترکہ تقسیم کرنا

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کی بیوی، دو بیٹیاں، حقیقی بہن اور ایک چچا زندہ ہے، مرحوم کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا، آیا چچا کو کچھ ملے گا یا نہیں؟ کتاب وسنت کے حوالے سے راہنمائی فرمائیں۔

جواب صورت مسئولہ میں بیوی کا کل ترکہ سے آٹھواں حصہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ [2]

’’اور اگر تمہاری اولاد ہو تو پھر انہیں (بیویوں کو) تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا۔‘‘

دو حقیقی بیٹیوں کو ۲/۳ ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ﴾ [3]

’’اللہ تعالیٰ تمہیں، تمہاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور (دو یا دو سے زیادہ ہوں تو انہیں ترکہ سے دو تہائی ملے گا۔‘‘

مقررہ حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ چچا کے لیے ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: مقررہ حصے حقداروں کو دو اور جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے۔‘‘ [4]

مذکورہ صورت میں چچا میت کا قریبی مذکر رشتہ دار ہے لہٰذا باقی ترکہ اس کو مل جائے گا۔ سہولت کے پیش نظر کل ترکہ کے چوبیس حصے کر لیں جائیں، ان میں سے تین حصے بیوہ کو، سولہ حصے دو بیٹیوں کو اور باقی پانچ حصے چچا کو دے دیئے جائیں۔

نوٹ: اگرچہ حقیقی بہن دو بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ مع الغیر ہے لیکن ان کے مقابلے میں چچا عصبہ بنفسہٖ موجود ہے لہٰذا چچا کی موجودگی میں بہن محروم ہوگی کیونکہ وہ ذاتی طور پر عصبہ ہے اور بہن بیٹیوں کی وجہ سے عصبہ بنی ہے۔ (واللہ اعلم)

بیوی کا تمام جائیداد پر قبضہ کر لینا

سوال میرا ایک عزیز فوت ہوا اس کی بیوی، دو بیٹیاں اور پانچ بھائی ہیں، اس کی بیوی نے تمام جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے، شریعت کے مطابق ہر وارث کو حصہ ملتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دے کر ممنون فرمائیں۔

---

[1] ابن ماجه، كتاب الوصايا:۲۷۰۳۔ [2] ٤/النساء:۱۲۔

[3] ٤/النساء:۱۱۔ [4] صحيح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٢۔

جواب اگر مرنے والے کے ذمے کوئی قرض وغیرہ نہیں اور نہ ہی اس نے کوئی وصیت کی ہے تو اس کی بیوی کل جائیداد سے آٹھویں حصہ کی حقدار ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ [1]

''اگر مرنے والے کی اولاد ہے تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

اس کی بیٹیوں کی کل جائیداد سے دوتہائی دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ﴾ [2]

''اگر لڑکیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہیں تو انہیں کل ترکہ سے 2/3 دیا جائے۔''

بیوی اور بیٹیوں کو حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے اس کے حقدار میت کے بھائی ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے مذکر قریبی رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [3]

سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کو چوبیس حصوں میں تقسیم کرلیا جائے، ان میں سے تین حصے بیوی کو، سولہ حصے بیٹیوں کو اور باقی پانچ حصے بھائیوں کو دے دیئے جائیں، اس طرح کل جائیداد کو تقسیم کیا جائے۔ بیوی کا کل جائیداد پر قبضہ کرلینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

عیسائی باپ کا ورثہ

سوال میرا والد بہت مالدار آدمی تھا لیکن وہ عیسائی مذہب رکھتا تھا، میرے دو بھائی اور ایک بہن بھی عیسائی ہیں، جب کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں، میرے والد فروری میں کسی حادثہ سے دوچار ہو کر فوت ہو گئے ہیں، اس کا بہت سا ترکہ ہے، کیا میں اس کی جائیداد سے حقدار ہوں؟

جواب ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اسلام پر استقامت دے، دولت اسلام کے مقابلہ میں دنیا کا مال و متاع کوئی حیثیت نہیں رکھتا، شرعی مسئلہ کی وضاحت اس طرح ہے کہ کفر پر مرنے والے شخص کی مسلمان اولاد وارث نہیں ہو سکتی، کیونکہ اسلام لانے سے کفر سے متعلقہ تمام رشتے کٹ جاتے ہیں، چنانچہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان، کافر کا اور کافر، کسی مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔'' [4]

بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو جائیداد کی تقسیم سے پہلے اگر کوئی مسلمان ہو جائے تو اسے بھی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔ ہمارے رجحان کے مطابق ایک مسلمان بیٹا اپنے کافر باپ کی جائیداد کا حقدار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے جو اسلام کی دولت دی ہے وہ اسی کو کافی خیال کرے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ٤/النساء:١٢۔ [2] ٤/النساء:١١۔

[3] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٣٥۔ [4] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٦٤۔

غیر شرعی وصیت کرنا

سوال میرے والد نے وصیت کی ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری دوکان بڑے بیٹے کو دے دی جائے اور باقی جائیداد تقسیم کرتے وقت بھی اسے حصہ دیا جائے، جب کہ اس کی اولاد اور بھی ہے۔ اس وصیت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قرآن و حدیث کے مطابق فتویٰ درکار ہے۔

جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مرنے والے کی جائیداد تقسیم کرنے کا اصول بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ﴾ [1]

"اللہ تمہیں، تمہاری اولاد کے متعلق وصیت کرتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے۔"

اس آیت کے پیش نظر اولاد، اپنے باپ کی شرعی وارث ہے اور جو شرعی وارث ہوتا ہے اس کے لیے وصیت ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے، اس بنا پر وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔" [2] اس حدیث کی روشنی میں بڑے بیٹے کے لیے باپ کی وصیت ناجائز اور باطل ہے، اس کا نافذ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ﴾ [3]

"جو شخص وصیت کرنے والے کی طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ محسوس کرے اور وہ اصلاح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔"

اس آیت کے پیش نظر اس غلط وصیت کی اصلاح ضروری ہے کیونکہ اس میں دوسرے بچوں کی حق تلفی کی گئی ہے۔ اگر باقی اولاد خوشی سے اس وصیت کو مان لیں اور اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں تو اس وصیت پر عمل کیا جا سکتا ہے لیکن اگر شرعی ورثاء اس وصیت کو نہ مانیں اور دل میں گھٹن محسوس کریں تو وصیت پر عمل کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصول پر عمل کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ وفات کے بعد اولاد میں جائیداد اس طرح تقسیم ہو کہ ایک بیٹے کو بیٹی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ دیا جائے، آباء و اجداد کو چاہیے کہ وہ اپنے ایک بیٹے کی طرفداری کرتے ہوئے اپنی عاقبت کو خراب نہ کریں۔ (واللہ اعلم)

مقروض کے ترکہ کی تقسیم

سوال ایک آدمی فوت ہوا، پسماندگان میں سے بیوی، باپ، ایک بیٹا اور ایک بیٹی زندہ ہے، اس کے ترکہ میں ایک لاکھ روپیہ ہے جبکہ ۲۸ ہزار روپیہ اس کے ذمے قرض بھی ہے، شرعی طور پر اس کے ورثاء کو اس سے کیا کچھ ملے گا؟ براہِ کرم جلدی جواب دیں۔

---

[1] ٤/النساء:١١۔ [2] ابوداود، الوصایا: ٢٨٧٠۔ [3] ٢/البقرة:١٨٢۔

جواب بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں بیوی کا آٹھواں حصہ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ﴾ [1]

''اگر مرنے والے کی اولاد ہو تو بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

باپ کا چھٹا حصہ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ﴾ [2]

''اگر میت کی اولاد ہے اور والدین بھی ہیں تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔''

مقررہ حصہ لینے والے ورثاء سے جو باقی بچے وہ اولاد کا ہے۔ حدیث میں ہے کہ مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کے طے شدہ حصے دیئے جائیں، ان سے جو باقی بچے وہ مذکر قریبی رشتہ دار کا ہے۔ [3]

پھر اولاد میں اس شرح سے تقسیم کیا جائے کہ لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا ملے، واضح رہے کہ تقسیم سے پہلے قرض کی ادائیگی ضروری ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾ [4]

''یہ تقسیم میت کی وصیت اور اس کا قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی۔''

سہولیت کے پیش نظر کل ترکہ کو بہتر (۷۲) حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ان میں آٹھواں حصہ یعنی نو حصے بیوہ کو اور چھٹا حصہ یعنی ۱۲ حصے والد کو اور باقی ۱:۲ کی نسبت سے لڑکے اور لڑکی میں تقسیم کر دیا جائے، لڑکی ۱۷ حصے اور لڑکے کو چونتیس حصے دیئے جائیں۔ ایک لاکھ ترکہ سے اٹھائیس ہزار قرض منہا کیا تو باقی بہتر (۷۲) ہزار روپیہ ہے، اس سے نو ہزار بیوہ کو، بارہ ہزار والد کو، چونتیس ہزار روپیہ لڑکے کو اور سترہ ہزار روپے لڑکی کو دیا جائے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

لے پالک کا حصہ

سوال میرا ایک بیٹا ہے اور میں نے اپنے پھوپھی زاد سے ایک بیٹا لے کر پالا ہے، اسے پڑھایا اور اس کی شادی کر دی ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلا جائے، کیا وہ میری جائیداد سے حقدار ہوگا، کتاب و سنت کی روشنی میں میری راہنمائی کریں؟

جواب کسی دوسرے کے بچے کو اپنی گود میں لینا اسے لے پالک کہا جاتا ہے، اس کے متعلق ہمارے معاشرہ میں بہت غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جو آدمی کسی دوسرے کا بیٹا لیتا ہے اس کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے۔ سکول وغیرہ میں داخلہ کے وقت والد کے خانہ میں اپنا نام لکھواتا ہے، حالانکہ وہ اس کا نہ حقیقی بیٹا ہے اور نہ ہی پرورش کنندہ کو حقیقی والد قرار دیا جا سکتا ہے قرآن کریم نے اس کا سختی سے نوٹس لیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم ان متبنی بیٹوں کو ان کے باپ کے ناموں سے پکارا کرو۔'' [5]

---

[1] ٤/النساء:١٢۔ [2] ٤/النساء:١١۔ [3] صحیح بخاری، الفرائض: ٦٧٤٦۔ [4] ٤/النساء:١٢۔
[5] ٣٣/الاحزاب:٥۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو اپنا متبنی بنالیا تو ہم لوگ انہیں زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے، جب کہ مذکورہ آیت نازل ہوئی تو ہم انہیں زید بن حارثہ ہی کہنے لگے۔ [1]

اس طرح یہ بھی حکم ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب نہ کرے، جس نے کسی دوسرے کو جان بوجھ کر اپنا باپ ظاہر کیا وہ کافر ہوگا۔ [2]

اس طرح وراثت کا مسئلہ ہے کہ لے پالک بیٹا حقیقی بیٹے کا مقام نہیں لے سکتا، یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کے دو باپ ہوں، باپ وہی ہے جس کے نطفہ سے وہ پیدا ہوا ہے بشرطیکہ جائز نکاح سے ہو، دوسرا کوئی شخص نہ اس کا حقیقی باپ ہوسکتا ہے اور نہ وہ اس کا حقیقی بیٹا بن سکتا ہے۔ متبنی اپنے نقلی باپ کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ باپ اس متبنی کا وارث ہوسکتا ہے۔ حقیقی بیٹا ہی باپ کا وارث ہوگا اور حقیقی باپ ہی بیٹے کا وارث قرار دیا جائے گا، ہر شخص اپنے متبنی کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرسکتا ہے اسی طرح متبنی بھی اپنے نقلی باپ کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح کرسکتا ہے، عرب معاشرہ میں یہ رسم عام تھی جس کی اصلاح اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لے پالک کی مطلقہ بیوی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کا حکم دیا جس کی تفصیل سورۂ احزاب آیت نمبر ۳۷ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس طرح پردہ کا مسئلہ ہے کہ لے پالک جس گھر میں رہتا ہے، اس میں جتنی بھی غیر محرم عورتیں ہیں وہ اس کے لیے لے پالک بن جانے سے محرم نہیں بن جائیں گے، مثلاً پرورش کنندہ کی بیوی اور اس کی بیٹیاں لے پالک کے لیے غیر محرم ہیں اور شرعی طور پر اس سے پردہ کرنے کی پابند ہیں، کھلی آزادی، بہت سی معاشرتی بیماریاں جنم لیتی ہیں اور عملاً ہمارے معاشرہ میں ایسے کئی واقعات ہوئے ہیں، اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ پرورش کنندہ اپنی کسی بیٹی کا اس سے نکاح کردے، بہر حال اسلام نے اس کی اس قدر حوصلہ افزائی نہیں کی ہے جتنی ہمارے ہاں خیال کی جاتی ہے لے پالک کسی صورت نقلی باپ کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی وہ اصل بیٹے کا مقام لے سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

والدین، بیوی، ایک بیٹا اور دو بھائی کا وارث بننا

سوال ہمارا بھائی فوت ہوگیا ہے، اس کے والدین، بیوی ایک بیٹا اور دو بھائی زندہ ہیں، اس کی جائیداد کیونکر تقسیم ہوگی؟ کتاب وسنت کی روشنی میں ہمارا مسئلہ حل فرمائیں۔

جواب والدین میں ہر ایک کو چھٹا، چھٹا حصہ، بیوی کو آٹھواں اور باقی بیٹے کو ملے گا، اس صورت میں بھائی محروم ہیں، کل جائیداد کے چوبیس حصے کرلیے جائیں، پھر درج ذیل تفصیل سے اسے تقسیم کرلیا جائے۔

❶ والد: چھٹا حصہ: 4 ❷ والدہ: چھٹا حصہ: 4 ❸ بیوی: آٹھواں حصہ: 3 ❹ بیٹا: باقی ماندہ: 13 ❺ بھائی: محروم

بیٹے کو عصبہ کی حیثیت سے دیا جائے گا، اس کی موجودگی میں بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، التفسیر: ۴۸۸۲۔ [2] صحیح بخاری، المناقب: ۳۵۰۸۔

فوت شدہ بیٹے کا حصہ نکالنا

سوال فوت شدہ بیٹا اپنے والد کی جائیداد کا شرعی وارث ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اگر قانونی لحاظ سے کوئی جائیداد فوت شدہ بیٹے کے نام منتقل ہو چکی ہے تو کیا شرعاً اس کی اصلاح ہوسکتی ہے اور اسے واپس لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کے مطابق فتویٰ دیا جائے۔

جواب بشرط صحت سوال فوت شدہ بیٹا اپنے باپ کی جائیداد کا شرعی وارث نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی کی جائیداد سے بطور وارث حصہ لینے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ حصہ لینے والا میت کی موت کے وقت زندہ ہو جس طرح وراثت جاری ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ میت کی موت واقع ہو چکی ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ فوت شدہ آدمی سے بھی جائیداد سے بطور وراثت حصہ نہیں پا سکتا اور نہ ہی زندہ آدمی اپنی جائیداد سے بطور وراثت کوئی حصہ دے سکتا ہے، اس پر تمام علماء امت کا اتفاق ہے، اگر قانونی طور پر کوئی جائیداد کسی فوت شدہ کے نام منتقل ہو چکی ہو تو شرعی طور پر اسے واپس لیا جا سکتا ہے بلکہ اس کی اصلاح کرنا بہت ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ [1]

''اگر وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی کی طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو ورثاء کے درمیان صلح کرادی جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ غلط وصیت پتھر پر لکیر نہیں جو انمٹ ہو بلکہ اس کی اصلاح ضروری ہے تاکہ قیامت کے دن اسے مواخذہ سے بچایا جاسکے، شریعت کسی بھی غلط اقدام کو تسلیم نہیں کرتی اور نہ ہی اسے برقرار رکھتی ہے بلکہ اس کی اصلاح کا مطالبہ کرتی ہے احادیث میں ایسے متعدد واقعات ہیں، جن میں غلط وصیت کی اصلاح کا ذکر ہے۔ اس بنا پر اگر کوئی جائیداد کسی فوت شدہ بیٹے کے نام منتقل ہو چکی ہو تو شرعاً اسے واپس لیا جا سکتا ہے بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے تاکہ کسی دوسرے وارث کی حق تلفی نہ ہو۔ بہرحال نہ تو فوت شدہ بیٹا جائیداد سے بطور وراثت حصہ لے سکتا ہے اور نہ ہی اس کے نام منتقل شدہ باپ کی جائیداد کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

رضاعی بیٹے کا حصہ

سوال رضاعی بیٹے کو وراثت سے حصہ دینے کے متعلق شریعت اسلامیہ کا کیا حکم ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب علم فرائض کی اصطلاح میں کسی کے ترکہ سے حصہ پانے کے دو اسباب بیان کیے جاتے ہیں، ایک نکاح اور دوسرا نسب۔ رضاعت یعنی اجنبی عورت کا دودھ پینا، ان اسباب سے نہیں جو کسی کے ترکہ سے حصہ پانے کا باعث ہو، چنانچہ ارشاد

---

[1] ۲/البقرۃ:۱۸۲۔

باری تعالیٰ ہے: ''والدین اور قریبی رشتہ دار جو ترکہ چھوڑیں، اس میں مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ ہے۔'' [1]

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾ [2]

''اور بعض ذوی الارحام دوسروں کے مقابلہ میں کتاب اللہ کی رو سے (وراثت لینے کے) زیادہ مستحق ہیں۔''

ان آیات کی روشنی میں رضاعی بیٹے کا ترکہ سے کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور خونی رشتہ ہے تو کسی اور صورت میں اسے وارث بنایا جا سکتا ہے مثلاً بھتیجے کو کسی عورت نے دودھ پلایا ہے تو اگر کوئی قریبی رشتہ نہ ہو تو اسے بھتیجا ہونے کی حیثیت سے وارث بنایا جا سکتا ہے، اگر مرنے والے نے اپنے رضاعی بیٹے کے حق میں وصیت کی ہو تو بھی ترکہ سے وصیت کے طور پر حصہ دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ وصیت کل ترکہ کا 1/3 (ثلث) یا اس سے کم ہو، جیسا کہ احادیث میں اس کی وضاحت ہے، ان صورتوں کے علاوہ رضاعی بیٹے کو وارث بنانا شرعاً ناجائز ہے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کی حق تلفی ہے، جس کے متعلق قیامت کے دن اللہ کے ہاں باز پرس ہو گی، لہٰذا بے اولاد حضرات کو اس پہلو پر غور کر لینا چاہیے، ویسے بھی اسلام نے لے پالک بنانے کی حوصلہ افزائی نہیں کی کیونکہ اس میں بہت سی قباحتیں ہیں، بس ایسا کرنے سے دل کو ایک موہوم سی تسلی ہو جاتی ہے، ہمارے رجحان کے مطابق اس کے فائدے کے مقابلہ میں نقصانات زیادہ ہیں۔ (واللہ اعلم)

پس ماندگان میں صرف ماں ہو تو تقسیم؟

سوال ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں صرف اس کی والدہ زندہ ہے، کیا ایسے حالات میں ترکہ کی حقدار اس کی والدہ ہو گی؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب علم میراث میں وہ چھوٹے سے چھوٹا ہندسہ جسے بنیاد بنا کر حصے تقسیم کیے جاتے ہیں، اسے اصل مسئلہ یا مخرج کہتے ہیں، اگر مقررہ حصے حقداروں کو دینے کے بعد اصل مسئلہ سے بچ جائے اور کوئی عصبہ وغیرہ نہ ہو تو باقی ماندہ حصے بیوی خاوند کے علاوہ دیگر ورثاء پر ہی لوٹا دیئے جاتے ہیں، اس لوٹا دینے کے عمل کو ردّ کہا جاتا ہے، صورت مسئولہ میں والدہ کا مقررہ حصہ ایک تہائی ہے، اصل مسئلہ تین سے ہو گا، والدہ کو مقررہ حصہ دینے کے بعد دو حصے بچ جاتے ہیں جو دوبارہ اسے دے دیئے جائیں گے۔ اس ردّ کے کئی ایک قاعدے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ اگر مقررہ حصہ لینے والا ایک ہے اور کوئی دوسرا وارث زندہ نہیں تو تمام جائیداد اسی وارث کو دے دی جاتی ہے جیسا کہ مذکورہ صورت میں تیسرا حصہ اصحاب الفروض کی حیثیت سے اور باقی دو حصے ردّ کی حیثیت سے مل گئے ہیں، اگر ماں کے ساتھ کوئی دوسرا عصبہ وارث ہوتا تو باقی ماندہ ترکہ اسے ملنا تھا چونکہ دوسرا کوئی وارث موجود نہیں ہے، لہٰذا تمام جائیداد کی حقدار مرنے والے کی ماں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ٤/النسا:٧۔ [2] ٨/الانفال:٧٥۔

بیوہ کا حصہ

سوال بیوہ، خاوند کی جائیداد تقسیم ہونے سے پہلے آگے نکاح کر لیتی ہے، کیا اس صورت میں وہ پہلے خاوند کی جائیداد سے حصہ لے گی؟

جواب بیوہ کو عدت گزارنے کے بعد عقد ثانی کی اجازت ہے، اس دوران خاوند کی جائیداد کو تقسیم کر دینا چاہیے، اگر کسی وجہ سے جائیداد تقسیم نہیں ہوتی ہے تو عقد ثانی کرنے سے اس کا پہلے خاوند کی جائیداد سے حصہ ختم نہیں ہو جاتا ہے، اگر خاوند کی اولاد ہے تو اسے کل جائیداد سے آٹھواں حصہ اگر اولاد نہیں ہے تو بیوہ چوتھے حصہ کی حقدار ہے، عقد ثانی اس کے وراثتی حصہ پر اثر انداز نہیں ہوگا، ایسی باتیں جہلاء کی پھیلائی ہوئی ہیں۔

نانا کی وراثت سے نواسی کا حصہ

سوال ایک شخص کی وفات کے وقت اس کے تین بھتیجے اور ایک نواسی زندہ تھی، وراثت اس کے بھتیجوں کو مل گئی، کافی عرصہ بعد اس کی نواسی نے عدالت میں دعویٰ کر دیا ہے کہ نانا کی وراثت میں اس کا برابر کا حق ہے، قرآن و حدیث کے مطابق بتایا جائے کہ نواسی کو کچھ حصہ ملتا ہے یا نہیں؟

جواب قرآن کریم کے ضابطہ وراثت کے مطابق میت کی جائیداد کے سب سے پہلے حقدار وہ ورثاء ہیں جن کے حصص قرآن یا حدیث میں مقرر ہیں۔ جنہیں اصحاب الفروض کہا جاتا ہے۔ ان سے بچا ہوا ترکہ عصبات کو ملتا ہے، صورت مسئولہ میں نواسی نہ تو اصحاب الفروض سے ہے اور نہ ہی عصبات میں اس کا شمار ہوتا ہے بلکہ نواسی ذوالارحام میں شامل ہے جو اصحاب الفروض اور عصبات کی عدم موجودگی میں وارث ہوتے ہیں، مرحوم کی وفات کے وقت اس کے بھتیجے زندہ تھے۔ ایسے حالات میں اس کی جائیداد کے وہ وارث ہیں کیونکہ ان کا شمار عصبات میں ہوتا ہے۔ ان کی موجودگی میں نواسی محروم ہے لہٰذا اس کا عدالت میں دعویٰ کرنا درست نہیں ہے۔ اور نہ ہی اسے مرحوم کی بیٹی کے قائم مقام سمجھ کر وراثت کا حقدار قرار دیا جا سکتا ہے، حدیث میں ہے کہ حصے داروں کو حصہ دینے کے بعد میت کے قریبی مذکر رشتہ دار وارث بنتے ہیں۔

اس حدیث کے پیش نظر بھتیجے قریبی مذکر رشتہ دار ہیں جو وراثت کے حقدار ہوں گے نواسی ان میں شامل نہیں ہے اس بنا پر نانا کی جائیداد سے اس کا کوئی حق نہیں بنتا۔ (واللہ اعلم)

اعضاء رئیسہ (دل، جگر، دماغ، گردوں کی وصیت) کرنا

سوال آج کل میڈیا پر لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ فوت ہونے سے قبل اپنے اعضاء رئیسہ دل، دماغ، جگر اور گردوں کے متعلق وصیت کر دیں کہ یہ فلاح انسانیت کے لیے وقف ہیں اور میرے فوت ہونے کے بعد انہیں نکالا جا سکتا ہے تا کہ لوگوں کے کام آئیں، کیا ایسا کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اللہ تعالیٰ کے انسان پر بے شمار احسانات ہیں، ان میں سے ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اسے جسم اور اعضا عطا

فرمائے ہیں جنہیں وہ کام میں لاتا ہے، اعضاء رئیسہ دل، دماغ جگر اور گردے وغیرہ تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جسم اور اعضاء کا انسان کو مالک نہیں بنایا کہ انہیں جیسے چاہے استعمال کرے یا ان میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرے بلکہ بطور امانت یہ جسم اور اعضاء اس کے حوالے کیے ہیں، قیامت کے دن ان کے استعمال کے متعلق انسان سے باز پرس ہوگی۔ قرآن کریم نے کان، آنکھ اور دل کے متعلق بطور خاص تنبیہ کی ہے کہ کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق اللہ کے ہاں باز پرس ہوگی۔ [1]

ہمارے رجحان کے مطابق جو لوگ دل، دماغ اور جگر، گردے کے متعلق وصیت کر جاتے ہیں کہ مرنے کے بعد انہیں نکال کر کسی بھی ضرورت مند کو لگا دیئے جائیں، یہ وصیت بے جا تصرف ہے، جس کی انسان کو اجازت ہی نہیں، حدیث میں ایک واقعہ سے اس موقف پر روشنی پڑتی ہے: حضرت طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو ان کے ساتھ ان کی قوم کے ایک شخص نے بھی ہجرت کی، لیکن مدینہ طیبہ کی آب و ہوا اسے موافق نہ آئی، چنانچہ وہ شخص بیمار ہوا اور تکلیف کے ہاتھوں بے بس ہو کر اس نے برچھے سے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ ڈالے، جب خون بہنا شروع ہوا تو دونوں ہاتھوں سے اس قدر خون نکلا کہ وہ مر گیا۔ طفیل دوسی رضی اللہ عنہ نے اسے خواب میں دیکھا تو اس کی شکل اچھی تھی مگر اپنے دونوں ہاتھوں کو چھپائے ہوئے تھا، انہوں نے پوچھا کہ تیرے رب نے تیرے ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا: ہجرت کی وجہ سے مجھے معاف کر دیا ہے پھر پوچھا تو نے ہاتھوں کو کیوں چھپایا ہوا ہے؟ تو اس نے کہا مجھ سے کہا گیا ہے؟ ہم تیرے ہاتھوں کو درست نہیں کریں گے کیونکہ تو خود انہیں خراب کر کے آیا ہے، جب حضرت طفیل رضی اللہ عنہ نے یہ خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا تو آپ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! تو اس کے دونوں ہاتھوں کو بھی بخش دے۔'' [2] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو انسان وصیت کر کے اپنے اعضاء رئیسہ کو خراب کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کی اصلاح نہیں فرمائیں گے۔ لہٰذا اس قسم کی وصیت سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ۱۷/الاسراء:۳۶۔ [2] مسلم، الایمان: ۳۱۱۔

نکاح وطلاق

نکاح وطلاق

گم شدہ خاوند کی بیوی دوسرے نکاح کے لیے کتنا عرصہ انتظار کرے؟

سوال ایک عورت جس کی شادی آج سے اٹھارہ سال قبل ہوئی، اس کے ہاں تین بچے بھی پیدا ہوئے، تقریباً پانچ ماہ قبل اس عورت کا خاوند، بیوی بچوں کو چھوڑ کر کہیں روپوش ہوگیا، اس کے اہل خانہ کو اس کے متعلق کوئی سراغ نہیں ملا اور نہ ہی اس نے کوئی اطلاع دی ہے، بچوں کو خرچہ بھی نہیں بھیجا، ایسے حالات میں عورت، کتنی مدت تک کے لیے اپنے خاوند کا انتظار کرے، کتنی مدت کے بعد وہ دوسرا نکاح کرنے کی مجاز ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق سوال کا جواب دیں۔

جواب فقہی اصطلاح میں لا پتہ شخص کو مفقود الخبر کہتے ہیں یعنی ایسا شخص جس کی زندگی یا موت کے متعلق تلاش کے باوجود کوئی سراغ نہ مل سکے آیا وہ زندہ موجود ہے یا دنیا سے چل بسا ہے۔ دورِ حاضر میں اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ملکی یا غیر ملکی ایجنسیاں کسی آدمی کو چپکے سے اٹھالیتی ہیں۔ پھر سالہا سال تک اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اخبارات میں بکثرت اس طرح کی خبریں ہم روزانہ پڑھتے ہیں، چونکہ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے تاکہ اس کی روشنی میں اس کے متعلق کوئی دوٹوک فیصلہ کیا جاسکے، اس بنا پر متقدمین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے البتہ ایک من گھڑت اور خود ساختہ حدیث مروی ہے، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لا پتہ شوہر کی بیوی اس وقت تک اس کی بیوی ہی رہے گی جب تک کہ گمشدہ آدمی کے متعلق کوئی واضح اطلاع نہ موصول ہوجائے۔'' [1]

اس حدیث کی سند میں محمد بن شرحبیل صمدانی ایک راوی ہے جسے محدثین نے متروک قرار دیا ہے اور وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے منکر اور باطل روایات بیان کرنے میں مشہور ہے، پھر اس سے بیان کرنے والا سوار بن مصعب بھی اسی قسم کا ہے بہر حال یہ روایت ناقابل حجت اور نکارہ ہے۔ [2]

اس مسئلہ کے متعلق کچھ حضرات نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ ایسے شخص کی بیوی طویل عرصہ تک انتظار کرے تاوقتیکہ لا پتہ شوہر کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوجائے مثلاً ایک اٹھارہ سال کی لڑکی کا نکاح بیس سالہ لڑکے سے ہوا، وہ لڑکا چند روز بعد لا پتہ ہوگیا اور اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تو ان حضرات کے نزدیک وہ لڑکی سو سال تک اپنے لا پتہ خاوند کا انتظار کرے تا آنکہ اس کی عمر ایک سو بیس برس ہوجائے، اس کے بعد فیصلہ کیا جائے گا وہ فوت ہوچکا ہے پھر وہ عدتِ وفات چار ماہ دس دن انتظار کرکے کسی دوسرے سے نکاح کرنے کی مجاز ہوگی۔ [3]

---

[1] دارقطنی، ص: ۳۱۲، ج۳۔ [2] التعلیق المغنی، ص: ۳۱۲، ج۳۔ [3] ھدایہ کتاب المفقود۔

لیکن مذکورہ مؤقف اختیار کرنے میں جو مفاسد پوشیدہ ہیں وہ کسی صاحب عقل سے مخفی نہیں ہیں کہ ایک لڑکی کا جب خاوند لا پتہ ہوا تو لڑکی کی عمر اٹھارہ سال تھی پھر اسے اٹھانوے سال اپنے لا پتہ شوہر کے انتظار میں گزارنے ہوں گے تا آنکہ اس کی موت یقینی ہو جائے، اس عمر میں وہ خاک شادی کرے گی، اس مؤقف کی سنگینی کو خود اختیار کرنے والوں نے محسوس کیا اور اس کے غیر معقول ہونے کا فیصلہ دیا، چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی نے ایسی مظلومہ کے لیے ایک کتاب ''الحیلۃ الناجزۃ'' لکھی وہ اس میں فرماتے ہیں: ''فقہاء حنفیہ میں سے بعض متاخرین نے وقت کی نزاکت اور فتنوں پر نظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر فتویٰ دیا ہے، ایک عرصہ سے ارباب فتویٰ اہل ہندو بیرون ہند تقریباً سب نے اس قول پر فتویٰ دینا اختیار کرلیا ہے اور یہ مسئلہ اس وقت ایک حیثیت سے فقہ حنفی ہی میں داخل ہوگیا۔ [1]

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے لا پتہ شوہر کی بیوی کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے کہ وہ خاوند کے لا پتہ ہونے کے وقت سے چار سال گزر جانے تک انتظار کرے پھر اس خاوند پر فوت ہونے کا حکم لگایا جائے گا، اس کے بعد عدت وفات چار ماہ دس دن گزارے گی، پھر اسے دوسرا نکاح کرنے کی اجازت ہوگی۔ [2] امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا ہے کہ اگر نکاح ثانی سے پہلے پہلے لا پتہ خاوند گھر آجائے تو وہ بیوی اسی کی ہوگی اور اگر وہ نکاح ثانی کر لینے کے بعد باز یاب ہو تو اسے بیوی سے محروم ہونا پڑے گا، اگرچہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان حالات میں اسے حق مہر اور بیوی میں سے ایک کا اختیار دیا جائے گا لیکن پہلا مؤقف ہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ یعنی اگر اس کی بیوی نکاح ثانی کر لیتی ہے تو اسے اپنی بیوی سے محروم ہونا پڑے گا۔ دراصل امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے لا پتہ شوہر کے متعلق جو مؤقف اختیار کیا ہے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلے کو بنیاد بنایا ہے۔ ان کے ہاں اس طرح کا ایک معاملہ آیا تو انہوں نے فرمایا: ''لا پتہ آدمی کی بیوی چار سال انتظار کرے، پھر شوہر کے فوت ہونے کی عدت گزارے یعنی چار ماہ دس دن، اس کے بعد اگر چاہے تو شادی کرے۔'' [3]

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اسی مؤقف کو اختیار کیا تھا اور اس کے مطابق فیصلہ دیا تھا۔ [4]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسی مؤقف کو اپنایا ہے۔ [5]

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر دوران جنگ لا پتہ ہو جائے تو اس کی بیوی ایک سال انتظار کرے اور اگر جنگ کے علاوہ کسی دوسری جگہ لا پتہ ہو جائے تو چار سال انتظار کرے۔ [6]

بہرحال قرآن کریم نے عورتوں کے متعلق فرمایا ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھے انداز سے زندگی گزارو۔ [7]

نیز فرمایا کہ انہیں محض تکلیف دینے کے لیے اپنے گھروں میں مت بند کرو۔'' [8]

---

[1] الحیلۃ الناجزہ، ص: ٥٠۔ [2] مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق۔ [3] بیہقی، ص: ٤٤٥، ج٧۔
[4] مصنف عبدالرزاق، ص: ٨٥، ج٧۔ [5] بیہقی، ص: ٤٤٥، ج٧۔ [6] مصنف عبدالرزاق، ص: ٨٩، ج٧۔
[7] ٤/النساء: ١٩۔ [8] ٢/البقرۃ: ٢٣١۔

ان دو آیات میں عورتوں کے حقوق کو بڑے عمدہ اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے، ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کی بنیاد یہی دو آیات ہوں، کیونکہ لاپتہ شوہر کی بیوی کو بلا وجہ طویل مدت تک انتظار کرنے کا پابند کرنا حسن معاشرت کے منافی اور اسے تکلیف دینے کے مترادف ہے، ہمارے رجحان کے مطابق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف صحیح ہے کیونکہ اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک فیصلے کی تائید حاصل ہے، معاشرتی حالات بھی اس کا تقاضا کرتے ہیں لیکن مدت انتظار کا تعین حالات و ظروف کے تحت کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں ذرائع مواصلات اس قدر وسیع اور سریع ہیں جن کا تصور زمانہ قدیم میں محال تھا۔ آج ہم کسی شخص کے گم ہونے کی اطلاع ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے ایک دن میں ملک کے کونے کونے تک پہنچا سکتے ہیں بلکہ انٹرنیٹ کے ذریعے چند منٹوں میں گم شدہ شخص کی تصویر بھی دنیا کے چپہ چپہ تک پہنچائی جا سکتی ہے، اس بنا پر چار سال کی مدت انتظار کو مزید کم کیا جا سکتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ایک سال مدت انتظار کی طرف سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی صحیح میں ایسے شخص کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

''مفقود الخبر کی بیوی اس کے مال ومتاع کا حکم''۔ [1]

لیکن آپ نے واضح طور پر دوٹوک الفاظ میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا، البتہ پیش کردہ احادیث و آثار سے آپ کا رجحان معلوم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن مسیب کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ جب کوئی سپاہی میدان جنگ میں گم ہو جائے تو اس کی بیوی ایک سال تک انتظار کرے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ انہوں نے کسی سے ادھار لونڈی خریدی پھر لونڈی کا مالک گم ہو گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک سال تک اس کا انتظار کیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا رجحان بیان کرنے کے لیے حدیث لقطہ کو ذکر کیا ہے کہ اگر کسی کو گرا پڑا سامان ملے تو وہ اس کا سال بھر اعلان کرے۔ [2]

ان آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زوجہ مفقود کے لیے انتظار کا وقت ایک سال مقرر کیا جا سکتا ہے، موجودہ احوالِ وظروف کے مطابق یہ مؤقف قرین قیاس بھی ہے لہٰذا ذرائع مواصلات اور میڈیا کے پیش نظر دورِ حاضر میں ایک سال کا انتظار کافی معلوم ہوتا ہے، بصورت دیگر قدیم فتویٰ تو اپنی جگہ جمہور علما اسلام اور مفتیانِ کرام کے ہاں رائج چلا آ رہا ہے لیکن عقد نکاح کوئی کچا دھاگہ نہیں ہے جسے آسانی سے توڑ دیا جائے اور یہ ایک ایسا حق ہے جو خاوند کے لیے لازم ہو چکا ہے۔ اس بنا پر اس عقد نکاح کو کھولنے کا مجاز عورت کا شوہر ہے لیکن دفع مضرت کے پیش نظر عدالت، خاوند کے قائم مقام ہو کر فسخ کرنے کی مجاز ہے جیسا کہ خلع وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے گم شدہ خاوند سے خلاصی کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ عورت عدالت کی طرف رجوع کرے، رجوع سے قبل جتنی مدت گزر چکی ہو گی اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، ہمارے ہاں بعض عورتیں مدت دراز انتظار کرنے کے بعد عدالت کے نوٹس میں لائے بغیر یا اس کا فیصلہ حاصل کرنے سے قبل محض فتویٰ لے کر نکاح کر لیتی ہیں، ان کا یہ اقدام صحیح نہیں ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی عورت عدالت کے نوٹس میں لائے بغیر اپنے مفقود شوہر کا انتظار چار سال تک کرے

---

[1] صحيح بخاری، الطلاق، باب نمبر ۲۲۔ [2] صحيح بخاری، الطلاق، حديث نمبر: ۵۲۹۲۔

تو اس مدت کا اعتبار کیا جائے گا؟ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا اگر وہ اس طرح بیس سال بھی گزار دے تو بھی اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ [1]

اس بنا پر ضروری ہے کہ جس کا خاوند لا پتہ ہو جائے وہ فوری طور پر عدالت کی طرف رجوع کرے پھر اگر عدالت اس نتیجہ پر پہنچے کہ واقعی مفقود الخبر ہے تو وہ عورت کو ایک سال انتظار کرنے کا حکم دے گی، اگر اس مدت تک شوہر نہ آئے تو ایک سال کے اختتام پر عدالت نکاح فسخ کر دے گی، پھر عورت اپنے شوہر کو مردہ تصور کر کے عدتِ وفات یعنی چار ماہ دس دن گزارنے کے بعد نکاح ثانی کرنے کی مجاز ہوگی، اگر عدالت بلا وجہ معاملہ کو طول دے اور عورت مجبور ہو اور وہ صبر نہ کر سکے تو مسلمانوں کی ایک جماعت تحقیق کر کے فیصلہ کرے، ایسے حالات میں پنچایتی فیصلہ بھی عدالت کا فیصلہ ہی تصور ہوگا۔

کن حالات میں خلع لینا جائز ہے

سوال کیا بیوی بلا وجہ اپنے خاوند سے خلع لینے کی مجاز ہے؟ وہ کون سے حالات ہیں جن کی بنا پر خلع لینا جائز ہے؟ کیا خلع لینے کے لیے عورت کو اپنے والدین سے اجازت لینا ضروری ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب کتاب وسنت کی روشنی میں دیں۔

جواب خلع، عورت کی طرف سے علیحدگی اختیار کرنے کا نام ہے، عورت کو چاہیے کہ کسی معقول وجہ کی بنا پر اپنے خاوند سے علیحدگی کا مطالبہ کرے، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو عورت کسی معقول وجہ کے بغیر اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔'' [2]

اس حدیث کی بنا پر عورت کو بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کرنا صحیح نہیں ہے، تاہم اس کے باوجود بلا وجہ خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے اگرچہ وہ ایسا کرنے میں گنہگار رہوگی۔ وہ حالات جن کے پیش نظر عورت خلع لینے میں حق بجانب ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

1. شکل وصورت، سیرت وکردار یا دینی اقدار کے متعلق اپنے خاوند کو ناپسند کرے۔
2. عمر میں بڑا ہونے، کمزور ہونے یا قوت برداشت سے باہر ہونے میں بھی خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

یا اس طرح کی کوئی بھی وجہ ہو جس کی بنا پر وہ حقوق کی ادائیگی نہ کر سکتا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾ [3]

''اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان پر (خلع میں) کوئی گناہ نہیں ہے۔''

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی جمیلہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ میں اپنے خاوند ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے خلق وکردار اور دینی اقدار کے متعلق کوئی عیب نہیں لگاتی، لیکن میں اسے برداشت نہیں کر سکتی ہوں، میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ اسلام میں رہتے ہوئے کفران نعمت کا ارتکاب کروں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حالات میں اسے خلع لینے کی اجازت دی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ حق مہر میں دیا ہوا باغ واپس کر دے۔ [4]

---

[1] المدونة الكبرىٰ، ص: ۹۳، ج۲۔ [2] مسند امام احمد، ص: ۲۷۷، ج۵۔
[3] ۲/البقرہ: ۲۲۹۔ [4] صحيح بخاری، الطلاق: ۵۲۸۵، ۵۲۷۳۔

واضح رہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی کو ان کی شکل وصورت پسند نہ تھی جیسا کہ بعض دیگر روایات میں اس کی صراحت موجود ہے، چونکہ یہ عورت کا ایک ذاتی اور پرائیویٹ معاملہ ہے اس لیے اگر وہ عقلمند اور صاحب بصیرت ہو تو اسے خلع لینے کے لیے اپنے والدین سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر نا سمجھ یا کم عمر یا واجبی سی فہم وبصیرت کی حامل ہو تو والدین یا اپنے بھائیوں سے اجازت لے اور اس اقدام پر ان سے مشورہ کرلے تاکہ آئندہ زندگی میں اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو۔ (واللہ اعلم)

رضاعت کا مانع حجاب ہونا

سوال ہمارے ادارہ میں کسی خاتون نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو تلامذہ آتے تھے آپ ان کے متعلق اپنی بھانجیوں اور بھتیجیوں کو کہتی تھیں کہ تم انہیں دودھ پلا دو تاکہ میرے ہاں آنے جانے میں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے اور ان سے میرا شرعی حجاب اٹھ جائے، ہمارے ہاں خواتین میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے اور الجھن کا باعث بنا ہوا ہے، قرآن حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب عورت کا وہ دودھ جو اجنبی سے رشتہ پر اثر انداز ہوتا ہے اس کی دو شرائط حسب ذیل ہیں:

❶ بچہ کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پیئے، ایک دو دفعہ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے، اس کی وضاحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں ہے۔ [1]

❷ بچہ اس عمر میں دودھ پیئے جب اس کی غذا کا انحصار صرف دودھ پر ہو، حدیث میں ہے کہ صرف وہی رضاعت حرمت ثابت کرتی ہے جو انتڑیوں کو کھول دے اور دودھ چھڑانے کی مدت (دو سال کی عمر) سے پہلے ہو۔ [2] اس ضابطہ سے ایک استثنائی صورت احادیث میں بیان ہوئی ہے: حضرت سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سالم رضی اللہ عنہ کو ہم نے لے پالک بنایا تھا، اب اس کے متعلق قرآن نے جو حکم دیا ہے وہ آپ کو معلوم ہے لیکن وہ ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا اور وہ بالغ ہو چکا ہے، میرے شوہر کو اس کا گھر میں آنا جانا ناگوار گزرتا ہے، ہماری الجھن کو حل فرمائیں، آپ نے فرمایا تم اسے اپنا دودھ پلا دو، اس نے کہا کہ وہ تو بڑا ہو چکا ہے، آپ نے فرمایا مجھے معلوم ہے کہ وہ بڑا ہو چکا ہے، تم اسے دودھ پلا دو۔ چنانچہ اس حکم کے بعد حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا نے سالم رضی اللہ عنہ کو پانچ مرتبہ دودھ پلا دیا پھر وہ اس کے بچے کی طرح ہو گیا اور حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ناگواری بھی دور ہوگئی۔ [3]

اس حدیث کو بنیاد بنا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جس آدمی کے متعلق اپنے پاس آنے جانے میں شرعی حجاب محسوس کرتیں اور اسے وہ آدمی پسند ہوتا تو اپنی بھانجیوں کو حکم دیتیں کہ تم اسے پانچ مرتبہ دودھ پلا دو اگرچہ وہ عمر میں کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ [4]

لیکن حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواج مطہرات نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس موقف سے اتفاق نہ کیا اور وہ اس قسم کی رضاعت کو غیر مؤثر خیال کرتیں تھیں، ان کا کہنا تھا کہ اگر بچہ گود میں رہتے ہوئے دودھ پیئے تو رضاعت سے حرمت ثابت ہوگی وہ

---

[1] صحیح مسلم، الرضاع: ۱٤٥۲۔ [2] ترمذی: ۱۱٥۲۔
[3] ابو داود، النکاح: ۲۰٦۱۔ [4] ابو داود، حوالہ مذکور۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہتی تھیں اللہ کی قسم! ہمارے خیال کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے صرف حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے متعلق اجازت دی تھی تاکہ سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا اسے دودھ پلا کر اپنا بیٹا بنا لے، اللہ کی قسم! اس عمر میں دودھ پینے والا کوئی شخص نہ ہمیں دیکھ سکے گا اور نہ ہی ہم اسے اپنے پاس آنے کی اجازت دیں گی۔ [1]

سوال میں ذکر کردہ بات صحیح نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے تلامذہ کے متعلق یہ مؤقف رکھتی تھیں، بہرحال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ مؤقف تھا کہ بڑی عمر میں دودھ پینے سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے لیکن جمہور اہل علم نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ صرف دو سال سے کم عمر میں پلائے گئے دودھ سے ہی حرمت ثابت ہوگی جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے، انہوں نے درج ذیل وجوہ کی بنا پر اپنے مؤقف کو راجح قرار دیا ہے۔

❶ دو سال کی عمر میں دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہونے کے متعلق متعدد احادیث ہیں جب کہ بڑے لڑکے کو دودھ پلانے کے متعلق صرف حضرت سالم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ہے جس میں عموم کا کوئی پہلو نہیں۔

❷ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے بھی اسی مؤقف کو اختیار کیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس معاملہ میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔

❸ احتیاط کا پہلو بھی اسی میں ہے کہ بڑے آدمی کی رضاعت کا اعتبار نہ کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے زندگی میں بہت سی الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

❹ بڑے آدمی کو دودھ پلانے سے جسم کا گوشت پوست نہیں بنتا ہے حالانکہ ان چیزوں کو احادیث میں حرمت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

❺ ممکن ہے کہ یہ معاملہ صرف حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہو کیونکہ یہ چیز صرف اسی قصہ میں موجود ہے، ازواج مطہرات نے بھی اس امر کو بیان کیا ہے۔

❻ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رضاعت اس وقت معتبر ہوگی جب بھوک کے وقت دودھ پیا جائے۔'' [2]

ہمارے رجحان کے مطابق محتاط مؤقف یہ ہے کہ دودھ پلانے کے مسئلہ میں بچپن کا ہی اعتبار کیا جائے گا ہاں اگر حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا جیسا مسئلہ درپیش ہو مثلاً ایک آدمی جو انتہائی تعلق دار ہے، اس کا کسی عورت کے پاس جانا ضروری ہو اور اس عورت کا اس سے پردہ کرنا بھی دشوار ہو تو ایسے حالات میں اگر بڑی عمر کے آدمی کو کسی عورت نے دودھ پلا دیا تو پردہ اٹھا دینے کی حد تک اس کا دودھ قابل تاثیر ہوگا۔ نیز اس قسم کی ضرورت کو آدمی اور عورت تک ہی محدود رکھا جائے، ایسی صورت کے علاوہ دودھ پینے کے قابل تاثیر مدت دو سال تک ہی ہوگی، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کا مؤقف اختیار کیا ہے۔ [3]

---

[1] نسائی، النکاح: ٣٣٢٦۔ [2] صحیح بخاری، النکاح: ٥١٠٢۔

[3] مجموع الفتاویٰ، ص: ٦٠، ج ٣٤۔

بہرحال اس مسئلہ میں وسعت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے ہر صورت میں احتیاط کا پہلو مدنظر رکھا جائے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

دوسری شادی کے لیے بیوی کی اجازت

سوال میری شادی آج سے تین سال قبل ہوئی، الحمد للہ میرے تین بچے ہیں، میرا دوسری شادی کا پروگرام ہے، میں نے اس بات کا ذکر جب اپنی بیوی سے کیا تو اس نے کہا مجھے طلاق دے دو، قرآن وحدیث کے مطابق کیا اسے حق ہے کہ وہ بلاوجہ طلاق کا مطالبہ کرے نیز کیا دوسری شادی کے لیے بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں۔

جواب جب کوئی شخص مالی اور بدنی طور پر دوسری شادی کرنے کی استطاعت رکھتا ہے اور وہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے تو شرعاً اسے دوسری شادی کرنے کی اجازت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ﴾ [1]

''اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو، دو، دو تین تین اور چار چار سے، لیکن اگر تمہیں عدل نہ کرسکنے کا اندیشہ ہو تو ایک ہی کافی ہے۔''

لیکن ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عورت میں بہت غیرت ہوتی ہے خاص طور پر سوکن کے سلسلہ میں اس کا کچھ زیادہ ہی مظاہرہ ہوتا ہے وہ اس بات کو قطعاً برداشت نہیں کرتی کہ خاوند کے ساتھ کوئی اور عورت بھی اس کی شریک ہوجائے، یہ غیرت کوئی ملامت والی چیز نہیں ہے، اچھی عورت میں یہ غیرت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ غیرت اس وقت قابل مذمت ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز پر اعتراض کا باعث ہو، خاوند اگر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اگرچہ پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے، تاہم حسن معاشرت کا تقاضا ہے کہ اپنی بیوی کو اعتماد میں لیا جائے، ایسا نہ ہو کہ شادی کرنے کے بعد گھر کا سکون تباہ ہوجائے، دوسری شادی بطور فیشن کرنا ہمارے نزدیک مستحسن نہیں ہے۔ البتہ بلاوجہ عورت کا طلاق لینا اور اس کا مطالبہ کرنا بھی شرعاً ناجائز ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی عورت کسی شرعی ضرورت کے بغیر اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہوگی۔'' [2]

اسے چاہیے کہ حالات کا بغور جائزہ لے اگر وہ دوسری بیوی کی موجودگی میں اچھی طرح زندگی نہیں گزار سکتی تو خلع لے کر فارغ ہوجائے اور اگر وہ گزارا کرسکتی ہے، لیکن اسے تکلیف یا تنگی محسوس ہوتی ہے تو اللہ کی رضا کے لیے صبر کرے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا ثواب ملے گا، ہم اس حوالے سے خاوند کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے اولاد کی نعمت سے نوازا ہے اور بیوی کے اخلاق وکردار میں کوئی کمزوری نہیں ہے تو دوسری بیوی سے شادی کرنے کا تجربہ نہ کرے کیونکہ یہ کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے جسے محض دل لگی اور تفریح طبع کے لیے عمل میں لایا جائے اور اگر اسے واقعی ضرورت ہے تو بہتر ہے کہ اپنی پہلی بیوی کو اعتماد میں لے تاکہ آئندہ اسے کسی قسم کی پریشانی نہ ہو، ہمارے معاشرہ میں یہ معاملہ آسانی سے ہضم نہیں ہوتا، اس لیے انتہائی غور وفکر اور سوچ وبچار کے بعد یہ اقدام کرنا چاہیے۔

---

[1] ٤/النساء: ٣۔ [2] ابوداود، الطلاق: ٢٢٢٦۔

عورت کو طلاق کی دھمکی دینا

سوال میرے گھر میں ٹی وی ہے اور میرا خاوند اس میں عریاں فلمیں دیکھتا ہے اور مجھے بھی ایسی ننگی فلمیں دیکھنے پر مجبور کرتا ہے، میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ اس قسم کی فلمیں دیکھنا ترک کر دے یا پھر مجھے چھوڑ دے اور اس نے بھی مجھے دھمکی دی ہے اگر میں اس کے ساتھ اس کار بد میں شریک نہیں ہوتی تو طلاق کی دھمکی دی ہے، ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے ایمان داروں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو جہنم کی آگ سے بچائیں جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ [1]

اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق خاوند کے لیے بیوی اور اس کی اولاد کو رعایا بنایا ہے اور قیامت کے روز اس سے اپنی رُعایا کے بارے میں باز پرس ہوگی، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''آدمی، اپنے اہل خانہ کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔'' [2]

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جسے بھی کسی رعایا کا ذمہ دار بنایا اور وہ انہیں نصیحت نہیں کرتا تو وہ جنت کی خوشبو تک حاصل نہیں کرے گا۔'' [3]

خاوند کا اپنے گھر میں گندی اور عریاں فلمیں دیکھنا بہت بڑا گناہ ہے اور اپنے گھر والوں کو دیکھنے پر مجبور کرنا اس گناہ سے بڑھ کر سنگین جرم ہے، بیوی کو چاہیے کہ وہ ایسے معاملات میں قطعی طور پر خاوند کی بات نہ مانے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ کی معصیت میں کسی کی بھی اطاعت نہیں، اطاعت تو صرف بھلے کاموں میں ہوتی ہے۔'' [4]

خاوند کا بیوی کو طلاق کی دھمکی دینا کوئی شرعی عذر نہیں ہے کہ وہ اس کی بات ماننے پر مجبور ہو بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند کو اچھے انداز میں نصیحت کرے اگر وہ اس کے کہنے پر برائی کو ترک کر دیتا ہے تو بیوی کو اس کا اجر و ثواب ہوگا اور اگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتا ہے تو بیوی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے خدشہ سے اس کے ساتھ چمٹی رہے، اس سلسلہ میں اسے ہر اس اقدام سے گریز نہیں کرنا چاہیے جو اس کی نجات کا باعث ہو، اللہ تعالیٰ اسے ضرور نعم البدل عطا فرمائے گا، ایسے حالات میں خاوند کے کہنے پر گناہ کا ارتکاب کرنا جائز نہیں بلکہ وہ اللہ سے دعا کرتی رہے کہ وہ اس کے لیے نجات کا کوئی ذریعہ پیدا کرے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو، اور ہمیں دین حنیف کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

خلع کے بعد پہلے خاوند کے ساتھ شادی کی شرائط

سوال ایک آدمی نے کسی کو قتل کر دیا اور جیل جانا پڑا، اس کی بیوی نے اپنے بھائیوں کے کہنے پر بذریعہ عدالت خلع لے لیا اور کسی دوسرے آدمی سے نکاح کر لیا، اب اس کا پہلا خاوند رہا ہو کر گھر آ گیا ہے اور اتفاق سے عورت کا دوسرا خاوند فوت ہو گیا

---

[1] ٦٦/التحریم:٦۔ [2] صحیح بخاری، الجمعه: ٨٩٣۔

[3] صحیح بخاری، الاحکام: ٧١٥٠۔ [4] صحیح بخاری، اخبار الاحاد:٧٢٥٧۔

ہے، ایسے حالات میں اس عورت کا پہلے خاوند سے نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب خلع یافتہ عورت کا نکاح خلع کا فیصلہ ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس عورت کے لیے ضروری ہے کہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لیے ایک حیض آنے تک انتظار کرے۔ اس کے بعد نکاح کرسکتی ہے صورت مسئولہ میں اپنی سزا یافتہ قیدی خاوند سے بذریعہ عدالت خلع لے لیا اور پھر اس نے عدت کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لیا، اتفاق سے وہ دوسرا خاوند فوت ہو چکا ہے اور اس دوران پہلا خاوند بھی رہا ہو کر آ گیا ہے تو اس صورت میں اس سے نکاح کرسکتی ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، طلاق یافتہ عورت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ [1]

"پھر اگر مرد (تیسری) طلاق بھی دے دے تو اس کے بعد وہ عورت اس کے لیے حلال نہ رہے گی حتیٰ کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے اگر دوسرا خاوند اسے طلاق دے دے تو پھر پہلا خاوند اور یہ عورت دونوں اگر یہ ظن غالب رکھتے ہوں کہ وہ حدود اللہ کی پابندی کرسکیں گے تو وہ آپس میں رجوع کر سکتے ہیں۔"

اگر دوسرا خاوند فوت ہو جائے تو پھر بھی عورت عدت گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے نکاح کرسکتی ہے، خلع یافتہ عورت کے لیے بھی یہی حکم ہے بلکہ وہ تو دوسرے نکاح کرنے کے بغیر ہی پہلے خاوند سے نکاح کرسکتی ہے لیکن جب اس نے دوسرے خاوند سے نکاح کرلیا ہے اور وہ فوت ہو چکا ہے تو عدت گزارنے کے بعد بالاولی پہلے خاوند سے نکاح ہوسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

رضاعی خالہ سے نکاح کرنا

سوال رقیہ اور بشریٰ دو بہنیں ہیں، بشریٰ نے رقیہ کی بیٹی فاطمہ کو دودھ پلایا یا پھر بشریٰ نے ایک ام کلثوم نامی لڑکی کو بھی دودھ پلایا، اب فاطمہ کا بیٹا بشیر ام کلثوم سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ بشریٰ نے فاطمہ اور ام کلثوم دونوں کو دودھ پلایا ہے، اس طرح یہ دونوں رضاعی بہنیں ہیں گویا فاطمہ کا بیٹا اپنی رضاعی خالہ سے نکاح کرنے کا خواہش مند ہے، شرعی ہدایت کے مطابق اسے نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی رضاعی خالہ ہے، ارشاد نبوی ہے: "جو رشتے خون کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں وہ رشتے دودھ پینے سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔" [2]

چونکہ نسبی خالہ حرام ہے اس لیے دودھ شریک خالہ بھی حرام ہے، دودھ کی وجہ سے مندرجہ ذیل رشتے حرام ہو جاتے ہیں۔ ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی کیونکہ یہ رشتے نسب کی وجہ سے بھی حرام ہیں، اس مسئلہ میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ واضح رہے کہ دودھ کی وجہ سے حرمت دو چیزوں پر موقوف ہے:

1. کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پیا ہو، ایک مرتبہ پینے سے مراد یہ ہے کہ بچہ ماں کے پستان کو منہ میں لے کر دودھ پینا شروع کرے

---

[1] ۲/البقرة: ۲۳۰۔ [2] صحیح بخاری، النکاح: ۵۰۹۹۔

پھر سانس لینے یا دوسرے پستان کی طرف منتقل ہونے کے لیے خود بخود اسے چھوڑ دے۔

❷ وہ دودھ جو بچے کی عمر دوسال مکمل ہونے سے پہلے پلایا گیا ہو، اگر بڑی عمر میں دودھ پیا ہے جب کہ اس کی غذا کا انحصار صرف دودھ پر نہیں ہے تو اس صورت میں دودھ پینا حرمت کے لیے مؤثر نہیں ہوگا۔

بہر حال صورت مسئولہ میں بشیر نامی شخص ام کلثوم سے نکاح نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کی رضاعی خالہ ہے۔

بیوی کا ظہار کرنا

سوال بعض دفعہ عورت اپنے خاوند سے کہہ دیتی ہے کہ تو مجھ پر اس طرح حرام ہے جس طرح میرا باپ یا میرا بھائی حرام ہے تو یہ ظہار کے حکم میں ہوگا؟ وضاحت کریں۔

جواب ظہار، خاوند کی طرف سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے کہے ''تو مجھ پر میری ماں کی طرح حرام ہے۔'' ظہار کے متعلق قرآن کریم میں ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ﴾ ❶

''جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کر لیں تو ان کے ذمے آپس میں ایک دوسرے کو چھونے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا ہے، اس کے متعلق تمہیں نصیحت کی جاتی ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے، ہاں جو شخص غلام آزاد کرنے کی ہمت نہ پائے اس کے ذمے دو ماہ کے مسلسل روزے ہیں، قبل ازیں کہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں اور جس شخص کو یہ طاقت بھی نہ ہو اس پر ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔''

بیوی کا شوہر کو حرام کرنا یا اسے اپنے کسی محرم رشتہ دار کے ساتھ تشبیہ دینا ظہار کے حکم میں نہیں ہے بلکہ یہ قسم کے حکم میں ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ کسی چیز کو حرام کر لیا تھا جو حلال تھی، تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ ﴾ ❷

''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قسموں کو کھول ڈالنا مقرر کیا ہے۔''

اس بنا پر عورت کے ذمے قسم کا کفارہ دینا ہے وہ دس مساکین کو کھانا کھلائے، اگر اس کی ہمت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھ لے جیسا کہ سورۃ المائدہ ۸۹ میں مذکور ہے۔ (واللہ اعلم)

عدّت کے احکام

سوال میری بیٹی کا صرف نکاح ہوا تھا، ابھی رخصتی نہیں ہوئی کہ اس کا خاوند کسی حادثہ میں ناگہانی طور پر فوت ہو گیا ہے

---

❶ ۵۸/المجادلہ: ۳، ۴۔ ❷ ٦٦/التحریم: ۲۔

کیا اس صورت میں بھی اسے عدت گزارنا ہوگی، اس پر کیا کیا پابندیاں ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب جس عورت کا نکاح ہوا لیکن رخصتی سے پہلے اس کا خاوند فوت ہوگیا تو اس عورت کو چار ماہ دس دن عدت گزارنا ضروری ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے متعلق فیصلہ فرمایا تھا کہ اس پر عدت گزارنا ضروری ہے۔ [1]

عدتِ وفات کا ذکر درج ذیل آیت میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ [2]

''اور تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور ان کی بیویاں زندہ ہوں تو ایسی بیوائیں چار ماہ دس دن انتظار کریں۔''

جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس پر دورانِ عدت درج ذیل پابندیاں ہیں۔

☆ جس گھر میں عدت گزار رہی ہے اس سے بلاضرورت باہر نہ نکلے ہاں اگر بامر مجبوری جانا ہو، یا گھر منہدم ہو جائے تو گھر سے نکل سکتی ہے۔

☆ اسے خوبصورت لباس زیب تن نہیں کرنا چاہیے خواہ وہ کسی رنگ کا ہو۔

☆ سونے، چاندی، جواہرات وغیرہ کے زیور بھی استعمال نہ کیے جائیں۔

☆ عطریات اور خوشبو کا استعمال بھی جائز نہیں۔

☆ سرمہ وغیرہ بھی استعمال نہ کرے، اسی طرح چہرے کی زیبائش کے لیے جو اشیاء استعمال ہوتی ہیں، ان سے بھی اجتناب کیا جائے لیکن غسل کے وقت صابن استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دوران عدت عورت کسی سے گفتگو نہ کرے، فون نہ سنے، گھر میں ننگے پاؤں چلے، چاندی کی روشنی میں بھی کمرے سے باہر نہ نکلے، اس قسم کی پابندی لگانا بلا دلیل ہے، شریعت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں۔ (واللہ اعلم)

چاندی کے برتن میں کھانا پینا؟

سوال ہمارے پڑوس میں ایک شادی ہوئی، لڑکی امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے والدین کی طرف سے ایک چاندی کا پیالہ بھی دیا گیا ہے، اس پیالہ میں کھانے پینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب اسلام ہمیں اس قسم کے اسراف کی اجازت نہیں دیتا کہ اپنی دولت کی نمائش کے لیے سونے چاندی کے برتن اپنی بیٹی کو بطور جہیز دیئے جائیں، سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے کی شرعاً اجازت نہیں ہے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص سونے یا چاندی کے برتنوں میں کھاتا یا پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔'' [3]

---

[1] ابوداود، النکاح: ۲۱۱۶۔ [2] ۲/البقرۃ: ۲۳۴۔ [3] صحیح مسلم، اللباس: ۲۰۶۵۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ مدائن میں تھے کہ انہیں ایک کاشت کار نے چاندی کے برتن میں پینے کے لیے پانی پیش کیا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پانی کو برتن سمیت دور پھینک دیا اور فرمایا کہ میں نے اسے کئی مرتبہ منع کیا ہے لیکن یہ باز نہیں آتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم سونے اور چاندی کے برتنوں میں مت پیو اور اس سے بنی ہوئی پلیٹوں میں مت کھاؤ، کیونکہ دنیا میں یہ کافروں کے لیے ہیں اور آخرت میں تمہارے لیے ہوں گی۔'' [1]

لہٰذا چاندی کا پیالہ فروخت کر کے اس کی قیمت کو استعمال میں لایا جاسکتا ہے لیکن اسے پینے کے لیے استعمال کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

دوران حمل دی ہوئی طلاق کا مسئلہ

سوال دوران حمل دی ہوئی طلاق شرعاً نافذ ہوجاتی ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب دوران حمل اپنی بیوی کو طلاق دی جاسکتی ہے اور شرعاً نافذ ہوجاتی ہے، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو جب اپنی بیوی کو طلاق دینے کا طریقہ بتایا تو فرمایا: ''تم اسے حالتِ حمل میں طلاق دو۔'' [2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران حمل دی گئی طلاق جائز اور مباح ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم میں حاملہ عورت کی عدت بایں الفاظ بیان ہوئی ہے:

﴿وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۭ﴾ [3]

''حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل جنم دے۔''

اگر دوران حمل طلاق ناجائز ہوتی تو اس کی عدت بتانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ خود ہی وضاحت کردیتے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے، الغرض دوران حمل طلاق دینا صحیح اور مباح اور ایسی طلاق شرعاً واقع ہوجاتی ہے اور اس قسم کی طلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے عین مطابق ہے۔ (واللہ اعلم)

اخراجات پورے نہ ہونے پر بیوی کا مطالبۂ طلاق

سوال اگر خاوند اپنی بیوی کے اخراجات پورے نہ کرے تو کیا وہ حاکم وقت سے شکایت کر کے اس سے خلاصی حاصل کرسکتی ہے یا وہ صبر کر کے خاوند کے پاس ہی رہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے خاوند کو بیوی کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ [4]

''اور ان کے ساتھ معروف طریقہ سے گزر بسر کرو۔''

---

[1] صحیح بخاری، الاشربہ: ۵۶۳۳۔ [2] بخاری، التفسیر: ۴۹۰۸۔ [3] ۶۵/الطلاق: ۴۔ [4] ۴/النساء: ۱۹۔

اور انہیں کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ﴾ ❶

''اور انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ۔''

ان آیات کا تقاضا ہے کہ خاوند، اپنی بیوی کی جائز ضروریات کو پورا کرے اور حسن معاشرت کا بھی تقاضا ہے کہ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ دے، اس سے بڑھ کر کیا تکلیف ہو سکتی ہے کہ خاوند اپنی بیوی کی جائز ضروریات بھی پوری نہ کرے، ایسے حالات میں اپنی بیوی کو گھر میں رکھنا، اسے تکلیف دینے کا باعث ہے۔ جسے قرآن نے منع کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ﴾ ❷

''تم انہیں نقصان پہنچانے کے لیے مت روکے رکھو۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تو اپنی بیوی کو کھلا جو تو خود کھائے اور اسے لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔'' ❸

ان تصریحات کا تقاضا ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی کے اخراجات پورے نہیں کرتا تو وہ حاکم وقت سے شکایت کر کے اس سے خلاصی حاصل کر سکتی ہے اور ایسے حالات میں ان کے درمیان تفریق کرا دینے کا مجاز ہے۔ ایک روایت میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کے متعلق فرمایا تھا جس کے پاس اپنی بیوی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا، آپ نے فرمایا کہ ان دونوں کے درمیان جدائی ڈال دی جائے۔ ❹

لیکن ہم ایسے حالات میں بیوی کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ صبر وقناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس صبر کے نتیجہ میں دنیا وآخرت میں بہتر بدلہ دے، ہاں اگر پانی سر سے گزر جائے اور حالات برداشت سے باہر ہو جائیں تو ایسے حالات میں خاوند سے علیحدگی اختیار کرنے کی شرعاً اجازت ہے اور حاکم وقت کے پاس استغاثہ کر کے ایسے خاوند سے خلاصی حاصل کی جا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

طلاق یافتہ بیوی کا بچوں کو خاوند سے ملاقات سے روکنا

سوال میں نے اپنی بیوی کو دو سال پہلے طلاق دے کر فارغ کر دیا تھا، میرا پانچ سالہ بچہ اور تین سالہ بچی اس کے پاس ہے، لیکن اس کے گھر والے مجھے اپنے بچوں سے ملاقات نہیں کرنے دیتے، کیا شریعت اس کی اجازت دیتی ہے کہ باپ کو اپنی اولاد سے نہ ملنے دیا جائے؟

جواب ہم کئی ایک معاشرتی خرابیوں میں مبتلا ہیں، ان میں سرفہرست مسئلہ طلاق ہے، پہلے تو گھر میں رہتے ہوئے نوک جھوک ہوتی رہتی ہے، اس سے فریقین کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آ جاتی ہے کہ بیوی کو زدوکوب کر کے گھر سے نکال دیا جاتا ہے اور اس کے رشتہ داروں کی بے عزتی کی جاتی ہے۔ اسے طلاق دی جاتی ہے، ایسے حالات میں کون ہے

---

❶ ٦٥/الطلاق: ٦۔ ❷ ٢/البقرة: ٢٣١۔ ❸ ابوداود، النكاح: ٢١٤٢۔

❹ بیهقی: ٤٧٠، ج٧۔

جو باپ کو اپنے چھوٹے بچوں سے ملنے کی اجازت دے؟ ہمیں چاہیے کہ کسی حالت میں بھی شریعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اپنے اندر برداشت کا مادہ پیدا کریں۔ صبر و تحمل سے کام لیں، ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں، صورت مسئولہ انتہائی تکلیف دہ ہے، باپ کو اپنے بچوں کے ساتھ ملاقات کرنے سے روکنا انتہائی مذموم حرکت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رشتہ ناطہ عرش سے لٹکا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے جو مجھے ملائے اللہ اسے ملائے گا اور جو مجھے کاٹے اللہ اس سے اپنا تعلق کاٹ لے گا۔'' [1]

اس حدیث کے مطابق بچے کسی کے پاس بھی ہوں ماں یا باپ کو ان سے ملاقات کی اجازت دینی چاہیے انہیں ملنے کی اجازت نہ دینا قطع رحمی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ (واللہ اعلم)

حالت حیض میں ہونے والے نکاح کی حیثیت

سوال میرا جب نکاح ہوا تو میری ہونے والی بیوی حالت حیض میں تھی، مجھے کسی نے کہا ہے کہ اس حالت میں نکاح نہیں ہوتا۔ کیا اب مجھے تجدید نکاح کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق میری پریشانی دور کریں۔

جواب عقود و معاملات میں اصل جواز و حلت ہے الا یہ کہ حرمت پر کوئی دلیل قائم ہو، حالت حیض میں نکاح کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ہے، کتاب وسنت، اقوال صحابہ اور اجماعِ امت میں کوئی ایسی دلیل ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی۔ قیاس صحیح سے بھی اسے حرام قرار نہیں دیا جا سکتا، کسی بھی اہل علم نے اسے حرام قرار دیا یا ناپسند کیا ہو، ایسا کہیں بھی منقول نہیں ہے، البتہ بعض فقہا نے حالت حیض میں لڑکی کی رخصتی کو مکروہ ضرور کہا ہے، مبادا خاوند اس سے ہم بستری کر کے گنہگار ہو۔ دراصل بعض لوگ حالت حیض میں نکاح کے حکم کو حالت حیض میں طلاق کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں، جس کی بنا پر ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جا سکے۔ ہمارے رجحان کی بنا پر حالت حیض میں نکاح بالاتفاق صحیح ہے البتہ خاوند کو اس حالت میں اس کے پاس جانے سے اجتناب کرنا ہو گا، ہاں اس حالت میں طلاق دینا بالاتفاق حرام ہے، اگرچہ اس حالت میں طلاق دینے سے شریعت کی خلاف ورزی کے باوجود طلاق ہو جائے گی جیسا کہ ہم کسی سابقہ فتویٰ میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ بہر حال ایسی حالت کا عقد نکاح جو حالت حیض میں ہو صحیح اور جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کی حرمت پر کتاب وسنت، اقوال صحابہ، قیاس صحیح اور اجماع میں کوئی دلیل نہیں ہے، معاملات میں اصل حلت و جواز ہونے کی بنا پر ایسا نکاح صحیح اور جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

خلع کے بعد پہلے خاوند سے رجوع

سوال میری ہمشیرہ نے اپنے خاوند کی زیادتیوں سے تنگ آ کر خلع لیا تھا، اس کے بچے بھی ہیں، ان بچوں کی خاطر دوبارہ اس خاوند کے ہاں جانا چاہتی ہے، کیا خلع کے بعد پہلے خاوند سے رجوع ہو سکتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

---

[1] صحیح مسلم، البر والصلہ: ٢٥٥٥۔

جواب شریعت مطہرہ میں بیوی خاوند کی تفریق کے بعد دو صورتیں ایسی ہیں کہ عام حالات میں یہ دونوں باہمی رجوع نہیں کر سکتے، ایک تیسری طلاق کے بعد جب بیوی اور خاوند میں علیحدگی ہوتی ہے تو پھر رجوع عام حالات میں نہیں ہو سکتا اور دوسری صورت لعان کی ہے جب بیوی خاوند آپس میں لعان کریں تو پھر دونوں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت ہے، البتہ خلع کی صورت میں نکاح تو فوراً ٹوٹ جاتا ہے لیکن اگر دونوں صلح کرنے پر آمادہ ہوں اور حدود اللہ کو قائم رکھنے کا عزم کر لیں تو دونوں نکاح جدید کے ساتھ اکٹھے ہو سکتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی فتویٰ ہے حضرت ابراہیم بن سعد نے ان سے اس عورت کے متعلق سوال کیا جسے اس کے خاوند نے دو طلاقیں دے دیں، اس کے بعد بیوی نے خاوند سے خلع لے لیا کیا وہ عورت دوبارہ اس کے عقد میں آ سکتی ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جن آیات میں طلاق کا ذکر کیا ہے، ان کے آغاز اور اختتام میں طلاق کا ذکر کیا ہے، ان کے درمیان خلع کا بیان ہے اور خلع، طلاق نہیں، لہٰذا خاوند اس خلع یافتہ بیوی سے نکاح کر سکتا ہے۔ [1]

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ خلع یافتہ عورت کے متعلق فرماتے ہیں: وہ اپنے خاوند کی طرف نکاح جدید سے لوٹ سکتی ہے۔'' [2]

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ خلع یافتہ عورت اگر اپنے سابقہ خاوند سے رجوع کرنا چاہے تو نکاح جدید سے اس کے ہاں آباد ہو سکتی ہے، نکاح جدید کے بغیر رجوع ممکن نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سابقہ بیوی کی بہن سے نکاح کرنا

سوال میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے، عدت گزرنے کے بعد کیا میں اس کی حقیقی بہن سے شادی کر سکتا ہوں، کتاب وسنت میں اس کی ممانعت تو نہیں ہے؟

جواب سابقہ بیوی کی بہن سے شادی جائز ہے بشرطیکہ اس کی عدت ختم ہو چکی ہو، کیونکہ دوران عدت مطلقہ بیوی پر منکوحہ کے احکام جاری رہتے ہیں۔ دوران عدت اگر خاوند فوت ہو جائے تو مطلقہ بیوی کو اس کی جائیداد سے باقاعدہ حصہ ملتا ہے، اس لیے اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور اس مطلقہ بیوی کی عدت گزر چکی ہے تو اس کی بہن سے نکاح جائز ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ [3]

''اور یہ حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو اپنے عقد میں جمع کرو۔''

اس آیت کے پیش نظر ممانعت صرف اس صورت میں ہے جب پہلی بیوی زوجیت میں ہو یا مطلقہ بیوی کی عدت ابھی باقی ہو لیکن اب جب کہ سابقہ بیوی کی عدت ختم ہو چکی ہے اور طلاق کی وجہ سے بیوی خاوند کا تعلق ختم ہو گیا ہے تو اس کی بہن سے نکاح کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ (واللہ اعلم)

---

[1] بیهقی، ص: ٣١٦، ج٧۔ [2] مؤطا امام مالك، الطلاق: ٣٣۔ [3] ٤/النساء: ٢٣۔

بیٹے کی غیر مدخولہ منکوحہ سے نکاح کرنا

سوال ایک لڑکے کا کسی لڑکی سے نکاح ہوا۔لیکن رخصتی سے قبل ہی اس نے طلاق دے دی، کیا لڑکے کا باپ اس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے؟

جواب بشرط صحت سوال جب بیٹا کسی عورت سے شادی کر لیتا ہے تو وہ لڑکے کے باپ پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔اگر اس لڑکے نے خلوت سے پہلے طلاق دے دی تو بھی وہ اس کے والد کے لیے حلال نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ﴾ [1]

''اور تم پر تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں حرام ہیں۔''

اس آیت کریمہ کے پیش نظر مطلق طور پر بیٹے کی منکوحہ باپ کے لیے حرام قرار دی گئی ہے، اس کے ساتھ خلوت کرنے یا نہ کرنے کی کوئی شرط بیان نہیں ہوئی، اس طرح جو لڑکا دودھ کی وجہ سے اس کا بیٹا قرار پایا ہے اس کی بیوی بھی اس پر حرام ہوگی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:''رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔'' [2]

اس بنا پر صورت مسئولہ میں باپ پر بیٹے کی منکوحہ حرام ہے خواہ اس نے خلوت سے پہلے ہی طلاق دے دی ہو۔

بغیر ولی کے نکاح کا حکم

سوال ہمارے ہاں ایسے واقعات بے شمار ہوتے ہیں کہ لڑکا اور لڑکی نکاح پر رضا مند ہوتے ہیں لیکن لڑکی کا ولی راضی نہیں ہوتا، لڑکی اپنے گھر سے بھاگ کر اس سے نکاح کر لیتی ہے، کیا شرعاً ایسا نکاح جائز ہے، اگر ولی نکاح کے بعد راضی ہو جائے تو پھر اس نکاح کا کیا حکم ہے؟

جواب جو عورت بھی اپنے سر پرست کی اجازت اور رضا مندی کے بغیر نکاح کرتی ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اسلام ایسے نکاح کو تسلیم نہیں کرتا جو ولی کی اجازت سے بالا بالا کیا ہو، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:''ولی کی اجازت کے بغیر نکاح درست نہیں۔'' [3] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے، آپ نے تین مرتبہ یہ کلمات دہرائے۔'' [4]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''کوئی عورت کسی دوسری عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ ہی خود اپنا نکاح کرے، بلاشبہ وہ عورت بدکار ہے جس نے اپنا نکاح خود کر لیا۔'' [5] ان احادیث کے پیش نظر ایسا نکاح نہیں ہوتا جو ولی کی اجازت کے بغیر کیا گیا ہو۔نکاح کے صحیح ہونے کے لیے ولی کی اجازت اور رضا مندی بنیادی شرط ہے، جب اس ناجائز نکاح کے بعد سر پرست رضا مند ہو جائے تو انہیں نیا نکاح کرنا ہوگا کیونکہ پہلا عقد شرعی شرائط کے مطابق نہ تھا، نکاح جدید سے قبل اس

---

[1] ٤/النساء: ٢٣۔ [2] ابن ماجه، النكاح: ١٩٣٧۔ [3] مسند امام احمد، ص: ٣٩٤، ج٤۔
[4] مسند امام احمد: ٤٧، ج٦۔ [5] ابن ماجه، النكاح: ١٨٨٢۔

جوڑے نے جو زندگی گزاری ہے اس کی اللہ کے حضور معافی اور سچی توبہ کرنی چاہیے۔ بہرحال ہمارے رجحان کے مطابق گھر سے بھاگ کر عدالتی نکاح کرنا شرعاً درست نہیں ہے اور شریعت اسے تسلیم نہیں کرتی، اگر ولی راضی ہو گیا ہے تو انہیں دوبارہ نکاح کرنا ہو گا۔ (واللہ اعلم)

عدت خلع کی مقدار

سوال میں نے اپنے خاوند سے خلع لے کر علیحدگی اختیار کی ہے، اب میں نے عدت کتنی گزارنی ہے اور عدت کے دن میں نے کہاں پورے کرنے ہیں؟۔

جواب خلع، بیوی کے مطالبے کے بعد عمل میں آتا ہے یعنی بیوی کے مطالبے کے بعد خاوند سے علیحدگی پر راضی ہونے کو خلع کہتے ہیں، خلع کی بنیاد پر علیحدگی اختیار کرنے والی ہر عورت پر عدت واجب ہے لیکن اگر رخصتی سے قبل ہی خلع حاصل کر لیا ہے تو اس صورت میں کوئی عدت نہیں ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ ﴾ [1]

”اے ایمان والو! جب تم اہل ایمان خواتین سے نکاح کرو پھر انہیں چھونے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو ان پر تمہارا حق عدت نہیں جسے تم شمار کرو۔“

اور خلع کی عدت کے متعلق راجح مؤقف یہی ہے کہ خلع یافتہ عورت صرف ایک حیض آنے تک عدت گزارے گی جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ان سے خلع لے لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ ایک حیض عدت گزارے۔ [2]

کچھ اہل علم کا خیال ہے کہ خلع والی عورت بھی مطلقہ عورت کی طرح تین حیض عدت گزارے، امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ خلع، طلاق نہیں کیونکہ ہم بستری کے بعد ہونے والی طلاق پر اللہ تعالیٰ نے تین احکام مرتب کیے ہیں جو خلع میں نہیں پائے جاتے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ طلاقوں کی تعداد تین ہے، تیسری طلاق کے بعد عام حالات میں خاوند رجوع نہیں کر سکتا جب کہ خلع میں تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے۔

☆ طلاق کی عدت تین حیض ہے جب کہ خلع کی عدت تین حیض نہیں بلکہ ایک حیض ہے جیسا کہ حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

☆ خلع عورت کے مطالبہ پر ہوتا ہے جبکہ طلاق خاوند اپنی طرف سے دیتا ہے۔

اس بنا پر خلع یافتہ عورت کی عدت ایک حیض ہی ہے۔ چونکہ خلع کا فیصلہ ہوتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے، اس لیے وہ عورت

---

[1] ۳۳/الاحزاب: ۴۹۔ [2] ترمذی، الطلاق: ۱۱۸۶۔

خاوند کے لیے اجنبی بن جاتی ہے لہٰذا اسے اپنے خاوند کے گھر کے علاوہ اپنے والدین کے ہاں عدت کے ایام گزارنا ہوں گے، اگر دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو ایسا کرنے سے دوبارہ گھر آباد کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

پیغام نکاح پر دوسرا پیغام بھیجنا

سوال میرے بھائی کی منگنی کے لیے ایک جگہ بات ہو رہی تھی کہ ہمارے ایک عزیز نے وہاں اپنا پیغام نکاح بھیج دیا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب جب کسی کے نکاح کے متعلق کسی جگہ بات چیت چل رہی ہو تو بات ختم ہونے سے پہلے کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس معاملہ کو خراب کرے اور وہاں اپنے نکاح کے متعلق بات چیت چلائے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر اپنا پیغام نکاح نہ بھیجے۔'' [1]

ہاں اگر فریق اول اجازت دے یا وہاں بات چیت ختم کر دے تو وہاں اس نکاح کے متعلق بات چیت کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

منگیتر سے گفتگو کرنا

سوال کیا انسان اپنی منگیتر کو دیکھ سکتا ہے اور اس سے گفتگو کی شرعاً اجازت ہے قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب جس عورت سے شادی کرنی ہے، اسے نکاح سے پہلے دیکھنا جائز ہے تاکہ اسے اطمینان وسکون حاصل ہو جائے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عہد رسالت میں ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے دریافت کیا: ''آیا تو نے اسے دیکھا ہے؟'' میں نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اسے ایک نظر دیکھ لو۔ اس طرح زیادہ توقع ہے کہ تم میں الفت پیدا ہو جائے۔'' [2]

اس کے متعلق متعدد احادیث منقول ہیں تاہم منگیتر کو دیکھنے کے لیے درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

1. نکاح کا پختہ ارادہ ہو محض دیکھنے کی حد تک دلچسپی نہ ہو۔
2. خلوت نہ ہو بلکہ لڑکی کے محرم کی موجودگی میں اسے دیکھا جائے۔
3. کسی قسم کے فتنے وفساد کا اندیشہ نہ ہو۔
4. مشروع مقدار سے زیادہ نہ دیکھا جائے یعنی لڑکی جو عام طور پر اپنے بھائی اور والد وغیرہ کے سامنے جو کچھ ظاہر رکھتی ہے صرف اس قدر دیکھنے پر اکتفاء کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، النکاح: ۱۵۴۲۔ [2] مسند امام احمد، ص: ۲۴۴، ج ٤۔

چچی یا ممانی سے شادی کرنا

سوال کیا انسان اپنی چچی یا ممانی سے شادی کر سکتا ہے، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا آیا ہے؟ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب حقیقی چچا کی منکوحہ چچی اور حقیقی ماموں کی منکوحہ ممانی کہلاتی ہے۔ جب چچا یا ماموں فوت ہو جائے یا ان کی منکوحہ کو طلاق مل جائے تو عدت گزارنے کے بعد ان سے نکاح کیا جا سکتا ہے کیونکہ قرآن وحدیث میں ان سے نکاح کرنے کے متعلق کوئی ممانعت ہماری نظر سے نہیں گزری، قرآن مجید میں متعدد محرمات کا تفصیلی ذکر ہے، جن میں کچھ خونی رشتہ دار ہیں، مثلاً بہن اور بیٹی وغیرہ اور کچھ سسرالی رشتہ کی وجہ سے حرام ہیں مثلاً خوش دامن وغیرہ۔ جب کہ کچھ عورتیں دودھ کے رشتہ کی بنا پر حرام ہیں مثلاً رضاعی ماں اور رضاعی بہن وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ رشتے ایسے ہیں جنہیں جمع نہیں کیا جا سکتا، انفرادی طور پر جائز ہیں مثلاً دو بہنیں، خالہ بھانجی اور پھوپھی، بھتیجی وغیرہ۔ اس طرح وہ عورت جو کسی دوسرے کے عقد میں ہے اس سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا، چچی اور ممانی ممنوعہ رشتہ نہیں ہے اگر چچا فوت ہو جائے یا وہ اسے طلاق دے دے اسی طرح ماموں فوت ہو جائے یا وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو عدت کے بعد چچی اور ممانی سے نکاح ہو سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ [1]

''اور مذکورہ حرام رشتوں کے علاوہ دیگر تمام عورتوں سے نکاح حلال ہے۔''

اس قرآنی نص کے پیش نظر چچی یا ممانی سے نکاح ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ چچا یا ماموں سے فارغ ہو چکی ہوں۔

عدالتی نکاح کی وضاحت

سوال ایک جوڑے کا نکاح عدالتی ہوا، ان کے ہاں تین چار بچے بھی ہیں، اب اس عورت کو طلاق مل گئی ہے، کیا وہ دونوں دوبارہ باہمی نکاح کر سکتے ہیں، یہ بھی واضح کریں کہ اس جوڑے کا جو عدالتی نکاح تھا اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب نکاح کے جائز ہونے کے لیے بنیادی شرط ولی یعنی سرپرست کی اجازت ہے، عدالتی نکاح میں چونکہ ولی کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ اس کی رضامندی سے بالا بالا نکاح کیا جاتا ہے لہٰذا ایسا نکاح جائز نہیں ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ولی کی اجازت کے بغیر نکاح درست نہیں۔'' [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے نکاح کو باطل قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس عورت نے اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کیا، اس کا نکاح باطل ہے، آپ نے آخری فقرہ تین مرتبہ دہرایا۔'' [3]

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولی کی اجازت کے بغیر خود بخود نکاح کرنے والی عورت کو بدکار کہا ہے۔ حضرت

---

[1] ٤/النساء: ٢٤۔ [2] ابوداود، النکاح ٢٠٨٥۔ [3] جامع ترمذی، النکاح: ١١٠٢۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی عورت کسی کا (ولی بن کر) نکاح نہ کرے اور نہ ہی وہ خود اپنا نکاح کرنے کی مجاز ہے، بلاشبہ وہ عورت زانیہ ہے جس نے اپنا نکاح خود کرلیا۔'' [1]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عورت کے نکاح کے لیے سرپرست کی اجازت شرط ہے اور اس کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہوتا، اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ صورت مسؤلہ کا نکاح صحیح نہیں ہے، اب ضروری ہے کہ اس جوڑے کے درمیان فوراً تفریق کرادی جائے، چونکہ یہ تفریق بذریعہ ''طلاق'' عمل میں آچکی ہے، اگرچہ اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جیسے نکاح ہی نہیں تو طلاق دینا چہ معنی دارد؟ تاہم قانونی اعتبار سے طلاق کا ہونا مستقبل میں تحفظات کا باعث ہوگا، اب دوبارہ باضابطہ طور پر ان کا باہمی نکاح ہوسکتا ہے، اس باضابطہ نکاح کی چار شرائط حسب ذیل ہیں: ① عورت کی رضامندی ہو، ② ولی کی اجازت ہو، ③ حق مہر از سر نو مقرر کیا جائے۔ ④ کم از کم دو گواہ موجود ہوں۔

بہرحال ہمارے رجحان کے مطابق عدالتی نکاح درست نہیں کیونکہ اس میں ولی کی اجازت نہیں پائی گئی ۔تفریق کے بعد دوبارہ باضابطہ طور پر نکاح کیا جاسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

گرین کارڈ کے حصول کے لیے نکاح کرنا

سوال ہمارے ہاں اکثر لوگ گرین کارڈ کے حصول کے لیے مغربی ممالک کا رخ کرتے ہیں اور وہاں جا کر کاغذی طور پر ایسی عورت سے شادی کر لیتے ہیں جسے وہاں کی شہریت حاصل ہوتی ہے، تاکہ نکاح کرنے والے کو گرین کارڈ کے حصول میں سہولت رہے کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب اسلام میں نکاح کے جو مقاصد ہیں وہ متعین ہیں، ان میں سرفہرست حسن معاشرت ہے اور ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھنا ہے، صورت مسؤلہ میں نکاح کرتے وقت اس طرح کے مقاصد پیش نظر نہیں ہوتے۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لیے ایسے اقدامات جائز نہیں ہیں جن کی شریعت میں گنجائش نہ ہو۔ گرین کارڈ کے حصول کے لیے اس طرح کا فریب کرنا شرعاً جائز نہیں ہے نیز اس میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ عورت ماہانہ ''وظیفہ'' کے لالچ میں کئی ایک لوگوں سے نکاح کا ڈھونگ رچا لیتی ہے، تاکہ اسے وظیفہ ملتا رہے۔ بعض ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں کہ اس طرح کا نکاح کرنے والے ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں اور انہوں نے نکاح کے بعد ایک دوسرے کو دیکھنا بھی نہیں ہوتا محض کاغذی کارروائی کی ہوتی ہے جو انٹرنیٹ پر مکمل کرلی جاتی ہے۔ نکاح کرنے والے کا مقصد صرف گرین کارڈ کا حصول اور عورت کا مقصد صرف ماہانہ وظیفہ حاصل کرنا ہے، حسن معاشرت یا خاندان کی بنیاد کا دور، دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ لہٰذا ہمارے رجحان کے مطابق اسطرح کا دھندا شرعاً ناجائز ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

---

[1] ابن ماجه، النكاح: ١٨٨٢۔

غصہ میں بیوی کا خاوند کو حرام قرار دینا

سوال میرا اپنی اہلیہ سے جھگڑا ہوا، اس نے غصہ میں آ کر کہا کہ تو مجھ پر حرام ہے، آج کے بعد تو میرے لیے حلال نہیں ہے، شرعی طور پر اس قسم کی بات کا کیا حکم ہے؟

جواب عورت کی طرف سے اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے سے ازدواجی تعلقات پر کچھ اثر نہیں پڑتا، خواہ وہ طلاق کا لفظ ہی کیوں نہ استعمال کرے کیونکہ طلاق دینا شوہر کا حق ہے اور وہ صرف شوہر کی طرف سے واقع ہوتی ہے۔ اس لیے صورت مسئولہ میں جو بیوی نے کہا ہے، اس سے طلاق نہیں ہوگی اور وہ ان الفاظ کے استعمال کے باوجود خاوند کے نکاح میں رہے گی، البتہ ایک حلال چیز کو اپنے آپ پر حرام کر لینے کی وجہ سے اس کے ذمے قسم کا کفارہ لازم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ تحریم میں واضح طور پر فرمایا ہے، قسم کا کفارہ حسب ذیل ہے: ''دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنا اور جو ان امور کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔''

بہرحال عورت کو چاہیے کہ خاوند کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کرے جو پریشانی یا ندامت کا باعث ہوں۔

''نکاح من سنتی'' کا حوالہ

سوال عام طور پر شادی کے دعوت ناموں پر درج ذیل حدیث تحریر ہوتی ہے، ''نکاح میری سنت ہے، جو کوئی میری سنت سے روگردانی کرے وہ مجھ سے نہیں۔'' کیا یہ حدیث انہی الفاظ سے مروی ہے؟ اگر ہے تو اس کا حوالہ درکار ہے، براہِ کرم اولین فرصت میں جواب دیں۔

جواب سوال میں ذکر کردہ حدیث کے الفاظ دو احادیث کا مجموعہ ہیں، ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نکاح میری سنت ہے۔'' ❶

اس کا دوسرا حصہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے میری سنت سے روگردانی کی وہ مجھ سے نہیں۔'' ❷

مذکورہ الفاظ کسی ایک حدیث کے نہیں ہیں یا کم از کم میری نظر سے نہیں گزرے البتہ اس سے ملتے جلتے الفاظ ایک حدیث میں وارد ہیں جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''نکاح میری سنت ہے، جس نے میری سنت کے مطابق عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں ہے۔'' ❸

اس وضاحت کی روشنی میں شادی کارڈ پر ان الفاظ کو ایک حدیث کی حیثیت سے لکھنا محل نظر ہے، اگر دو الگ الگ احادیث کے حوالہ سے لکھا جائے تو جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ ابن ماجه، النكاح: ١٨٤٦۔ ❷ صحيح بخاري، النكاح: ٥٠٦٣۔ ❸ ابن ماجه، النكاح: ١٨٤٦۔

معجّل اور موجل کی وضاحت

سوال ہمارے ہاں ایک نکاح کے موقع پر اسی ہزار روپیہ حق مہر معجّل اور تین لاکھ موجل طے ہوا، اس معجّل اور موجل کی اصطلاح سے کیا مراد ہے؟ نکاح فارم پر بھی موجل اور غیر موجل لکھا ہوتا ہے، اس کے متعلق وضاحت مطلوب ہے۔

جواب وہ حق مہر جو موقع پر ادا کر دیا جائے اسے معجّل یا غیر موجل کہتے ہیں اور جسے آیندہ کسی وقت ادا کرنا ہو اسے غیر معجّل یا موجل کہا جاتا ہے، حق مہر کے متعلق ہمارا معاشرہ بہت افراط وتفریط کا شکار ہے، حالانکہ اس کے متعلق قرآن وحدیث کے واضح احکام موجود ہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝﴾ [1]

''عورتوں کو ان کے حق مہر بخوشی ادا کرو، ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے تمہارے لیے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے مزے سے کھا سکتے ہو۔''

اس آیت کریمہ میں حق مہر کی ادائیگی کے متعلق تاکید کی گئی ہے کہ ان کے حق مہر برضاء ورغبت پورے کے پورے ادا کر دیئے جائیں، ہاں اگر وہ ازخود بلا جبر واکراہ اپنی خوشی سے پورا حق مہر یا اس کا کچھ حصہ چھوڑ دیں تو وہ خاوند کے لیے حلال وطیب رزق ہے لیکن ان کا حق مہر یا اس کا کچھ حصہ معاف کرانے میں ہیرا پھیری سے ہرگز کام نہ لیا جائے، ہمارے رجحان کے مطابق نکاح فارم پر معجّل اور موجل کی اصطلاح حق مہر پر شب خون مارنے کا ایک چور دروازہ ہے کیونکہ شادی پر دیگر اخراجات کی مد میں لاکھوں روپیہ خرچ کر دیا جاتا ہے مگر جب حق مہر کی باری آتی ہے تو شرعی حق مہر کا سہارا لے کر سوا بتیس روپے یا اس سے کم وبیش باندھا جاتا ہے یا تھوڑی سی رقم موقع پر ادا کر دی جاتی ہے اور جھوٹی عزت کو بحال رکھنے کے لیے لاکھوں حق مہر موجل کر دیا جاتا ہے، پھر مختلف حیلوں بہانوں سے اسے معاف کرالیا جاتا ہے، حالانکہ شریعت میں اس قسم کی کوئی گنجائش نہیں ہے، حق مہر کو لڑکی پر دباؤ ڈال کر معاف کرانا غلط اور گناہ کی بات ہے۔ اگر وہ ازخود کسی قسم کے دباؤ کے بغیر معاف کر دے تو اور بات ہے، یہ بات دیکھنے کے لیے کہ وہ خوشی سے معاف کر رہی ہے، یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ طے شدہ حق مہر اس کے حوالے کر دیا جائے پھر وہ اگر اپنی خوشی سے واپس کر دے تو اسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے، بہرحال حق مہر بیوی کا خاوند کے ذمے ایک فرض ہے جسے بہرصورت ادا کرنا چاہیے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً ؕ﴾ [2]

''جن عورتوں سے تم (شرعی نکاح کے بعد) فائدہ اٹھاؤ انہیں ان کا حق مہر ادا کرو۔''

شادی کے موقع پر جہاں دیگر اخراجات پورے کیے جاتے ہیں وہاں حیثیت کے مطابق حق مہر باندھ کر اسے فوراً ادا کر دیا جائے، معجّل اور غیر موجل کی اصطلاح سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کی جائے اور نہ ہی بیوی پر دباؤ ڈال کر اسے معاف کرایا

---

[1] ٤/النساء: ٤۔ [2] ٤/النساء: ٢٤۔

جائے۔ (واللہ اعلم)

باپ کی غیر مدخولہ منکوحہ سے نکاح

سوال ایک آدمی نے کسی عورت سے نکاح کیا لیکن رخصتی سے پہلے وہ فوت ہو گیا، اب کیا اس کا بیٹا اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب صورت مسئولہ مذکورہ عورت نکاح کے بعد اس آدمی کی بیوی بن چکی ہے، اب اس پر بیوی کے احکام لاگو ہوں گے، وہ حق مہر کی بھی حق دار ہے، اسے ترکہ سے حصہ بھی ملے گا اور اس نے عدتِ وفات چار ماہ دس دن بھی گزارنے ہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی عورت کے متعلق سوال ہوا تھا تو انہوں نے جواب دیا پھر اس کی تصدیق قبیلہ اشجع کے چند آدمیوں نے بھی کی تھی کہ یہی فیصلہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے متعلق فرمایا جب کہ اس کا خاوند حضرت ہلال بن مرہ اشجعی رضی اللہ عنہ فوت ہو چکے تھے۔ [1]

جب مذکورہ عورت باپ کی منکوحہ ہے تو اس سے نکاح نہیں ہو سکتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ [2]

''اور جن عورتوں کو تمہارے باپ نکاح میں لا چکے ہیں، تم ان سے نکاح نہ کرو مگر پہلے جو ہو چکا سو ہو چکا۔''

اس آیت کریمہ کا واضح مطلب کہ سوتیلی ماں بھی حقیقی ماں کے مقام پر ہے، اس سے نکاح کرنا انتہائی شرمناک اور قابل مذمت ہے، البتہ جو نکاح اس حکم کے آنے سے پہلے ہو چکے تھے وہ کالعدم نہیں ہوں گے اور نہ ہی ان کی پیدا شدہ اولاد حرامی ہو گی، وراثت کے احکام بھی ان پر لاگو ہوں گے لیکن اس حکم کے بعد سوتیلی ماں سے نکاح کرنا حرام ہے، البتہ اگر کوئی شخص رخصتی سے قبل منکوحہ کو طلاق دے دی تو ایسی عورت پر عدت طلاق نہیں ہو گی جیسا کہ قرآن کریم میں اس کی صراحت ہے، البتہ خاوند کے فوت ہونے کی صورت میں وہ اس کے بیٹے کے نکاح میں نہیں آ سکے گی، اس بنا پر صورت مسئولہ میں مذکورہ عورت، خاوند کے بیٹے کی سوتیلی ماں ہے اور اس سے نکاح کرنا حرام ہے جیسا کہ قرآن کریم نے وضاحت فرمائی ہے۔ (واللہ اعلم)

اکٹھی تین طلاقیں دے دینا

سوال ہمارے ایک دوست نے اپنی بیوی کو بحالت غصہ اکٹھی تین طلاقیں دے دیں، جب لڑکی والوں کی طرف سے عدالت میں دعویٰ دائر ہوا تو پہلے سے دی ہوئی طلاقوں کو دوبارہ پیش کر دیا گیا، اس بات کو چار سال کا عرصہ بیت گیا ہے، اب فریقین صلح کرنا چاہتے ہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں رجوع ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو کیسے ہو گا؟

جواب ایک ہی مجلس میں اکٹھی تین طلاقیں دینا ہمارے معاشرے کا بہت نازک اور سلگتا ہوا مسئلہ ہے لیکن ہم اس سلسلہ میں بہت لاپرواواقع ہوتے ہیں، اس کی نزاکت کا اندازہ درج ذیل حدیث سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

---

[1] ابوداود، النکاح: ۲۱۱۴۔ [2] ٤/النساء: ۲۲۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دیں جب آپ کو اس کی اطلاع دی گئی تو غضبناک ہو کر کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''کیا میری موجودگی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی یہ حالت دیکھ کر ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں اس شخص کو قتل نہ کر دوں؟ [1]

بہرحال کتاب وسنت کے مطابق ایک مجلس میں اکٹھی تین طلاقیں دینے سے ایک رجعی طلاق واقع ہوتی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سالہ عہد حکومت میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لوگوں نے ایک ایسے معاملہ میں جلدی کی ہے جس میں انہیں سہولت دی گئی تھی، انہوں نے اس کے بعد تینوں کو نافذ کر دینے کا حکم دیا۔ [2]

اسی طرح حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دی تھیں، پھر اس پر وہ نادم و پشیمان ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ تینوں طلاقیں ایک ہی ہیں۔'' [3]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو رکانہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تم ام رکانہ رضی اللہ عنہا سے رجوع کر لو۔'' انہوں نے عرض کیا: میں نے اسے تین طلاقیں دے دی ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے اس بات کا علم ہے تم اس سے رجوع کر لو۔'' [4] حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث طلاق ثلاثہ کے متعلق فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے جس کی دوسری کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ [5]

درج بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک رجعی طلاق شمار ہوتی ہے، عدالت کے روبرو پہلی طلاق کو ہی پیش کر دیا گیا لہٰذا اس کی کوئی الگ حیثیت نہیں ہے، اس طلاق پر چار سال کا عرصہ بیت چکا ہے اور مطلقہ کی عدت ختم ہو چکی ہے، عدت کے اختتام پر نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے لہٰذا تجدید نکاح سے صلح ہو سکے گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ﴾ [6]

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو تم ان کے شوہروں سے نکاح میں رکاوٹ نہ بنو بشرطیکہ وہ آپس میں جائز طور پر راضی ہو جائیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رجعی طلاق کے بعد اگر عدت ختم ہو جائے تو تجدید نکاح سے صلح ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے چار باتوں کا ہونا ضروری ہے:

1. عورت تجدید نکاح پر رضامند ہو، اس پر اس سلسلہ میں کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے۔
2. عورت کے سرپرست کی اجازت حاصل ہو کیونکہ اس کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

---

[1] سنن النسائی، الطلاق: ۳۴۳۰۔ [2] صحیح مسلم، الطلاق: ۱۴۷۲۔ [3] مسند امام احمد، ۲۶۵، ج۱۔
[4] ابو داود، الطلاق: ۲۱۹۶۔ [5] فتح الباری: ۴۵۰، ج۹۔ [6] ۲/البقرۃ: ۲۳۲۔

❸ از سر نو حق مہر مقرر کیا جائے۔ ❹ گواہوں کی تعیین بھی ضروری ہے۔

بہر حال ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک رجعی شمار ہوگی، دوران عدت نئے نکاح کے بغیر ہی رجوع ممکن ہے، البتہ عدت گزرنے کے بعد تجدید نکاح سے صلح ہو سکے گی۔ (واللہ اعلم)

حق مہر کی شرعی حیثیت

سوال حق مہر کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس کی کم از کم مقدار کتنی ہے؟ مسنون حق مہر کی وضاحت کریں اگر زندگی میں اسے ادا نہ کیا جائے تو کیا اللہ کے ہاں اس کا مؤاخذہ ہے؟

جواب نکاح کے وقت عورت کے لیے حق مہر مقرر کرنا ضروری ہے اور اس کی ادائیگی واجب ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ ❶

''جن عورتوں سے تم (نکاح کے بعد) فائدہ اٹھاؤ، انہیں ان کا مقرر کردہ حق مہر ادا کرو۔''

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ ❷

''عورتوں کو ان کے حق مہر راضی خوشی ادا کرو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اسے کچھ دو تو انہوں نے عرض کیا: میرے پاس کچھ نہیں ہے، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تیری زرہ کہاں ہے۔'' ❸ ان آیات وحدیث کے پیش نظر حق مہر ضروری ہے، اس کی کم از کم یا زیادہ سے زیادہ کوئی مقدار نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نکاح کے خواہش مند سے فرمایا تھا کہ جاؤ کچھ تلاش کر کے لاؤ خواہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی ہو، اسے تلاش بسیار کے باوجود کچھ نہ ملا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ تمہیں قرآن کا کچھ حصہ یاد ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں مجھے قرآن کی فلاں فلاں سورت یاد ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمہیں قرآن کی ان سورتوں کے عوض اس عورت کا مالک بنا دیا۔ ❹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی آزادی کو ہی ان کا مہر بنا دیا تھا۔ ❺

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نکاح کے وقت کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا بطور حق مہر دیا تھا۔ ❻

اسی طرح زیادہ سے زیادہ حق مہر کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ ❼

''تم نے ان عورتوں میں سے کسی کو خزانہ بھی بطور مہر دیا تو اس سے طلاق کے وقت کچھ واپس نہ لو۔''

---

❶ ٤/النساء: ٢٤۔ ❷ ٤/النساء: ٤۔ ❸ ابوداود، النکاح: ٢١٢٥۔ ❹ صحیح بخاری، النکاح: ٥٠٨٧۔
❺ صحیح بخاری، النکاح: ٥٠٨٦۔ ❻ ابوداود، النکاح: ٢١٠٩۔ ❼ ٤/النساء: ٢٠۔

شاہ حبشہ حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے چار ہزار درہم مہر دیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمایا تھا۔ [1]

شرعی حق مہر کی تعیین لوگوں کی طرف سے خود ساختہ ہے بلکہ یہ حسب توفیق ہونا چاہیے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا حق مہر 500 درہم تھا۔ [2]

اس مقدار کو مسنون قرار دیا جا سکتا ہے، البتہ وہ حق مہر جو آسانی سے ادا کر دیا جائے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر و برکت کا باعث قرار دیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بہترین حق مہر وہ ہے جسے ادا کرنا انتہائی آسان ہو۔'' [3]

عورت اگر اپنی خوشی سے معاف کر دے تو جائز ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيٓـًٔا مَّرِيٓـًٔا﴾ [4]

''اگر وہ خوشی سے کچھ حق مہر تمہیں چھوڑ دیں تو تم اسے مزے سے کھا سکتے ہیں۔''

کچھ لوگ ایسے ہی ہیں کہ اگر عورت حق مہر معاف نہ کرے تو اسے طرح طرح کی تکلیفیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنا حرام ہے۔ راجح یہی ہے کہ جو حق مہر طے ہو جاتا ہے اسے ادا کرنا ضروری ہے، اگر ادائیگی کے بغیر فوت ہو گیا تو اس کی متروکہ جائیداد سے حق مہر کی رقم منہا کر کے بقیہ رقم کو تقسیم کیا جائے گا، ہم لوگ اس سلسلہ میں افراط و تفریط کا شکار ہیں، شادی پر لاکھوں روپیہ خرچ کر دیتے ہیں لیکن حق مہر کے وقت شرعی حق مہر کی رٹ لگا دی جاتی ہے جس کی مقدار سوا بتیس روپے ہے، شریعت میں اس قسم کے شرعی حق مہر کا کوئی وجود نہیں ہے۔

عقدِ نکاح کے لیے مساجد کا انتخاب کرنا

سوال عقد نکاح کے لیے مساجد ہی کو خاص کرنا کہاں تک درست ہے؟ اس کے متعلق کوئی حدیث مروی ہے تو اس سے بھی آگاہ کریں۔

جواب عقد نکاح مساجد میں یا ان کے علاوہ دیگر مقامات میں دونوں طرح صحیح اور درست ہے۔ البتہ مساجد میں نکاح کے اہتمام سے بہت سی برائیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے، جبکہ دیگر مقامات پر یعنی شادی ہال وغیرہ میں بہت سی برائیوں کو علانیہ کیا جاتا ہے، مساجد میں نکاح کرنے سے سگریٹ نوشی اور فوٹو گرافی یا وڈیو وغیرہ سے انسان محفوظ رہتا ہے، اس بنا پر بہتر ہے کہ عقد نکاح کے لیے مساجد میں اہتمام کیا جائے اس سلسلہ میں ایک حدیث مروی ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس نکاح کا اعلان کرو اور عقد نکاح کے لیے مساجد کا انتخاب کرو۔'' [5]

اس حدیث کو علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ [6] تاہم کچھ علماء نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ [7] اس حدیث کی

---

[1] ابوداود، النکاح: ۲۱۰۷۔ [2] صحیح مسلم، النکاح: ۱۴۲۶۔ [3] ابوداود، النکاح: ۲۱۱۷۔
[4] ٤/النساء: ٤۔ [5] ترمذی، النکاح: ۱۰۸۹۔ [6] ضعیف ترمذی حدیث نمبر ۱۸۵۔
[7] السیل الجرار، ص: ۲۳٦، ج ۲۔

وجہ سے علامہ شوکانی نے مسجد میں نکاح کرنے کو مستحب قرار دیا ہے، ہمارے رجحان کے مطابق اگر شادی ہال میں اہتمام کے بجائے مساجد کا انتخاب کیا جائے تو انسان کئی ایک قباحتوں سے محفوظ رہتا ہے، اگرچہ شادی ہال میں نکاح کا اہتمام بھی جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

فواحش والی دعوت ولیمہ میں شرکت کرنا

سوال اگر دعوت ولیمہ میں فواحش ومنکرات ہوں تو ایسے ولیمہ میں شرکت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے جبکہ دعوت ولیمہ کو قبول کرنا بھی ضروری ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اس میں شک نہیں کہ دعوت ولیمہ قبول کرنا ضروری ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو ولیمے میں شمولیت کی دعوت دی جائے تو اس میں ضرور شرکت کرے۔'' [1]

لیکن وہاں کھانا تناول کرنا ضروری نہیں جیسا کہ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر چاہے تو کھالے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے۔'' [2] تاہم جن دعوتوں میں فواحش ومنکرات ہوں مثلاً گانے اور موسیقی کا اہتمام یا بے پردگی اور مرد وزن کا اختلاط اور انسان انہیں روکنے کی بھی ہمت نہ رکھتا ہو تو اس قسم کی دعوت کو ٹھکرا دینا چاہیے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے دستر خوان پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے جہاں شراب نوشی ہو رہی ہو۔ [3]

دیگر منکرات کو بھی اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے، اس لیے اگر ولیمہ کی دعوت میں اللہ کی نافرمانی والے کام ہوں اور انسان انہیں روکنے کی ہمت نہ رکھتا ہو تو اس قسم کی دعوت میں شرکت کرنا جائز نہیں، اگر انہیں روکنے کی ہمت رکھتا ہے تو پھر ایسی دعوتوں میں شرکت کی جاسکتی ہے تاکہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کا سد باب ہو۔ (واللہ اعلم)

دخول سے قبل تین طلاقیں اکٹھی دینا

سوال ایک آدمی نے نکاح کے بعد بیوی کے پاس جانے سے پہلے ہی اسے اکٹھی تین طلاقیں دے دیں، کیا وہ شخص دوبارہ اس عورت سے نکاح کرسکتا ہے؟

جواب نکاح کے بعد اگر بیوی کے پاس جانے سے پہلے ہی اسے طلاق دے دی جائے تو اسی وقت نکاح ٹوٹ جاتا ہے، اس صورت میں عورت کے لیے عدت وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! جب اہل ایمان خواتین سے نکاح کرو پھر ان کے پاس جانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو تمہارے لیے ان کے ذمہ کوئی عدت نہیں، جسے پورا کرنے کی روادار ہوں۔'' [4]

نکاح ختم ہونے کے بعد دوبارہ رشتہ ازواج میں منسلک ہونے کے متعلق اس آیت کریمہ میں کوئی اشارہ نہیں، اس کے لیے

---

[1] صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۷۳۔ [2] مسند امام احمد، ص: ۳۹۲، ج ۳۔

[3] ترمذی، الادب: ۲۷۷۵۔ [4] ۳۳/الاحزاب: ۴۹۔

دوسرے دلائل کو دیکھنا ہوگا، چنانچہ ایک دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی یا دوسری طلاق کے بعد اگر عدت ختم ہو جائے تو نکاح جدید سے دوبارہ گھر آباد کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۳۲ میں اس کی وضاحت ہے۔ صورت مسئولہ میں جس عورت کو طلاق دی گئی ہے اس کے ذمے کوئی عدت نہیں ہے لہٰذا ہمارے رجحان کے مطابق نکاح جدید سے رجوع ممکن ہے، اس کے علاوہ شریعت میں دو مواقع ایسے ہیں کہ نکاح ختم ہو جانے کے بعد وہ عام حالات میں دوبارہ نکاح نہیں کر سکتے۔

❶ جس عورت کو وقفہ وقفہ سے تین طلاقیں دی جائیں وہ ہمیشہ کے لیے خاوند پر حرام ہو جاتی ہے، صرف ایک صورت میں اکٹھے ہو سکتے ہیں کہ وہ آباد ہونے کی نیت سے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے وہ دوسرا خاوند فوت ہو جائے یا اسے طلاق دے دے تو عدت کے بعد پہلے خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے۔ [1]

❷ جو بیوی خاوند آپس میں لعان کریں، اس کے نتیجہ میں جو علیحدگی عمل میں آئے گی وہ بھی فیصلہ کن ہوگی، چنانچہ حدیث میں ہے کہ لعان کرنے والے میاں بیوی آپس میں دوبارہ نکاح نہیں کر سکتے۔

صورت مسئولہ کا ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا نکاح کے بعد اگر پاس جانے سے پہلے طلاق ہو جائے تو نکاح جدید سے گھر آباد کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ عورت رضامند ہو، سرپرست کی اجازت، حق مہر اور گواہ بھی موجود ہوں۔ (واللہ اعلم)

حرمتِ رضاعت

سوال مسمی عبدالحمید نے گیارہ ماہ کی عمر میں اپنی پھوپھی کا دودھ ایک مرتبہ پیا، جبکہ اس کی والدہ کو غسل دیا جا رہا تھا کیونکہ وہ فوت ہو چکی تھی، پھر دوسری مرتبہ اس وقت دودھ پیا جب کہ اس کی والدہ کو دفن کیا جا چکا تھا، اب عبدالحمید اپنے لڑکے کی شادی اپنی پھوپھی کی ایک چھوٹی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے، اس نکاح میں رضاعت یا کوئی دوسرا امر تو مانع نہیں؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمی عبدالحمید نے صرف دو مرتبہ اپنی پھوپھی کا دودھ پیا ہے، دو مرتبہ دودھ پینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی، حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک دفعہ یا دو دفعہ دودھ چوسنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔'' [2] ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ایک مرتبہ دودھ پینے اور دو مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، جب کہ ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''پستان کو ایک مرتبہ منہ میں ڈالنے یا دو مرتبہ منہ میں ڈالنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔'' [3]

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ ایک یا دو مرتبہ دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینا ضروری ہے۔ حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضرت سالم رضی اللہ عنہ کو پانچ مرتبہ دودھ پلایا پھر وہ ان کے بچے کی جگہ پر ہو گیا۔ [4]

متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی موقف ہے کہ کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوتی ہے حضرت عبداللہ بن

---

[1] دارقطنی، ص: ۲۷۶، ج۳۔ [2] مسلم، الرضاع: ۱۴۵۰۔ [3] صحیح مسلم، الرضاع: ۱۴۵۱۔
[4] صحیح مسلم، الرضاع: ۱۴۵۲۔

مسعود، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے متعلق ایسا ہی مروی ہے۔صورت مسئولہ میں عبدالحمید نے اپنی پھوپھی کا دو مرتبہ دودھ پیا ہے، اتنی تعداد سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔لہٰذا وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنی پھوپھی کی لڑکی سے کرسکتا ہے، اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے، اگر چہ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ دودھ تھوڑا یا زیادہ جتنا بھی پی لیا جائے، اس سے حرمت ثابت ہو جائے گی لیکن ہمارے نزدیک یہ مؤقف صحیح اور صریح احادیث کے خلاف ہے۔(واللہ اعلم)

نکاح متعہ کی وضاحت

سوال آج کل نکاح متعہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کیا اسلام میں اس نکاح کی گنجائش ہے؟ اس کے متعلق وضاحت درکار ہے۔

جواب کسی عورت سے ایک مقررہ مدت تک کے لیے نکاح کرنا متعہ کہلاتا ہے، اس قسم کا نکاح پہلے مباح تھا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جہاد کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ہماری بیویاں نہیں ہوتی تھیں، ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم خود کو خصی نہ کرلیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے منع فرمادیا، پھر ہمیں اجازت دی کہ ہم کسی عورت سے کپڑوں وغیرہ کے عوض نکاح کرلیں، اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے درج ذیل آیت تلاوت کی:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ ﴾ [1]

''اے ایمان والو! اپنے اوپر ان چیزوں کو حرام نہ کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں۔'' [2]

اس کے بعد اس نکاح سے قیامت تک کے لیے روک دیا گیا کیونکہ یہ عارضی رشتہ مقاصد نکاح کے منافی ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر نکاح متعہ اور پالتوں گدھوں کے گوشت سے منع فرمادیا۔ [3]

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ اوطاس کے موقع پر صرف تین دن کے لیے نکاح متعہ کی اجازت دی پھر اس کے متعلق امتناعی حکم جاری کردیا۔ [4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ دوران خطبہ فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تین مرتبہ نکاح متعہ کی اجازت دی پھر اسے حرام کردیا، اللہ کی قسم! مجھے کسی بھی شادی شدہ جوڑے کے نکاح متعہ کا علم ہوا تو میں انہیں رجم کردوں گا۔ [5] کتب حدیث میں نکاح متعہ کی رخصت کے بعد مختلف مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں اس کا منسوخ ہونا مروی ہے۔امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: درست بات یہ ہے کہ نکاح متعہ دو مرتبہ حرام ہوا اور دو ہی مرتبہ اس کی رخصت دی گئی، چنانچہ یہ غزوۂ خیبر سے قبل حلال تھا پھر اسے غزوۂ خیبر کے موقع پر حرام کردیا گیا۔اس کے بعد فتح مکہ کے موقع پر اسے حلال کیا گیا اور (عام اوطاس بھی اسی کو کہتے ہیں) اس کے بعد نکاح متعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام کردیا گیا۔ [6]

---

[1] ٥/المائدة: ٨٧۔ [2] صحیح بخاری، التفسیر: ٤٦١٥۔ [3] صحیح بخاری، النکاح: ٥١١٦۔
[4] صحیح مسلم، النکاح: ١٤٠٥۔ [5] ابن ماجه، النکاح: ١٩٦٣۔ [6] شرح نووی، ص: ١٨١، ج٩۔

بہر حال نکاح متعہ کی حرمت کے متعلق تمام اہل اسلام کا اجماع ہے، روافض اسے جائز کہتے ہیں، جمہور، سلف وخلف کے اجماع کے مقابلہ مین ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

بے نمازکے ساتھ نکاح کرنا

سوال کیا بے نماز کو اپنی بیٹی یا بہن کا رشتہ دینا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب بچیوں کے نکاح اور اس کے معیار کے متعلق کتاب وسنت میں بڑی کھلی ہدایات ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''عورت سے چار چیزوں کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب کی وجہ سے، اس کی خوبصورتی اور حسن و جمال کی وجہ سے اور اس کے دین واخلاق کی وجہ سے۔ تم دیندار عورت سے نکاح کرنے میں کامیابی حاصل کرو۔'' [1]

یہ حدیث اس امر کی واضح دلیل ہے کہ نکاح کے سلسلہ میں دین اور اخلاق کے پہلو کو ترجیح دی جائے۔ ایک دوسری حدیث میں اس کی مزید تفصیل ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص آئے جس کے دین واخلاق کو پسند کرتے ہو تو اسے نکاح دے دو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ وفساد پیدا ہوگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر اس میں کوئی بات موجود ہو تو آپ نے پھر اپنی بات کو دہراتے ہوئے فرمایا: ''جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص آئے جس کے دین واخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اسے نکاح دے دو۔ آپ نے تین مرتبہ یہ بات دہرائی۔'' [2]

صورت مسئولہ میں بے نماز شخص اس معیار کا حامل نہیں ہے، ہاں اگر رشتہ طلب کرنے والا نماز باجماعت ادا نہیں کرتا تو وہ فاسق، اللہ اور اس کے رسول کا نافرمان ہے نیز وہ مسلمانوں کے اجماع کا بھی مخالف ہے۔ تاہم اس سے وہ دین اسلام سے خارج نہیں ہوتا، ایسے شخص کو بیٹی یا بہن کا رشتہ دیا جاسکتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں اگر دوسرے رشتے ملیں جو دینی اعتبار سے بہتر ہوں تو انہیں ترجیح دی جائے، خواہ وہ مال و دولت اور حسب ونسب کے اعتبار سے کم مرتبہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر رشتہ کا طالب نماز کے قریب تک نہیں جاتا تو ایسے آدمی سے رشتہ کرنا ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

رخصتی سے قبل طلاق ہونے پر حق مہر لینا

سوال میری ہمشیرہ کا نکاح ہوا لیکن رخصتی سے قبل ہی اسے طلاق ہوگئی، کیا وہ حق مہر لینے کی مجاز ہے؟ نیز وہ کب عقد ثانی کرسکتی ہے؟

جواب مطلقہ عورت کے حق مہر کی ادائیگی کے متعلق شرعی طور پر چار صورتیں ممکن ہیں۔

1. حق مہر مقرر نہیں ہوا تھا اور صحبت سے پہلے اسے طلاق ہوگئی، اس صورت میں خاوند کو چاہیے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرے کیونکہ رشتہ ازدواج جوڑنے کے بعد صحبت سے پہلے ہی طلاق دینے سے عورت کو جو نقصان ہوا ہے، اس کی

---

[1] صحیح بخاری، النکاح: ۵۰۹۰۔ [2] ترمذی، النکاح: ۱۰۸۵۔

کسی حد تک تلافی ہو سکے۔

❷ حق مہر مقرر ہو چکا تھا لیکن صحبت سے پہلے اسے طلاق مل گئی تو خاوند کے ذمے طے شدہ حق مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا، الا یہ کہ مطلقہ بیوی ازخود اسے معاف کردے۔ قرآن مجید میں اس کی صراحت ہے۔ [1]

❸ مہر بھی مقرر ہوا اور صحبت یا خلوت میسر آنے کے بعد طلاق ہوئی تو اس صورت میں خاوند کے لیے ضروری ہے کہ وہ پورا حق مہر ادا کرے، عام طور پر یہی صورت پیش آتی ہے۔

❹ مہر طے نہیں ہوا تھا مگر صحبت یا خلوت کے بعد طلاق واقع ہوئی، اس صورت میں مہر مثل ادا کرنا ہوگا یعنی اتنا حق مہر جو اس عورت کے قبیلہ میں عام طور پر رائج ہے۔

صورت مسئولہ میں اگر حق مہر طے شدہ ہے تو اس کا نصف بیوی کو ملے گا الا یہ کہ وہ فیاضی سے کام لیتے ہوئے نصف حق مہر بھی معاف کردے یا خاوند سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نصف کے بجائے پورا حق مہر ادا کردے، اجتماعی زندگی میں خوشگواری پیدا کرنے کے لیے اس قسم کی فیاضی ضروری ہے۔ البتہ ایسی عورت طلاق ملتے ہی عقد ثانی کرنے کی مجاز ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں اس کی صراحت ہے۔ [2]

محرمات کی وضاحت

سوال میرے سسر کی دو بیویاں ہیں، جس بیوی کی لڑکی میرے عقد میں ہے وہ میری ساس ہے دوسری بیوی کے متعلق شرعی حکم کیا ہے کیا وہ بھی محرمات میں شمار ہوگی؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب بیوی کی والدہ تو محرمات سے ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ ...... أُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ﴾ [3]

''اور تمہاری بیویوں کی مائیں بھی حرام ہیں۔''

سسر کی دوسری بیوی، داماد کے لیے اجنبی ہے اور محرمات میں شامل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے محرمات کے بیان کے بعد فرمایا ہے:

﴿وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ [4]

''اور ان کے علاوہ دیگر عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں۔''

قرآن کریم کی اس قطعی نص سے صرف پھوپھی، بھتیجی، اور خالہ، بھانجی کو بیک وقت جمع کرنے کا استثناء احادیث میں آیا ہے، اس کے علاوہ کسی عورت کی حرمت کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے، پھر داماد اور سسر کی دوسری بیوی کے درمیان قرابت اور رشتہ داری نہیں یعنی یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں، ہمارے رجحان کے مطابق سسر کی دوسری بیوی کو اپنے خاوند کے داماد سے پردہ کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ خلوت اور سفر کرنا جائز نہیں، جب کہ حقیقی ساس محرمات میں سے ہے اور اس کے

---

[1] ٢/البقرة: ٢٣٧۔ [2] ٣٣/الاحزاب: ٤٩۔
[3] ٤/النساء: ٢٣۔ [4] ٤/النساء: ٢٤۔

ساتھ خلوت بھی کی جاسکتی ہے اور وہ اس سے پردہ بھی نہیں کرے گی بلکہ اکثر علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ کسی کے سسر کی بیوی اور اس کی دوسری بیوی کی بیٹی کو نکاح میں جمع کیا جاسکتا ہے امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس میں کوئی حرج نہیں کہ کسی شخص کی بیوی اور اس کی کسی اور بیوی سے بیٹی کو نکاح میں جمع کر لیا جائے۔ [1]

بہرحال بیوی کے والد کی دوسری بیوی محرمات سے نہیں ہے، جب سسر فوت ہو جائے یا وہ اسے طلاق دے دے تو اس سے نکاح جائز اور مباح ہے۔ (واللہ اعلم)

پہلے خاوند کی بیٹی کا موجودہ خاوند کے بیٹے سے نکاح کرنا

سوال ایک آدمی نے کسی بیوہ سے شادی کی جب کہ اس کے ہاں پہلے خاوند سے ایک بیٹی تھی، وہ شادی کے بعد اپنے بیٹے کا نکاح بیوہ کی لڑکی سے کر دیتا ہے اور وہ بیٹا اس کی پہلی بیوی کے بطن سے تھا، کیا ایسا کرنا قرآن وحدیث کی رو سے جائز ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں سے نکاح نہیں ہو سکتا ان کی فہرست سورۃ النساء میں بیان کی ہے، اس کے بعد فرمایا کہ

﴿ وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ ﴾ [2]

''ان کے علاوہ تمام عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں۔''

مذکورہ بیوہ کی پہلے خاوند سے لڑکی کے ساتھ خاوند کی پہلی بیوی کے لڑکے کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہیں جس کی بنا پر ان کے نکاح کو ناجائز قرار دیا جائے بلکہ نص قرآنی کے مطابق یہ حلال اور جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔ (واللہ اعلم)

قریبی رشتوں میں نکاح کرنا

سوال جدید طبی انکشافات کے پیش نظر شادی کے متعلق یہ فلسفہ بیان کیا جاتا ہے کہ رشتہ داروں میں شادی کرنے سے موروثی بیماریاں بچوں میں منتقل ہو جاتی ہیں، اس لیے خونی رشتہ داروں میں شادی کرنا مناسب خیال نہیں کیا جاتا ہے، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب ہمارے معاشرہ میں شادی و نکاح کے لیے برادری سسٹم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے بلکہ اس سسٹم کی بت کی طرح پوجا کی جاتی ہے، شاید مذکورہ جدید طبی فلسفہ اسی بت پرستی کا ردعمل ہو، بہرحال قرآن وحدیث میں اس فلسفہ کو کوئی اہمیت نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے سلسلہ میں درج ذیل معیار کی نشاندہی کی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عورت سے چار اسباب کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے خاندان کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کی وجہ سے، اور اس کے دین کی وجہ سے، لہٰذا تم دیندار خاتون سے نکاح کر کے کامیابی حاصل کرو اگر ایسا نہ کرو تو تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں۔'' [3]

دینداری کے ساتھ ساتھ اگر خاندان میں سے ہو تو صلح رحمی ہوگی، لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہم جدید طب کے

---

[1] المغنی، ص: ۹۸، ج۷۔ [2] ٤/النساء: ٢٤۔

[3] صحیح بخاری، النکاح: ۵۰۹۰۔

انکشافات کی وجہ سے قطع رحمی کر لیتے ہیں، کیا اس جدید طب میں موروثی بیماریوں کا علاج نہیں ہے، اگر ہے تو اسے کیوں نہیں اختیار کیا جاتا؟ بہرحال شریعت نے اس کو کوئی حیثیت نہیں دی ہے خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے جگر گوشہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیا تھا جبکہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خونی رشتہ تھا، رسول اللہ ﷺ تو ہماری طرح شبہات میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اسے آج کل کی زبان میں کزن میرج کہا جاتا ہے جس کی ممانعت کے لیے جدید طب کا سہارا لیا جاتا ہے شرعاً اس کی کوئی حقیقت نہیں ہمارے نزدیک اس طرح کی سوچ رکھنا قطع رحمی کو ترویج دینا ہے، اگر اس طرح کا کوئی اندیشہ ہو تو سد باب کے طور پر جدید طب سے استفادہ کرنا چاہیے اور اس کے علاج کے لیے کوئی اقدام کرنا چاہیے لیکن قطع رحمی کی اسلام اجازت نہیں دیتا ہے۔ (واللہ اعلم)

موبائل کے ذریعہ طلاق دینا

سوال میں نے اپنی بیوی کو موبائل کے ذریعے طلاق کا پیغام بھیجا، میری بیوی کو وقفہ وقفہ سے گیارہ مرتبہ وہ پیغام موصول ہو چکا ہے، کیا وہ ایک طلاق شمار ہوگی یا زیادہ طلاقوں کا اعتبار کیا جائے گا؟ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے خاوند کو زندگی بھر تین طلاقیں دینے کا اختیار دیا ہے، پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش ہے جس کی دو صورتیں ہیں، اگر دوران عدت رجوع کر لیا جائے تو تجدید نکاح کے بغیر ہی گھر آباد کیا جا سکتا ہے اور اگر عدت گزر جانے کے بعد رجوع کا پروگرام بنے تو تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے، اس لیے بیوی کی رضا مندی، سرپرست کی اجازت، حق مہر کا تعین اور گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر تیسری طلاق بھی دے دی جائے تو عام حالات میں رجوع نہیں ہو سکے گا تا آنکہ وہ آباد ہونے کی نیت سے کسی دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح کرے، ملاپ کے بعد اگر وہ فوت ہو جائے یا اسے طلاق دے دے تو عدت گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے از سر نو نکاح ہو سکتا ہے، صورت مسئولہ میں اگر خاوند نے موبائل کے ذریعے طلاق کے پیغام متعدد مجالس میں متعدد مرتبہ ارسال کیے ہیں تو تینوں طلاق واقع ہو چکی ہیں اور اب رجوع کا کوئی موقع نہیں رہا اور اگر خاوند نے صرف ایک مرتبہ طلاق کا پیغام ارسال کیا پھر نیٹ ورک کے ذریعے خود بخود ہی بیوی کو پیغام طلاق موصول ہوتے رہے تو اس صورت میں صرف ایک طلاق ہوگی اور دوران عدت رجوع ہو سکتا ہے اور عدت گزرنے کے بعد تجدید نکاح سے اپنا گھر آباد کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

شادی کے جوڑے آسمان پر بنتے ہیں وضاحت

سوال عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ شادی کے لیے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے صحیح صحیح اندازے اور تقدیر کے مطابق

ہورہا ہے لیکن اس کے لیے اسباب مہیا کرنا اور بھاگ دوڑ کرنا ہماری ذمہ داری ہے، جس طرح حصول رزق کے لیے اسباب تلاش کیے جاتے ہیں، اس طرح مناسب رشتے کے لیے کوشش کرنا ہمارا فرض ہے، تقدیر کے سہارے پر بیٹھے رہنا تو عجز ودرماندگی ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے۔ عقل اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ آسمانوں پر جوڑے بننے کے باوجود ہمیں مناسب رشتہ کے لیے کوشش کرنی چاہیے، قلم کی پیدائش سے لے کر قیامت کے دن تک کی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اسے حکم دیا کہ تو لکھ، اس نے عرض کیا، اے میرے رب! میں کیا لکھوں؟ فرمایا: جو کچھ ہونے والا ہے وہ لکھ دے۔ چنانچہ قلم نے اسی لمحے وہ سب کچھ لکھ دیا جو قیامت تک ہونے والا ہے۔ [1]

بہر حال جس طرح رزق لکھا ہوا ہے اور وہ اسباب کے ساتھ مقدر ہے، اسی طرح شادی کا معاملہ بھی لکھا ہوا ہے یعنی میاں بیوی میں سے ہر ایک کے لیے یہ لکھا ہوا ہے کہ اس کی شادی فلاں سے ہوگی، ہمارا یہ ایمان اور عقیدہ ہے کہ دنیا میں جو کام بھی ہوتا ہے وہ اللہ کے علم اور فیصلہ کے عین مطابق ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

خاوند بیوی کی ناچاقی کا حل

سوال میرا خاوند میرے ساتھ بڑی ترش روئی سے پیش آتا ہے، جبکہ وہ دوسروں کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے، میں اس معاملہ میں بہت پریشان ہوں، ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے، اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں؟

جواب شریعت اسلامیہ کا تقاضا ہے کہ میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ حسن معاشرت اور اخلاق فاضلہ کا تبادلہ کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ ﴾ [2]

''تم ان بیویوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔''

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ایمان والوں میں سے کامل ترین مومن وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو اور تم میں اچھے وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے اچھے ہیں۔'' [3] نیز آپ نے فرمایا کہ تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہترین ہے اور میں اپنے اہل خانہ کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔ [4]

علاوہ ازیں بہت سی احادیث ہیں جو مسلمانوں کو عمومی طور پر حسن خلق اور باہمی رواداری کا درس دیتی ہیں۔ میاں بیوی کو تو ان امور کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ بہر حال آپ صبر وتحمل کا مظاہرہ کریں، دل برداشتہ ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو آپ کے لیے دنیا وآخرت میں نقصان کا باعث ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ [5]

''یقیناً جو شخص اللہ سے ڈر جائے اور صبر کرے تو بلا شبہ اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔''

---

[1] ترمذی، الفتن: ۲۱۵۵۔ [2] ٤/النساء: ۱۹۔

[3] مسند امام احمد، ص: ۴۷۳، ج۲۔ [4] سنن ابن ماجه، النكاح: ۱۹۷۷۔ [5] ۸/الانفال: ٦٤۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے خاوند کی اصلاح فرمائے اور حسن خلق اور خندہ پیشانی کے ساتھ بیوی کے حقوق ادا کرنے کی توفیق دے۔'' (آمین!)

وہ امور جن کے پیش نظر خاوند کی طلاق کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا

سوال وہ کون سے امور ہیں جن کے پیش نظر خاوند کی طلاق کا اعتبار نہیں کیا جاتا اور اس کے طلاق دینے کے باوجود بیوی مطلقہ نہیں ہوتی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب جب شوہر عاقل، بالغ اور مکلف ومختار ہو تو اس کی طلاق کا اعتبار کیا جاتا ہے اور اس کی طلاق سے بیوی مطلقہ ہو جاتی ہے، اس کے برعکس اگر نابالغ ہے یا حالت نشہ میں ہے یا وہ اس قدر شدید غصہ میں ہو کہ طلاق کے نقصان کو سمجھنے سے عاجز ہو جائے اور اسے مدہوش کر دے تو ایسے حالات میں اس کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''تین شخص مرفوع القلم ہیں، سویا ہوا آدمی حتیٰ کہ وہ بیدار ہو جائے، بچہ حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے اور مجنون حتیٰ کہ وہ سمجھنے لگے۔'' [1]

اسی طرح جو شخص مجبور ہو اور اس سے زبردستی طلاق لی گئی ہو، اس کی طلاق کا بھی اعتبار نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''زبردستی طلاق اور جبری آزادی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' [2]

اہل علم نے ''اغلاق'' کا یہ معنی کیا ہے کہ زبردستی اور شدید غصہ کی حالت کو اغلاق کہا جاتا ہے، اسی طرح ایسے شخص کی طلاق کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے جو نشہ میں مدہوش ہو، ایسا نشہ کہ عقل کو ماؤف کر دے اگرچہ نشہ کی وجہ سے گنہگار ہو گا لیکن اس کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

رجعی طلاق کا حکم

سوال ایک شخص نے اپنی بیوی کو غصہ کی حالت میں طلاق دے دی اور ایک ہی مجلس میں تین دفعہ طلاق کے الفاظ دہرائے، اس کے چھ دن بعد تحریری طلاق بھی لکھ دی لیکن اسے بیوی تک نہیں پہنچایا، اب طلاق کے اڑھائی سال بعد دونوں صلح کرنا چاہتے ہیں، کیا ایسا کرنا ممکن ہے؟

جواب قرآن وحدیث کے مطابق ایک مجلس کی تین طلاق ایک رجعی شمار ہوتی ہے جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت ہے، اس طلاق کے چھ دن بعد خاوند نے تحریری طلاق بھی دے دی جو بیوی تک نہیں پہنچائی، اس طرح یہ دوسری طلاق ہے، واضح رہے کہ طلاق کے لیے بیوی کو اس کا علم ہونا ضروری نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے مؤثر ہونے کے لیے شرط ہے، اڑھائی سال تک عورت کی عدت ختم ہو چکی ہے، عدت ختم ہوتے ہی نکاح ٹوٹ جاتا ہے، اب تجدید نکاح سے صلح ہو سکتی ہے بشرطیکہ عورت رضامند ہو، اس کے سرپرست کی اجازت ہو، گواہ بھی موجود ہوں اور حق مہر بھی از سر نو مقرر کیا جائے، ان چار شرائط کی موجودگی میں نیا نکاح کر کے اپنا گھر آباد کیا جا سکتا ہے، لیکن آئندہ کے لیے طلاق وغیرہ کے اقدام سے اجتناب کرنا ہو گا۔ کیونکہ اب تجدید نکاح

---

[1] ترمذی، الحدود: ١٤٢٣۔ [2] ابوداود: ٢١٩٣۔

کے بعد طلاق دینے سے بیوی ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائے گی پھر عام حالات میں رجوع بھی نہیں ہو سکے گا۔ (واللہ اعلم)

طلاق دینے کی شرائط

سوال میری بیوی منہ پھٹ اور بدزبان ہے، ایک دفعہ میرا اپنی بیوی کے ساتھ جھگڑا ہوا تو میں نے اسے کہا اگر تو خاموش نہ ہوئی تو میں تجھے طلاق دے دوں گا لیکن وہ خاموش نہ ہوئی، میں نے شدید غصے کے عالم میں اسے طلاق دے دی، اب مجھے بتایا جائے کہ ایسی حالت میں طلاق ہو جاتی ہے؟

جواب اس میں شک نہیں ہے کہ غصہ آگ کا ایک انگارہ ہے جسے شیطان، انسان کے دل میں ڈال دیتا ہے پھر انسان کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، رگیں پھول جاتی ہیں، پھر انسان آپے سے باہر ہو کر اُول فول بکنا شروع کر دیتا ہے، اس قسم کے غصہ میں مبتلا ہونا شریعت کو انتہائی ناپسند ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو یہی وصیت فرمائی تھی، جب اس نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی وصیت فرمائیں! آپ نے فرمایا: ''غصہ نہ کر'' اس نے کئی مرتبہ اپنی بات کو دہرایا تو آپ نے ہر دفعہ جواب میں یہی فرمایا: ''غصہ نہ کیا کر۔'' [1]

☆ طلاق غصہ کی ابتدائی حالت میں دی جائے جب طلاق دینے والے کے ہوش و حواس قائم ہوں اور اسے علم ہو کہ میں منہ سے کیا کہہ رہا ہوں، ایسی حالت میں طلاق ہو جاتی ہے کیونکہ اس نے ایسی حالت میں طلاق دی ہے کہ غصہ آنے کے باوجود اس کے حواس درست تھے اور اپنے اختیار و ارادہ سے یہ کام کیا ہے۔

☆ دوسری حالت یہ ہے کہ بیوی کو طلاق غصے کی ایسی حالت میں دی جائے کہ انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو، ایسی حالت میں وہ مجنون اور دیوانے کی حالت میں خیال کیا جائے گا اور اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''حالت اغلاق میں طلاق نہیں ہوتی۔'' [2]

اغلاق سے مراد عقل پر پردہ ڈال دینے والا شدید غصہ ہے، جب انسان بحالت غصہ اس حد تک پہنچ جائے کہ اس کا شعور ختم ہو جائے اور اپنی یادداشت کھو بیٹھے، اسے کچھ معلوم نہ ہو کہ وہ اپنے منہ سے کیا کہہ رہا ہے تو ایسی حالت میں راجح قول کے مطابق طلاق نہیں ہوتی، یہ معلوم کرنا کہ طلاق دہندہ نے غصے کی حالت میں طلاق دی ہے، اس بات کا اندازہ وہ خود ہی لگا سکتا ہے، مطلق طور پر غصہ کی حالت میں طلاق نہ ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ طلاق ہمیشہ غصہ کی حالت میں دی جاتی ہے، کوئی انسان بھی راضی خوشی اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیتا۔ (واللہ اعلم)

نکاح کے ساتویں ماہ لڑکا جنم دینا

سوال میری بیوی نے نکاح کے ساتویں ماہ لڑکا جنم دیا ہے، میرے دل میں اس کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں، ویسے بیوی کی بدچلنی ظاہر نہیں ہوئی، اب میرے لیے کیا حکم ہے، اسے چھوڑ دوں یا اپنے گھر میں آباد رکھوں؟

---

[1] صحیح بخاری، الادب: ٦١١٦۔ [2] ابو داود، الطلاق: ٢١٩٣۔

جواب: کسی کی عزت وناموس کے متعلق شکوک وشبہات کا اظہار کرنا شریعت میں انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے، پھر اپنی رفیقۂ حیات کے بارے میں اس قسم کے خیالات ذہن میں لانا جس سے اس کی آبرو مجروح ہوتی ہو بہت برا فعل ہے، جب کہ خاوند کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ بیوی کی بدچلنی ظاہر نہیں ہوئی، ایسے حالات میں بیوی کے متعلق بدگمانی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ شریعت نے نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ جنم دینے کو جائز قرار دیا ہے اور اسے حلال کا بچہ شمار کیا ہے، کیونکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ [1]

''اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس (۳۰) ماہ ہے۔''

اور دوسرے مقام پر اس کے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال یعنی چوبیس ماہ قرار دی گئی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ [2]

''اور اس کی دودھ چھڑانے کی مدت دو سال ہے۔''

ان دونوں آیات کے مطابق اگر تیس ماہ سے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال یعنی چوبیس ماہ نکال دی جائے تو باقی مدت چھ ماہ رہ جاتی ہے جو حمل کی مدت ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ لہٰذا اگر کوئی عورت نکاح کے ساتویں ماہ میں بچہ جنم دیتی ہے جیسا کہ سوال میں ذکر کیا گیا ہے تو اس میں کسی قسم کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

خواب میں بار بار طلاق دینا

سوال: میں شادی شدہ ہوں اور اکثر یہ خواب دیکھتا ہوں کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہوں، کیا خواب میں اپنی بیوی کو بار بار طلاق کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے؟ اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں۔

جواب: خاوند اگر بار بار خواب دیکھتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے تو اس خواب کی تعبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیوی خاوند کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہیں اور خاوند اس سے کافی حد تک کبیدہ خاطر ہے، فریقین کو چاہیے کہ وہ اصلاح احوال کی کوشش کریں، کیونکہ خاوند کے دل ودماغ پر طلاق سوار ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ عالم بیداری میں اس قسم کے خواب کو سچا کر دکھائے، جہاں تک بیوی کو حالتِ خواب میں طلاق دینے کا مسئلہ ہے تو اس طرح کی طلاق قابل مؤاخذہ نہیں ہے اور نہ ہی اس قسم کی طلاق واقع ہوتی ہے کیونکہ سونے والے کا کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا اور نہ ہی اس کے کسی قول وعمل کو معتبر خیال کیا جاتا ہے، اس قسم کے خواب شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعے انسان کو پریشان کرے۔ حدیث میں ہے کہ جب کوئی انسان خواب میں ناپسندیدہ امر دیکھے تو اپنے بائیں جانب تھوتھو کرے اور شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگے، نیز وہ اپنی کروٹ بدل کر لیٹ جائے، یہ عمل تین

---

[1] ٤٦/الاحقاف: ١٥۔ [2] ٣١/لقمان: ١٤۔

مرتبہ دہرائے۔ ❶

بہرحال خواب کو کسی چیز کی بنیاد نہیں قرار دیا جا سکتا اور اس میں دی ہوئی طلاق کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے خواب انسان کے اندرونی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

طلاق یافتہ بہن پر خرچ کرنا

سوال میرے والد گرامی ہماری طلاق یافتہ بہن پر خرچ کرتے ہیں جبکہ وہ صاحب اولاد ہے اور اس کے بچے کمانے کے قابل ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب غریب رشتہ دار پر خرچ کرنا بہت بڑی فضیلت کا باعث ہے، حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسکین پر خرچ کرنا صرف صدقہ ہے اور رشتہ دار پر خرچ کرنے میں دو چیزیں شامل ہیں یعنی صدقہ اور صلہ رحمی۔'' ❷

واضح رہے کہ کسی پر خرچ یعنی صدقہ کرنے کی دو شرائط ہیں: ❶ وہ فقیر ہو اور کسی چیز کا مالک نہ ہو اور جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس کے لیے کافی نہ ہو اور نہ ہی وہ کمانے کی طاقت رکھتا ہو۔ ❷ خرچ کرنے والا غنی ہو اور اس کے پاس بیوی بچوں کی ضروریات سے زیادہ مال ہو۔ مذکورہ شرائط کی موجودگی میں مطلقہ بیٹی پر خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

خاوند کے ذمہ بیوی کے حقوق

سوال ایک لڑکی کی انگلینڈ میں شادی ہوئی، کچھ عرصہ تک میاں بیوی اکٹھے رہے، اب عرصہ چھ سال سے خاوند لاتعلق ہے اور اخراجات وغیرہ بھی نہیں دیتا ہے بلکہ وہ لڑکی کے والدین کو دھمکیاں دیتا ہے۔ لڑکی تنگ آ چکی ہے اور آگے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن خاوند طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہے، اس کے متعلق شریعت اسلامیہ کا کیا حکم ہے؟

جواب قرآن کریم نے عائلی زندگی کے متعلق خاوند کو پابند کیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گزارے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ ❸

''ان بیویوں کے ساتھ اچھے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ بیویوں کو تنگ کرنے کے لیے مت روکو، قرآن کریم میں صراحت ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ﴾ ❹

''ان بیویوں کو تکلیف پہنچانے کی خاطر مت روکے رکھو کہ تم ان پر زیادتی کرو اور جو شخص یہ کام کرے گا وہ اپنے

---

❶ صحیح بخاری، التعبیر: ۷۰۰۵۔ ❷ ترمذی، الزکوٰۃ: ۶۵۸۔
❸ ٤/النساء: ۱۹۔ ❹ ۲/البقرۃ: ۲۳۱۔

آپ پر ہی ظلم کرے گا۔''

بیوی کا نان ونفقہ بھی خاوند کے ذمے ہے، اس کے کھانے، پینے، لباس، رہائش اور دیگر ضروریات زندگی فراہم کرنا اس کی ذمہ داری ہے، اگر وہ کسی وجہ سے اسے ناپسند کرتا ہے اور نبھا کی کوئی صورت نہیں بنتی تو اسے طلاق دے کر فارغ کر دینا چاہیے، اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ﴾ [1]

''اور اگر دونوں میاں بیوی الگ ہو جائیں تو اللہ اپنی مہربانی سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ مجبوراً بیوی کا خاوند کے ساتھ بندھے رہنا ضروری نہیں، تکلیف دہ حالات میں علیحدگی ضروری ہے، اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ عورت کو کوئی اور اچھا خاوند نصیب کر دے اور مرد کو اس سے بہتر بیوی نصیب کر دے اور وہ حسن سلوک سے باہمی نبھا کر لیں، لیکن گومگو کی زندگی گزارنے کو شریعت نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا ہے، اگر خاوند اچھی معاشرت سے کام نہ لے اور نہ ہی طلاق دے کر اپنی بیوی کو فارغ کرے تو شریعت نے بیوی کو حق دیا ہے کہ وہ خلع لے کر فارغ ہو جائے، اس کی دو صورتیں ہیں۔

دونوں میاں بیوی باہمی رضامندی سے علیحدگی اختیار کر لیں، بیوی حق مہر واپس کر کے اس سے طلاق لے لے۔

اگر باہمی رضامندی سے یہ کام نہ ہو سکے تو بذریعہ عدالت علیحدگی کرائی جائے، اس کی صورت یہ ہے کہ عورت فیملی کورٹ میں درخواست دے کہ میں انتہائی نامساعد حالات سے دوچار ہوں، میرا خاوند مجھے آباد بھی نہیں کرتا اور طلاق بھی نہیں دیتا۔ مجھے حق انصاف دیا جائے، عدالت حسب ضابطہ کاروائی عمل میں لائے گی اور خاوند کو نوٹس جاری کرے گی، بالآخر عدالت تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کرے گی، جس دن علیحدگی کا فیصلہ ہو جائے اس کے ایک ماہ بعد عورت آگے نکاح کرنے کی مجاز ہے۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ رضاعت

سوال ایک لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پیا، پھر اس لڑکی کے باپ نے اس عورت سے نکاح کر لیا، کیا لڑکی کا بھائی، اس عورت کی لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کے سابقہ خاوند سے ہے؟

جواب دودھ پینے والی لڑکی کے لیے عورت کے تمام رشتہ دار نسبی رشتوں کی طرح ہو جاتے ہیں یعنی عورت کا خاوند، اس کا باپ، خاوند کے بھائی اس کے چچا اور اس کی اولاد لڑکی کے بہن بھائی بن جاتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں۔'' [2]

یہ حرمت کا سلسلہ دودھ پینے والے بچے یا بچی کے لیے ہے۔ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ یہ سلسلہ قائم نہیں ہوگا۔ یعنی دودھ پینے والے بچے کے لیے وہ عورت ماں کے درجہ میں ہوگی جس کا بچے نے دودھ پیا ہے، اس بچے کے باقی بہن بھائی جنہوں

---

[1] ٤/النساء: ١٣٠۔ [2] صحیح بخاری، النکاح: ٢٦٤٤۔

نے اس کا دودھ نہیں پیا ان کا اس سے کوئی رشتہ دودھ کی وجہ سے قائم نہیں ہوگا، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے ام یحییٰ بنت ابی اھاب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا تو ایک دوسری عورت نے شہادت دی کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ''اب تم اسے کس طرح اپنے نکاح میں رکھ سکتے ہو جبکہ رضاعت کی اطلاع دے دی گئی ہے؟'' چنانچہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو جدا کر دیا تو اس نے کسی دوسرے آدمی سے نکاح کر لیا۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے کہ اس عورت نے اپنے خاوند کے بھائی حضرت ظریب بن حارث رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا تھا، اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دودھ کا رشتہ صرف دودھ پینے والے تک محدود رہتا ہے، اس کے بہن بھائیوں کو متاثر نہیں کرتا، اس بنا پر جس لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے تو اس لڑکی کا بھائی، عورت کی اس لڑکی سے شادی کر سکتا ہے جو پہلے خاوند سے ہے، کیونکہ اس لڑکے کا اس عورت اور اس کی بیٹی سے کوئی حرمت کا تعلق قائم نہیں ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)

نکاح کے وقت حاملہ عورت کے حق مہر کا مسئلہ

سوال کسی آدمی نے ایک عورت سے نکاح کیا، کافی دیر بعد پتہ چلا کہ وہ نکاح کے وقت حاملہ تھی، اس کے حق مہر کے متعلق شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے، کیا خاوند کے ذمے اس کی ادائیگی ضروری ہے جبکہ اس سے کچھ بچے بھی پیدا ہو چکے ہیں؟ کتاب و سنت کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب اگر کوئی عورت بوقت نکاح حاملہ تھی تو شرعی طور پر اس کا نکاح صحیح نہیں ہے، مطلقہ عورت کی عدت اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے رحم کے متعلق یقین ہو جائے، اگر حمل ہے تو وضع حمل تک انتظار کیا جائے گا، قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ ﴾ [2]

''اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔''

ایسے حالات میں بیوی خاوند کے درمیان علیحدگی ضروری ہے۔ باقی رہا حق مہر کا مسئلہ تو اس کی حقدار بیوی ہے، خاوند کو واپس نہیں ملے گا، بشرطیکہ دونوں میں خلوت عمل میں آ چکی ہو، یا وہ دونوں مباشرت کر چکے ہوں۔ لعان کرنے والے خاوند نے اپنے حق مہر کے متعلق سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''کہ تجھے کوئی مال (حق مہر) واپس نہیں ملے گا کیونکہ اگر تو سچا ہے تو نے اس کی شرمگاہ کو اپنے لیے حلال سمجھا، اس کے عوض تیرا حق مہر ختم ہوا، اگر تو نے ناجائز تہمت لگائی تو بالا ولیٰ تو محرومی کے قابل ہے۔'' [3]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: جس نے (نکاح کے بعد) ہمبستری کی ہے حق مہر اس کے لیے ہے۔ [4]

ان احادیث کی روشنی میں ہمیں راہنمائی ملتی ہے کہ سرے سے یہ نکاح نہیں ہوا، البتہ حق مہر خاوند کو واپس نہیں ملے گا کیونکہ حق

---

[1] بخاری الشهادات: ٢٦٦٠۔ [2] ٦٥/الطلاق: ٤۔

[3] صحيح بخاری، الطلاق: ٥٣٥٠۔ [4] صحيح بخاری، الطلاق، باب نمبر ١٢۔

مہر کے عوض اس نے فائدہ حاصل کرلیا ہے، بچوں کی نسبت اس خاوند کی طرف ہوگی۔ (واللہ اعلم)

باپ کا بیٹے کی ساس سے نکاح کرنا

سوال ایک نوجوان کا کسی دوشیزہ سے نکاح ہوگیا، اس کے بعد اس نوجوان کی والدہ محترمہ وفات پا گئیں جبکہ اس کا سسر نکاح سے پہلے انتقال کر چکا تھا تو کیا اس نوجوان کا باپ اس کی ساس سے نکاح کرسکتا ہے؟ شریعت کی رو سے جواز ممانعت واضح فرمائیں۔

جواب قرآن کریم نے تفصیل سے وضاحت کی ہے کہ کن کن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے، ان میں سات خونی، دو رضاعی اور تین سسرالی رشتہ دار خواتین ہیں، اسی طرح بیک وقت دو بہنوں کو اپنے عقد میں رکھنا بھی حرام قرار دیا ہے نیز شادی شدہ منکوحہ عورت سے بھی نکاح حرام ہے، احادیث میں مزید دو رشتوں کی ممانعت کا ذکر ہے کہ پھوپھی، بھتیجی اور خالہ، بھانجی کو بیک وقت نکاح میں نہیں رکھا جاسکتا، ان محرمات میں بیٹے کی ساس کا کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا اس سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ﴾ [1]

’’ان کے ماسوا جتنی بھی عورتیں ہیں انہیں اپنے مال کے ذریعے حاصل کرنا تمہارے لیے جائز قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ اس سے تمہارا مقصد نکاح میں لانا ہو، محض شہوت زنی نہ ہو۔‘‘

صورتِ مسئولہ میں نوجوان کا باپ اس کی ساس سے نکاح کرسکتا ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

فون یا انٹرنیٹ پر نکاح کرنا

سوال فون یا انٹرنیٹ پر نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق فتویٰ دیا جائے، آج کل بکثرت ایسے نکاح ہوتے ہیں۔

جواب نکاح کے لیے ایجاب وقبول رکن کی حیثیت رکھتا ہے، ایجاب لڑکی والوں کی طرف سے پیشکش ہوتی ہے جبکہ لڑکے والے اس پیش کش کو قبول کرلیتے ہیں، یہ معاہدہ خود زوجین بھی سرانجام دے سکتے ہیں اور ان کے نمائندے بھی یہ کام کرسکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے کہا کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ میں تمہاری شادی فلاں عورت سے کرادوں؟ اس نے کہا ’’جی ہاں‘‘ پھر آپ ﷺ نے عورت سے کہا کیا تمہیں پسند ہے کہ میں تیری شادی فلاں مرد سے کرادوں تو اس نے بھی ہاں کہا، اس کے بعد آپ ﷺ نے ان دونوں کی شادی کرادی۔ [2]

پھر نکاح کے لیے مزید چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے، عورت کی رضامندی، سرپرست کی اجازت، حق مہر کا تعین اور گواہوں کی موجودگی، اگر مذکورارکان وواجبات اور شرائط نکاح کے موقع پر موجود ہوں تو نکاح صحیح ہے، بصورت دیگر نکاح درست نہیں ہوگا۔

---

[1] ٤/النساء: ٢٤۔ [2] ابوداود، النکاح: ١٩٢٤۔

فون یا انٹرنیٹ پر نکاح کی صورت میں اگر لڑکی والے اس بات کی شہادت دیں کہ واقعی وہی آدمی ہے جس سے ہم اپنی بیٹی کا نکاح کرنا چاہتے ہیں، تو نکاح خواں زوجین کا ایجاب وقبول گواہوں کی موجودگی میں کرا دیتا ہے تو اس قسم کا نکاح درست ہے۔ صرف اتنا ہوتا ہے کہ دولہا میاں خود موجود نہیں ہوتا لیکن اس کی آواز سنی جاتی ہے، جسے اس کے رشتہ دار اور لڑکی کے سرپرست، گواہ وغیرہ سب پہچانتے ہیں۔ اس قسم کے نکاح میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے بشرطیکہ مذکورہ بالا ارکان وشرائط موجود ہوں۔ (واللہ اعلم)

تین ماہ کی حاملہ کو طلاق دینے کے بعد رجوع کرنا

سوال ہمارے ایک عزیز نے اپنی بیوی کو طلاق دی جبکہ وہ تین ماہ کی حاملہ تھی، طلاق کے بعد والدین نے اسقاط حمل کرا دیا، اس کے بعد اسے دو دفعہ حیض بھی آ چکا ہے، اب دونوں میاں بیوی صلح کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیں۔

جواب مختلف حالات کے پیش نظر طلاق یافتہ بیوی کی عدت تین حیض یا وضع حمل یا نوے دن ہے۔ صورت مسؤلہ میں بیوی، طلاق کے وقت حمل سے تھی۔ جس کی عدت بچہ جنم دینے تک ہے لیکن اس کے والدین نے اس کا حمل گرا کر اپنے ذمے قتل ناحق کا جرم لیا ہے جو ہمارے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے، انہیں اس سنگین جرم پر اللہ سے معافی مانگنی چاہیے۔ ہم لوگ اپنی اولاد سے خیر خواہی کے جوش میں اللہ کی حدود کو فراموش کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک میاں بیوی اب بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن اس رجوع کے لیے تجدید نکاح کرنا ہوگا، جس کے لیے بیوی کی رضامندی، سرپرست کی اجازت، حق مہر کی از سر نو تعیین، گواہوں کی موجودگی بنیادی شرائط ہیں۔ ہم اسقاطِ حمل کو وضع حمل تو شمار نہیں کرتے تاہم طلاق ملنے کے بعد اسقاط حمل کی مدت کو عدت میں ضرور شمار کیا جائے جو کم از کم ایک ماہ سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے، اسقاط کے بعد اسے دو مرتبہ حیض بھی آ چکا ہے، اس طرح پہلی مدت اور دو حیض ملا کر وہ اپنی عدت ختم کر چکی ہے، عدت کے بعد نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے، ایسے حالات میں تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [1]

''اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں اپنے پہلے خاوندوں سے نکاح کرنے میں رکاوٹ نہ بنو، جبکہ وہ معروف طریقے سے آپس میں نکاح کرنے پر راضی ہوں۔''

ہمارے رجحان کے مطابق میاں بیوی رجوع کر سکتے ہیں لیکن یہ رجوع تجدید نکاح کے بغیر نہیں ہوگا، آئندہ اس قسم کے حالات نہ پیدا ہونے دیئے جائیں۔ نیز والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے رویے پر نظر ثانی کریں، اولاد سے محبت کرتے ہوئے اللہ کے غضب کو نہ دعوت دی جائے۔ اللہ ہمیں صالح عمل کرنے کی توفیق دے۔

---

[1] ٢/البقرۃ: ٢٣٢۔

خاوند سے خلع لینا

سوال ایک عورت اپنے خاوند سے خلع لیتی ہے، پھر رجوع کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہے، کیا خلع کے بعد رجوع ہوسکتا ہے نیز زندگی میں کتنی مرتبہ عورت کو خلع لینے کا حق ہے؟ طلاق کے لیے تو تین کی تحدید ہے، خلع کی تحدید بھی ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیں۔

جواب میاں بیوی کے لیے دو قسم کی علیحدگی ایسی ہے کہ وہ عام حالات میں دوبارہ ازدواجی زندگی گزارنے کے اہل نہیں رہتے، ایک تو وقفہ وقفہ سے تین طلاق دینا، اس صورت میں وہ صلح نہیں کرسکتے ہاں اگر تیسری طلاق کے بعد بیوی کسی دوسرے شخص سے اس کے گھر آباد ہونے کا ارادہ لے کر نکاح کرتی ہے پھر وہ فوت ہوجاتا ہے یا اسے طلاق دے دیتا ہے تو عدت گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے نکاح ہوسکتا ہے۔ دوسری علیحدگی جو لعان کے بعد عمل میں آئے تو ایسے میاں بیوی زندگی میں کبھی اکٹھے نہیں ہوسکتے، البتہ خلع کے بعد بیوی اگر موقف سے دستبردار ہوجاتی ہے تو نئے نکاح سے وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوسکتے ہیں، لیکن خلع کے بعد نکاح کرنے کی صورت میں پھر دوبارہ خلع کا پروگرام بنانا اللہ کی شریعت کو کھلونا بنانے کے مترادف ہے، ہمارے رجحان کے مطابق خلع بھی ایک قسم کی طلاق ہے بلکہ طلاق سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ کیونکہ ایک یا دو طلاق کے بعد دوران عدت تجدید نکاح کے بغیر رجوع کیا جاسکتا ہے، لیکن خلع کے بعد تو تجدید نکاح کے بغیر رجوع ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے عورت کو زیادہ سے زیادہ زندگی میں دو خلع لینے کا حق ہے جس کے بعد رجوع کیا جاسکتا ہے وہ بھی تجدید نکاح کے ساتھ لیکن تیسری دفعہ خلع لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے معاملہ ختم ہوجائے گا، اگرچہ قرون اولیٰ میں اس قسم کا کوئی واقعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا تاہم دیگر اشباہ ونظائر کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارا یہ رجحان ہے کہ طلاق کی طرح خلع کی تعداد بھی مقرر ہونی چاہیے جو زیادہ سے زیادہ تین ہے، تین دفعہ خلع لینے کے بعد معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ رضاعت

سوال میری آج سے پانچ سال قبل شادی اپنی خالہ زاد سے ہوئی تھی اور اب ہمارے دو بچے بھی ہیں۔ مجھے والدہ نے کئی مرتبہ بتایا کہ تیری نانی نے کئی مرتبہ تجھے دودھ پلایا تھا، اب میں پریشان ہوں کہ اگر رضاعت ثابت ہوجائے تو تعلقات کیسے ختم کیے جائیں اور بچوں کا کیا بنے گا؟ کتاب وسنت کی روشنی میں میری اس الجھن کو دور فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ شریعت اسلامیہ میں خونی تعلق کی بنا پر جو رشتے حرام ہیں دودھ پینے سے بھی وہ حرام ہوجاتے ہیں۔ خونی رشتہ کی وجہ سے حرام ہونے والوں میں بھانجی بھی شامل ہے، نانی کا دودھ پینے سے خالہ زاد بہن، رضاعی بھانجی بن جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''دودھ پینے سے وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو ولادت یعنی خون سے حرام ہوتے ہیں۔'' [1]

صورت مسئولہ میں اگر سائل نے واقعی اپنی نانی کا دودھ پیا ہے تو اس کی خالہ زاد بیوی رضاعی طور پر اس کی بھانجی بن جاتی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح: ٥٠٩٩۔

ہے،جس سے نکاح جائز نہیں، اس لیے فوراً اسے الگ کر دیا جائے اور بچے وغیرہ والدہ کے ہیں اور وہ اس کے پاس رہیں گے۔ البتہ والد سے بھی اس اولاد کے تعلقات استوار رہنے چاہئیں، اس قسم کا ایک واقعہ خود رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بھی پیش آیا تھا۔ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ام یحییٰ بنت اھاب سے شادی کر لی، شادی کے بعد ایک سیاہ فام عورت نے کہا کہ میں نے تم دونوں میاں بیوی کو دودھ پلایا ہے، میں نے اسے کہا کہ مجھے اس کا علم نہیں اور نہ تو نے پہلے ہمیں اس قسم کی خبر دی ہے۔ چنانچہ میں نے سواری لی اور فوراً مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اپنا ماجرہ بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب وہ عورت اس بات کا دعویٰ کرتی ہے تو اسے صحیح تسلیم کیا جائے، لہٰذا تم اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ، چنانچہ اس کے بعد میں نے مکہ آتے ہی اپنی بیوی کو چھوڑ دیا اور اس نے آگے نکاح کر لیا تھا۔ (1)

سوال میں ایک الجھن ضرور ہے کہ والدہ کو اگر اس بات کا علم تھا تو اس نے بوقت نکاح اس کا اظہار کیوں نہ کیا؟ لہٰذا اس بات کی اچھی طرح تحقیق کر لینی چاہیے یا پھر نانی اماں سے اس کی تصدیق کرا لی جائے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

وٹہ سٹہ کی شادی کرنا

سوال اسلام میں وٹہ سٹہ کی شادی کی کیا حیثیت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اسلام میں وٹہ سٹہ کی شادی ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اسلام میں نکاح شغار (وٹہ سٹہ) کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (2)

شغار کی تعریف یہ ہے کہ آپس میں یوں کہا جائے، تو اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے اس شرط پر کر دے کہ میں اپنی لڑکی تیرے نکاح میں دیتا ہوں، بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ اس شرط کے ساتھ ساتھ دونوں لڑکیوں کا کوئی الگ حق مہر مقرر نہ کیا جائے۔

واضح رہے کہ مہر ہونے یا نہ ہونے سے نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ نتائج وعواقب کے لحاظ سے دونوں صورتیں یکساں حکم رکھتی ہیں، اگر ایک لڑکی کا گھر برباد ہوتا ہے تو دوسری بھی ظلم وستم کا نشانہ بن جاتی ہے، قطع نظر کہ نکاح کے وقت ان کا الگ الگ مہر مقرر کیا گیا تھا یا نہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس طرح کے ایک نکاح کو باطل قرار دیا تھا، حالانکہ ان کے درمیان مہر بھی مقرر تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہی وہ شغار ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا تھا۔ (3)

ہمارے نزدیک اس قسم کے نکاح کی تین صورتیں ممکن ہیں:

1. نکاح کا معاملہ کرتے وقت ہی رشتہ لینے دینے کی شرط کر لی جائے۔ یہ صورت بالکل حرام اور ناجائز ہے۔
2. نکاح کے وقت شرط تو نہیں کی البتہ آثار وقرائن ایسے ہیں کہ شرط کا سا معاملہ ہے انجام کے لحاظ سے یہ بھی شغار ہے اور ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔
3. نکاح کے وقت شرط بھی نہیں اور نہ ہی آثار وقرائن شرط جیسے ہیں، اس صورت کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ تبادلہ نکاح محض اتفاقی ہے، اس طرح کے نکاح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں متعدد مرتبہ ہوئے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

---

(1) مقدمہ فتح الباری۔ (2) صحیح مسلم، کتاب النکاح: ٣٤٦٨۔ (3) ابو داود، کتاب النکاح، باب فی الشغار: ٢٠٧٥۔

بیوی پر ہمسایوں کے ہاں جانے پر پابندی لگانا

سوال اگر شوہر اپنی بیوی کو پڑوسی کے گھر جانے کے متعلق پابندی لگادے کہ تو نے ان کے گھر نہیں جانا ہے تو کیا ایسی پابندی شرعاً جائز ہے؟

جواب بیوی کے لیے اپنے شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نکلنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بیوی پر شوہر کا حق ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے، اگر وہ کسی وجہ سے پڑوسی کے گھر جانے پر پابندی عائد کرتا ہے تو شوہر کی اطاعت ضروری ہے، ہاں اگر شوہر نے واضح طور پر یا عرفی اجازت دی ہو تو اس کا گھر سے باہر جانا جائز ہے، عرفی اجازت کا مطلب یہ ہے کہ عورت کو یہ معلوم ہو اگر وہ کسی پڑوسی کے گھر جائے گی تو خاوند اسے نہیں روکے گا، ہاں اگر کوئی شرعی مجبوری ہو تو بیوی کو گھر سے نکلنے کی اجازت ہے، بہرحال اگر شوہر اپنی بیوی کو اپنے کسی پڑوسی کے گھر جانے سے روکتا ہے تو اس کی بات کو مانا جائے بلاوجہ وہاں جانے پر اصرار نہ کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

شب زفاف کے راز کھولنا

سوال ہمارے ہاں یہ ایک معاشرتی عیب ہے کہ شادی کی پہلی رات کی روئیداد دوستوں کو بتائی جاتی ہے اور دوست بھی اسے مجبور کرتے ہیں، بعض عورتیں بھی اپنی سہیلیوں کو اس طرح کی باتیں بتاتی ہیں، شریعت میں اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ وضاحت کریں۔

جواب بلاشبہ ہمارے معاشرہ میں یہ بیماری ہے کہ مرد اور عورتیں اپنے گھر اور ازدواجی زندگی کی باتیں اپنے دوستوں اور سہیلیوں کو بتاتے ہیں، یہ ایک حرام کام ہے کسی بھی مرد یا عورت کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر کے راز یا ازدواجی تعلقات کی کیفیت کسی انسان کے سامنے ظاہر کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ﴾ [1]

''فرمانبردار عورتیں، خاوند کی عدم موجودگی میں بہ حفاظت الٰہی نگہداشت رکھنے والیاں ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''بے شک قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقام اور مرتبے کے اعتبار سے بدترین وہ شخص ہوگا جو اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کرتا ہے اور وہ بھی اس سے لطف اندوز ہوتی ہے پھر وہ شخص اس عورت کا راز لوگوں میں پھیلاتا ہے۔'' [2]

لہٰذا یہ بہت قبیح حرکت ہے کہ انسان ایسی راز کی باتیں دوستوں کو بتائے یا کوئی عورت شب زفاف کے راز اپنی سہیلیوں کے ہاں کھولے، اس سے اجتناب کرنا انتہائی ضروری ہے۔

دوسری شادی کے لیے بیوی سے اجازت لینا

سوال کیا دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

---

[1] ٤/النساء: ٣٤۔ [2] صحیح مسلم، النکاح: ١٤٣٧۔

جواب شرعی طور پر دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی خاوند پر فرض ہے کہ وہ جب دوسری شادی کرنا چاہے تو پہلی بیوی کو راضی کرے، ہمارے معاشرہ میں ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ اچھے اخلاق اور حسن معاشرت کا تقاضا ہے کہ خاوند دوسری شادی کرنے سے پہلے اپنی پہلی بیوی کو اعتماد میں لے اور اسے کسی بھی جائز طریقہ سے راضی کرنے کی کوشش کرے تاکہ اس کے بعد حالات کشیدہ نہ ہوں، کیونکہ ہمارے ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو اعتماد میں نہیں لیا جاتا جبکہ چوری چھپے یہ ''فریضہ'' ادا کر لیا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں جب راز کھلتا ہے تو پہلی بیوی سے تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ حفظ ماتقدم کے طور پر پہلی بیوی کو اعتماد میں لے لیا جائے۔ (واللہ اعلم)

اخراجات کے متعلق خاوند کی ذمہ داری

سوال میرا خاوند مالدار ہونے کے باوجود گھریلو اخراجات کے سلسلہ میں کنجوس واقع ہوا ہے، کیا میرے لیے جائز ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر میں گھریلو اخراجات کے لیے اتنی رقم لے لوں جس سے گھر کا نظام بآسانی چل سکے؟ شریعت میں اس کی کہاں تک اجازت ہے؟

جواب بیوی اور اولاد کا خرچہ خاوند کے ذمے ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ﴾ [1]

''کشادگی والے کو اپنی کشادگی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے اور جس پر رزق تنگ کیا گیا ہو اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے دے رکھا ہے اس میں سے دے، اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔''

نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ تم پر معروف طریقہ کے مطابق ان عورتوں کو کھلانا پلانا اور لباس مہیا کرنا لازم ہے۔ [2]

بہرحال شریعت نے خاوند پر خرچہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے، جتنی ضرورت ہو اور جتنا ان کو کفایت کر جائے اتنا خرچہ دینا واجب ہے، لیکن اگر کوئی خاوند اس خرچہ سے پہلوتہی کرتا ہے یا دیتا تو ہے لیکن اس سے گھر کا نظام نہیں چلتا تو اتنا خرچہ کسی طریقہ سے بھی لیا جا سکتا ہے جو اہل خانہ کے لیے کافی ہو جیسا کہ حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے جو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ابوسفیان ایک کنجوس آدمی ہے، مجھے وہ اتنا خرچہ نہیں دیتا جو میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے کافی ہو، مگر میں خفیہ طریقے سے کچھ لے لیتی ہوں کیا ایسا کرنے سے مجھے گناہ نہیں ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''معروف طریقہ سے اتنا مال لے لیا کرو جو تمہیں اور تمہارے بچوں کو کافی ہو جائے۔'' [3]

اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل کا پتہ چلتا ہے:

---

[1] ٦٥/الطلاق: ٧۔ [2] صحیح مسلم، الحج: ١٢١٨۔ [3] صحیح بخاری، البیوع: ٢٢١١۔

❶ بیوی کے خرچہ کی مقدار متعین نہیں ہے اور نہ اولاد کے لیے کچھ مقرر ہے، دونوں اخراجات معروف طریقہ سے ادا کیے جائیں۔

❷ اگر شوہر اور والد اپنے اوپر واجب خرچہ ادا نہ کریں تو بیوی اور اولاد کو اتنا خرچہ لینے کی اجازت ہے جو انہیں کافی ہو۔

❸ واجب حقوق میں جس کی مقدار اللہ اور اس کے رسول نے مقرر نہیں کی، اس میں عرف کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

صورت مسئولہ میں سائلہ کو خاوند کے مال سے معروف طریقہ کے مطابق اتنا لینے کی اجازت ہے جس سے گھر کا نظام چل سکے، لیکن ضروریات کی آڑ میں فضولیات کا دروازہ نہ کھولا جائے اور فیشن پرستی اور فضول خرچی کی گنجائش اس حدیث سے پیدا نہیں ہوتی۔ اگرچہ خرچہ کی مقدار مقرر نہیں ہے کیونکہ مقدار مقرر کرنا ظلم کے مترادف ہے بہرحال جتنی ضرورت ہو اور اس قدر کفایت کی جائے خاوند کے مال سے اجازت کے بغیر لینے کی شرعاً گنجائش ہے۔ (واللہ اعلم)

مطلقہ کا نکاح ثانی کرنا

سوال میرے خاوند نے عرصہ دو سال سے مجھے طلاق دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دیا ہے، اب میرا اللہ کے علاوہ اور کوئی سہارا نہیں ہے، میں زندگی گزارنے کے لیے کسی سہارے کی تلاش میں ہوں، کیا شریعت کی رو سے مجھے نکاح ثانی کرنے کی اجازت ہے؟ ازراہ کرم اس سلسلہ میں میری راہنمائی فرمائیں۔

جواب جس عورت کو طلاق دی جاتی ہے دوران عدت خاوند کو اس سے رجوع کرنے کا پورا پورا حق ہوتا ہے، عدت گزارنے کے بعد عورت آزاد ہے، شریعت نے اسے نکاح ثانی کرنے کی اجازت دی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾[1]

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں دوسرے شوہروں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو جبکہ وہ آپس میں معروف طریقہ کے مطابق رضامند ہوں۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے اور عورت عدت گزارنے کے بعد کہیں دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو اس کے سابقہ شوہر کو ایسی گھٹیا حرکت اور کمینگی نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں رکاوٹ بنے اور یہ کوشش کرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے اسے کوئی دوسرا اپنے نکاح میں لانا پسند نہ کرے، کیونکہ دوسری جگہ نکاح کرنا عورت کا حق ہے، سابق شوہر کو اس حق میں حائل ہونے کی شرعاً اجازت نہیں ہے لیکن نکاح ثانی کے لیے چند چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

☆ اپنے سرپرست کی اجازت انتہائی ضروری ہے اس کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔

☆ حق مہر اور گواہوں کی موجودگی بھی لازمی ہے۔

☆ اس نکاح کو خفیہ نہ رکھا جائے بلکہ جہاں عورت رہائش پذیر ہے اس کے قرب و جوار میں رہنے والوں کو اس نکاح کا علم ہونا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں سائلہ کو مذکورہ شرائط ملحوظ رکھتے ہوئے نکاح ثانی کرنے کی اجازت ہے شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ٢/البقرة: ٢٣٢۔

رضاعی بہن بھائیوں کا نکاح کرنا

سوال ہسپتال میں دوعورتوں نے بچے جنم دیئے، ایک کے ہاں لڑکی اور دوسری کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، جب وہ شادی کے قابل ہوئے تو ان کی آپس میں شادی کرنا طے پایا، لیکن پتہ چلا کہ پیدائش کے دن غلطی سے ایک کا بچہ دوسری کو مل گیا اور ان دونوں نے انہیں دودھ پلایا اور ان کی پرورش کی، اب کیا ان کا آپس میں نکاح ہوسکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے۔

جواب ہسپتال میں بچوں کی بایں طور پر تبدیلی ممکن ہے لیکن شادی کا پروگرام طے کرتے وقت اس کا اچانک انکشاف عجیب سا معلوم ہوتا ہے بہرحال اگر یہ کوئی فرضی صورت نہیں ہے تو ایسے جوڑے کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا کیونکہ قرآن کریم کی صراحت کے مطابق بچے کی ماں وہ ہے جس نے اسے جنم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ﴾ [1]

''ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا ہے۔''

اس آیت کے پیش نظر جس عورت نے بچے کو جنم دیا ہے وہ اس کی حقیقی ماں ہے، پھر غلطی سے تبادلے کے بعد جس عورت کا اس نے دودھ پیا ہے وہ اس کی رضاعی ماں ہے، اسی طرح بچی کا معاملہ ہے، بہرحال یہ دونوں ایک دوسرے کے رضاعی بہن بھائی ہیں، انہیں کسی صورت میں رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ دودھ پینے سے وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو خونی رشتے حرام ہوتے ہیں، جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت ہے۔ [2]

نکاح میں گواہ لانا

سوال اسلام میں نکاح کے وقت گواہوں کی کیا حیثیت ہے۔ کیا گواہوں کے بغیر نکاح صحیح ہے؟ اگر ہوسکتا تو عورت کے انکار اور سرپرست کے دھوکہ سے غلط بیانی کا سدباب کیا ہے؟

جواب نکاح کے وقت جس طرح سرپرست کی اجازت اور عورت کی رضامندی ضروری ہے، اسی طرح اظہار رضامندی کے وقت کم ازکم دوگواہوں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ آئندہ اگر کوئی تنازعہ کھڑا ہو تو دونوں گواہ اپنا کردار ادا کرسکیں، حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سرپرست اور دوگواہوں کی بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ [3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے ''دو دیانت دار گواہ'' کے الفاظ ہیں۔ [4]

گواہوں میں عدالت بھی شرط ہے کہ وہ اچھے کردار کے حامل اور بہترین اخلاق سے متصف ہوں، اسی طرح سرپرست کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکی کے لیے خیرخواہی کے جذبات رکھنے والا ہو جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دوعادل گواہ

---

[1] ۵۸/المجادلہ:۲۔ [2] صحیح بخاری، النکاح: ۵۰۹۹۔

[3] دارقطنی، ص: ۲۲۵، ج۲۔ [4] بیھقی، ص: ۱۲۵، ج۷۔

اور خیر خواہ سر پرست کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ ❶

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے موقوف صحیح قرار دیا ہے۔ ❷

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک معاملہ لایا گیا جس میں نکاح کے وقت صرف ایک مرد اور ایک عورت گواہ تھے تو انہوں نے فرمایا یہ خفیہ نکاح ہے، میں اسے جائز نہیں قرار دے سکتا۔ اگر میں وہاں شریک ہوتا تو انہیں رجم کی سزا دیتا۔ ❸

اگر کوئی غلط بیانی کرتا ہے تو عورت کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے۔ بہر حال ہمارے نزدیک نکاح کے وقت کم از کم دو عادل اور امانت دار گواہوں کا ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے۔

خاوند کے گھر جہیز بھیجنا

سوال ہمارے ملکی رواج کے مطابق شادی کے موقع پر گھریلو سامان عورت کے ورثا تیار کر کے خاوند کے گھر روانہ کرتے ہیں، اگر نہ دیا جائے تو بیوی سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ حق مہر کی رقم سے اسے تیار کرائے یا اپنے سر پرستوں پر زور ڈالے کہ وہ اسے تیار کر کے فراہم کریں، کیا عورت پر یا اس کے سر پرست پر واجب ہے کہ وہ گھریلو سامان تیار کر کے خاوند کو دے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب شرعی طور پر گھر کا سامان شوہر پر واجب ہے، یعنی شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لیے رہائش کا انتظام کرے اور اس گھر میں ہر قسم کی ضرورت کا سامان مثلاً برتن، بستر اور فرنیچر وغیرہ فراہم کرے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ﴾ ❹

''کشادگی والے کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے، اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے دے رکھا ہے اس میں سے حسب توفیق خرچ کرے اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

رہائش کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ﴾ ❺

''جہاں تم خود رہتے ہو وہاں اپنی بیوی کو بھی رہائش دو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''تم پر معروف طریقہ سے ان عورتوں کو کھلانا پلانا، اور انہیں لباس مہیا کرنا لازم ہے۔'' ❻

پیش کردہ قرآنی آیات اور حدیث کا تقاضا ہے کہ گھر اور اس کی جملہ ضروریات فراہم کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے، بیوی یا اس

---

❶ مسند احمد، ص: ۲۵۰، ج ۱۔ ❷ ارواء الغليل، ص: ۲۳۹، ج ٦۔ ❸ مؤطا امام مالك، ص: ۵۳۵، ج ۲۔
❹ ٦۵/الطلاق: ۷۔ ❺ ٦۵/الطلاق: ٦۔ ❻ صحيح مسلم، الحج: ۱۲۱۸۔

کے سرپرست کے لیے گھر کی تیاری یا گھریلو سامان خریدنا واجب نہیں ہے، کیونکہ قرآن وحدیث میں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی کہ لڑکی کے والدین گھر کا ساز وسامان خرید کر خاوند کے حوالے کریں، اس سلسلہ میں کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ لڑکی کو یا اس کے والدین کو اس کام کے لیے مجبور کرے یا شادی کے بعد لڑکی پر سامان کی فراہمی کے لیے کوئی دباؤ ڈالے، ہاں اگر کوئی اس دباؤ سے آزاد ہو کر گھر کا سامان بنا کر دیتا ہے تو یہ اس کی طرف سے صدقہ ہوگا، اگر نیت خالص ہے تو اس صدقہ پر ثواب کی امید بھی کی جا سکتی ہے، نیز واضح رہے کہ حق مہر خاص بیوی کا حق ہے، وہ جہاں چاہے اور جیسے چاہے اسے خرچ کرنے کی مجاز ہے، اسے معاف کر دینے یا گھریلو سامان خریدنے کے لیے مجبور کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اگر اس کی رضامندی سے استعمال کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا ۝﴾ [1]

''اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے مزے سے کھا پی سکتے ہو۔''

بہر حال ہمارے ہاں لڑکی کی طرف سے گھریلو سامان فراہم کرنے کی رسمِ جہیز اصلاح طلب ہے۔ (واللہ اعلم)

نشئی کی طلاق

سوال ایک آدمی نے شراب کے نشہ میں مدہوش اپنی بیوی کو طلاق دے دی، جب اسے ہوش آیا تو اسے بتایا گیا کہ تو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو اس نے سرا سر انکار کر دیا کہ مجھے اس کا علم نہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ نشہ اور بیماری کی مدہوشی میں طلاق ہو جاتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب طلاق کے لیے ضروری ہے کہ خاوند طلاق دیتے وقت خود مختار، مکلف اور کامل ہوش وحواس میں ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلاق اور آزادی اغلاق میں نہیں ہوتی۔ [2]

محدثین نے اغلاق کے دو مفہوم بیان کیے ہیں۔

1. زبردستی لی جانے والی طلاق واقع نہیں ہوتی۔
2. شدید غصے اور سخت نشہ میں جب انسان کی عقل پر پردہ پڑ جائے تو ایسی صورت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حالت نشہ میں موجود انسان اور مجبور شخص کی طلاق جائز نہیں ہے۔ ایسی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ [3]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ پاگل اور بحالت نشہ کی طلاق نہیں ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک ایسا آدمی لایا گیا جس نے نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دی تھی، انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسے شراب کی حد لگائی جائے اور اس کی بیوی کو الگ کر دیا جائے، ان سے حضرت ابان بن عثمان نے بیان کیا کہ حضرت

---

[1] ٤/النساء:٤۔ [2] ابوداود، الطلاق: ٢١٩٣۔

[3] صحیح بخاری، الطلاق، باب نمبر ١٠۔

عثمان رضی اللہ عنہ کے نزدیک مجنون اورنشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔اس کے بعد آپ نے صرف حد لگائی لیکن اس کی بیوی کو اس سے الگ نہ کیا کیونکہ اس حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ [1]

ہمارے نزدیک نشہ کی حالت میں عقل ماؤف ہونے کے اعتبار سے دیوانگی کی ہی ایک قسم ہے،جنون کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تین آدمی مرفوع القلم ہیں،ایک سونے والا حتیٰ کہ بیدار ہوجائے دوسرا بچہ حتیٰ کہ وہ بالغ ہوجائے تیسرا پاگل حتیٰ کہ عقل مند ہوجائے۔" [2]

اس بنا پر نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی لیکن اس بات کا بغور جائزہ لینا ہوگا کہ نشے کی حالت میں جب طلاق دی گئی تھی تو اس وقت نشہ ابتدائی مرحلہ میں تھا یا پورے عروج پر تھا،اگر ابتدائی مرحلہ ہے کہ نشہ کرنے والے کا عقل وشعور پوری طرح ختم نہیں ہوا بلکہ اسے طلاق دینے کا علم تھا تو ایسی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر نشہ کرنے والا ایسی حالت میں ہے کہ اسے عقل وشعور نہیں بلکہ اسے طلاق دینے کا قطعاً علم نہیں تو ایسی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوگی،کیونکہ طلاق دھندہ کی عقل ماؤف ہوچکی ہے جبکہ طلاق کے مؤثر ہونے کے لیے بقائم ہوش وحواس ہونا ضروری ہے۔(واللہ اعلم)

بذریعہ عدالت خلع لینے کے بعد دوبارہ نکاح کرنا

سوال ہندہ کی شادی زید سے ہوئی،دوسال بعد ان میں اختلاف پیدا ہوگئے اور ہندہ نے زید سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا اور اپنی مرضی سے بذریعہ عدالت خلع لے لیا،اب ہندہ دوبارہ زید کے ہاں آباد ہونا چاہتی ہے کیا کتاب وسنت کی رو سے ایسا ممکن ہے؟

جواب عائلی زندگی میں شرعی طور پر طلاق دینا خاوند کا حق ہے لیکن اگر میاں بیوی کے تعلقات اس حد تک کشیدہ ہو جائیں کہ باہمی اتفاق کی کوئی صورت نہ رہے اور شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو ایسے حالات میں اسلام نے عورت کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو کچھ دے دلا کر اس سے خلاصی حاصل کرے،اسے شریعت میں خلع کہتے ہیں،اس کے لیے شرط یہ ہے کہ میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں حدود اللہ کے پامال ہونے کا اندیشہ ہو،اس وضاحت کے بعد دین اسلام میں میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات ختم ہونے پر دوصورتیں ایسی ہیں کہ وہ عام حالات میں اکٹھے نہیں ہوسکتے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ جب خاوند اپنی زندگی میں وقفے وقفے کے بعد تین طلاقیں دے ڈالے تو ہمیشہ کے لیے مطلقہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے لیے حرام ہوجاتی ہے البتہ تحلیل شرعی کے بعد اکٹھا ہونے کی گنجائش ہے واضح رہے کہ تحلیل شرعی مروجہ حلالہ نہیں کیونکہ ایسا کرنا حرام اور باعث لعنت ہے۔

☆ لعان کے بعد جو جدائی عمل میں آتی ہے وہ آیندہ زندگی میں باہمی نکاح کرنے کے لیے رکاوٹ کا باعث ہے،کسی بھی صورت میں ان کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا جیسا کہ حدیث میں ہے۔ان دوصورتوں کے علاوہ کوئی ایسی صورت نہیں کہ دائرہ اسلام میں

---

[1] بیہقی، ص: ۳۵۹، ج۷۔ [2] نسائی، الطلاق: ۳۴۳۲۔

رہتے ہوئے ازدواجی تعلقات ختم ہونے پر دوبارہ میاں بیوی کا نکاح نہ ہوسکتا ہو۔صورت مسئولہ میں یہاں بیوی کی علیحدگی بذریعہ خلع عمل میں آئی ہے لہٰذا اگر عورت اپنے مؤقف سے دستبردار ہوکر دوبارہ اپنے سابقہ خاوند کے ہاں آباد ہونے کی خواہش مند ہے تو شرعی نکاح کرنے کے بعد ازدواجی زندگی گزارنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے البتہ نکاح جدید میں ان تمام شرائط کو ملحوظ رکھنا ہوگا جو نکاح کے لیے ضروری ہے۔ (واللہ اعلم)

مطلقہ بیوی کا ایک ہفتہ بعد عقد ثانی کرنا

سوال ایک عورت نکاح کے بعد اپنے خاوند کے پاس صرف دو ماہ رہی، اس دوران خاوند اس کے قریب تک نہیں گیا، پھر اس نے طلاق دے دی، مطلقہ بیوی نے ایک ہفتہ بعد عقد ثانی کر لیا، کیا ایسا کرنا درست ہے؟ جس عالم دین نے نکاح پڑھایا اس نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ،قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت کریں۔

جواب ہمارے ہاں عام طور پر یہ رواج ہے کہ نکاح کے ساتھ ہی رخصتی ہوجاتی ہے اور اسے شادی کہتے ہیں،تاہم یہ بھی ہوتا ہے کہ پہلے نکاح کر دیا جاتا ہے مثلاً بچپن میں نکاح کر دیا اور رخصتی یا شادی کچھ مدت کے بعد یا زوجین کے جوان ہونے کے بعد ہوتی ہے،عرب میں یہ عام رواج تھا کہ نکاح پہلے ہوجاتا تھا اور رخصتی بعد میں ہوتی تھی،رخصتی سے قبل طلاق کی صورت میں عورت پر کوئی عدت وغیرہ کی پابندی نہیں ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر تم چھونے سے پیشتر طلاق دے دو تو تمہارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں ہے جس کے پورا ہونے کا تم ان سے مطالبہ کرو۔'' [1]

صحبت سے پہلے طلاق دینے میں چونکہ حمل وغیرہ کا احتمال نہیں ہوتا لہٰذا غیر مدخولہ عورت پر کوئی عدت نہیں اگر وہ چاہے تو طلاق کے فوراً بعد نکاح کرسکتی ہے۔صورت مسئولہ کچھ اس طرح ہے کہ رخصتی عمل میں آچکی ہے اور بیوی اپنے خاوند کے پاس دو ماہ رہی ہے اگرچہ اس دوران خاوند اس کے قریب نہیں گیا اور اس نے طلاق دے دی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس صورت میں خلوت صحیحہ کو صحبت کے مترادف قرار دیا جائے اور بیوی کو عقد ثانی کے لیے عدت کے ایام پورے کرنا ہوں گے یا خلوتِ صحیحہ کو صحبت کے مترادف نہیں خیال کیا جائے گا اور وہ رخصتی عمل میں آنے کے باوجود اس پر عدت وغیرہ گزارنے کی پابند نہیں ہوگی۔ہمارے رجحان کے مطابق ایسی عورت کو عدت گزارنا ہوگی اور اسے مدخولہ کا حکم دیا جائے گا،اگرچہ اس دوران شوہر نے اس سے مباشرت نہ کی ہو، کیونکہ فقہاء نے بر سبیل احتیاط یہ حکم لگایا ہے کہ اگر خلوتِ صحیحہ عمل میں آجائے جس میں مباشرت ممکن ہو اور وہاں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو اس کے بعد طلاق دینے کی صورت میں عدت لازم آئے گی اور سقوط عدت صرف اس حالت میں ہوگا جبکہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی گئی ہو،چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اگر عقد صحیح کے بعد خلوت عمل میں آجائے تو مہر پورا دینا ہوگا اور عورت پر عدت گزارنا بھی ضروری ہے اگرچہ اس سے مباشرت نہ کی ہو۔خلفاء راشدین، حضرت زید اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایسا ہی مروی ہے نیز علی بن حسین،عروہ،عطاء،زہری،اوزاعی،امام اسحاق اور اہل رائے کا بھی یہی موقف ہے۔ [2]

---

[1] ۳۳/الاحزاب:۴۹۔ [2] مغنی، ص:۵۹، ج۱۰۔

حضرت زرارہ بن اوفی سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ خلفاء راشدین کا یہ فیصلہ ہے کہ نکاح کے بعد جب میاں بیوی اکٹھے ہوجائیں، پردے لٹکا کر دروازے بند کر دیئے جائیں تو اس سے مہر واجب ہوجاتا ہے اور عورت پر عدت گزارنا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ ❶

حضرت عمر، حضرت علی، حضرت سعید بن مسیب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے بھی یہی ثابت ہے کہ عورت پر عدت گزارنا ضروری ہے اور اسے حق مہر بھی پوا پورا ملے گا۔ ❷

عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ایسی حالت میں عورت کو مدخولہ ہی قرار دیا جائے کیونکہ مدخولہ قرار دینے میں میاں بیوی دونوں کا مفاد وابستہ ہے اس لیے ممکن ہے کہ وہ خلاف واقعہ بیان بازی کریں، ایسا کرنے سے شوہر کو نصف مہر سے اور بیوی کو عدت گزارنے سے چھوٹ مل سکتی ہے، اس بنا پر احتیاط اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ خلوت صحیحہ کے بعد اسے مدخولہ ہی قرار دیا جائے اور اس پر عدت گزارنے کی پابندی عائد کی جائے۔ صورت مسئولہ میں طلاق کے ایک ہفتے بعد عقد ثانی درست نہیں بلکہ فوراً تفریق کرنے کے بعد تجدید نکاح کی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ (واللہ اعلم)

خلع کی عدت

سوال ہم نے اپنی بیٹی کا خلع بذریعہ عدالت لیا، جبکہ عدالت کے کہنے پر اس کے خاوند نے عدالت میں طلاق نامہ بھی جمع کرا دیا، اب بیٹی کو کون سی عدت گزارنا ہوگا؟

جواب خلع، عورت کے مطالبہ پر ہوتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں۔

بیوی خاوند گھر میں اس امر پر اتفاق کرلیں کہ بیوی اپنے خاوند کو طے شدہ حق مہر واپس کر دے اور خاوند اس معاملے کے مطابق اسے طلاق دے دے۔

اگر خاوند اسے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو عورت کو بذریعہ عدالت خلع لینے کا حق ہے اس کی پھر دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ عدالت، خاوند کو طلاق دینے کا نوٹس جاری کرے گی۔ اگر وہ طلاق دے دے تو اس بنیاد پر عدالت تنسیخ کی ڈگری جاری کرنے کی مجاز ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ عدالت کے کہنے پر خاوند طلاق نہیں دیتا، بار بار یاد دہانی کے باوجود اس پر کان نہیں دھرتا تو ایسے حالات میں عدالت کو اختیار ہے کہ وہ تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کر دے، عدالت کے فیصلے کے بعد عورت صرف ایک حیض آنے کے بعد آگے نکاح کرنے کی مجاز ہے۔ صورت مسئولہ میں لڑکی کے والد نے اپنی بیٹی کی طرف سے عدالت کی طرف رجوع کیا تاکہ خلع کا فیصلہ لیا جائے، عدالت کے کہنے پر خاوند نے عدالت میں طلاق نامہ جمع کرا دیا۔ چونکہ یہ طلاق، خلع کی بنیاد پر دی گئی ہے اس لیے اس کی عدت ایک حیض ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جب ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ان سے خلع لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ ایک حیض عدت گزارے۔ ❸

---

❶ مصنف ابن ابی شیبہ، ص: ۲۳۵، ج ۴۔ ❷ بیہقی، ص: ۲۵۵،۷۔ ❸ ابو داود، الطلاق: ۲۲۲۹۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ خلع یافتہ عورت کی عدت ایک حیض ہے۔ [1]

اس بنا پر صورت مسئولہ میں عورت کو صرف ایک حیض عدت گزارنا ہے۔ (واللہ اعلم)

زیر تعلیم لڑکی کی عدت

سوال ایک لڑکی کا خاوند کسی حادثہ میں فوت ہوگیا جب کہ وہ لڑکی کالج میں زیر تعلیم ہے، اس بنا پر اس نے چار ماہ دس دن عدت گزارنی ہے، ایسے حالات میں کیا وہ تعلیم جاری رکھ سکتی ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب جس عورت کا خاوند فوت ہوگیا ہو، اس کے لیے اسی گھر میں عدت گزارنا ضروری ہے جہاں اس کا خاوند رہائش پذیر تھا، وہ عورت اسی گھر میں سوئے، اس دوران اسے زیب وزینت کی اشیاء استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ خوشبو لگانا، سرمہ استعمال کرنا، خوبصورت کپڑے زیب تن کرنا، البتہ دوران عدت وہ کسی ضرورت کے پیش نظر گھر سے باہر جاسکتی ہے مثلاً وہ کسی ادارہ میں ملازم ہے اور ادارہ کی طرف سے اسے چھٹی نہیں مل سکی تو ملازمت کے لیے ادارہ آنا جانا جائز ہے بشرطیکہ رات کو اپنے گھر آجائے۔ اسی طرح کسی طالبہ کا حصول تعلیم کے لیے کالج یا فہم مسائل کے لیے مدرسہ جانا بھی جائز ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے ان تمام چیزوں سے پرہیز کرنا ہوگا جن سے سوگ منانے والی عورتیں اجتناب کرتی ہیں۔ (واللہ اعلم)

خاوند کا بیوی پر نکاح نہ کرنے کی شرط لگانا

سوال ایک شوہر نے اپنی بیوی کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ اگر وہ پہلے فوت ہوگیا تو وہ دوسری شادی نہیں کرے گی، اب وہ خاوند فوت ہوچکا ہے۔ کیا وہ عورت اپنے خاوند کے عہد کی پاسداری کرے یا شرعاً وہ نکاح کرسکتی ہے؟

جواب خاوند کی وفات کے بعد صرف امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے لیے پابندی تھی کہ وہ کسی اور سے شادی نہیں کرسکتی تھیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا۝۵۳﴾ [2]

''نہ تمہیں یہ جائز ہے کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف دو اور نہ تمہارے لیے یہ حلال ہے کہ آپ کے بعد کسی وقت آپ کی بیویوں سے نکاح کرو، اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے بعد کسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بلاوجہ اپنے آپ کو عقد ثانی سے باز رکھے اگرچہ عقد ثانی اس کے لیے واجب یا ضروری بھی نہیں ہے لیکن اس طرح کے عہد وپیمان کی پاسداری بھی ضروری نہیں ہے، حدیث میں ہے:

''اطاعت صرف نیکی کے کام میں ہے۔'' [3]

ہاں اگر کسی عورت کی اپنے خاوند سے بہت محبت تھی اور وہ جنت میں بھی اس کی رفاقت چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ اس کی

---

[1] ابوداود، الطلاق: ۲۲۳۰۔ [2] ۳۳/الاحزاب: ۵۳۔ [3] مسند امام احمد، ص: ۱۲٤، ج۱۔

وفات کے بعد کسی دوسرے خاوند سے شادی نہ کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''عورت (جنت میں) اپنے آخری شوہر کی بیوی ہوگی۔'' ❶

چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے فرمایا تھا اگر تم چاہتی ہو کہ جنت میں میری بیوی بنو تو میرے بعد کسی اور سے شادی نہ کرنا، عورت جنت میں اپنے آخری دنیوی خاوند کی بیوی ہوگی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات پر آپ ﷺ کے بعد نکاح ممنوع قرار دیا تھا۔ ❷

بہرحال عورت اس طرح کے عہد و پیمان کی پابند نہیں ہے اگر چاہے تو عقد ثانی کر سکتی ہے اور اگر اپنے خاوند کی جنت میں بیوی رہنا پسند کرتی ہے تو عقد ثانی نہ کرے، اس جذبہ کے تحت عہد و پیمان کی پاسداری کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

کسی معاہدے کے تحت مطلقہ بیوی سے تعلقات رکھنا

سوال میرے ایک دوست نے اپنی بیوی کو ایک معاہدے کے تحت طلاق دی ہے کہ وہ اس کے بچوں کی پرورش کرتی رہے، اسے پرورش اور اس پر محنت کا خرچہ ملتا رہے گا، سابقہ خاوند ہر مہینے اس کے پاس خرچہ دینے کے لیے جاتا ہے اور وہاں رات بھی گزارتا ہے، کیا شریعت میں اس امر کی گنجائش ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اس سے تعلقات رکھے؟

جواب آدمی جب اپنی بیوی کو کسی وجہ سے طلاق دیتا ہے تو وہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد دوران عدت اس کی بیوی ہی شمار ہوتی ہے، اس دوران اگر کسی کی وفات ہو جائے تو ان کے مابین تقسیم وراثت کا معاملہ قائم رہتا ہے اور جب عدت ختم ہو جائے تو نکاح ختم ہو جاتا ہے اور وہ بیوی اس خاوند کے لیے ایک اجنبی عورت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ عدت گزارنے کے بعد خاوند کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس سے میل ملاپ یا تعلقات رکھے، اگر تیسری طلاق بھی دے ڈالی ہے تو پھر طلاق دیتے ہی رشتہ زوجیت ختم ہو جاتا ہے، اب مطلقہ عورت کا اپنے سابقہ خاوند سے اتنا ہی تعلق ہوگا جتنا ایک اجنبی شخص سے ہوتا ہے۔ اولاد کی پرورش کے بہانے ان کا ایک دوسرے کو دیکھنا، خلوت کرنا یا وہاں رات گزارنا جائز نہیں ہے، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: تین طلاق والی عورت اپنے سابقہ خاوند کے لیے باقی اجنبی عورتوں کی طرح ہے، اس بنا پر مرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کے ساتھ خلوت کرے کیونکہ وہ کسی بھی اجنبی عورت کے ساتھ خلوت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس کے لیے اسے دیکھنا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے لیے اب اجنبی بن چکی ہے نیز اس خاوند کو اب کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ❸

اولاد کی پرورش اور اس کے لیے خرچہ بھیجنے کی اور بہت سی صورتیں ممکن ہیں، وہ خرچہ بذریعہ ڈاک بھی روانہ کیا جا سکتا ہے، کسی محرم کے ذریعے بھی دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال عدت کے بعد خاوند کا اپنی سابقہ بیوی کے پاس آنا جانا شرعاً درست نہیں ہے کیونکہ وہ عورت اس کی بیوی نہیں رہی بلکہ ایک اجنبی عورت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ احادیث صحیحہ، رقم: ۱۲۸۱۔ ❷ بیہقی، ص: ۶۹، ج ۷۔

❸ مجموع الفتاویٰ، ص: ۳۴۹، ج ۳۔

مشروط طلاق

سوال ہمارے گھر میں بیوی خاوند کے درمیان جھگڑا رہتا ہے، ایک دفعہ خاوند نے غصے میں آ کر کہہ دیا کہ اگر تم اس طرح کرتی رہی تو پھر ہمارا گزارا مشکل ہے، وہ ایک دو مرتبہ گھر چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا، دوسری بار جب گھر سے گیا تو اس کی طرف سے ہمیں ایک خط موصول ہوا جس میں گھر واپس آنے کی کچھ شرائط درج تھیں، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر تم نے ان شرائط پر عمل نہ کیا تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ ایسے حالات میں اس کا گھر چھوڑ دینا اور یہ کہنا کہ اگر تم نے ان شرائط پر عمل نہ کیا تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا یا یہ کہنا کہ اگر تم اس طرح کرتی رہی تو پھر ہمارا گزارا مشکل ہے، اس طرح کی گفتگو اور طرز عمل سے طلاق ہو جاتی ہے؟

جواب طلاق کی صرف نیت کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، جب تک عملی طور پر طلاق نہ دی جائے۔ طلاق کے لیے دو چیزوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے، زبان سے صراحت کے ساتھ اس لفظ کو استعمال کرے یا اسے تحریر کرے، اسی طرح خاوند کا ناراض ہو کر گھر سے چلے جانا اس سے بھی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ گئے تھے، اس سے قطعاً طلاق واقع نہیں ہوئی، خاوند نے اپنے خط میں لکھا کہ اگر ان شرائط پر عمل نہ کیا گیا تو وہ طلاق دے دے گا۔ اس انداز سے بھی طلاق واقع نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو ایک دھمکی اور ڈراوا ہے۔ اگر شرائط کو پورا نہ کیا گیا ہو تب بھی طلاق واقع نہیں ہو گی جب تک خاوند اپنی دھمکی کے مطابق عمل نہ کرے۔ ہاں اگر اس نے عملی طور پر طلاق کا لفظ کہہ دیا یا تحریر کر دیا ہے تو اس صورت میں طلاق ہو جائے گی، اس کے علاوہ خاوند کا اپنی بیوی کو یہ کہنا کہ اگر تم اسی طرح کرتی رہی تو پھر ہمارا گزارا مشکل ہے، اس جملہ کو بھی طلاق شمار نہیں کیا جائے گا لیکن اگر ان الفاظ کو بولتے وقت طلاق کی نیت کی ہو تو پھر طلاق ہو جاتی ہے۔ اگر اس نے طلاق کی نیت کی یا ان الفاظ کی ادائیگی کے وقت اسے نیت کا علم ہی نہیں تو بھی طلاق شمار نہیں ہو گی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خاوند غصہ میں آ کر بیوی کو ایسے الفاظ کہہ دیتا ہے جو طلاق کی طرف اشارہ تو کرتے ہیں لیکن ان میں طلاق کی صراحت نہیں ہوتی، ایسے حالات میں طلاق نہیں ہوتی لیکن ہم ایسے جذباتی خاوند کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ غصہ کی حالت میں اپنی بریک پر پاؤں رکھنے کی عادت ڈالے، بات بات پر لڑائی جھگڑا، دھمکی آمیز باتیں یا خطوط لکھنا کوئی اچھا اقدام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ اور حسن سلوک کرنے کی تلقین کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [1]

''تم ان کے ساتھ بھلے طریقے سے بود و باش رکھو۔''

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کے ساتھ حسنِ معاشرت کی بہت تاکید کی ہے، اس لیے خاوند کو چاہیے کہ وہ بردباری، صبر اور حوصلے سے کام لے، جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ حالات درست ہونے کی کوئی سبیل ضرور پیدا فرما دیں گے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ٤/النساء:١٩۔

حق مہر واپس لینا

سوال ایک شخص کا کسی عورت سے نکاح ہوا، ایک لاکھ روپیہ حق مہر غیر معجّل طے پایا، اس کے علاوہ نکاح فارم پر یہ شرط لکھی گئی کہ پانچ تولے طلائی زیور، عورت کی ملکیت ہوگا، شادی کے کچھ عرصہ بعد عورت نے تنسیخ نکاح کی درخواست دائر کردی، پھر تنسیخ نکاح کا فیصلہ ہوگیا، اب کیا خاوند حق مہر کی عدم ادائیگی اور زیورات کی واپسی کا حق رکھتا ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق فتویٰ درکار ہے۔

جواب ہمارے رجحان کے مطابق حق مہر کی ادائیگی موقع پر ہوجانی چاہیے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ ﴾ [1]

''تم عورتوں کا حق مہر خوشی خوشی ادا کردو۔''

نکاح فارم پر حق مہر کے متعلق معجّل اور غیر معجّل کی تقسیم ایک چوردروازہ ہے، ہم اسے صحیح نہیں سمجھتے، بعض لوگ حکومت کی طرف سے حق مہر کی رقم پر ناجائز عائد کردہ ٹیکس سے بچنے کے لیے ایسا کرتے ہیں کہ معمولی حق مہر عند الطلب یا غیر معجّل رکھ لیتے ہیں اور طلائی زیورات، عورت کی ملکیت کردیتے ہیں، بطور خلع تنسیخ نکاح کی صورت میں بیوی کو حق مہر سے دستبردار ہونا پڑتا ہے، صورت مسئولہ میں حق مہر مبلغ ایک لاکھ روپیہ غیر معجّل ہے جو ادا نہیں کیا گیا، خلع کی صورت میں اس کی ادائیگی خاوند سے ساقط ہوجائے گی، البتہ جو زیورات اس کی ملکیت کردیئے گئے ہیں، وہ اسے واپس نہیں ملیں گے، کیونکہ وہ خود ہی ان طلائی زیورات کو اس کی ملکیت کر چکا ہے۔ (واللہ اعلم)

قبل از نکاح طلاق دینا

سوال میری اپنی حقیقی چچا کی بیٹی سے منگنی ہوئی ہے لیکن میں جہالت کی وجہ سے متعدد مرتبہ اسے نکاح سے پہلے ہی طلاق دے بیٹھا ہوں، اب میرا ارادہ اس سے نکاح کرنے کا ہے، میرے لیے شرعی حکم کیا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب ہم میں کچھ لوگ اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں، قبل از نکاح طلاق دینا بھی اسی قبیل سے ہے، عقد نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہوتی کیونکہ طلاق دینا شوہر کا اختیار ہے، اور جو ابھی ''شوہر'' نہیں بنا اسے طلاق دینے کا کوئی اختیار نہیں، وہ لڑکی جس سے منگنی ہوئی ہے وہ اس کی بیوی نہیں ہے، ایسے حالات میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''طلاق، صرف نکاح کے بعد ہی ہوتی ہے۔'' [2]

بہرحال قبل از نکاح طلاق واقع نہیں ہوتی، اگر کسی نے یہ حماقت کرڈالی ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس اقدام پر استغفار کرے۔ ایسی طلاق سے آئندہ ہونے والے نکاح پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ٤/النساء: ٤۔ [2] ابن ماجه، الطلاق: ٢٠٤٨۔

طلاق کے بعد اکٹھے رہنا

سوال میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے، بچوں کی وجہ سے ہم ایک ہی جگہ پر رہتے ہیں لیکن گفتگو وغیرہ سے اجتناب کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب عورت، خاوند کی طلاق کے بعد جب اپنی عدت پوری کر لے تو وہ اس کے لیے اجنبی بن جاتی ہے، اس کے بعد دونوں کا اکٹھے رہنا فحاشی اور بے حیائی کو دعوت دینا ہے، کسی اجنبی عورت کے ساتھ اس طرح رہنا کسی مذہب میں بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ اسلام میں رہتے ہوئے ایسا کام کیا جائے، جو انسان اپنی اصلاح چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے بچوں کی خاطر خود کو اس فتنۂ اختلاط میں مبتلا نہ کرے، طلاق دینے کے بعد اس کی عدت گزرتے ہی دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو چکے ہیں اور اجنبی کو دیکھنا اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ ﴾ [1]

''مومن مردوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے باخبر ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان خواتین کو بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے، اس بنا پر طلاق یافتہ بیوی کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اپنے سابقہ خاوند سے علیحدگی اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی راستہ پیدا فرمائے گا جس سے وہ اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ (واللہ اعلم)

والدین کی ناراضگی میں نکاح کرنا

سوال نکاح کے لیے لڑکا اور لڑکی رضامند ہیں، لیکن والدین اس میں رکاوٹ ہیں، لڑکی گھر سے بھاگ کر لڑکے سے نکاح کر لیتی ہے، اس کے بعد والدین بھی راضی ہو جاتے ہیں' تو کیا یہ شادی صحیح ہے؟

جواب یہ نکاح صحیح نہیں ہے اگرچہ اس کے بعد والدین راضی ہو جائیں، کیونکہ نکاح کے لیے ولی یعنی سرپرست کی اجازت ضروری ہے، جو عورت سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیتی ہے، حدیث میں اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایسی عورت کو زانیہ اور بدکار کہا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''کوئی عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ ہی کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے، بلاشبہ وہ عورت زانیہ ہے جس نے اپنا نکاح خود کر لیا۔'' [2]

اگر اس کے والدین، اس نکاح کو قبول کر لیتے ہیں اور اس کے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں تو بھی نکاح دوبارہ کیا

---

[1] ٢٤/النور: ٣٠۔ [2] ابن ماجه، النكاح: ١٥٢٧۔

جائے گا کیونکہ پہلا عقدِ نکاح صحیح نہیں تھا، ان دونوں لڑکی اور لڑکے کو اللہ تعالیٰ سے اس غیر شرعی اقدام پر معافی مانگنا ہوگی اور فوراً علیحدگی اختیار کر کے دوبارہ سرپرست کی اجازت سے نکاح کیا جائے، پہلے نکاح کو شریعت تسلیم نہیں کرتی اگرچہ والدین نے اس پر اظہار رضامندی کر دیا ہو۔

رخصتی سے پہلے طلاق دے دینا

سوال ایک آدمی کا کسی لڑکی سے صرف نکاح ہوا تھا، رخصتی ہونے سے پہلے ہی اس نے طلاق دے دی، کیا وہ رجوع کر کے اسے اپنے گھر لا سکتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب نکاح کے بعد تعلقات زن وشوہر سے پہلے اگر طلاق ہو جائے تو ایسی عورت پر کوئی عدت نہیں ہوتی، وہ طلاق ملتے ہی آزاد ہو جاتی ہے اور آگے نکاح کرنے کی مجاز ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَآَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ فَمَا لَـكُمۡ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ عِدَّةٍ تَعۡتَدُّوۡنَهَا‌ ﴾ [1]

''اے ایمان دارو! جب تم اہل ایمان خواتین سے نکاح کرو پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو ان پر تمہارا کوئی حق عدت کا نہیں ہے، جسے تم شمار کرو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نکاح کے بعد اگر میاں بیوی کے درمیان ہم بستری نہیں ہوئی، اگر اسے طلاق ہو جائے تو کوئی عدت نہیں ہے، وہ عورت عدت گزارے بغیر فوری طور پر اگر نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، البتہ ہم بستری سے قبل اگر خاوند فوت ہو جائے تو پھر اسے عدت وفات چار ماہ دس دن عدت گزارنا پڑے گی، طلاق ملنے کی صورت میں عورت کے ذمے کوئی عدت نہیں اور طلاق ملتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد فریقین اگر دوبارہ آباد ہونا چاہتے ہیں تو نئے نکاح سے رجوع ہو سکے گا، جس کی چار شرائط حسب ذیل ہیں:

1. عورت، دوبارہ نکاح کرنے پر رضامند ہو۔
2. اس کا سرپرست اس نکاح کی اجازت دے۔
3. حق مہر نیا مقرر کیا جائے۔
4. گواہ وغیرہ بھی موجود ہوں۔

جان بوجھ کر حق مہر مؤخر کرنا

سوال ایک آدمی کسی عورت سے نکاح کرتا ہے اور حق مہر بھی طے ہو جاتا ہے لیکن وہ کسی وجہ سے اس کی ادائیگی نہیں کر پاتا بلکہ وہ اسے مؤخر کر دیتا ہے کیا اس صورت میں اپنی بیوی کے پاس جا سکتا ہے؟

جواب طے شدہ حق مہر کی ادائیگی ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً‌ ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَـكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓــًٔا مَّرِیۡٓـــٴًﺎ ۝ ﴾ [2]

---

[1] ۳۳/الاحزاب:۴۹۔ [2] ۴/النساء:۴۔

''تم عورتوں کو ان کے حق مہر بخوشی ادا کرو، ہاں اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمہیں چھوڑ دیں تو تم اسے مزے سے کھا سکتے ہو۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ طے شدہ حق مہر کی ادائیگی ضروری ہے، اگر باہمی رضا مندی سے حق مہر مؤخر کرنے پر کوئی سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ﴾ [1]

''اگر حق مہر طے ہو جانے کے بعد بیوی خاوند آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔''

لیکن بیوی کے پاس جانے سے پہلے پہلے اس کی ادائیگی کرنا یا مباشرت سے پہلے ادائیگی کو مشروط کرنا درست نہیں۔ اگرچہ بہتر ہے کہ اس کی ادائیگی جلد از جلد ہونی چاہیے اور خاوند کا دانستہ طور پر اس کی ادائیگی سے پہلو تہی کرنا بھی ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

لڑکے کا لڑکی کو براہِ راست پیغام نکاح دینا

سوال میں ایک لڑکی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوں تو کیا براہِ راست اس سے گفتگو کر سکتا ہوں، میرا اس کو شادی کا پیغام دینا کس طرح ممکن ہے؟ اس سلسلہ میں میری راہنمائی کریں۔

جواب ہمارے ہاں مشرقی روایات کے مطابق لڑکے کے سرپرست ہی پیغام نکاح دیتے ہیں یعنی والدین کے ذریعے ہی منگنی وغیرہ کا پروگرام طے ہوتا ہے، کوئی لڑکا براہِ راست ایسا کام نہیں کرتا اور نہ ہی لڑکی سے بات چیت کرنے کا مجاز ہے۔ اجنبی عورت سے بات چیت کرنے کے کچھ شرعی آداب حسب ذیل ہیں، اگر کوئی دوسرا پیغام نکاح دینے کے لیے موجود نہ ہو تو ان آداب کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

1. مرد، عورت تک اس کے محرم یا اپنی محرم عورت کے ذریعے بات پہنچائے۔
2. اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ان کی یہ گفتگو خلوت وتنہائی کے بغیر ہو نیز یہ کلام مباح اور جائز موضوع سے خارج نہ ہو۔
3. فتنہ وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو، اگر اس طرح کے کلام سے لذت حاصل کرنے لگیں تو ایسا کرنا حرام ہے۔
4. عورت کی طرف سے گفتگو میں نرم لہجہ اختیار نہ کیا جائے اور وہ مکمل پردے میں ہو۔
5. یہ گفتگو ضرورت سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

بہرحال ایسے موقع پر ضروری ہے کہ فتنہ میں مبتلا کر دینے والے اسباب سے احترام کیا جائے اور انتہائی احتیاط سے کام لیا جائے اور اپنے مقصد کو ہر اس طریقہ سے حل کیا جا سکتا ہے جو لڑکی کے پاس جانے کے علاوہ ہو، بہرحال اس سلسلہ میں ہر اس کام سے پرہیز کیا جائے جو حرام کام کی طرف لے جانے والا ہو یا حرام کے قریب کرنے والا ہو۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ٤/النساء:٢٤۔

طلاق کی اجازت باپ سے لینا

سوال میرے بیٹے نے میری اجازت کے بغیر اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور وہ کسی صورت میں اسے آباد کرنے پر آمادہ نہیں ہے، میں نے اس کو رجوع کرنے پر آمادہ کیا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ میں اس شرط پر رجوع کرتا ہوں کہ میں اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھوں گا بلکہ وہ نئی شادی کرنا چاہتا ہے، اب کتاب وسنت کے مطابق میرے لیے کیا حکم ہے؟

جواب کتاب وسنت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا حق خاوند کو دیا ہے، اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ طلاق دینے کے لیے اپنے باپ سے اجازت لے، مشورہ کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن طلاق کو باپ کی اجازت سے مشروط کرنا صحیح نہیں ہے، جب اس نے طلاق دے دی ہے تو طلاق نافذ ہو جائے گی، اگر وہ اسے دوبارہ آباد کرنے پر آمادہ ہے تو رجوع کرنے کا اسے حق ہے لیکن یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے کہ وہ رجوع کرنے کے بعد اپنی بیوی سے لاتعلق رہے کیونکہ یہ بیوی کو تکلیف دینا ہے اور شریعت کی رو سے ایسا کرنا حرام ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ ﴾ [1]

''اور انہیں تکلیف دینے کے لیے مت روکے رکھو، تاکہ تم ان پر زیادتی کرو اور جو شخص ایسا کام کرے گا وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرے گا۔''

بلکہ قرآن کریم نے بیوی کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ ﴾ [2]

''اور ان بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔''

صورت مسئولہ میں اگر بیٹا رجوع کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے، اگر وہ لاتعلق رہتے ہوئے رجوع پر آمادہ ہے تو اس قسم کا رجوع شرعاً ناجائز ہے، بہتر ہے کہ اس کی ذہن سازی کی جائے اور جن وجوہات کی بنا پر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے، اس کی تلافی کرتے ہوئے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان صلح کی کوشش کی جائے لیکن باپ ہونے کی حیثیت سے اس پر کسی قسم کا ناجائز دباؤ ڈالنا جائز نہیں، اگر اسکی بیوی، باپ کی کوئی عزیزہ ہے تو رشتہ داری کے حقوق اپنی جگہ پر قابل احترام ہیں لیکن اس کے لیے خاوند کے حقوق کو قربان نہ کیا جائے گا، ہمارے معاشرے میں یہ امر قابل اصلاح ہے کہ باپ اپنی اولاد کی شادی کرتے وقت انہیں اعتماد میں نہیں لیتا پھر شادی کرنے کے بعد بھی مداخلت کی جاتی ہے، اس کی مداخلت سے بہت بگاڑ پیدا ہوتا ہے لہٰذا والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں اور نکاح سے پہلے اپنے بچوں اور بچیوں کو اعتماد میں لیں تاکہ آئندہ ہونے والے بگاڑ کا سدباب ہو سکے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ۲/البقرۃ: ۲۳۱۔ [2] ۴/النساء: ۱۹۔

طلاق دینے کا طریقہ

سوال میری بیوی نافرمان اور گستاخ ہے، اسے سمجھانے کے تمام حربے استعمال کر چکا ہوں لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوئے ہیں، اب میں اسے طلاق دینا چاہتا ہوں، اس طلاق کا شرعی طریقہ کیا ہے؟

جواب قرآن کریم نے نافرمان اور گستاخ بیوی کو سمجھانے کے لیے درج ذیل چار طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

1. اسے وعظ ونصیحت کی جائے اور نافرمانی کے انجام سے آگاہ کیا جائے۔
2. اگر وہ باز نہ آئے تو خواب گاہ سے اسے الگ کر دیا جائے۔
3. اگر یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہ ہو تو اسے ہلکی پھلکی مار دی جائے۔
4. اگر مار پیٹ کا وہ کوئی اثر قبول نہ کرے تو اصلاح احوال کے لیے ثالثی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اگر ثالثی کے ذریعہ بھی اصلاح نہ ہو سکے تو اسے ایک طلاق دی جائے، چونکہ آج کل نکاح تحریری ہوتے ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ طلاق بھی تحریری دی جائے، ایک طلاق دینے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر عورت کا دماغ درست ہو جائے تو دوران عدت تجدید نکاح کے بغیر ہی رجوع ہو سکتا ہے، اگر عدت گزر جائے تو نکاح ٹوٹ جائے گا لیکن تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ﴾ [1]

”جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں اپنے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو، جب کہ وہ معروف طریقہ کے مطابق آپس میں نکاح کرنے پر آمادہ ہوں۔“

رضاعی بھائی کی بہن سے نکاح کرنا

سوال میرے بھائی نے ایک لڑکی کے ساتھ کسی عورت کا دودھ پیا ہے، کیا میں اس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہوں؟

جواب رضاعت کے متعلق ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ دودھ پینے والے کا تعلق دودھ پلانے والی کے تمام اصول و فروع اور اطراف سے قائم ہو جاتا ہے جب کہ دودھ پلانے والی کا تعلق صرف دودھ پینے والے اور اس کی فروع سے قائم ہوتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ دودھ پینے والا بچہ جب کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو عورت کا باپ، پینے والے کا نانا، اس کا خاوند، اس کا باپ، خاوند کے بھائی اس کے چچا اور دودھ پلانے والی کی اولاد پینے والے کے بہن بھائی بن جاتے ہیں، پھر جس طرح دودھ پینے والا پلانے والی کا بیٹا بن جاتا ہے اسی طرح دودھ پینے والے کے بچے دودھ پلانے والی کے پوتے اور پوتیاں شمار ہوں گے، البتہ دودھ پینے والے کے باپ، بھائی اور دیگر رشتے داروں کا دودھ پلانے والی سے کوئی رشتہ قائم نہیں ہوگا، یہی وجہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت، دودھ پینے والے کے باپ، چچا، ماموں اور بھائی سے شادی کر سکتی ہے اور دودھ پلانے والی کا خاوند دودھ پینے والے کی

---

[1] ٢/البقرۃ:٢٣٢۔

ماں، بہن، پھوپھی اور خالہ سے شادی کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے درمیان دودھ یا نسب کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی اگر اپنے رضاعی بھائی کی بہن سے شادی کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ❶

صورت مسئولہ میں ایک لڑکے نے کسی لڑکی کے ساتھ ایک عورت کا دودھ پیا ہے تو لڑکا اور لڑکی تو دودھ کے اعتبار سے بہن بھائی بن جائیں گے، ان کا باہمی نکاح حرام ہے البتہ لڑکے کا بھائی، اس لڑکی سے شادی کر سکتا ہے کیونکہ ان کے درمیان میں نسبی یا رضاعی کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے ابواھاب کی بیٹی ام یحییٰ رضی اللہ عنہا سے شادی کی، نکاح کرنے کے بعد ایک سیاہ فام لونڈی نے دعویٰ کر دیا کہ میں نے میاں بیوی دونوں کو دودھ پلایا ہے یعنی یہ دونوں دودھ کے اعتبار سے بہن بھائی ہیں، لہٰذا ان کا نکاح جائز نہیں ہے۔ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مسئلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تمہارا آپس میں نکاح کیونکر جائز ہو سکتا ہے جب کہ ایک عورت دعویٰ کرتی ہے کہ میں نے ان دونوں کو دودھ پلایا ہے۔'' چنانچہ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے علیحدگی اختیار کر لی تو اس نے دوسرے خاوند سے نکاح کر لیا۔ ❷

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے کہ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ کے ہمراہ دودھ پینے والی لڑکی نے پھر ان کے بھائی ظریب بن حارث سے شادی کر لی تھی۔ ❸ ان حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص نے ایک لڑکی کے ہمراہ کسی عورت کا دودھ پیا ہے تو وہ لڑکی اس شخص کی رضاعی بہن ہے، جس نے اس کے ساتھ دودھ پیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا نکاح نہیں ہو سکتا، البتہ دودھ پینے والے کے بھائی کے لیے جائز ہے کہ وہ اس لڑکی سے نکاح کر لے کیونکہ اس کا لڑکی کے ساتھ نسب اور رضاعت کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا۔ (واللہ اعلم)

باضابطہ رخصتی سے پہلے طلاق دے دینا

سوال پچھلے سال فروری ۲۰۰۹ء میں میرا نکاح ہوا، لیکن کچھ مجبوری کی وجہ سے رخصتی نہ ہو سکی، جب کہ گھر سے باہر ہم میاں بیوی آپس میں ملتے رہے، باضابطہ رخصتی سے قبل ہی میرے خاوند نے مجھے طلاق دے دی، اب میرے گھر والے کہتے ہیں کہ اس صورت میں عدت وغیرہ نہیں ہے، وہ آگے نکاح کرنا چاہتے ہیں جب کہ میرے خاوند نے طلاق کے بعد رجوع کر لیا ہے، اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی کریں۔

جواب رخصتی سے قبل اگر طلاق ہو جائے تو مطلقہ عورت پر کوئی عدت نہیں ہوتی بلکہ طلاق ملتے ہی نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور اسے آگے نکاح کرنے کی اجازت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ ﴾ ❸

---

❶ المغنی، ص: ۳۱۹، ج۱۱۔ ❷ صحیح بخاری، العلم: ۸۸۔

❸ عمدۃ القاری، ص: ۱۴۳، ج۲۔ ❸ ۳۳/الاحزاب: ۴۹۔

"اے ایمان والو! جب تم اہل ایمان عورتوں سے نکاح کرو پھر ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو ان کے ذمے تمہارا کوئی حق عدت نہیں ہے جسے تم شمار کرو۔"

اس آیت کے پیش نظر سائلہ کے اہل خانہ کا موقف مبنی برحقیقت ہے لیکن انہیں علم نہیں ہے کہ ان کی صاحبزادی نے کچھ عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ اس آیت کریمہ کی حدود سے تجاوز کر چکی ہے، صاحبزادی کے لیے اب یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے والدین کو صورت حال سے آگاہ کر دے اور انہیں بتا دے کہ وہ اب غیر مدخولہ نہیں ہے کہ مذکورہ آیت کے ضابطہ کے تحت آئے، اب اس طلاق کا حکم درج ذیل آیت کے مطابق ہے:

﴿وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْۤ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا ؕ﴾ [1]

"طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض آنے تک روکے رکھیں، انہیں حلال نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو پیدا کیا ہے وہ اسے چھپائیں اگر انہیں اللہ پر یقین اور یوم آخرت پر ایمان ہے، ان کے خاوند اس مدت میں انہیں لوٹا لینے کے پورے حقدار ہیں بشرطیکہ ان کا ارادہ اصلاح کا ہو۔"

صورت مسئولہ میں خاوند کا حق رجوع صحیح ہے اور سائلہ بدستور اس کی بیوی ہے، اس صورت میں والدین آگے نکاح کرنے کے مجاز نہیں ہیں، سائلہ کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کو پوری صورت حال سے آگاہ کر دے اور کوئی چیز چھپا کر نہ رکھے، انہوں نے جو کچھ کیا ہے معاشرتی طور پر انتہائی قابل اعتراض ہے اگرچہ شرعی طور پر اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

نافرمانی کی بنا پر طلاق دینا

سوال میری بیوی بے نماز اور نافرمان ہے، کیا اس وجہ سے میں اسے طلاق دے سکتا ہوں؟ نیز بتائیں کہ کن کن حالات میں بیوی کو طلاق دی جا سکتی ہے؟

جواب نکاح صرف پیاس بجھانے اور افزائش نسل کا ذریعہ نہیں بلکہ شریعت میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو باہمی محبت و یگانگت اور ایک دوسرے سے سکون حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے طالب بھی ہیں اور مطلوب بھی۔ مرد کو عورت اور عورت کو مرد سے سکون ہوتا ہے اور دونوں میں ایک دوسرے کے لیے اس قدر کشش رکھ دی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ رہ کر سکون حاصل کر ہی نہیں سکتے۔ جب مرد دیکھے کہ بیوی میرے لیے جسمانی یا ذہنی سکون کا ذریعہ نہیں بلکہ روح کو بے چین کرنے کا باعث ہے تو پھر نکاح کے بندھن کو کھول دینے پر غور ہو سکتا ہے، سکون واطمینان کے فقدان کا باعث بیوی کی طرف سے نشوز و نافرمان ہونا ہے، جو طلاق کے لیے تمہید بنتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ﴾ [2]

---

[1] ٢/البقرة: ٢٢٨۔ [2] ٤/النساء: ٣٤۔

''اور جن بیویوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ، اگر نہ سمجھیں تو خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو پھر بھی نہ سمجھیں تو انہیں مارو، پھر وہ اگر تمہاری بات قبول کرلیں تو خواہ مخواہ ان پر زیادتی کے بہانے تلاش نہ کرو۔''

نشوز کا لغوی معنی اٹھان اور ابھار کے ہیں، اصطلاحی طور پر نشوز سرکشی کو کہتے ہیں مثلاً: عورت اپنے خاوند کو اپنا ہمسر یا اپنے سے کمتر سمجھتی ہو یا اس کی سربراہی کو اپنے لیے توہین سمجھ کر اسے تسلیم نہ کرتی ہو یا اس کی اطاعت کے بجائے اس سے سرکشی اور کج روی کرتی ہو، خندہ پیشانی سے پیش آنے کے بجائے بد خلقی اور پھوہڑ پن کا مظاہرہ کرتی ہو، بات بات پر ضد کرتی ہو، ہٹ دھرمی دکھاتی ہو یا مرد پر ناجائز قسم کے اتہامات لگاتی ہو۔ یہ تمام باتیں نشوز کے معنی میں داخل ہیں، ایسی عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو تین قسم کے ترتیب وار اقدامات کرنے کی اجازت دی ہے۔

1. اسے نرمی سے سمجھایا جائے کہ اس کے موجودہ رویہ کا انجام برا ہو سکتا ہے۔
2. اگر وہ اس کا اثر قبول نہ کرے تو خاوند اس سے الگ کسی دوسرے کمرہ میں سونا شروع کر دے۔
3. اگر وہ سرد جنگ کو نہیں چھوڑتی تو اسے ہلکی پھلکی مار دی جائے، اس مار کی چند شرائط ہیں کہ اس مار سے ہڈی پسلی نہ ٹوٹے اور چہرے پر نہ مارے، اگر یہ تمام حربے ناکام ہو جائیں تو طلاق سے قبل فریقین اپنے اپنے ثالث مقرر کریں جو اصلاح کی کوشش کریں۔ اگر اس طرح اصلاح نہ ہو سکے تو آخری حربہ طلاق دینے کا ہے۔ صورت مسؤلہ میں اگر بیوی بے نماز یا نافرمان ہے تو مذکورہ بالا اقدامات سے اصلاح کی جائے بصورت دیگر طلاق دے کر اسے فارغ کر دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

طلاق کو مشروط کرنا

سوال میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو نے اس بچے کو آیندہ مارا تو تجھے طلاق ہے، جبکہ وہ حاملہ تھی چنانچہ میرے کہنے کے تیسرے دن اس نے بچے کو مارا اور شام کے وقت بچے کو جنم دیا، اب میرے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا میں اس سے رجوع کر سکتا ہوں؟

جواب طلاق کو کسی کام کے ساتھ مشروط کر دینے کو طلاق معلق کہا جاتا ہے، اگر کام کرنے سے پہلے وہ اس شرط کو ختم کر دے تو اسے یہ حق ہے کیونکہ جو شخص کوئی شرط عائد کر سکتا ہے وہ اس شرط کو ختم کرنے کا بھی مجاز ہے لیکن اگر وہ شرط کو برقرار رکھتا ہے تو بیوی کے وہ کام کرنے کے ساتھ طلاق واقع ہو جائے گی، پھر اسے دوران عدت رجوع کا حق حاصل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا ؕ﴾ [1]

''اور ان کے خاوند اس مدت میں ان سے رجوع کرنے کے زیادہ حقدار ہیں، بشرطیکہ وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں۔''

یعنی رجوع کر کے بیوی کو تنگ کرنا مقصود نہ ہو بلکہ اسے گھر میں آباد کرنے کا ارادہ ہو تو اسے رجوع کرنے کا شریعت نے حق دیا ہے۔ صورت مسؤلہ میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو مشروط طلاق دی اور وہ شرط پوری ہو گئی اس لیے یہ ایک طلاق شمار ہو گی، پھر

---

[1] ۲/البقرۃ: ۲۲۸۔

اس کو دوران عدت رجوع کرنے کا حق تھا لیکن اتفاق سے اس نے اپنے بچے کو جنم دے دیا اب اس کی عدت بھی پوری ہو چکی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [1]

''اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔''

عدت کے ختم ہونے کے ساتھ ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے، اب تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے، بشرطیکہ مطلقہ بیوی نکاح پر آمادہ ہو اور اس کا سرپرست بھی اس کی اجازت دے، نیز حق مہر بھی نیا ہو گا اس کے ساتھ گواہوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان چار شرائط کے ساتھ اب نیا نکاح ہو سکتا ہے۔ تجدید نکاح کی رعایت بھی پہلی اور دوسری طلاق کے بعد ہے البتہ تیسری طلاق کے بعد کسی صورت میں رجوع نہیں ہو سکتا، مسئلہ کی وضاحت کے بعد ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ آپ کے ذہن نشین کروا دیں کہ طلاق کو مذاق خیال نہ کیا جائے بلکہ اس کا تصور لاتے ہوئے خوب سوچ وبچار کر لیا جائے کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟ خاوند، بچوں اور بیوی کے لیے کیا کیا مشکلات پیدا ہوں گی؟ یہ کوئی بجلی کا بلب نہیں ہے کہ ایک خراب ہونے کے بعد دوسرا لگا لیا جائے، نکاح ایک زندگی کا بندھن ہے، جو زندگی میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ بہر حال طلاق دینے سے پہلے اس کے نتائج پر نہایت سنجیدگی سے غور کر لینا چاہیے تاکہ اس کے بعد ندامت وشرمساری اور پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ (واللہ اعلم)

باپ کی سالی سے نکاح کرنا

سوال باپ کی سالی سے نکاح کرنا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی کریں۔

جواب باپ کی سالی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک صورت میں نکاح حرام ہے جبکہ دوسری صورت میں سالی سے نکاح جائز ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1. اگر باپ کی سالی برخوردار کی حقیقی خالہ ہے تو اس صورت میں باپ کی سالی سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تمہاری خالائیں حرام کر دی گئی ہیں۔'' [2]
2. اگر باپ نے دوسری شادی کی ہے تو اس صورت میں باپ کی سالی پہلی بیوی کی اولاد کے لیے حقیقی خالہ نہیں ہے، اس صورت میں پہلی بیوی کا کوئی بھی لڑکا اپنے باپ کی منکوحہ کی بہن یعنی اس کی سالی سے شادی کر سکتا ہے، کیونکہ وہ حقیقی خالہ نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ﴾ [3]

''ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں۔''

مذکورہ سوال کے تناظر میں ہم اپنے قارئین سے گزارش کریں گے کہ وہ سوالات کو معمہ کی شکل دینے سے اجتناب کیا کریں کیونکہ اس میں وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔

---

[1] ٦٥/الطلاق:٤۔ [2] ٤/النساء:٢٣۔ [3] ٤/النساء:٢٤۔

طلاق رجعی کے چار سال بعد رجوع کرنا

سوال ایک آدمی نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ چار سال بعد وہ اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کرنا چاہتا ہے، کیا شریعت میں اس کی گنجائش ہے؟

جواب بیوی کو ایک رجعی طلاق دینے کے بعد خاوند کو اس سے دوران عدت رجوع کرنے کا حق ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا﴾ [1]

''اگر ان کے شوہر تعلقات درست کرنے پر آمادہ ہوں تو وہ دوران عدت انہیں اپنی زوجیت میں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوران عدت اگر رجوع کرنا چاہے تو سابقہ نکاح سے ہی پھر گھر آباد کیا جا سکتا ہے، اگر عدت گزر جانے کے بعد رجوع کا خیال آیا ہے تو نئے نکاح کے ساتھ رجوع ہو سکے گا، جس کے لیے سرپرست کی اجازت، بیوی کی رضامندی نیز حق مہر اور گواہوں کا بھی از سر نو اہتمام کرنا ہوگا، صورت مسؤلہ میں ایک رجعی طلاق دینے کے بعد چار سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عدت کے ایام ختم ہو چکے ہیں، اب عورت اگر رضامند ہے اور اس کا سرپرست بھی اجازت دیتا ہے تو نکاح جدید سے رجوع ممکن ہے، اب عورت پر دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا کیونکہ عدت گزارنے کے بعد وہ آزاد ہے۔ اس کی مرضی ہو تو آگے کسی دوسرے شخص سے بھی نکاح کر سکتی ہے، اگر چاہے تو پہلے خاوند کے پاس بھی واپس آ سکتی ہے، بہرصورت اسے نکاحِ جدید کرنا ہوگا۔ صورت مسؤلہ میں پہلا خاوند اگر معروف طریقہ کے مطابق اسے اپنے گھر آباد کرنے کا خواہش مند ہے تو مطلقہ بیوی سے نکاح جدید ہو سکتا ہے، لیکن آیندہ اتفاق و محبت سے زندگی بسر کرنے کا عہد کرنا ہوگا۔

عورت کا خاوند فوت ہو گیا کیا دوران عدت منگنی ہو سکتی ہے؟

سوال ایک عورت کا خاوند کسی حادثہ میں فوت ہو گیا، اہل خانہ نے دوران عدت ہی اس کی منگنی کر دی اور اسے سونے کی انگوٹھی پہنا دی، کیا کتاب و سنت کی رو سے ایسا کرنا صحیح ہے؟

جواب جو عورت اپنے خاوند کی وفات کے بعد عدت گزار رہی ہو، اسے اشارہ کے ساتھ تو پیغام نکاح دیا جا سکتا ہے لیکن دوٹوک الفاظ میں اسے پیغام دینا جائز نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ﴾ [2]

''ایسی بیواؤں کو اگر تم اشارہ کے ساتھ پیغام نکاح دے دو یا بات اپنے دل میں چھپائے رکھو دونوں صورتوں میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔''

---

[1] ۲/البقرۃ: ۲۲۸۔ [2] ۲/البقرۃ: ۲۳۵۔

اس آیت سے معلوم ہوا ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کو اشارہ کے ساتھ تو پیغام نکاح دیا جا سکتا ہے مگر واضح الفاظ میں پیغام دینا ناجائز ہے مثلاً اسے یوں کہا جائے کہ میرا ابھی نکاح کرنے کا ارادہ ہے، اس طرح پیغام دینے میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ کوئی دوسرا اس سے پہلے کوئی پیغام نہ دے دے۔ البتہ جو عورت طلاق رجعی کی عدت میں ہو اسے اشارہ سے بھی کوئی ایسی بات کہنا حرام ہے، صورت مسئولہ میں ایک بیوہ جو اپنے عدت کے ایام گزار رہی تھی اسے پیغامِ نکاح سے بالاتر ہو کر اس کی منگنی کر دی گئی ہے پھر اسے نشانی کے طور پر منگنی کی انگوٹھی بھی پہنا دی گئی ہے، اس طرح دو گناہوں کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ ❶ دورانِ عدت پیغام نکاح واضح طور پر دے دیا گیا ہے جو شرعاً حرام ہے۔ ❷ اسے دوران عدت سونے کی انگوٹھی پہنائی گئی حالانکہ عدت کے دن زینت اس کے لیے حرام تھی۔ اب یہ کام ہو چکے ہیں، سونے کی انگوٹھی کو اتار دیا جائے اور منگنی کرنے کے گناہ سے استغفار کیا جائے، یہ کوئی ایسا گناہ نہیں جس کے ارتکاب پر کوئی کفارہ ہوتا ہو، اس سے توبہ اور استغفار کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (واللہ اعلم)

عقد نکاح سے پہلے طلاق دینا

سوال میں نے ایک لڑکی سے منگنی کی ہے، لیکن میں اسے کئی مرتبہ طلاق دے چکا ہوں لیکن میں اس سے شادی کا خواہشمند بھی ہوں، کیا ایسے حالات میں میرا اس سے نکاح ہو سکتا ہے۔

جواب عقد نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہوتی کیونکہ طلاق دینا شوہر کا حق ہے۔ منگنی کرنے سے انسان شوہر نہیں بن جاتا بلکہ نکاح سے شوہر بنتا ہے۔ وہ منگیتر جس کے ساتھ ابھی عقد نکاح نہیں ہوا وہ اس کی بیوی نہیں اور نہ وہ اس کا شوہر ہے اس لیے ایسے حالات میں دی ہوئی طلاق بھی صحیح نہیں ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''طلاق دینے کا حق صرف اسی کو ہے جس نے پنڈلی کو تھام رکھا ہو۔'' [1] پنڈلی کو تھامنے والا اس کا شوہر ہے اور اسے ہی طلاق دینے کا حق ہے۔ اس لیے منگنی کی صورت میں طلاق صحیح نہیں ہے نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''طلاق، صرف نکاح کے بعد ہی ہوتی ہے۔'' [2]

صورت مسئولہ میں عقد نکاح نہیں ہوا بلکہ صرف منگنی ہوئی ہے، اس لیے منگنی کے دوران طلاق دینا حماقت ہے اور اس قسم کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں، اگر واقعی منگنی کرنے والا لڑکی سے شادی کا خواہشمند ہے تو شرعاً اسے نکاح کرنے کی اجازت ہے لیکن اسے اپنے ذہن کو صاف کرنا ہو گا اور خلوص نیت سے اسے نبھانے کا عزم کرنا ہو گا۔

رخصتی سے پہلے اگر کسی کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کی عدت

سوال ہماری بچی کا نکاح ہوا، لیکن رخصتی سے پہلے ہی اس کا شوہر ایک حادثہ میں فوت ہو گیا، اب کیا ہماری بیٹی پر عدت گزارنا ضروری ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب اگر نکاح کے بعد رخصتی سے قبل طلاق ہو جائے تو عورت کے ذمے کوئی عدت نہیں ہے جیسا کہ سورۂ احزاب میں

---

[1] بیہقی۔ [2] ابن ماجه، الطلاق: ۲۰۴۸۔

اس کے متعلق صریح نص موجود ہے، طلاق قبل از خلوت کی صورت میں عدت ساقط ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس صورت میں مرد کا حق رجوع باقی نہیں رہتا اور عورت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ طلاق کے فوراً بعد جس سے چاہے نکاح کرے لیکن یہ حکم صرف طلاق قبل از خلوت کا ہے، اگر نکاح کے بعد خلوت سے پہلے عورت کا شوہر فوت ہو جائے جیسا کہ صورت مسؤلہ میں ہے تو عورت کو عدتِ وفات گزارنا ہوگی، یعنی اسے چار ماہ دس دن تک سوگ کرنا ہوگا، جو کہ منکوحہ مدخولہ کے لیے واجب ہے، اس صورت میں عدتِ وفات ساقط نہیں ہوگی۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایسی عورت کے متعلق سوال ہوا تھا، جس کا خاوند اس سے ہم بستری سے پہلے فوت ہو گیا تھا، آیا اس پر عدت ہے یا نہیں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا کہ اس عورت پر عدت گزارنا بھی ضروری ہے، خاوند کے ترکہ سے اسے حصہ بھی ملے گا نیز وہ حق مہر کی بھی حقدار ہوگی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس فتویٰ کے بعد حضرت جراح اور ابو سفیان رضی اللہ عنہما کھڑے ہوئے انہوں نے شہادت دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے خاندان کی ایک عورت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا تھا جب کہ اس کا شوہر ہلال بن مرہ اشجعی رضی اللہ عنہ رخصتی سے قبل فوت ہو گیا تھا۔ یہ حدیث سن کر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے کہ میرا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے عین مطابق ہوا ہے۔ [1]

مندرجہ بالا تصریحات کے مطابق اس بیوی کے لیے ضروری ہے جس کا شوہر قبل از رخصتی فوت ہو گیا ہے کہ وہ چار ماہ دس دن عدت گزارے، اس دوران وہ رنگ دار شوخ قسم کا کپڑا زیب تن نہ کرے، سرمہ اور خوشبو بھی استعمال نہ کرے، مہندی لگانے پر بھی پابندی ہے اس کے علاوہ کنگھی کرنا بھی درست نہیں ہے، یہ تمام پابندیاں احادیث سے ثابت ہیں۔ (واللہ اعلم)

قسم کھا کر طلاق کو مشروط کرنا

سوال اگر کوئی بایں انداز قسم کھائے کہ اللہ کی قسم! اگر میں فلاں کام کروں تو میری بیوی کو طلاق ہو، اب وہ آدمی مذکورہ کام کرنا چاہتا ہے اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ میری بیوی کو طلاق نہ ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے، راہنمائی فرمائیں۔

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ مسئلہ کے متعلق ہماری مکمل راہنمائی فرمائی ہے چنانچہ آپ نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''جب تو کسی چیز کے متعلق قسم اٹھائے پھر اس کا غیر اس سے بہتر دیکھے تو وہ کرو جو بہتر ہو اور اپنی قسم کا کفارہ دے دو۔'' [2]

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق فرمایا کہ ''میں جب بھی کوئی قسم اٹھالوں پھر کسی دوسری چیز کو اس کے مقابل بہتر خیال کروں تو وہی کرتا ہوں جو بہتر ہوتا ہے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں۔'' [3]

ان احادیث کے پیش نظر وہ اپنی قسم توڑ دے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے اور اس شرط کو ختم کر دے جو اس نے خود پر عائد کر رکھی ہے۔ واضح رہے کہ قسم کا کفارہ دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے یا انہیں پوشاک دینا ہے اگر اس کی ہمت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھنا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اس کی وضاحت ہے۔ [4] (واللہ اعلم)

---

[1] ابو داود، النکاح: ٢١١٦۔
[2] صحیح بخاری، الایمان والنذور: ٦٧٢٢۔
[3] صحیح بخاری: ٦٧٢٠۔
[4] ٥/المائدۃ: ٨٩۔

خاندان سے باہر شادی کرنا

سوال لوگوں میں مشہور ہے کہ خاندانی عادتیں اور بیماریاں آگے منتقل ہوتی رہی ہیں، اس بنا پر بچوں کے مستقبل کے حوالہ سے خاندان سے باہر شادی کرنا بہتر ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس امر کی وضاحت کریں۔

جواب اس میں شک نہیں ہے کہ خاندانی موروثی کردار کا ایک اثر ہوتا ہے اور معاشرتی اخلاق وعادت میں خاندانی اور موروثی عادات واخلاق مستقل طور پر اثر انداز ہوتے ہیں، جیسا کہ درج ذیل حدیث میں اس امر کی وضاحت ہے:

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی حاضر ہوا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری بیوی نے ایک سیاہ رنگ کے بچے کو جنم دیا ہے (جبکہ ہم دونوں میاں بیوی سفید رنگ کے ہیں) رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: 'آیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟'' اس نے جواب دیا، جی ہاں اونٹ موجود ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کا رنگ کیسا ہے؟'' اس نے عرض کیا ان کا رنگ سرخ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا ان اونٹوں میں کوئی خاکستری رنگ کا اونٹ بھی ہے؟'' اس نے کہا جی ہاں موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ خاکستری رنگ اسے کہاں سے ملا؟'' اس نے جواب دیا ممکن ہے کہ یہ رنگ کوئی رگ کھینچ لائی ہو، دیہاتی کا یہ جواب سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شاید تیرے بیٹے کے اس رنگ کو بھی کوئی رگ کھینچ لائی ہو۔'' [1]

بہر حال نکاح کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ نے دینداری کو ترجیح دی ہے خواہ دیندار شخص خاندان میں قریبی رشتہ کی صورت میں ہو یا وہ دور کا رشتہ دار ہو یا وہ خاندان سے باہر ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''عورت سے چار چیزوں کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، حسب ونصب کی وجہ سے، حسن وجمال کی وجہ سے اور دین واخلاق کی وجہ سے، تو دیندار خاتون سے شادی کرنے میں کامیابی حاصل کر، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔'' [2]

اسلام نے خاندان میں نکاح کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے لیکن اس کی بنیاد موروثی عادات نہیں بلکہ خالص دینداری اور اخلاقی برتری ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ خاندان اور قبیلے تو محض جان پہچان کے لیے ہیں لیکن قرب الٰہی کے حقدار تو یقیناً اہل تقویٰ ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [3]

''اللہ کے ہاں تم سب سے زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو زیادہ ڈرنے والا ہے۔''

شادی کے بعد خاوند کی طرف نسبت کرنا

سوال ہمارے ہاں معاشرتی طور پر خواتین شادی سے پہلے خود کو اپنے والد کی طرف منسوب کرتی ہیں مثلاً: ''رقیہ محمود'' یعنی محمود کی بیٹی رقیہ لیکن شادی کے بعد اس نسبت کو ترک کر کے اپنے خاوند کی طرف خود کو منسوب کرتی ہیں مثلاً ''رقیہ عامر'' یعنی

---

[1] صحیح بخاری، الطلاق: ۵۳۰۵۔ [2] صحیح بخاری، النکاح: ۵۰۹۰۔
[3] ۴۹/الحجرات: ۱۳۔

عامر کی بیوی، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب دور جاہلیت میں لوگ لے پالک کو اپنی طرف منسوب کر لیتے تھے اور اسی نسبت سے اسے پکارا کرتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور ہمیں آگاہ کیا کہ ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [1] ان (منہ بولے بیٹوں) کو ان کے باپوں کے نام سے ہی پکارا کرو اللہ کے ہاں یہی انصاف کی بات ہے۔ اس آیت کا تقاضا ہے کہ انسان مرد ہو یا عورت اس کی نسبت حقیقی باپ کی طرف ہونی چاہیے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ لوگوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا جائے، پھر اس کے تحت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن ہر غدار کے لیے ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی غداری ہے۔'' [2] شارح بخاری ابن بطال کہتے ہیں کہ باپ کے نام سے پکارنا ہی پہچان میں زیادہ واضح اور امتیاز میں زیادہ بلیغ ہے اور قرآن و حدیث کے دلائل بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں [3] جب قیامت کے دن باپ کی نسبت ہی تعارف کا ذریعہ ہو گی تو دنیا میں یہ نسبت اختیار کرنے میں کیا قباحت ہے، کتب حدیث میں جہاں فلاں بن فلاں کے نام استعمال ہوتے ہیں، اسی طرح عورتوں کے لیے فلانہ بنت فلاں کے الفاظ آئے حالانکہ ان میں اکثر خواتین شادی شدہ تھیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا شادی سے پہلے بھی عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما اور شادی کے بعد بھی انہیں اسی نسبت سے پکارا جاتا تھا۔ کسی موقع پر ''عائشہ محمد'' نہیں کہا گیا، اس لیے ہمارا رجحان اسی طرف ہے کہ شادی کے بعد بھی خواتین کو اپنے باپ کی نسبت سے پکارا جانا زیادہ مناسب ہے، معاشرتی طور پر نئی نسبت کو اختیار کرنے میں کئی ایک قباحتیں ہیں مثلاً بچی جب اٹھارہ سال کی ہو جاتی ہے تو اس کا شناختی کارڈ باپ کے نام سے بنتا ہے، شادی کے بعد اسے تبدیل کرنے کی زحمت اٹھانا پڑتی ہے اور خاوند کی نسبت سے نیا شناختی کارڈ بنانا پڑتا ہے، جب میاں بیوی میں کسی وجہ سے علیحدگی ہو جاتی ہے تو مزید تکلیف سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ قانونی کاغذات میں اس کا نام اپنے شوہر کے نام کے ساتھ منسلک ہوتا ہے جبکہ شوہر اس کے لیے اجنبی ہو چکا ہوتا ہے۔ جب وہ آگے کسی نئے مرد سے شادی کرتی ہے تو اسے مزید الجھن سے دو چار ہونا پڑے گا، جیسے جیسے اس کی زندگی میں خاوند وفات، طلاق اور خلع کی وجہ سے تبدیل ہوتے ہیں اسی طرح اس کی شناخت بھی تبدیل ہوتی رہے گی، اگر ہر بار شناختی کارڈ تبدیل کرانا پڑے تو یہ ایک دردسر ہے، دراصل مغربی تہذیب نے ہمارے ذہنوں کو خراب کیا ہے۔ اسلام نے تو ہماری شناخت باپ سے کی ہے جو کسی صورت میں تبدیل نہیں ہوتی، یہ نسبت دنیا اور آخرت میں برقرار رہے گی، اس لیے ہمیں چاہیے کہ اسی نسبت کو برقرار رکھیں تاکہ پریشانیوں اور الجھنوں سے محفوظ رہیں، ہماری اسلاف خواتین کا بھی یہی طریقہ تھا اور اب بھی بعض مسلم خواتین اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ کا نام لگانا ہی پسند کرتی ہیں۔ اسلامی طرز عمل کو اختیار کرنے میں خیر و برکت ہے۔ (واللہ اعلم)

زچگی کے اخراجات کا خاوند سے مطالبہ کرنا

سوال میری ہمشیرہ کے ہاں پہلے بچے کی پیدائش ہمارے ہاں ہوئی، ہم نے بچے کا عقیقہ کیا۔ کیا ہم بچے کی پیدائش اور

---

[1] ۳۳/الاحزاب:۵۔ [2] صحیح بخاری، الادب: ٦١٧٧۔ [3] شرح بخاری، ص: ۳٥٤، ج۹۔

عقیقہ پر اٹھنے والے اخراجات کا مطالبہ اپنے بہنوئی سے کر سکتے ہیں؟

جواب واضح رہے کہ نکاح کے بعد بیوی کے جملہ اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں، خواہ ان کا تعلق خور دونوش سے ہو یا علاج معالجہ یا لباس ورہائش وغیرہ سے ہو ان تمام اخراجات کا پورا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ ﴾ [1]

''کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے سے خرچ کرے۔''

رہائش کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ ﴾ [2]

''انہیں وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر معروف طریقہ کے مطابق ان عورتوں کو کھلانا پلانا اور انہیں لباس مہیا کرنا لازم ہے۔ [3]

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! عورتوں کا تم پر حق یہ ہے کہ تم انہیں لباس مہیا کرنے اور انہیں کھانا فراہم کرنے میں احسان کرو۔'' [4]

ان آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کا ہر خرچہ خاوند کے ذمہ ہے، لیکن ہماری مشرقی روایات کچھ اس طرح تشکیل پاتی ہیں کہ شادی کے بعد بھی شادی شدہ بیٹی کے اخراجات والدین کے ذمے پڑے رہتے ہیں، اگر والدین ان کا مطالبہ کریں تو غیر مروت اور غیر مہذب ہونے کے طعنے سننے پڑتے ہیں، اس لیے والدین بے چارے رواداری میں انہیں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ سوال میں ذکر کردہ اخراجات بھی اس قبیل سے ہیں، بچی کی شادی کے بعد اس کے ہاں پہلے بچے کی ولادت عام طور پر والدین کے ہاں ہوتی ہے۔ شرم وحیا اور نسوانیت کا کچھ تقاضا بھی یہی ہوتا ہے لیکن لڑکے والے والدین اور بچی کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ولادت پر جتنے بھی اخراجات آتے ہیں وہ بچی کے والدین ہی برداشت کرتے ہیں، خواہ بچے کی پیدائش گھر میں ہو، ہسپتال میں یا کسی پرائیویٹ کلینک میں، ڈاکٹر حضرات بھی ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں، دس پندرہ ہزار روپے تو معمولی بات ہے۔ پھر ولادت کے بعد اگر مذہبی ماحول ہے تو عقیقہ کے اخراجات بھی بچی کے والدین ہی برداشت کرتے ہیں۔ شرم کے مارے کچھ کہا بھی نہیں جاتا۔ حالانکہ ولادت وعقیقہ کے تمام اخراجات کو پورا کرنا شرعاً واخلاقاً خاوند کی ذمہ داری ہے پھر جب ولادت کے بعد بچی کو واپس خاوند کے گھر رخصت کرنا ہوتا ہے تو اس وقت بھی افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ باپ تمام اولاد کے درمیان مساوات قائم رکھنے کا پابند ہے، عید، بقر عید کے موقع پر ''عیدی'' کے نام سے بھی یہی کچھ کیا جاتا ہے۔ ہمارے

---

[1] ٦٥/الطلاق:٧۔ [2] ٦٥/الطلاق:٦۔ [3] صحیح مسلم، الحجه: ١٢١٨۔

[4] مسند امام احمد، ص: ٤٢٦، ج ٤۔

ہاں ایک اور بہت گندی رسم رائج ہے کہ جب بچی فوت ہوتی ہے تو اس کے کفن دفن کے اخراجات بھی بچی کے والدین پورا کرتے ہیں، حالانکہ اس بے چاری نے ساری عمر خاوند کی خدمتگاری میں گزاری ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرہ میں کفن کا بندوبست بچی کے والدین کے ذمہ ہوتا ہے۔ پھر کفن کے نام پر اسے سرخ رنگ کی چادر یا دوپٹہ دیا جاتا ہے گویا آج اسے گھر سے دلہن بنا کر رخصت کرنا ہے۔ اس قسم کی افراط تفریط ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے، بہرحال شادی کے بعد بیوی کے تمام اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں، اس لیے ولادت وعقیقہ اور کفن ودفن کے اخراجات خاوند کو پورے کرنے چاہئیں۔ (واللہ اعلم)

رسوائی سے بچنے کے لیے نکاح کرنا

سوال ایک لڑکے نے اپنی منگیتر سے بدکاری کی، گھر والوں نے رسوائی سے بچنے کے لیے ان کا فوراً نکاح کر دیا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب زانی مرد جس عورت سے زنا کرتا ہے اس کے ساتھ اس کا نکاح جائز ہے خواہ وہ اس کی منگیتر ہو یا اس سے منگنی نہ ہوئی ہو، جرم زنا اپنی جگہ پر بہت سنگین ہے تاہم اس سے ایک حلال چیز حرام نہیں ہوگی، لیکن اپنی منگیتر سے بدکاری کرنے کی صورت میں برائی سے بچنے کے لیے فوراً نکاح کر دینا صحیح نہیں ہے، اس بات کا یقین کر لینا ضروری ہے کہ منگیتر کا رحم خالی ہے، اس کے لیے ایک حیض آنے کا انتظار کرنا ہوگا، قرار حمل کی صورت میں وضع حمل کے بعد نکاح ہو سکے گا، کیونکہ حالت حمل میں نکاح کی ممانعت ہے خواہ وہ زنا کے نتیجہ میں قرار پایا ہو، بہرحال نکاح کے وقت رحم کا خالی ہونا اولین شرط ہے، اس کا یقین ہو جانے کے بعد نکاح ہو سکے گا، اگر نکاح کر دیا گیا ہے تو ان کے درمیان علیحدگی کرا دی جائے۔ (واللہ اعلم)

شب زفاف کی خبریں سننا

سوال ہمارے معاشرہ میں یہ بات رائج ہے کہ شادی کے بعد دولہا کے دوست وغیرہ شب زفاف کے متعلق اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس سے معلومات حاصل کرتے ہیں، ہمارے علم کے مطابق ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق اس کے متعلق آگاہ کریں؟

جواب شب زفاف میں بیوی سے متعلقہ حالات وواقعات بیان کرنا شرعاً حرام ہیں، بلکہ یہ خلاف مروت بھی ہیں، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں بدترین انسان وہ ہوگا جو بیوی سے جماع کرتا ہے اور وہ اس سے مباشرت کرتی ہے پھر وہ شخص اس عورت کا راز لوگوں میں پھیلاتا ہے۔''[1]

اس حدیث پر امام نووی نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''بیوی کے راز افشاں کرنا حرام ہے۔'' اس حدیث کی بنا پر دولہا میاں کو چاہیے کہ وہ شب زفاف کے حالات وواقعات کسی سے بیان نہ کرے بلکہ ان کے متعلق خاموشی اختیار کرے، مومن کی شان یہی ہے۔ اسی طرح دوست واحباب کو بھی چاہیے کہ وہ اس سے اس رات کے متعلق سوالات پوچھنے اور معلومات لینے سے

---

[1] صحیح مسلم، النکاح: ١٤٣٧۔

اجتناب کریں، کیونکہ ایسا کرنا شرعاً حرام ہے اور حرام فعل کا ارتکاب ایک مومن کے شایان شان نہیں۔

بچی کی پرورش کا حقدار کون؟

سوال میں شادی کے بعد سعودیہ چلا گیا جبکہ میری بیوی حاملہ تھی، جب اس نے بچی کو جنم دیا تو وہ دوران زچگی فوت ہو گئی، بچی اپنی نانی کے پاس رہی، میں چند دن کے بعد واپس آیا تو اپنی بیٹی کو اپنے پاس لے آیا، سسرال والوں نے عدالت میں مقدمہ کر دیا ہے، آپ وضاحت فرمائیں کہ بچی کے متعلق کون زیادہ حق دار ہے؟ میں بحیثیت باپ اس کی پرورش وتربیت خود کرنا چاہتا ہوں، قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب نوزائیدہ بچہ اپنی پرورش وتربیت میں دوسروں کا محتاج ہے اور مہلک وضرررساں اشیاء سے بچاؤ میں وہ خود کفیل نہیں' اس لیے ضروری ہے کہ جس میں بچے کے لیے بہتری اور خیر خواہی کا پہلو زیادہ ہو اسے اختیار کرنا چاہیے۔ اگر باپ کے مقابلہ میں ماں زیادہ صحیح تربیت اور اچھی طرح پرورش کر سکتی ہو نیز وہ غیرت مند عورت ہو تو ماں کو باپ پر ترجیح دی جائے گی اور اگر اس کے برعکس باپ میں یہ اوصاف موجود ہوں تو بچہ باپ کے حوالے کر دیا جائے گا، پھر وہی اس کی تربیت کا حقدار ہو گا۔ بہرحال بچے کی خیر خواہی اور بہبود کو مدنظر رکھنا ہو گا کیونکہ بچہ کم عقل اور ناعاقبت اندیش ہوتا ہے، چونکہ بچے کی پرورش وتربیت کے سلسلہ میں ماں زیادہ رحم دل اور بچے پر شفقت کرنے والی ہوتی ہے اس۔ لیے رسول اللہ ﷺ نے ماں کو یہ حق دیا ہے کہ بچے کی پرورش کرے۔ چنانچہ ایک ماں نے بچے کی پرورش کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میرے خاوند نے مجھے طلاق دے دی ہے اور مجھ سے اس بچے کو چھینتا ہے حالانکہ میرا پیٹ بچے کے لیے برتن، میری چھاتی اس کے لیے مشکیزہ اور میری آغوش اس کے لیے جائے قرار تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تک تو دوسرا نکاح نہیں کرتی، اس وقت تک تو ہی اس کی زیادہ حقدار ہے۔''[1]

واضح رہے کہ ماں کا یہ استحقاق عقد ثانی سے پہلے ہے، جب وہ نکاح کرے گی تو اس کا یہ حق ساقط ہو جائے گا۔ کیونکہ عقد ثانی کے بعد اس کی مصروفیات بچے کی پرورش اور تربیت میں حائل ہو جائیں گی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ماں کے ہاں ماحول اچھا نہیں، بچے پر برے اثرات مرتب ہونے کا اندیشہ ہے تو اسے بچے کی تربیت و پرورش کا حق نہیں دیا جائے گا، کیونکہ مقصد بچے کی تربیت و بہبود ہے، یہی وجہ ہے کہ ماں کی عدم موجودگی میں شریعت نے خالہ کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے بھانجے یا بھانجی کی پرورش کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ کی بیٹی کا فیصلہ اس کی خالہ کے حق میں دیا تھا اور فرمایا کہ خالہ، ماں کے درجہ میں ہے۔[2]

بچے کی صحیح پرورش اور اچھی تربیت کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ اگر ماں کے ہاں ماحول اچھا نہ ہو یا وہ آگے نکاح کر لیتی ہے یا اس کی عدم موجودگی میں خالہ بھی صحیح خیال نہیں رکھ سکتی تو بچہ باپ کی کفالت و پرورش میں رہے گا۔ صورت مسئولہ میں ماں فوت ہو چکی ہے، اب دیکھا جائے اور حالات کا جائزہ لیا جائے کہ بچی کی صحیح پرورش کہاں ہو سکتی ہے اور اس کی صالح تربیت کے مواقع

---

[1] ابوداود، الطلاق: ۲۲۷٦۔ [2] صحیح بخاری، الصلح: ۲٦۹۹۔

کہاں میسر ہیں، اگر نانی کے ہاں ایسے مواقع ہیں تو بچی کو اس کے ہاں رہنے دیا جائے اور اگر اس کے برعکس وہاں ماحول خراب ہے یا بچی کی پرورش کا وہاں صحیح بندوبست نہیں تو بچی کو باپ کے پاس رہنے دیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ استحقاق پرورش اس بچے کے متعلق ہیں۔ جو بچپن میں ہو اور ابھی سن شعور کو نہ پہنچا ہو لیکن وہ تمیز کی عمر کو پہنچ جائے تو صورت مسئولہ میں باپ کا ہی حق ہے، وہ بچی کا سرپرست ہے اور اس کی تعلیم و تربیت اور شادی وغیرہ کا بندوبست کرے گا۔ بہرحال بچے کی پرورش اور تربیت کو مدنظر رکھنا ہوگا وہ کہاں بہتر ہوسکتی ہے، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ بچہ جہاں بھی ہوگا ماں یا باپ یا کوئی دوسرا ہمدرد رشتہ دار اسے ملنا چاہے تو اس پر ہرگز پابندی نہ لگائی جائے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''رحم یعنی رشتہ ناطہ عرش سے لٹکا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ جو مجھے ملائے اللہ اسے ملائے اور جو مجھے کاٹے اللہ اسے کاٹے۔'' [1]

لہٰذا میل ملاپ پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ (واللہ اعلم)

نومولود کو گھٹی دینا

سوال ہمارے ہاں نومولود کو گھٹی دی جاتی ہے، اس کا کیا مقصد ہوتا ہے اور کیا طریق کار ہے، کیا یہ ضروری ہے کہ کسی نیک سیرت انسان سے گھٹی دلوائی جائے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب گھٹی کی تعریف یہ ہے کہ کوئی نیک سیرت آدمی کھجور یا اس جیسی کوئی میٹھی چیز چبائے، جب وہ باریک ہو جائے تو بچے کا منہ کھول کر اس کے حلق سے چپکا دی جائے تاکہ وہ اس کے پیٹ میں پہنچ جائے۔ یہ عمل مسنون اور مستحب ہے، مدنی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کا بایں طور پر اہتمام کرتے تھے کہ ان کے ہاں جب بھی بچہ پیدا ہوتا تو اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لاتے اور آپ ﷺ سے گھٹی دلواتے، تاکہ آئندہ اس نومولود میں اس نیک سیرت انسان کی جھلک نظر آسکے، جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

1. حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو میں اسے لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور کھجور کو اپنے منہ میں چبا کر نرم کیا پھر اسے نومولود کے منہ میں رکھا اور اس کے لیے خیر و برکت کی دعا کی۔ [2]
2. جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے انہیں لا کر رسول اللہ ﷺ کی گود میں رکھ دیا، رسول اللہ ﷺ نے کھجور منگوائی پھر اسے چبایا اور اسے نومولود کے منہ میں رکھ دیا۔ چنانچہ پہلی چیز جو بچے کے پیٹ میں گئی وہ رسول اللہ ﷺ کا لعاب مبارک تھا پھر آپ ﷺ نے اس کے لیے خیر و برکت کی دعا فرمائی۔ [3]
3. حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور ساتھ کھجوریں بھی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے کھجور کو منہ میں رکھ کر چبایا پھر انہیں اپنے منہ سے نکال کر بچے کے منہ میں رکھ دیا اور اس کا

---

[1] صحیح مسلم، البر وصلہ: ۲۵۵۵۔ [2] صحیح بخاری، العقیقہ: ۵۴۶۷۔ [3] صحیح بخاری، العقیقہ: ۵۴۹۔

نام عبداللہ رکھا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث سے گھٹی کے عمل کو ثابت کیا ہے، وہ یہ ہے کہ کھجور یا کوئی بھی میٹھی چیز کو چبا کر نرم کر کے نومولود کے منہ میں ڈالنا، اس کا مقصد ایمان کی نیک فال لینا ہے کیونکہ کھجور کے درخت کو مومن سے تشبیہ دی گئی ہے پھر میٹھی چیز کو رسول اللہ ﷺ پسند بھی کرتے تھے، لہٰذا اسی عمل سے حلاوت ایمان کے لیے نیک فال لینا ہے، خصوصاً گھٹی دینے والا نیک سیرت اور اچھی شہرت کا حامل ہو۔ بازار سے ''ہمدرد گھٹی'' بھی دستیاب ہے، لوگ اس سے گھٹی کا کام نکال لیتے ہیں لیکن یہ تو پیٹ کی صفائی کے لیے ہوتی ہے، اس سے مسنون گھٹی کا کام نہیں لیا جا سکتا، ہاں اگر کوئی نیک آدمی اسے اپنے منہ میں ڈال کر پھر نومولود کے منہ میں ڈالے تو صحیح ہے، بہر حال گھٹی کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

کھجور یا کوئی بھی میٹھی چیز شہد وغیرہ۔ کسی بزرگ کا انتخاب، وہ بزرگ اس میٹھی چیز کو پہلے اپنے منہ میں رکھے پھر اسے نومولود کے منہ میں ڈالے اور اس کے لیے خیر و برکت کی دعا کرے، امت کے اہل علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بچے کی ولادت کے موقع پر کھجور کے ساتھ گھٹی دینا مستحب عمل ہے اگر کھجور نہ مل سکے تو کسی بھی میٹھی چیز سے یہ عمل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کام کسی نیک سیرت، بزرگ انسان سے کرایا جائے۔

بچیاں جنم دینے پر طلاق دینا

سوال ہمارے معاشرہ میں بچی کی پیدائش کو اچھا خیال نہیں کیا جاتا بلکہ بعض دفعہ عورت کو بچیاں جنم دینے کی سزا میں طلاق دے دی جاتی ہے، ہماری اس سلسلہ میں راہنمائی کریں۔

جواب بچی یا بچے کی پیدائش میں انسان بے بس ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۙ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ﴾ [1]

''آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹوں سے نوازتا ہے اور جسے چاہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہے بانجھ کر دیتا ہے۔''

ہمارے معاشرہ میں بچی کی پیدائش پر اظہار ناپسندیدگی جاہلیت کا فعل ہے، اسلام نے اس کی حوصلہ شکنی کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ۚ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا

---

[1] ٤٢/الشوریٰ:٤٩۔٥٠۔

بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَیُمۡسِکُهٗ عَلٰی هُوۡنٍ اَمۡ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ ❶

''ان میں سے جب کسی کولڑکی کی پیدا ہونے کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہوجاتا ہے اور دل میں گھٹنے لگتا ہے، اس ''بری'' خبر کی وجہ سے لوگوں میں چھپنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اس ذلت کو برداشت کیے رکھے یا اسے مٹی میں دبا دے، یہ لوگ کیا ہی برے فیصلے کرتے ہیں۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بچی کی پیدائش پر غمگین اور پریشان ہونا ایک مسلمان کا کام نہیں بلکہ دور جاہلیت کا فعل ہے، جسے اسلام پسند نہیں کرتا بلکہ رسول اللہ ﷺ نے بچیوں کو اللہ کی رحمت قرار دیا ہے، ان کی اچھی پرورش اور تربیت کے نتیجہ میں جنت کی بشارت دی ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ایک عورت اپنی بچیوں کو ساتھ لیے مجھ سے کچھ مانگنے کے لیے آئی، میرے پاس اس وقت صرف ایک کھجور تھی، میں نے وہی اسے دے دی، اس نے کھجور کو دو حصوں میں تقسیم کرکے اپنی بچیوں کو دے دی اور خود نہ کھائی، اس کے بعد وہ اٹھ کر چلی گئی، جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ ﷺ کو یہ واقعہ سنایا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ان بچیوں کی وجہ سے خود کو کسی آزمائش میں ڈالا تو وہ اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔'' ❷

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس آدمی کی تین بیٹیاں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں، وہ ان کے معاملہ میں اللہ سے ڈرے اور ان سے اچھا سلوک کرے تو اللہ تعالیٰ اس آدمی کو جنت میں داخل کرے گا۔'' ❸

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بڑے عجیب انداز میں اس عمل کی فضیلت بیان فرمائی: ''جس شخص نے دو بیٹیوں کی پرورش کی تا آنکہ وہ بالغ ہوگئیں تو وہ شخص اور میں قیامت کے دن اس طرح آئیں گے، پھر آپ نے ﷺ نے سمجھانے کے لیے دو انگلیوں کو ملالیا۔ ❹ بہرحال بچیوں کی پیدائش پر ناراض ہونا، بیوی کو برا بھلا کہنا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کے فیصلہ سے خفا ہونا ہے، یہ انداز ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ ١٦/النحل: ٥٨۔٥٩۔ ❷ صحیح بخاری، الزکوٰۃ: ١٤١٨۔ ❸ مسند امام احمد، ص: ٤٢، ج٣۔
❹ مسند امام احمد، ص: ١٧٤، ج٣۔

عقیقہ و قربانی

عقیقہ و قربانی

اونٹ کو نحر کرنے کا مسنون طریقہ

سوال قربانی کے موقع پر اونٹ کو نحر کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق وضاحت کریں۔

جواب قرآن کریم کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کو ذبح کرنے کے بجائے نحر کرنا چاہیے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا﴾ [1]

''انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو، جب ان کے پہلو زمین سے لگ جائیں تو ان سے کھاؤ۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ''صواف'' کی تفسیر بایں الفاظ مروی ہے: ''اونٹ کی ایک ٹانگ باندھ کر اسے کھڑا کرنا ہے۔''

اس کے نحر کا طریقہ یہ ہے کہ اونٹ کا بایاں گھٹنا باندھ کر اسے تین ٹانگوں پر کھڑا کر دینا چاہیے، پھر کوئی تیز دھار چیز اس کی گردن پر ماری جائے، جب آہستہ آہستہ خون بہہ جائے اور اونٹ ایک طرف گر جائے تو اس کی کھال وغیرہ اتار دی جائے، یہ طریقہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اونٹ کی بائیں ٹانگ باندھ کر نحر کرتے تھے اور وہ باقی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا تھا۔ [2]

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ اونٹ نحر کیے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ اونٹوں کی گردنوں میں اپنے ہاتھ میں موجود چھوٹا نیزہ مارتے تھے۔ [3]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جس نے اونٹ کو ذبح کرنے کی غرض سے اسے بٹھا رکھا تھا انہوں نے اسے دیکھ کر فرمایا: اس کا گھٹنا باندھ کر اسے کھڑا کرو، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت ہے۔ [4]

بہر حال اونٹ کو ذبح کرنے کے بجائے اسے نحر کرنا چاہیے جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں اس کا طریقہ بیان ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)

کیا قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ جائز ہے

سوال کیا قربانی کے جانور میں لڑکی کے عقیقہ کے لیے حصہ رکھا جا سکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب موجودہ مادہ پرستی کے دور میں ہمارے دل و دماغ پر معاشی مفادات کی اہمیت بری طرح سوار ہو گئی ہے، اب

---

[1] ۲۲/الحج: ۳۶۔ [2] ابوداود، لمناسك: ۱۷٦۷۔

[3] صحيح مسلم، الحج: ۱۲۱۸۔ [4] صحيح بخاری، الحج: ۱۷۱۳۔

ہماری نظر میں معاشی اقتدار کے علاوہ کسی چیز کی قدر باقی نہیں رہی، مندرجہ بالا سوال میں بھی اسی طرح کی سوچ کارفرما ہے، حالانکہ عقیقہ ایک الگ عبادت ہے جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے اور نعمت اولاد پر اس کا شکر ادا کرنے کے لیے بچے کی پیدائش کے ساتویں روز جانور ذبح کرنے کی صورت میں ادا کی جاتی ہے، نومولود کی طرف سے مستقل طور پر ایک جانور ذبح کرنا ہوتا ہے تاکہ اسے گروی سے آزاد کیا جائے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض گروی ہوتا ہے لہٰذا پیدائش کے ساتویں روز اس کا عقیقہ کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور سر کے بال منڈوائے جائیں۔'' ❶

لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کے سوال کرنے پر اس طرح کا حکم دیا تھا۔ ❷

ہمارے رجحان کے مطابق قربانی کے جانور میں اس طرح کا اشتراک صحیح نہیں ہے، عقیقہ کے لیے الگ سے جانور ذبح کرنے کا اہتمام کیا جائے، عبادات کے سلسلہ میں اس طرح کی ''بچت سکیم'' کو نظرانداز کر دینا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

مقروض کے لیے قربانی کا حکم

سوال میں مقروض ہوں لیکن قربانی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا مزید قرض لے کر قربانی کر سکتا ہوں، قرآن و حدیث میں میرے لیے کیا حکم ہے؟

جواب شریعت اسلامی میں تلاش بسیار کے باوجود ہمیں ایسی کوئی دلیل نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ مقروض شخص قربانی نہیں کر سکتا یا قرض لے کر قربانی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قرض لینے کے بعد اسے جلد از جلد اتارنے کی کوشش کرنی چاہیے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''ابن آدم کی جان قرض کی وجہ سے معلق رہتی ہے تاآنکہ اسے ادا کر دیا جائے۔'' ❸

اسی طرح ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں اللہ کی راہ میں لڑتے لڑتے شہید ہو جاؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: ''جنت ملے گی، جب وہ واپس جانے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جبرئیل نے ابھی ابھی میرے کان میں کہا ہے کہ ایسے حالات میں قرض معاف نہیں ہو گا۔'' ❹

قرض کے متعلق اس قدر سخت وعید کے باوجود اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ اگر مقروض شخص قربانی کرے گا تو اس کی قربانی قبول نہیں ہو گی بلکہ قربانی ایک ایسی عبادت ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے بہت ترغیب دلائی ہے، اس لیے اگر مقروض شخص بھی قربانی جیسی عبادت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے تو اسے ضرور ایسا کرنا چاہیے، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنے خزانہ غیب سے قرض اتارنے کی کوئی سبیل پیدا کر دے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ ابو داود، الضحایا: ۲۸۲۸۔ ❷ مسند امام احمد، ص: ۳۸۱، ج۶۔
❸ مسند امام احمد، ص: ۵۰۱، ج۲۔ ❹ مسند امام احمد، ص: ۳۲۵، ج۳۔

ناجائز آمدن سے قربانی کرنا

سوال کیا سود، رشوت اور دیگر ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ رقم سے قربانی کرنا جائز ہے، کیا ایسا کرنے سے قربانی کرنے والے کو کوئی ثواب ملے گا؟۔

جواب قربانی کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ پاکیزہ اور حلال مال سے خریدی گئی ہو جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاکیزہ چیز کو ہی قبول کرتا ہے۔ 1

نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور نہ ہی صدقہ خیانت کے مال سے قبول ہوتا ہے۔ 2

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جیسے وضو کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حرام مال سے کیا صدقہ بھی قبول نہیں ہوتا۔ سود کا مال بھی حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے سود سے باز نہ آنے والوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ﴾ 3

''اگر تم سود سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے، کھلانے، لکھنے اور اس کے متعلق گواہی دینے والے کو ملعون قرار دیا ہے۔ 4

اسی طرح رشوت اور دیگر ناجائز ذرائع کا معاملہ ہے، یہ سب حرام ہیں اور حرام مال سے خریدی ہوئی قربانی قبول نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر کرتا ہے، جس کا سر پراگندہ اور قدم غبار آلود ہیں وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر دعا کرتا ہے اور کہتا ہے: اے میرے پروردگار! جبکہ اس کا کھانا پینا حرام، اور حرام مال سے اسے غذا ملی ہے ایسے حالات میں اس کی دعا کیسے قبول کی جائے؟ 5

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کو حلال مال کا اہتمام کرنا چاہیے اور حلال مال سے ہی قربانی خرید کر اللہ کی خاطر اسے ذبح کرنا چاہیے۔ حرام مال سے خرید کردہ قربانی نہ صرف رد کر دی جائے گی بلکہ قیامت کے دن اس کے لیے وبال جان بن جائے گی۔ (واللہ اعلم)

غیر موجود کی طرف سے قربانی کرنا

سوال کیا غائبانہ طور پر کسی شخص کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے جبکہ دوسرے شخص کو اس کا علم بھی نہ ہو، قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

---

1 مسلم، الزکوٰۃ: ۲۳۴۶۔ 2 مسلم، الطھارۃ: ۵۳۵۔ 3 ۲/البقرۃ: ۲۷۹۔
4 صحیح مسلم، البیوع: ۴۰۹۳۔ 5 مسلم، الزکوٰۃ: ۲۳۴۶۔

جواب اپنے علاوہ کسی زندہ شخص کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی تھی۔ [1] جس زندہ کی طرف سے قربانی کی جائے اسے بتانا یا اس کے علم میں لانا ضروری نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہم منیٰ میں خیمہ زن تھے کہ میرے پاس گائے کا گوشت لایا گیا، میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو مجھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے گائے کی قربانی دی ہے۔ [2] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زندہ افراد کی طرف سے قربانی کی جا سکتی ہے، ایک دوسری حدیث میں بھی کی اس وضاحت ہے۔ حضرت عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے قربانی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے ایک بکری ذبح کرتا تھا جسے وہ یعنی اہل خانہ خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ [3]

بہرحال شریعت میں یہ مسئلہ ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص، زندہ افراد یعنی گھر والے یا دوست احباب کی طرف سے قربانی کرنا چاہے تو کرسکتا ہے اور جس کی طرف سے قربانی کی جاتی ہے اسے علم ہونا ضروری نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

قربانی نہ کرنے والے کے لیے ناخن اور بال کاٹنا

سوال جو شخص قربانی نہ کرنا چاہتا ہو کیا اس پر ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد ناخن اور بال کاٹنے کی پابندی ہے؟ قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب جس شخص نے قربانی کرنی ہے اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بال اور اپنے ناخن کاٹے جب کہ ماہ ذوالحجہ کا چاند طلوع ہو چکا ہو تا آنکہ وہ قربانی کرلے جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ اپنے بال اور ناخن کاٹنے سے رُک جائے۔ [4]

ایک دوسری روایت میں مزید وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس قربانی کا کوئی جانور ہو، وہ ذوالحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد قربانی کر لینے تک ہرگز اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔ [5]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کرنے والے کے لیے ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد قربانی ذبح کرنے تک اپنے بال یا ناخن کاٹنا حرام ہے اگرچہ کچھ علماء اس کے متعلق کچھ نرم گوشہ رکھتے ہیں تاہم بیان کردہ مؤقف ہی اقرب الی الحدیث ہے لیکن جس شخص نے قربانی نہیں کرنی ہے، اس پر اس قسم کی پابندی لگانا کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ قربانی کا اجر حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ عید کے دن اپنے بال اور ناخن کاٹ لے، اپنی موچھیں پست کرے اور زیر ناف بال بھی صاف کرے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے یوم الاضحیٰ کو عید منانے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے مقرر فرمایا ہے، ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اگر مجھے قربانی کے لیے

---

[1] صحیح بخاری، الاضاحی: ۵۵۵۹۔ [2] صحیح بخاری: ۵۵٤۸۔ [3] ترمذی، الاضاحی: ۱۵۰۵۔
[4] صحیح مسلم، الاضاحی: ۵۵٦۹۔ [5] مستدرك حاکم، ص: ۲۲۰، ج٤۔

دودھ دینے والے جانور کے علاوہ کوئی دوسرا جانور میسر نہ آئے تو کیا میں اسے ذبح کر دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں لیکن عید کے دن تم اپنے بال اور ناخن تراش لینا، اپنی مونچھیں کاٹ لینا اور زیر ناف بال مونڈ لینا، اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ تیری مکمل قربانی ہو جائے گی۔ [1]

اگرچہ کچھ محققین نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے تاہم یہ حسن درجہ کی ہے اور فضائل اعمال میں اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

بھینس کی قربانی

سوال ہمارے علاقہ میں بھینس کی قربانی بکثرت کی جاتی ہے حالانکہ دوسرے جانور دستیاب ہوتے ہیں، اس کے متعلق ہماری رہنمائی کریں۔

جواب قرآن کریم کے مطابق ایسے جانوروں کی قربانی دینی چاہیے جن پر ''بہیمۃ الانعام'' کا لفظ بولا جاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ﴾ [2]

''ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کے طریقے مقرر کیے ہیں تاکہ وہ مویشی قسم کے ان چوپائیوں پر اللہ تعالیٰ کا نام لیں جو اللہ نے انہیں دے رکھے ہیں۔''

اور الانعام میں چار قسم کے نر اور مادہ جانور شامل ہیں۔

1 اونٹ، 2 گائے، 3 بھیڑ (دنبہ) 4 بکری۔

قرآن کریم نے صراحت کی ہے کہ یہ چوپائے آٹھ قسم کے ہیں یعنی دو، دو بھیڑوں میں سے اور دو، دو بکریوں میں سے (نر اور مادہ)......اور دو، دو، اونٹوں دو گائیوں میں سے (نر اور مادہ) [3]

ہمارے رجحان کے مطابق قربانی کے سلسلہ میں صرف انہی جانوروں پر اکتفاء کیا جائے جن پر بہیمۃ الانعام کا لفظ بولا جا سکتا ہے اور وہ صرف اونٹ، گائے، بھیڑ (دنبہ) اور بکری ہیں۔ چونکہ بھینس ان جانوروں میں شامل نہیں ہے لہٰذا اس سے اجتناب بہتر ہے۔ اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ یا آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھینس کی قربانی ثابت نہیں ہے اور جو اہل علم بھینس کی قربانی کے قائل اور فاعل ہیں وہ صرف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بھینس کو گائے کی جنس کہتے ہیں یا گائے پر اسے قیاس کرتے ہیں حالانکہ بھینس ایک الگ جنس ہے۔ ان کے دودھ اور گوشت کی تاثیر بھی الگ الگ ہے پھر قیاس کے لیے کوئی علت مشترک ہونی چاہیے جو ان میں نہیں پائی جاتی۔ ہم کہتے ہیں کہ گائے کی قربانی رسول اللہ ﷺ کے قول، عمل اور تقریر تینوں طریقوں سے ثابت ہے لہٰذا گائے، اونٹ اور بکری کی ہی قربانی دی جائے، حافظ عبداللہ روپڑی مرحوم نے اس سلسلہ میں بڑا اچھا موقف اختیار کیا ہے کہ قربانی کے سلسلہ میں احتیاط اور واضح موقف یہی ہے کہ بھینس کی قربانی نہ دی جائے بلکہ مسنون قربانی اونٹ، گائے، بھیڑ، (دنبہ) اور بکری

---

[1] ابو داود، الضحایا: ۲۷۸۹۔ [2] ۲۲/الحج: ۳٤۔
[3] ٦/الانعام: ١٤٣، ١٤٤۔

سے کی جائے۔ جب یہ جانور دستیاب ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے مشتبہ امور سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ’’دع ما یریبك الی ما لا یریبك‘‘ (واللہ اعلم)

بغیر دانت کا جانور قربانی کرنا

سوال ہمارے ہاں ایک بکرا ہے جس کے پیدائشی طور پر دانت نہیں ہیں تو اس کے متعلق دو دانتہ ہونے کا کیسے پتہ چلایا جائے؟

جواب قربانی کے لیے ضروری ہے کہ جس جانور کی قربانی کرنی ہو وہ مویشی جانوروں میں سے دو دانتہ ہو جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’تم دو دانتہ جانور کے علاوہ کوئی دوسرا ذبح نہ کرو، ہاں اگر تمہیں تنگی ہو تو بھیڑ کا (ایک سال کا) کھیرا بھی ذبح کیا جا سکتا ہے۔[1]

واضح رہے کہ اونٹوں میں دو دانتہ پانچویں سال میں، گائے میں عمر کے اعتبار سے تیسرے سال میں اور بکری وغیرہ میں عمر کے لحاظ سے دوسرے سال میں ہوتا ہے، اس سے کم عمر والے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ اگر صحت اور علاقہ کے لحاظ سے اس عمر سے کم میں کوئی دو دانتہ ہو جاتا ہے تو اسے قربانی کے طور پر ذبح کیا جا سکتا ہے۔ صورت مسئولہ بہت ہی شاذ و نادر ہے ہمارے رجحان کے مطابق اس کے لیے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔

1. اس سے ملتے جلتے بکرے جب دو دانتہ ہو جائیں تو بغیر دانت والا بکرا ان پر قیاس کرتے ہوئے قربانی کے طور پر ذبح کیا جا سکتا ہے۔
2. اگر اس کا انداز نہ ہو سکے تو وہ ایک سال مکمل ہونے کے بعد جب دوسرے سال میں ہو جائے تو اس کی قربانی ان شاء اللہ جائز ہو گی۔ (واللہ اعلم)

قربانی کی بجائے اُس کا عوض صدقہ کرنا

سوال کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قربانی ذبح کرنے کی بجائے اگر اس کی قیمت صدقہ کر دی جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے اس کے متعلق شرعی ضابطہ کی وضاحت کر دیں۔

جواب قربانی ایک ایسا عمل ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم نے اختیار کیا ہے، اگر قربانی ذبح کرنے کی بجائے اس کی قیمت صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس کی وضاحت کر دیتے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت نہیں ہے، اگر قربانی کے بجائے اس کی قیمت صدقہ کرنا شروع کر دی جائے تو یہ سنت ہی ختم ہو جائے گی، حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’دس ذوالحجہ کو خون بہانے سے بڑھ کر ابن آدم اللہ کے ہاں کوئی عمل بہتر نہیں کرتا۔‘‘[2]

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قربانی کی قیمت صدقہ کرنے سے قربانی افضل ہے۔[3]

---

[1] صحیح مسلم، الاضاحی: ۱۹۶۳۔ [2] ترمذی، الاضاحی: ۱۴۹۳۔ [3] المغنی، ص: ۳۶۱، ج۱۳۔

ہمارے رجحان کے مطابق قربانی کے دنوں میں قربانی ہی کی جائے کیونکہ اس میں سنت کا احیاء، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقہ کی اقتداء ہے۔ (واللہ اعلم)

دو تھن والی گائے کی قربانی

سوال ہم نے قربانی کے لیے ایک گائے خریدی ہے جس کے پیدائشی طور پر دو تھن ہیں، کیا اس طرح کی گائے قربانی کے لیے جائز ہے؟

جواب قربانی کے لیے درج ذیل عیوب کا خیال رکھنا چاہیے۔

❶ واضح طور پر آنکھ سے کانا ہونا یعنی وہ ایک آنکھ کی بینائی سے محروم ہو۔ ❷ ایسا بیمار جس کی بیماری نمایاں اور ظاہر ہو۔

❸ ایسا لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔ ❹ ایسا کمزور جس میں چربی کا نشان تک نہ ہو۔

❺ اس کا سینگ ٹوٹا ہوا اور کان کٹا ہوا ہو۔

اسی طرح وہ جانور جو کھیرا ہو اسے بھی قربانی کے طور پر ذبح نہیں کیا جا سکتا، ہاں اگر دو دانتہ دستیاب نہ ہو یا مالی حیثیت اس کی اجازت نہ دیتی ہو تو بھیڑ کا کھیرا بچہ ذبح کیا جا سکتا ہے، اگر کسی مادہ جانور کا تھن خراب ہے یا پیدائشی طور پر اس کے دو تھن ہیں تو یہ کوئی ایسا عیب نہیں ہے جو قربانی کے لیے رکاوٹ ہو، ایسا جانور ذبح کیا جا سکتا ہے قرآن و حدیث میں اس کے عیب دار ہونے کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

عقیقہ کرنے کے بجائے رقم غرباء کو دے دینا

سوال بچے کی پیدائش پر عقیقہ کرنے کے بجائے اگر اس کی قیمت کسی غریب کو دے دی جائے تاکہ وہ اپنی اس رقم سے کوئی ضرورت پوری کرے تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں راہنمائی کریں۔

جواب عقیقہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض گروی ہوتا ہے، پیدائش کے ساتویں دن اس کا عقیقہ کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور سر کے بال منڈوائے جائیں۔'' [1]

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاد ایک بہت بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت کا شکر ادا کرنا ضروری قرار دیا ہے، اس لیے شریعت نے بچے کی پیدائش کے ساتویں روز عقیقہ مشروع قرار دیا ہے تاکہ اللہ کی نعمت کے حصول پر اس کا شکر بھی ادا ہو جائے اور اقرباء اور دوست واحباب کی ضیافت کے ساتھ ساتھ غرباء اور مساکین کا بھی فائدہ ہو جائے۔ ہمارے رجحان کے مطابق جانور کی قیمت کسی غریب کو دینے کے بجائے جانور ہی ذبح کرنا چاہیے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جانور ہی ذبح کرنے کا حکم دیا ہے اور عملی طور پر حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی پیدائش پر جانور ہی ذبح کیے تھے، اس کے متعلق روایات میں بہت تاکید آئی ہے، اس لیے ولیمہ اور قربانی کی طرح جانور کو ذبح کرنا ہی افضل ہے۔ اتباع سنت کا یہی تقاضا ہے کہ عقیقہ کی رقم کسی کو دینے کی بجائے

---

[1] ابو داود، الضحایا: ۲۸۳۹۔

جانور ہی ذبح کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

ذبح کا طریقہ

سوال کیا جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ کے بعد تین مرتبہ اللہ اکبر پڑھنا چاہیے یا ایک مرتبہ اللہ اکبر کہا جائے؟ شریعت کے مطابق اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا بیان کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔''

پھر آپ نے ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نماز عید کے بعد اپنی قربانی کو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔'' [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا چاہیے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک دوسرا عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''ذبح کے وقت اللہ اکبر کہنا'' پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے قربانی ذبح کرتے اور ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہتے۔ [2]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ذبح کرتے وقت صرف ''بسم اللہ اللہ اکبر'' پڑھنا چاہیے۔ تین مرتبہ اللہ اکبر پڑھنے کا ذکر کتب حدیث میں مروی نہیں ہے لہٰذا سنت پر عمل کرتے وقت صرف ایک مرتبہ اللہ اکبر پڑھا جائے۔ (واللہ اعلم)

قربانی کتنے دن تک جائز ہے؟

سوال قربانی کتنے دنوں تک کی جا سکتی ہے، کیا تیرہ ذوالحجہ کو قربانی کرنا جائز ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیا جائے۔

جواب قربانی، عید کے بعد تین دن تک کی جا سکتی ہے، عید دسویں ذی الحجہ کو ہوتی ہے، اس کے بعد تین دنوں ایام تشریق کو ذبح کے دن قرار دیا گیا ہے۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمام ایام تشریق ذبح کے دن ہیں۔'' [3]

اگرچہ اس روایت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ منقطع ہے لیکن امام ابن حبان اور امام بیہقی نے اسے موصول بیان کیا ہے اور علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ [4]

بعض فقہاء نے عید کے بعد صرف دو دن تک قربانی کی اجازت دی ہے، ان کی دلیل درج ذیل امر ہے:

قربانی، یوم الاضحیٰ کے بعد دو دن تک ہے۔ [5]

---

[1] صحیح بخاری، الذبائح: ۵۵۰۰۔ [2] صحیح بخاری، الاضاحی: ۵۵۶۵۔ [3] مسند امام احمد، ص: ۸۲، ج ۴۔
[4] صحیح الجامع الصغیر: ۴۵۳۷۔ [5] بیہقی، ص: ۲۹۷، ج ۹۔

لیکن یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کی مرفوع حدیث کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا یہ قابل حجت نہیں ہے، علامہ شوکانی نے اس کے متعلق پانچ مذاہب ذکر کیے ہیں پھر اپنا فیصلہ بایں الفاظ لکھا ہے: تمام ایام تشریق ذبح کے دن ہیں اور وہ یوم النحر کے بعد تین دن ہیں۔ [1]

واضح رہے کہ پہلے دن قربانی کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اسی پر عمل پیرا رہے ہیں، لہٰذا بلاوجہ قربانی ذبح کرنے میں دیر نہ کی جائے اگرچہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ غرباء و مساکین کو فائدہ پہنچانے کے لیے تاخیر کرنا افضل ہے لیکن یہ محض ایک خیال ہے، جس کی کوئی منقول دلیل نہیں ہے، نیز اگر کسی نے تیرہ ذوالحجہ کو قربانی کرنی ہو تو غروب آفتاب سے پہلے پہلے قربانی ذبح کر دے کیونکہ غروب آفتاب کے بعد اگلا دن شروع ہو جاتا ہے۔

عقیقہ کے لیے کون سا جانور بہتر ہے؟

سوال کیا عقیقہ کے لیے بکری کی جنس ضروری ہے یا گائے، اونٹ بھی عقیقہ کے لیے ذبح کرنا جائز ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب عقیقہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ لڑکا ہو تو اس کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے۔ [2] عربی زبان میں ''شاۃ'' کا لفظ بھیڑ اور بکری دونوں پر بولا جاتا ہے، اس میں دنبہ بھی شامل ہے، حضرت ام کرز رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم پر کوئی ضروری نہیں کہ عقیقہ کے جانور نر ہوں یا مادہ۔'' [3]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے عقیقہ میں بھیڑ بکری نر مادہ دونوں جائز ہیں، عقیقہ میں گائے یا اونٹ ذبح کرنے کے متعلق جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ گائے یا اونٹ ذبح کیا جا سکتا ہے۔ [4] جمہور کی طرف سے ایک روایت پیش کی جاتی ہے کہ بچے کی طرف سے اونٹ، گائے اور بکری سے عقیقہ کیا جا سکتا ہے۔ [5] لیکن یہ روایت انتہائی کمزور ہے، اس میں ایک مسعدہ بن یسع نامی راوی، محدثین کے ہاں ضعیف ہے، امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں مسعدہ بن یسع راوی کذاب ہے۔ [6]

ہمارے رجحان کے مطابق صحیح روایات میں لفظ شاۃ آیا ہے جو بھیڑ اور بکری کو شامل ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ عقیقہ کرتے وقت انہی جانوروں پر اکتفا کیا جائے، اونٹ ذبح کرنے کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کراہت منقول ہے چنانچہ ام المومنین کے بھائی حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا آپ اپنے بھتیجے کی طرف سے اونٹوں کا عقیقہ کریں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ کی پناہ، اللہ کے رسول ﷺ نے تو ایسا نہیں فرمایا، آپ نے تو شاتان فرمایا ہے، میں تو وہی کام کروں گی جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔'' [7]

اونٹ کے عقیقہ کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے معاذ اللہ پڑھ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی عقیقہ کرتے

---

[1] نیل الاوطار، ص: ۱۲۵، ج۵۔ [2] جامع ترمذی، الاضاحی: ۱۵۱۳۔ [3] جامع ترمذی، الاضاحی: ۱۵۱٦۔
[4] نیل الاوطار، ص: ۵۰٦، ج۳۔ [5] طبرانی صغیر، ص: ۸٤، ج۱۔ [6] مجمع الزوائد، ص: ٦۱، ج٤۔
[7] بیہقی، ص: ۳۰، ج۹۔

وقت رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کے فرمان کو پیش نظر رکھنا چاہیے چونکہ صحیح احادیث میں صرف بھیڑ بکری کا ذکر ملتا ہے لہٰذا عقیقہ میں صرف انہی جانوروں کو ذبح کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

بغیر سینگ کے جانور قربان کرنا

سوال ہمارے ہاں جو جانور رکھے جاتے ہیں، ان کے جب سینگ نکلنے کے قریب ہوتے ہیں تو تیزاب یا کسی اور کیمیکل کے ذریعے انہیں ختم کر دیا جاتا ہے کیا ایسے جانور کی قربانی جائز ہے؟

جواب جانور کے سینگ ختم کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ ہے کہ انہیں اگنے سے پہلے ہی کسی کیمیکل وغیرہ سے ختم کر دیا جائے اور دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگنے کے بعد انہیں ختم کرایا جائے۔ پہلی صورت میں ایسا جانور قربانی کے لیے ذبح کیا جا سکتا ہے جب کہ دوسری صورت میں ایسا جانور قربانی کے لیے ذبح نہیں کرنا چاہیے جس کے سینگ توڑ دیئے گئے ہوں چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے جانور کی قربانی سے منع فرمایا ہے جس کا کان اور سینگ کٹا ہوا ہو۔ [1]

لہٰذا ایسے جانور کی قربانی سے اجتناب کرنا چاہیے جس کے سینگ نکل آنے کے بعد ختم کر دیئے گئے ہوں کیونکہ ایسا جانور مذکورہ بالا حدیث کے حکم میں آتا ہے، اگر سینگ اگنے سے پہلے ہی کسی طرح ان کا صفایا کر دیا جائے تو ایسا جانور قربانی کے لیے جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

حاملہ جانور کی قربانی

سوال حاملہ جانور کی قربانی کے متعلق کیا حکم ہے، اگر معلوم ہو کہ اس کے پیٹ میں بچہ ہے تو کیا ایسا جانور قربانی کے لیے ذبح کیا جا سکتا ہے؟

جواب حاملہ جانور کو بطور قربانی ذبح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے جانور کے پیٹ میں بچے کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو اسے کھا سکتے ہو، ہم نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! ہم اونٹنی، گائے اور بکری ذبح کرتے ہیں تو ہم اس کے پیٹ میں بچہ پاتے ہیں، کیا ہم اسے پھینک دیں یا اسے کھا لیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو اسے کھا سکتے ہو کیونکہ اس کا ذبح، اس کی ماں کا ذبح کرنا ہی ہے۔'' [2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حاملہ جانور خواہ اونٹنی ہو یا گائے یا بکری اسے قربانی کے لیے ذبح کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس کی ممانعت کے متعلق کوئی حدیث کتب حدیث میں مروی نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

اونٹ کیسے نحر کیا جائے؟

سوال قرآن و حدیث کی روشنی میں اونٹ ذبح کرنے کا کیا طریقہ ہے تفصیل سے بیان کریں، ہمارے ہاں اس کے متعلق کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔

---

[1] ابو داود، الضحایا: ۲۸۰۵۔ [2] ابو داود، الضحایا: ۲۸۲۸۔

جواب اونٹ کو ذبح نہیں کیا جاتا بلکہ اسے نحر کیا جاتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا اگلا بایاں پاؤں باندھ کر اسے تین ٹانگوں پر کھڑا کر دیا جائے پھر کوئی تیز دھار آلہ مثلاً چھری، چاقو، نیزہ یا برچھی اس کی گردن میں ماردی جائے، جب خون بہنے کے بعد وہ ایک طرف گر جائے تو اس کی کھال اتار کر گوشت بنالیا جائے، چھری مارتے وقت ذبح کرنے کی دعا پڑھ لی جائے۔ نحر کرنے کے بعد اس کی گردن پر دوبارہ چھری چلانے کی ضرورت نہیں ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرے جس نے اونٹ کو ذبح کرنے کی غرض سے بٹھا رکھا تھا، ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس کا گھٹنا باندھ کر اسے کھڑا کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت ہے۔'' [1]

اس طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اونٹ کی بائیں ٹانگ باندھ کر اسے نحر کرتے تھے اور وہ اپنی باقی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا تھا۔ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں وضاحت ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تریسٹھ اونٹ نحر کیے۔ آپ ان کی گردنوں میں اپنے ہاتھ سے چھوٹا نیزہ مارتے تھے۔ [3] اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا﴾ [4]

''ہم نے تمہارے لیے اونٹوں کو اللہ کی نشانیاں بنادیا ہے، ان میں تمہارے لیے خیر و برکت ہے، انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو پھر جب ان کے پہلو زمین پر لگ جائیں تو اسے کھاؤ۔''

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کو کھڑے کھڑے نحر کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

اونٹ کی قربانی میں حصہ داروں کی تعداد؟

سوال اونٹ کی قربانی میں کتنے آدمی شریک ہو سکتے ہیں؟ ہمارے ہاں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اونٹ میں گائے کی طرح سات ہی حصہ دار ہو سکتے ہیں۔

جواب اونٹ کی قربانی میں دس افراد جبکہ گائے کی قربانی میں سات افراد شریک ہو سکتے ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں ہمراہ تھے تو قربانی کا وقت آ گیا، ہم اونٹ میں دس آدمی اور گائے میں سات آدمی شریک ہوئے۔ [5]

اس سلسلہ میں ایک دوسری حدیث بھی مروی ہے: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مقام ذوالحلیفہ میں تھے، مال غنیمت کے طور پر بکریاں اور اونٹ ہمارے ہاتھ لگے، لوگوں نے جلدی جلدی انہیں ذبح کر کے

---

[1] صحیح بخاری، الحج: ۱۷۱۳۔ [2] ابوداود، المناسک: ۱۷۶۷۔
[3] صحیح مسلم، الحج: ۱۲۱۸۔ [4] ۲۲/الحج: ۳۶۔ [5] ابن ماجہ، الاضاحی: ۳۱۳۱۔

ہانڈیاں چڑھا دیں، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے ہانڈیوں کو الٹ دینے کا حکم دیا پھر آپ نے دس بکریوں کو ایک اونٹ کے برابر قرار دے کر انہیں تقسیم کیا۔ [1] البتہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''گائے سات آدمیوں کے طرف سے اوراونٹ بھی سات آدمیوں کی طرف سے قربان کیا جائے۔'' [2]

اس کے متعلق علما کا مؤقف ہے کہ ان کا تعلق ھدی سے ہے یعنی ان سے مراد وہ قربانی ہے جو حج کے موقع پر کی جاتی ہے، اس موقع پر ایک اونٹ میں صرف سات آدمی ہی شریک ہو سکتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے رخصت ہے، صاحب استطاعت اونٹ میں سات اور مالی لحاظ سے کچھ کمزور حضرات اونٹ میں دس شریک ہو سکتے ہیں۔ اکیلا آدمی بھی اونٹ اور گائے کی قربانی کر سکتا ہے۔ بہر حال اونٹ میں دس افراد شریک ہو سکتے ہیں، اسے سفر کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، نیز اگر استطاعت ہو تو سات آدمی بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ البتہ ھدی کے اونٹ میں سات افراد ہی شریک ہوں گے۔ (واللہ اعلم)

اونٹ کی قربانی میں حصہ داروں کی وضاحت

سوال اونٹ کی قربانی میں کتنے حصے ہیں، ہمارے حضرات کا کہنا ہے کہ اس میں بھی گائے کی طرح سات حصے ہوتے ہیں جبکہ قبل ازیں ہم اونٹ میں دس حصے رکھتے تھے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب قربانی کے لیے جو جانور ذبح کیے جاتے ہیں ان کی دو اقسام ہیں۔ ❶ ہدی ❷ اضحیہ

ھدی: وہ جانور ہے جو حرم کی طرف لایا جائے اور حرم میں ہی ذبح کیا جائے، یہ مناسک حج سے ہے۔

اضحیہ: اس جانور کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے تقرب کے لیے عید اور ایام تشریق میں ذبح کیا جائے۔

اگر اونٹ کو ہدی کے طور پر ذبح کرنا ہے تو اس میں سات حصے ہو سکتے ہیں جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا: ''ہم اونٹ اور گائے کی قربانی میں سات سات افراد شریک ہو جائیں۔'' [3]

واضح رہے کہ مذکورہ حکم رسول اللہ ﷺ نے حج کے موقع پر دیا تھا جیسا کہ حدیث کے آغاز سے معلوم ہوتا ہے اگر اونٹ کو بطور اضحیہ ذبح کرنا ہے تو اس میں دس حصوں کی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے تو قربانی کا وقت آ گیا، ہم اونٹ میں دس آدمی اور گائے میں سات آدمی شریک ہوئے۔ [4]

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ دس بکریوں کو ایک اونٹ کے برابر قرار دیا تھا۔ [5]

کچھ علما کا یہ موقف ہے کہ اللہ کی طرف سے ایک اونٹ میں دس یا سات آدمیوں کی شرکت ایک رخصت ہے، یعنی اونٹ میں دس آدمی بھی شریک ہو سکتے ہیں اور سات بھی، ویسے اگر استطاعت ہو تو اکیلا آدمی بھی ایک اونٹ یا گائے کی قربانی کر سکتا ہے۔ جیسا

---

[1] صحیح بخاری، الشرکہ: ۲۵۰۷۔ [2] ابوداود، الضحایا: ۲۸۰۸۔

[3] صحیح مسلم، الحج: ۱۲۱۳۔ [4] ابن ماجہ، الاضاحی: ۳۱۳۱۔

[5] صحیح بخاری، الشرکۃ: ۲۵۰۷۔

کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کی تھی۔ [1]

بہر حال عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی دینے کے لیے ایک اونٹ میں دس آدمی شریک ہو سکتے ہیں، اگر اونٹ میں سات حصے رکھے جائیں تو بھی جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

بڑی قربانی سے کیا مراد ہے؟

سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ [2]

''ہم نے ایک بڑی قربانی بطور فدیہ دے کر اسے چھڑا لیا۔''

اس بڑی قربانی سے کیا مراد ہے؟ بعض لوگ اس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی مراد لیتے ہیں، وضاحت فرمائیں۔

جواب حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق متعدد اسرائیلی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کے بیان کے بعد کسی روایت کی ضرورت نہیں رہتی۔ چنانچہ اس واقعہ کو ایک ''نمایاں کارنامہ'' کٹھن امتحان کے طور پر بیان کیا ہے اور ذبح عظیم کا بطور فدیہ ذکر کیا ہے البتہ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ذبح عظیم سے مراد ایک مینڈھا تھا۔ [3]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آواز دی گئی کہ آپ نے اپنا خواب سچا کر دکھایا ہے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک سفید رنگ کا سینگوں اور سرگیں آنکھوں والا مینڈھا ذبح ہوا پڑا ہے۔ [4]

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی قربانی کے لیے مینڈھوں کی یہی قسم تلاش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ایک طویل روایت ہے جس سے محدثین کرام نے کئی ایک مسائل کو مستنبط کیا ہے، ہمارے نزدیک ذبح عظیم سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ مراد لینا ایک خاص مکتب فکر کے حاملین کا کشید کردہ مسئلہ ہے، احادیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس کے خلاف واقعہ ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت اور شہادت سے ہزاروں سال پہلے ذبح عظیم کا واقعہ ہو چکا تھا۔ (واللہ اعلم)

عشرہ ذی الحجہ میں ناخن و بال نہ کاٹنا

سوال ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد بال اور ناخن نہ کاٹنے کی پابندی تمام مسلمانوں کے لیے ہے یا صرف وہ شخص پابندی کرے جس نے قربانی کرنی ہے؟

---

[1] ابن ماجہ، الاضاحی: ۳۱۳۵۔ [2] ۳۷/الصافات: ۱۰۷۔
[3] البدایہ والنہایہ، ص: ۱۴۹، ج ۴۔ [4] مسند امام احمد، ص: ۲۹۷، ج ۱۔

جواب جو شخص قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اسے چاہیے کہ ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے تا آنکہ اپنی قربانی کرے اور جس شخص کا قربانی کرنے کا ارادہ نہیں، اس کے لیے بال اور ناخن کاٹنے کی ممانعت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، البتہ قربانی کرنے والے کے لیے مذکورہ ممانعت احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی قربانی کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ اپنے ناخن اور بال کاٹنے سے رک جائے۔'' ❶

جس کے پاس قربانی کے لیے کوئی جانور ہو وہ ذوالحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد قربانی کر لینے تک اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔ ❷

اس بنا پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف ہے کہ قربانی کرنے والے کے لیے ذوالحجہ کے ابتدائی دس دنوں کے دوران بال یا ناخن کاٹنا حرام ہے۔ ❸

بہرحال ذوالحجہ کا چاند طلوع ہونے کے بعد ناخن یا بال نہ کاٹنے کی پابندی صرف اس شخص کے لیے ہے جو قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور جس کا قربانی دینے کا ارادہ نہیں ہے، اس کے لیے یہ پابندی نہیں، ہاں ایسا شخص اگر قربانی کا ثواب لینا چاہتا ہے تو وہ عید کے روز اپنے بال اور ناخن تراش لے، مونچھیں کاٹ لے اور زیر ناف بال صاف کر لے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں اس امر کی صراحت ہے۔ ❹

عقیقہ میں مادہ یا نر جانور ذبح کرنا

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ لڑکی کے عقیقہ میں مادہ اور لڑکے کے عقیقہ میں نر جانور ذبح کیے جائیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب لڑکی کے لیے مادہ اور لڑکے کے لیے نر جانور ذبح کرنے کی تفصیل کتاب وسنت میں نہیں ہے بلکہ اس تفصیل کے بغیر عقیقہ کے لیے نر اور مادہ دونوں طرح کے جانور ذبح کیے جا سکتے ہیں جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ام کرز رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیقہ کے متعلق سنا آپ نے فرمایا: ''لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے، یہ جانور نر ہوں یا مادہ تمہیں کوئی چیز نقصان نہیں دے گی۔'' ❺

اس حدیث کے مطابق عقیقہ کے لیے نر یا مادہ جانور کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ لوگوں کا خود ساختہ معلوم ہوتا ہے۔

قربانی کی شرعی حیثیت

سوال قربانی کی شرعی حیثیت کیا ہے، کیا اسے واجب کہنا صحیح ہے، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا تصریحات ہیں؟

جواب قربانی کے فرض یا سنت ہونے کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے احناف کا مؤقف ہے کہ قربانی ہر صاحب

---

❶ مسند امام احمد، ص: ٢٨٩، ج٦۔ ❷ بیهقی، ص: ٢٦٦، ج٩۔ ❸ المغنی لا بن قدامه، ص: ٩٦، ج١١۔
❹ مستدرك حاكم، ص: ٢٢٣، ج٤۔ ❺ ابوداود، العقيقه: ٢٨٣٥۔

استطاعت پر واجب ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں سنت مؤکدہ ہے، ہمارے رجحان کے مطابق قربانی سنت مؤکدہ ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''قربانی کے سنت ہونے کا بیان'' پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قربانی سنت ہے اور یہ امر مشہور ہے۔

اس کے بعد ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''جس نے نماز کے بعد جانور ذبح کیا اس کی قربانی مکمل ہوئی اور وہ مسلمانوں کی سنت کو پہنچا۔'' [1]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے سنت ہونے کے متعلق ایک عنوان قائم کیا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں: ''اس باب کی دلیل کہ قربانی کرنا سنت ہے'' البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے متعلق بایں الفاظ تاکید فرمائی ہے: ''جس کے پاس وسعت وطاقت ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔'' [3]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ وجوب کے قائل حضرات کے قول سے کراہت کرتے ہوئے قربانی نہیں کرتے تھے۔ [4]

بہر حال قربانی کی مشروعیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بلاشبہ یہ سنت مؤکدہ ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کے وجوب کی کوئی دلیل ثابت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] بخاری، الاضاحی: ٥٥٤٦۔ [2] ترمذی، الاضاحی باب نمبر ١١۔ [3] ابن ماجہ، الاضاحی: ٢٥٣٢۔
[4] بیہقی، ص: ٢٦٥، ج٩۔

زینت و لباس

زینت و لباس
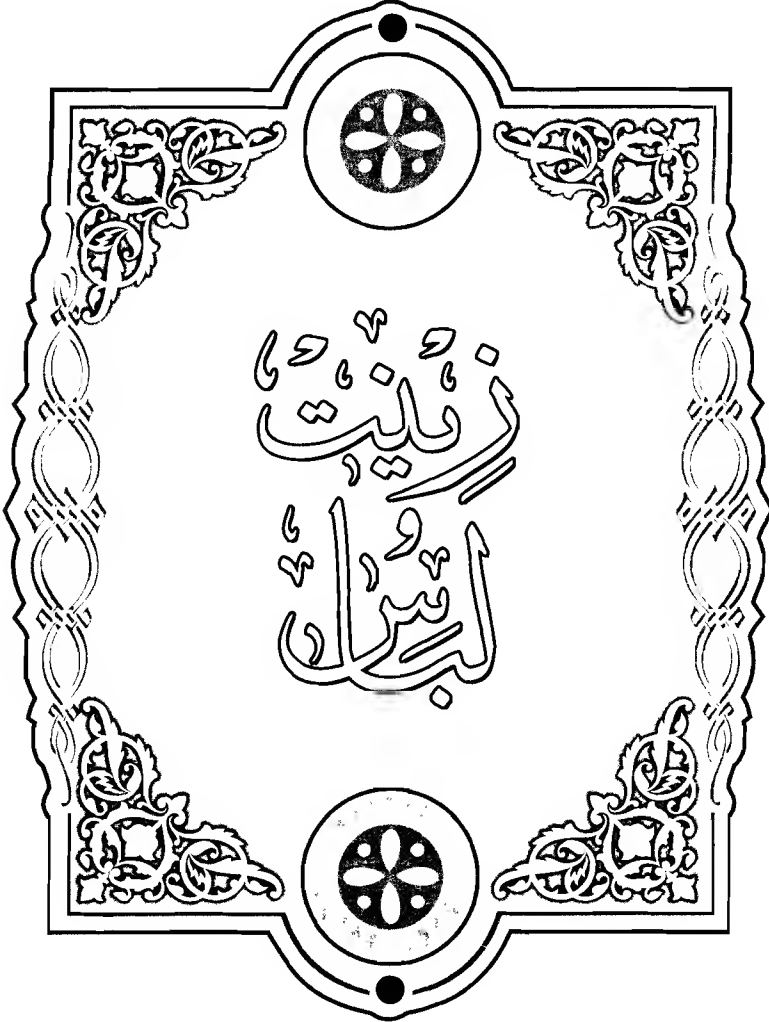
عریانی والے بازار میں جانا

سوال آج کل تجارتی بازاروں میں صورت حال یہ ہوتی ہے کہ عورتیں عریاں قسم کا لباس پہنے ہوئے ہوتی ہیں، وہاں مردوزن کا اختلاط بھی ہوتا ہے، اس قسم کے بازار میں جانے کا کیا حکم ہے؟

جواب اس قسم کے بازار میں ضرورت کے بغیر جانا درست نہیں ہے، ویسے بھی بازار کا شوروشغب ایک مسلمان کے لیے موزوں نہیں، بالخصوص جب وہاں اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہونا پڑے جو سوال میں ذکر کی گئی ہے، تاہم اگر سخت ضرورت کے پیش نظر وہاں جانا ناگزیر ہو تو درج ذیل امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ❶ نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے، مسلمان کے لیے یہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔ ❷ نظریں جھکاتے ہوئے اور اسباب فتنہ سے بچتے ہوئے وہاں سے گزرے۔ ❸ اپنے دین اور عزت کی حفاظت کی حرص لے کر اور شر کے وسائل سے دور رہتے ہوئے وہاں جائے اگر اس میں طاقت ہو تو اس قسم کے بازار میں برائی سے روکنے کے لیے جانا باعث اجروثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس امت کے متعلق فرماتا ہے:

﴿وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ١ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۰۰۱۰۴﴾ [1]

’’تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیروبھلائی کی طرف لوگوں کو دعوت دے، نیکی کی تلقین کرے اور برے کاموں سے روکے، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ’’جب لوگ برائی دیکھنے کے بعد اسے نہیں روکیں گے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا میں انہیں بھی شامل کر لے۔‘‘ [2]

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ’’تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے اس کی برائی بیان کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اپنے دل میں ہی اسے برا خیال کرے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔‘‘ [3]

ان آیات واحادیث کے پیش نظر ایک مسلمان کسی سخت ضرورت کے پیش نظر بازار میں جا سکتا ہے البتہ اسے درج بالا آداب کو ضرور ملحوظ رکھنا ہوگا۔‘‘ (واللہ اعلم)

---

❶ ٣/آل عمران: ١٠٤۔ ❷ ابن ماجه، الفتن: ٤٠٠٥۔

❸ ابن ماجه، الفتن: ٤٠١٣۔

سیاہ لباس کی شرعی حیثیت

سوال کیا سیاہ لباس پہنا جا سکتا ہے؟ اور کیا ٹھیکے پر کام کرنا جائز ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب سیاہ لباس پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس ممانعت کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے بلکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود سیاہ لباس زیب تن فرمایا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک چادر کو سیاہ رنگ دیا، آپ ﷺ نے اسے زیب تن فرمایا مگر جب اس میں پسینہ آیا تو آپ ﷺ نے اس میں اون کی بساند محسوس کی، پھر آپ ﷺ نے اسے اتار دیا کیونکہ آپ ﷺ کو عمدہ خوشبو ہی پسند آتی تھی۔ [1]

بلکہ بعض روایات میں اس کی مزید تفصیل ہے کہ جب آپ ﷺ نے سیاہ لباس زیب تن فرمایا تو آپ ﷺ کا سفید رنگ اور جبہ کا سیاہ رنگ ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں کبھی آپ ﷺ کے سفید مکھڑے کو دیکھتی اور کبھی جبہ کی سیاہ رنگت کو دیکھتی پھر پسینہ کی وجہ سے ناگواری ہوا آنے لگی تو آپ ﷺ نے اسے اتار پھینکا۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام خالد رضی اللہ عنہا کو خود اپنے دست مبارک سے سیاہ چادر پہنائی پھر خود ہی اس کی تحسین فرمائی۔ [3]
رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے سیارہ رنگ کی پگڑی پہن رکھی تھی، یہ فتح مکہ کے موقع کی بات ہے۔ [4] البتہ محرم کے ایام میں یا کسی مصیبت کے وقت سیاہ رنگ کا لباس پہننے سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ سیاہ رنگ اور لباس کو ایک مخصوص گروہ نے ان ایام میں اظہار سوگ کی علامت قرار دے دیا ہے جبکہ اظہار سوگ کے اس طریقے یا علامت کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

☆ فقہاء کی اصطلاح میں ٹھیکے پر کام کرنے کو اجارہ کہا جاتا ہے اور ٹھیکہ ہر اس کام میں جائز ہے جس سے شریعت نے منع نہ کیا ہو، نیز ٹھیکہ کا معاوضہ اور اس کی مدت کا معلوم ہونا ضروری ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مزدوری پر کام کرتے تھے نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تمام انبیا علیہم السلام بکریاں چراتے رہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ فرمایا: ہاں! میں بھی اہل مکہ کی بکریاں چند قیراط کے عوض چرایا کرتا تھا۔ [5]

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے سفر میں ایک آدمی کو راستہ کی راہنمائی کے لیے ''اجرت'' پر رکھا تھا، حالانکہ وہ شخص مشرک تھا۔ [6]

یہ حدیث بھی ٹھیکہ کے جائز ہونے کی دلیل ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑا عنوان ''کتاب الاجارہ'' قائم کیا ہے، جس میں ٹھیکہ کے متعدد پہلو اور ان کی مشروعیت بیان کی ہے، اس لیے ٹھیکے پر کام کرنا جائز ہے بشرطیکہ معاوضہ اور کام کی مدت معلوم ہو۔'' (واللہ اعلم)

---

[1] ابوداود، اللباس: ٤٠٧٤۔ [2] مسند امام احمد، ص: ١٣٢، ج٦۔ [3] بخاری، اللباس: ٥٨٢٣۔
[4] ابوداود، اللباس: ٤٠٧٤۔ [5] صحیح بخاری، الاجارہ: ٢٢٦٢۔ [6] صحیح بخاری، الاجارہ: ٢٢٦٣۔

کسی سے پردہ کرنا کسی سے نہ کرنا

سوال میری ہمشیرہ گھر میں رہتے ہوئے ہمارے بہنوئی سے پردہ کرتی ہے لیکن جب اکیڈمی میں پڑھانے کے لیے جاتی ہے تو وہاں موجود سٹاف یعنی مرد اساتذہ سے پردہ نہیں کرتی، اس کے متعلق قرآن وحدیث کی تعلیمات سے آگاہ کریں تاکہ ہماری ہمشیرہ جب پڑھانے کے لیے اکیڈمی جائے تو وہاں بھی پردہ کی پابندی کرے۔

جواب اللہ تعالیٰ نے مرد وزن کا دائرہ عمل الگ الگ متعین کیا ہے تاکہ عملی زندگی میں کسی موقع پر ٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہو، کیونکہ اس ٹکراؤ میں جذبات و ہیجان میں بے راہ روی کا امکان ہے، خواتین کا دائرہ عمل اندرون خانہ مقرر کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ [1]

''اور اپنے گھروں میں قرار پکڑے رہو، پہلے دور جاہلیت کی طرح اپنی زیب وزینت کا اظہار نہ کرتی پھرو۔''

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے لیے اصلی مقام اس کا گھر ہی ہے، اس لیے جہاد، مسجد میں باجماعت نماز کی ادائیگی اس پر فرض نہیں ہے، لیکن ہمارے ہاں عورت کو مردوں کے شانہ بشانہ چلانے کی غیر فطری کوشش کی جاتی ہے، پھر ظلم کی انتہا یہ ہے کہ مرد وزن کے اختلاط کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ گھر کی چار دیواری کی مالک ومختار ہے، گھر کے اندر تمام سرگرمیاں اس کے ماتحت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کو اندرون خانہ حجاب کی پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور مرد حضرات کو تاکید گئی ہے کہ وہ گھر میں داخل ہونے سے قبل اجازت لیں خواہ وہ گھر ان کی حقیقی ماں ہی کا کیوں نہ ہو، اس کے مقابلہ میں مرد کا دائرہ کار بیرون خانہ ہے تاکہ اللہ کی وسیع زمین میں شریعت کی پابندی کرتے ہوئے ہر قسم کے کام سرانجام دے۔ میدان عمل کی اس تقسیم کے باجود مرد وعوت کی ایک دوسرے کے میدان عمل میں آمدورفت ناگزیر ہے، ہمارے معاشرہ میں اس کا موقع اکثر وبیشتر آتا رہتا ہے، ایسے حالات میں عورت کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ مرد کی اس آزاد مملکت میں جب قدم رکھے تو حجاب کے ساتھ ساتھ غض بصر کی مکمل پابندی کرے اور مرد حضرات کو بھی غض بصر کا پابند کیا گیا ہے تاکہ باہم نظروں کے ملنے یا ایک دوسرے کو دیکھنے سے ان میں صنفی کشش کی تحریک پیدا نہ ہو۔ غض بصر، اسلام کا ایسا پاکیزہ قانون ہے کہ اسے اختیار کرنے سے انسانی معاشرہ فواحش، منکرات اور دیگر خباثتوں سے نجات پا کر پاک وصاف ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''عورت ہر لحاظ سے قابل ستر ہے، جب وہ گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اسے تاکتا ہے، تاہم اس کا اپنے گھر کے گوشہ میں رہنا اللہ کی رحمت کا باعث ہے۔'' [2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کو عریاں حالت میں دیکھ کر مرد شیطانی جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے لہٰذا عورت کو چاہیے کہ جب وہ کسی مجبوری کے پیش نظر گھر سے نکلے تو وہ مرد کو اپنی طرف متوجہ کرنے والے تمام محرکات وعوامل سے اجتناب کرے، مرد حضرات کو تاکید کی گئی ہے کہ اگر انہیں نامحرم خواتین سے کوئی چیز مانگنے کی ضرورت پیش آئے تو پردے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر

---

[1] ۳۳/الاحزاب: ۳۳۔ [2] صحیح ابن خزیمہ: ۱۶۸۵۔

مانگی جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ﴾ ❶

’’اگر تمہیں کچھ مانگنا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب ہے۔‘‘

اس تمہید کے بعد ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں تو انتہائی تکلیف دہ معاملہ سامنے آتا ہے، یعنی ایک بیٹی گھر میں رہتے ہوئے اپنے بہنوئی سے پردہ کرتی ہے، لیکن جب وہ اکیڈمی میں پڑھانے کے لیے جاتی ہے تو وہاں مرد اساتذہ سے پردہ نہیں کرتی، حالانکہ پردے کے احکام ہر مقام پر یکساں ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے، ہمارے لیے یہ بات انتہائی تعجب کا باعث ہے کہ عورت نے اپنے دائرہ عمل سے باہر قدم رکھا ہے، اگر کوئی ایسی مجبوری ہے تو ایسی اکیڈمی میں پڑھانے کا شوق پورا کر لیا جائے جہاں عملہ خواتین پر مشتمل ہو، اگر کسی مقام پر مردوں کا سامنا کرنا پڑے تو اپنے ستر وحجاب کی پابندی ناگزیر ہے، اس میں عورت کی عزت وناموس اور عصمت وعفت کی حفاظت ہے، بہر حال پردہ عورت کے لیے ایسی حفاظتی جیکٹ ہے جو مردوں کی طرف سے نگاہ کے زہر آلود تیروں سے بچاتی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیٹی کو گھر اور باہر ہر جگہ شرعی پردہ کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

خوبصورتی کے لیے سونا چاندی کے برتن رکھنا

سوال کیا سونے اور چاندی کے برتن خوبصورتی اور زینت کے لیے گھر میں رکھنا جائز ہیں یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا اور پینا تو بالاتفاق جائز نہیں ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور نہ ہی ان سے بنی ہوئی پلیٹوں میں کھاؤ، کیونکہ دنیا میں یہ کافروں کے لیے ہیں اور آخرت میں ہمارے لیے ہیں۔ ❷

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو شخص چاندی کے برتنوں میں (کھاتا) پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔‘‘ ❸

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہر چیز میں اصل حلت ہے، جس کی حرمت موجود نہیں وہ حلال ہے، اس لیے چاندی اور سونے کے برتنوں کو کھانے پینے کے علاوہ کسی بھی استعمال کے لیے رکھا جا سکتا ہے۔ ❹ لیکن ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے کی حرمت بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے یہ برتن کافروں کے لیے دنیا میں ہیں اور ہمارے لیے آخرت میں ہیں، اس بنا پر ہمارا رجحان ہے کہ یہ کھانے پینے کے علاوہ گھر کی خوبصورتی کے لیے بھی نہ رکھے جائیں کیونکہ اس میں اپنے مال کی نمود ونمائش اور اسراف وتبذیر ہے۔ اس بنا پر سونے اور چاندی کے برتنوں سے اجتناب کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ ۳۳/الاحزاب: ۵۲۔ ❷ صحیح بخاری، الاطعمہ: ۵٤۲٤۔

❸ بخاری، الاشربۃ: ۵٦۳٤۔ ❹ نیل الاوطار، ص: ۱۲۷۔

گنجے پن کی دوا لینا

سوال آج کل گنجے پن کا ایک علاج دریافت ہوا ہے کہ بال اگائے جاتے ہیں، ایسا علاج شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب بالوں کی پیوندکاری تو حرام ہے یعنی مصنوعی بالوں کو دوسرے بالوں کے ساتھ جوڑنا مصنوعی بالوں کو ہی استعمال کرنا شرعاً یہ فعل حرام اور ناجائز ہے، انصار کی ایک لڑکی بیمار ہوئی تو اس کے بال گر گئے، اہل خانہ نے مصنوعی بال پیوند کرنے کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اس عورت پر جو بال پیوند کرتی ہے یا کراتی ہے۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جب حج سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ تشریف لائے تو انہیں مصنوعی بالوں کا گچھا ملا تو انہوں نے خطبہ دیا اور فرمایا: ''اے اہل مدینہ! تمہارے علماء کدھر ہیں؟ بنی اسرائیل کی ہلاکت اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ ان کی عورتوں نے ان مصنوعی بالوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔'' [1]

البتہ بال اگانے کا طریقہ طب جدید کا کشید کردہ ہے، یہ مصنوعی نہیں بلکہ اس طریقہ سے حقیقی بال اگائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے علاج میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس کے متعلق وہ حدیث بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ فرشتے نے ایک گنجے کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا تو اس کے خوبصورت بال اُگ آئے تھے، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے۔'' [2]

اس حدیث کے پیش نظر ہمارا رجحان ہے کہ بالوں کو کاشت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ پیوندکاری حرام ہے۔

ریشم کا بستر بنانا

سوال ریشم پہننے کے متعلق اسلام کا کیا موقف ہے؟ کیا اس کا گدا وغیرہ بنایا جاسکتا ہے جسے نیچے بچھایا جائے؟ اس کے متعلق تفصیل سے لکھیں۔

جواب ریشم کا استعمال شرعاً جائز نہیں ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے: ''ریشم مت پہنو کیونکہ جس نے اسے دنیا میں پہناوہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔'' [3]

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ ریشمی لباس لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اسے آپ خرید لیں، عید اور وفود کے موقع پر زیب تن کیا کریں، آپ نے فرمایا: ''یہ لباس تو ان لوگوں کا ہے جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔'' [4]

بعض اہل علم نے پہلی حدیث کے پیش نظر مطلق طور پر اسے حرام قرار دیا ہے جب کہ کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ عورتوں کے لیے

---

[1] صحیح بخاری، اللباس: ٥٩٣٢۔ [2] صحیح بخاری، احادیث الانبیاء: ٣٤٦٤۔

[3] صحیح بخاری، اللباس: ٥٧٣٤۔ [4] بخاری، اللباس: ٥٧٣٥۔

اس کا استعمال جائز ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سونے اور ریشم کے متعلق فرمایا: ''یہ دونوں اشیاء میری امت کے مردوں کے لیے حرام ہیں۔'' (1) چھوٹے بچے چونکہ مکلف نہیں ہوتے اس لیے اگر وہ ریشم پہن لیں تو گنہگار نہیں ہوں گے البتہ پہنانے والے ضرور گنہگار ہوں گے۔ کسی عذر کی بنا پر مرد حضرات بھی ریشم پہن سکتے ہیں جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو خارش کی وجہ سے ریشم پہننے کی اجازت دی تھی۔ (2) اگر ریشم کسی دوسرے کپڑے کے ساتھ ملا ہوا ہو تو اسے پہننے میں اختلاف ہے لیکن ہمارا رجحان ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے مگر تین چار انگلی کے برابر ریشم استعمال کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے دو، تین یا چار انگلیوں سے زیادہ ریشم پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (3)

اسی طرح ریشم کے گدے اور لحاف وغیرہ بنانا جائز نہیں ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں موٹا اور باریک ریشم پہننے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (4) اس حدیث سے معلوم ہوا ہے کہ ریشم کے گدے بنا کر ان پر بیٹھنا یا لیٹنا حرام ہے، اگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سامنے نہ ہوتی تو بھی اس سے گدے اور لحاف بنانے کا جواز کشید نہیں کیا جا سکتا کیونکہ لغوی اور شرعی اعتبار سے یہ پہننے میں ہی شامل ہے۔ (واللہ اعلم)

دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا

سوال انگوٹھی کس ہاتھ میں پہنی جا سکتی ہے اسے کس انگلی میں پہننا چاہیے؟ قرآن و حدیث کی رو سے اس کی وضاحت کریں۔

جواب انگوٹھی دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں میں پہنی جا سکتی ہے البتہ بہتر ہے کہ اسے دائیں ہاتھ میں پہنا جائے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ اپنے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔'' (5)

اگرچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ (6)

تاہم علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو شاذ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ بائیں کے بجائے دائیں ہاتھ کے الفاظ محفوظ ہیں۔ (7)

تاہم ان (حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ) کا عمل یہ ہے کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ (8)

اس بنا پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہنی جائے لیکن اگر کوئی بائیں ہاتھ میں پہنتا ہے تو صحابی کے عمل سے اسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے، البتہ انگشت شہادت اور درمیانی انگلی میں انگوٹھی نہ پہنی جائے کیونکہ اس کی ممانعت احادیث میں مروی ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس اور اس یعنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی میں انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا۔ (9) (واللہ اعلم)

---

(1) ابوداود، اللباس: ٤٠٥٧۔ (2) بخاری، اللباس: ٥٨٣٩۔ (3) صحيح مسلم، اللباس والزينة: ٢٠٦٩۔
(4) بخاری، اللباس: ٥٨٣٧۔ (5) ابوداود، الخاتم: ٤٢٢٦۔ (6) ابوداود، الخاتم: ٤٢٢٧۔
(7) ضعيف ابی داود: ٩٠٨۔ (8) ابوداود، الخاتم: ٤٢٢٨۔ (9) ابوداود، الخاتم: ٤٢٢٥۔

سیاہ لباس پہننا

سوال کیا سیاہ لباس اہل جہنم کا لباس ہے اور مرد حضرات اسے استعمال نہیں کر سکتے؟ اس کے متعلق وضاحت درکار ہے، قرآن وحدیث کے مطابق راہنمائی فرمائیں۔

جواب لباس کے متعلق عمومی اسلامی ہدایت یہ ہیں کہ اسراف وتکبر سے اجتناب کرتے ہوئے جو میسر ہو پہن لیا جائے اس میں چنداں حرج نہیں ہے، البتہ دینِ اسلام میں سفید لباس کو پسند کیا گیا ہے جو وقار کی علامت ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادگرامی ہے: ''سفید لباس پہنو یہ زیادہ پاک صاف ہوتا ہے اور اپنے مردوں کو اسی میں کفن دو۔'' [1]

سیاہ رنگ کا لباس، اس کی ممانعت کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے یا سیاہ لباس اہل جہنم کا ہے، اس کے متعلق بھی تلاش بسیار کے باوجود ہمیں کوئی حدیث نہیں ملی، بلکہ محدثین کرام نے سیاہ لباس پہننے کے متعلق عنوانات قائم کیے ہیں، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''سیاہ چادر پہننے کا بیان۔'' [2]

پھر آپ نے اس کے تحت حضرت ام خالد رضی اللہ عنہا کے متعلق ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے انہیں سیاہ چادر پہنائی اور اس کی تحسین فرمائی۔ [3] حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو سیاہ رنگ کی چادر زیب تن کیے ہوئے دیکھا تھا۔ [4]

ان احادیث سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''سیاہ رنگ کے لباس کا بیان۔'' [5] پھر آپ نے اسے ثابت کرنے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک چادر کو سیاہ رنگ سے رنگ دیا جسے آپ نے زیب تن فرمایا۔ [6] بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے لیے سیاہ رنگ کا جبہ تیار کیا تھا جسے آپ نے پہنا۔ [7]

بعض روایات میں اس کی مزید تفصیل ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اس سیاہ لباس کو زیب تن فرمایا تو آپ کا سفید رنگ اور جبہ کا سیاہ رنگ ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔ [8]

پھر جب پسینہ آنے کی وجہ سے اس سے ناگوار بساند آنے لگی تو آپ نے اسے اتار دیا۔ [9] رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر سیاہ پگڑی بھی باندھی تھی۔ [10] لیکن ایام محرم یا کسی مصیبت کے وقت سیاہ رنگ کا لباس پہننے سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ ہمارے ہاں ایک مخصوص طبقہ نے سیاہ رنگ اور سیاہ لباس کو اظہار سوگ کی علامت بنا لیا ہے جسے وہ ماتمی لباس کہتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ترمذی، الادب: ۲۸۱۰۔ [2] صحیح بخاری، اللباس، باب نمبر: ۲۱۔ [3] بخاری، اللباس، ۵۸۳۔
[4] صحیح بخاری، اللباس: ۵۸۲٤۔ [5] ابوداود، اللباس، باب نمبر: ۱۹۔ [6] ابوداود، اللباس: ٤۰۷٤۔
[7] مسند امام احمد، ص: ۳۵۰، ج٦۔ [8] مسند امام احمد، ص: ۱۳۲، ج٦۔ [9] ابوداود، اللباس: ٤۰۷٤۔
[10] صحیح مسلم، الحج: ۱۳۵۹۔

آداب و اخلاق

آداب و اخلاق

دوران نماز کسی دوسرے کا باآواز بلند تلاوت کرنا

سوال مسجد میں باآواز بلند قرآن مجید کی تلاوت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے جبکہ اس کی تلاوت دوسرے نمازیوں کے لیے تشویش کا باعث ہو قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب جب مسجد میں لوگ نماز پڑھ رہے ہوں، اور قرآن کی تلاوت ان نمازیوں کے لیے خلل کا باعث ہو تو ایسی حالت میں باآواز بلند تلاوت کرنا حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے آپ ایک مرتبہ مسجد میں تشریف لائے جبکہ لوگ اس طرح نماز پڑھ رہے تھے کہ تلاوت کرتے وقت ان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں تو آپ نے فرمایا: ''بے شک نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، لہٰذا تم میں سے ہر ایک کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے رب سے کیا سرگوشی کر رہا ہے؟ اور کوئی کسی سے بڑھ کر بلند آواز میں تلاوت نہ کرے۔'' [1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نمازیوں کے پاس باآواز بلند قرآن پاک کی تلاوت کرنا درست نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنا نمازیوں کے لیے تشویش کا باعث ہے۔

اجنبی عورت کو خلوت میں دم کرنا

سوال ہمارے ایک بزرگ دور کے رشتہ دار ہیں، وہ مختلف امراض میں مبتلا عورتوں کو دم کرتے ہیں، بعض اوقات عورت کی تشویش ناک حالت کے پیش نظر وہ کچھ دنوں کے لیے اپنے ہاں قیام کا بھی کہتے ہیں، ایسے حالات میں دم کروانے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب کسی بھی اجنبی عورت سے خلوت اختیار کرنا شرعاً حرام ہے۔ خواہ وہ تنہائی قرآنی دم کرانے کے لیے ہی کیوں نہ ہو، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''خبردار! جو آدمی بھی کسی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرتا ہے، ان دونوں میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔'' [2]

کسی اجنبی مرد کے ساتھ اجنبی عورت کی خلوت جائز نہیں ہے پھر سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ ایک غیر محرم کے پاس دم کرانے کے بہانے چند راتوں کا قیام کرنا، ہمارے نزدیک یہ قیام شر اور فساد کے وسائل میں شامل ہے، ہم مسلمانوں کو ایسے

---

[1] ابو داود، الصلوٰۃ: ۱۳۳۲۔ [2] ترمذی، الرضاع: ۲۱۶۵۔

کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے، جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت ہوتی ہو۔ (واللہ اعلم)

قرآن کریم کی بے وضو تلاوت کرنا

سوال تلاوت قرآن کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے یا بے وضو ہی قرآن پڑھا جا سکتا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب قرآن کریم کی تلاوت باوضو ہو کر کرنا بہتر اور افضل ہے، تاہم اسے بے وضو پڑھا جا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سو رہے تھے، جب رات کو بیدار ہوئے تو اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے صاف کیا اور سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات کو تلاوت فرمایا پھر لٹکے ہوئے مشکیزہ کی طرف بڑھے اور اچھی طرح وضو کیا پھر نماز شروع کر دی۔ [1]

اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یوں عنوان قائم کیا ہے۔ ''بے وضو ہونے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرنا'' اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان وضو کے بغیر قرآن مجید کی تلاوت کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ [2]

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان بے وضو تلاوت کر سکتا ہے، اگر وضو کی پابندی لگا دی جائے تو وہ بچے جو قرآن مجید یاد کرتے ہیں ان کے لیے بہت مشکل ہو گا، اس لیے ہمارا رجحان ہے کہ افضل اور بہتر ہے کہ انسان باوضو ہو کر تلاوت قرآن کرے تاہم اگر بے وضو ہے تو بھی قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

خاوند کی اجازت کے بغیر پیسے لینا

سوال ہمارے گھر میں اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا سب کچھ ہے، اس کے باوجود میرے خاوند گھریلو اخراجات کے متعلق بہت تنگ کرتے ہیں، ایسے حالات میں مجھے شرعاً اجازت ہے کہ میں گھریلو اخراجات کے لیے اپنے خاوند کی جیب سے اس کی اجازت کے بغیر پیسے نکال لوں۔

جواب نکاح کے بعد بیوی کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری خاوند پر عائد ہوتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''خوشحال کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اخراجات پورے کرے اور تنگدست اللہ کی دی ہوئی حیثیت کے مطابق خرچہ دے۔'' [3] اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی بات کی تلقین فرمائی ہے حدیث میں ہے: ''بیوی کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے اخراجات تمہارے ذمے ہیں۔'' [4] ان اخراجات میں کھانا، پینا، علاج، رہائش اور لباس وغیرہ شامل ہے، خاوند کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق ان اخراجات کو پورا کرے، اگر وہ ان اخراجات کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتا ہے یا بخل سے کام لے کر پورے ادا نہیں کرتا تو بیوی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی بھی طریقہ سے خاوند کی آمدن سے انہیں پورا کر سکتی ہے جیسا کہ حضرت ھند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا

---

[1] صحیح بخاری، الوضوء: ۱۸۳۔ [2] صحیح مسلم، الحیض: ۳۷۳۔
[3] ۶۵/الطلاق: ۷۔ [4] صحیح مسلم، الحج: ۲۹۵۰۔

نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے اپنے خاوند کے متعلق شکایت کی کہ میرا خاوند ابو سفیان رضی اللہ عنہ گھریلو اخراجات پورے ادا نہیں کرتا تو کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اس کی آمدن سے اتنی رقم اس کی اجازت کے بغیر لے لوں جس سے گھر کا نظام چل سکے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اس کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر اتنا لے سکتی ہو جس سے معروف طریقہ کے مطابق تیرے اور تیری اولاد کی گزر اوقات ہو سکے یعنی گھر کا نظام چل سکے۔ [1] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

''اگر خاوند اخراجات پورے نہ کرے تو بیوی کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اس قدر لے لے جس سے معروف طریقہ کے مطابق اہل خانہ کا گزارا ہو سکے۔'' مندرجہ بالا احادیث کے پیش نظر اگر خاوند گھریلو اخراجات کی ادائیگی میں کنجوسی کرتا ہے تو بیوی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اتنی رقم لے سکتی ہے جس سے گھر کا نظام چل سکے، لیکن یہ اجازت صرف ضروریات کے لیے ہے فضولیات کے نہیں نیز اگر ایسا کرنے سے بیوی خاوند کے درمیان اختلاف اور تعلقات کے کشیدہ ہونے کا اندیشہ ہے تو اس طریقہ سے اخراجات پورے نہیں کرنے چاہیے، کیونکہ بیوی خاوند کے تعلقات کی استواری مقدم ہے، اس بات کا فیصلہ بیوی خود کر سکتی ہے کہ ایسا کرنے سے تعلقات تو خراب نہیں ہوں گے، بہر حال ایسے حالات میں ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بیوی کو اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اس قدر رقم لینے کی شرعاً اجازت ہے جس سے معروف طریقہ کے مطابق گزر اوقات ہو سکے۔

بیمار پرسی کی فضیلت

سوال اسلام میں بیمار پرسی کی کیا فضیلت ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب اگر کوئی مسلمان بیمار ہو جائے تو دوسرے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس کی تیمارداری کریں اور ایسا کرنا ان کا حق اور ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں، سلام کا جواب دینا، مریض کی عیادت کرنا، جنازے میں شریک ہونا، دعوت قبول کرنا اور چھینک کا جواب دینا۔ [2]

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی تیمارداری کرتا ہے تو واپسی تک جنت کے باغیچے میں رہتا ہے۔ [3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی مسلمان عیادت کی غرض سے اپنے مسلمان بھائی کے پاس بیٹھتا ہے اگر صبح کو عیادت کرے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعا مغفرت کرتے ہیں اور اگر شام کو عیادت کرے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ [4] ان احادیث سے بیمار پرسی کی فضیلت کا پتہ چلتا ہے لیکن عیادت کرنے والے کو چاہیے کہ وقت کا خیال رکھے اور اہل خانہ کی مصروفیات کو بھی پیش نظر رکھے اور بیمار کے پاس زیادہ دیر تک نہ بیٹھے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح بخاری، النفقات: ٥٣٦٤۔ [2] صحیح بخاری، الجنائز: ١٢٤٠۔

[3] صحیح مسلم، البر والصلہ: ٢٥٦٨۔ [4] ابو داود، الجنائز: ٣٠٩٨۔

قریب الموت کے پاس سورت یٰسین پڑھنا

سوال مردے کے پاس سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنا، احادیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ وضاحت سے جواب دیں۔

جواب میت کے پاس سورۂ یٰسین پڑھنے کے متعلق کوئی حدیث صحیح نہیں ہے، اس سلسلہ میں ضعیف احادیث مروی ہیں، حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے مرنے والوں کے قریب سورۂ یٰسین پڑھا کرو۔'' [1]

یہ روایت ضعیف ہے، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف ابی داؤد میں بیان کیا ہے۔ (حدیث: ۶۸۳) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جس مردے کے پاس سورۃ یٰسین کی تلاوت کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرما دیتے ہیں۔ [2]

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بیان کر کے بتایا ہے کہ اس میں مروان بن سالم راوی ثقہ نہیں ہے۔ اس لیے اس عمل سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

محرم کون کون ہے؟

سوال میں نئی نئی مسلمان ہوئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ شریعت کے مطابق زندگی بسر کروں، سب سے پہلے مجھے پردہ کے متعلق مشکلات کا سامنا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں میری راہنمائی کریں کہ کن کن لوگوں سے مجھے پردہ کرنا ضروری نہیں ہے، تاکہ میں ان کے علاوہ دوسروں سے پردہ کروں؟

جواب اللہ تعالیٰ آپ کو دین اسلام پر استقامت دے۔ آپ کا سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے، ہم اس کا جواب ذرا تفصیل سے دے دیتے ہیں تاکہ دوسری مسلمان خواتین بھی اس کی روشنی میں اپنے رویے پر نظر ثانی کریں۔

عورت اپنے محرم مردوں سے پردہ نہیں کرے گی اور عورت کا محرم وہ ہوتا ہے جس سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہو، حرمت نکاح کے تین اسباب ہیں:

۱۔ قرابت داری، ۲۔ دودھ کا رشتہ، ۳۔ سسرالی تعلق۔

نسبی محارم: قرابت داری کی وجہ سے محارم کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1. آباء واجداد: عورتوں کے باپ، ان کے اجداد اوپر تک، ان میں دادا اور نانا سب شامل ہیں۔
2. بیٹے: عورتوں کے بیٹے، ان میں بیٹے، پوتے، نواسے وغیرہ سب شامل ہیں۔
3. عورتوں کے بھائی: ان میں حقیقی بھائی، باپ کی طرف سے اور ماں کی طرف سے تمام بھائی شامل ہیں۔
4. بھانجے اور بھتیجے: ان میں بھائی کے بیٹے اور بہن کے بیٹے اور ان کی تمام نسلیں شامل ہیں۔
5. چچا اور ماموں: یہ دونوں بھی نسبی محارم میں شامل ہیں، انہیں والدین کا قائم مقام ہی سمجھا جاتا ہے، بعض دفعہ چچا کو بھی والد کہہ

---

[1] مستدرك حاكم، ص: ٥٦٥، ج١۔ [2] ميزان الاعتدال، ص: ٩٠، ج٤۔

دیا جاتا ہے۔

رضاعی محرم: اس سے وہ مراد ہیں جو رضاعت یعنی دودھ کی وجہ سے محرم بن جاتے ہیں، حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رضاعت سے بھی ان رشتوں کو حرام کیا ہے جنہیں نسب کی وجہ سے حرام کیا ہے۔ [1] جس طرح نسبی محرم کے سامنے عورت کو پردہ نہ کرنا جائز ہے، اس طرح رضاعت کی وجہ سے محرم بننے والے شخص کے سامنے بھی اس کے لیے پردہ نہ کرنا مباح ہے یعنی عورت کے رضاعی بھائی، رضاعی والد اور رضاعی چچا سے پردہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے رضاعی چچا، افلح آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی تو میں نے انہیں اجازت نہ دی بلکہ ان سے پردہ کر لیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے پردہ نہ کرو اس لیے کہ رضاعت سے بھی وہی حرمت ثابت ہوتی ہے جو نسب کی وجہ سے ثابت ہوتی ہے۔ [2]

اس حدیث کے مطابق عورت کے رضاعی محارم بھی نسبی محارم کی طرح ہیں لہٰذا رضاعی محارم سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سسرالی محارم: عورت کے سسرالی محارم سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جن سے شادی کی وجہ سے ابدی طور پر نکاح حرام ہو جاتا ہے جیسا کہ سسر اور اس کا بیٹا یا داماد وغیرہ۔ والد کی بیوی کے لیے محرم مصاہرت وہ بیٹا ہوگا جو اس کی دوسری بیوی سے ہو، سورۃ النور کی آیت ۳۱ میں اللہ تعالیٰ نے سسر اور خاوند کے بیٹوں کو شادی کی وجہ سے محرم قرار دیا ہے اور انہیں باپوں اور بیٹوں کے ساتھ ذکر کیا ہے اور انہیں پردہ نہ ہونے کے حکم میں برابر قرار دیا ہے۔

مذکورہ محرم رشتہ داروں کے علاوہ جتنے بھی رشتہ دار ہیں ان سے عورت کو پردہ کرنا چاہیے خواہ وہ چچا، پھوپھی، خالہ اور ماموں کے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح خاوند کے چچا اور ماموں سے بھی بیوی کو پردہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ اس کے خاوند کے چچا یا ماموں ہیں اس کے نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

کھانا کھانے والے اور قرآن پڑھنے والے کو سلام کہنا

سوال ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ کھانا کھانے والوں اور قرآن پڑھنے والوں کو سلام نہیں کہنا چاہیے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب کھانا کھانے والوں کو سلام نہ کہنے کی ممانعت کسی صحیح حدیث میں بیان نہیں ہوئی ہے، یہ محض مفروضہ ہی معلوم ہوتا ہے، جب نمازی کو سلام کہا جا سکتا ہے تو کھانا کھانے والوں کو سلام کہنے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے؟ قران پڑھنے والوں کو سلام کہنے کے متعلق ایک حدیث مروی ہے جسے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم مسجد میں تھے اور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے، انہوں نے ہمیں سلام کہا اور ہم نے آپ کے سلام کا جواب

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۱۳۱، ج ۱۔ [2] صحیح مسلم، الرضاع: ۱۴۴۵۔

دیا۔ ❶

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید پڑھنے والے کو سلام کہا جا سکتا ہے اور وہ اپنی تلاوت روک کر جواب بھی دے سکتا ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، جب نمازی اور قرآن پڑھنے والے کو سلام کہنا جائز ہے تو کھانا کھانے والے کو سلام کہنا کیونکر ناجائز ہو سکتا ہے؟ (واللہ اعلم)

بچے کا نام رکھنا

سوال میرے بھائی کے ہاں اک خوبصورت بچہ پیدا ہوا ہے، ہم اس کا بہترین، خوبصورت نام رکھنا چاہتے ہیں، نام رکھنے کے متعلق شرعی ہدایات کی وضاحت کریں۔

جواب ولادت کے بعد بچے کا نام رکھنا انتہائی اہم کام ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نعمت کے حاصل ہونے کے بعد نومولود کا بہترین نام بھی اظہار تشکر کا ایک انداز ہے، نام نہ صرف شناخت کا باعث ہوتے ہیں بلکہ انسان کی شخصیت پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا مسلمان والدین پر فرض ہے کہ وہ اپنے بچے کا بامعنی، خوبصورت، دلکش اور اسلامی نام رکھیں، رسول اللہ ﷺ نے اچھے نام رکھنے کی تلقین فرمائی ہے اور برے اور شرکیہ ناموں سے منع فرمایا ہے چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے ناموں میں سے دو نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہیں۔'' ❷

اس کا مطلب یہ ہے کہ نام رکھتے وقت کسی ایسے نام کا انتخاب کیا جائے، جس سے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبودیت کا اظہار ہوتا ہو، ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نومولود کا نام کسی نبی کے نام پر بھی رکھا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت ابو وہب جشمی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم حضرات انبیاء علیہم السلام والے نام رکھو۔'' ❸

پھر ایسے ناموں کا انتخاب کیا جائے جو معنی خیز اور صداقت پر مبنی ہوں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ تمام ناموں میں سب سے زیادہ صداقت و سچائی کا اظہار کرنے والے دو نام حارث اور ہمام ہیں۔ ❹

حارث کا معنی کمال اور کھیتی باڑی کرنے والا اور ہمام کا معنی سوچ و بچار میں مصروف رہنے والا ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ایسے ناموں سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے جو اسلامی شخصیت و وقار میں ایک داغ کی حیثیت رکھتے ہوں، اس قسم کے ناپسندیدہ اور مکروہ نام حسب ذیل ہیں:

☆ ایسا نام جو انتہائی قبیح اور جس سے آدمی کی عزت پر حرف آئے، رسول اللہ ﷺ اس قسم کے برے ناموں کو تبدیل کر دیتے تھے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ برے نام بدل دیتے تھے۔ ❺

---

❶ مسند امام احمد، ص: ١٥٠، ج٤۔ ❷ صحیح مسلم، الآداب: ٢١٣٢۔
❸ مسند امام احمد، ص: ٣٤٥، ج٤۔ ❹ ابو داود، الادب: ٤٩٥٠۔
❺ ترمذی، الادب: ٢٩٣٩۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک لخت جگر کا نام عاصیہ یعنی ''نافرمانی کرنے والی'' تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام بدل کر جمیلہ ''خوبصورت'' رکھ دیا۔ ❶

امام ابوداؤد نے چند ایک ناموں کی فہرست دی ہے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل کیا تھا۔ ❷

☆ ایسے ناموں سے بھی اجتناب کرنا چاہیے جن سے بدشگونی اور نحوست والے معانی ظاہر ہوتے ہوں، حضرت سعید بن مسیب اپنے باپ حضرت مسیب رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ ان کا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کا نام دریافت فرمایا اس نے جواب دیا میرا نام حزن ہے (جس کا معنی غم اور پریشانی ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنا نام سہل رکھ لو'' (جس کا معنی سہولت اور نرمی ہے) اس نے جواب دیا میں اپنے باپ کا رکھا نام تبدیل نہیں کر سکتا۔ حضرت سعید بن مسیب کا بیان ہے کہ اس وقت سے ہمارا خاندان قلق و پریشانی اور بے چینی و اضطراب کا شکار ہے۔ ❸

☆ اپنے بچوں کا ایسا نام بھی نہ رکھا جائے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن سب سے بدترین اور ناپسندیدہ شخص وہ ہوگا جو خود کو شاہان شاہ کہلواتا تھا کیونکہ تمام بادشاہوں کا بادشاہ تو اللہ تعالیٰ ہے۔'' ❹

ایسے ناموں کے شروع میں لفظ عبد کا اضافہ کر کے رکھے جا سکتے ہیں۔

☆ ایسے ناموں سے بھی گریز کیا جائے جن میں خوشحالی اور برکت وغیرہ کا مفہوم پایا جاتا ہو کیونکہ ان ناموں میں یہ قباحت ہے کہ جب کبھی دوسرے شخص سے اس نام والے کے متعلق پوچھا جائے گا آیا وہ گھر میں موجود ہے، اگر وہ شخص گھر میں موجود نہ ہو تو جواب میں کہا جائے گا نہیں، مثلاً یسار گھر میں ہے اور جواب دیا جائے کہ آسانی گھر میں نہیں ہے، تو یہ صورت حال خوش حالی کے خلاف ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ❺

☆ ایسے ناموں سے اجتناب کیا جائے جن میں لفظ عبد کو غیر اللہ کے ساتھ ملایا گیا ہو جیسا کہ کسی کا نام عبدالنبی رکھ دیا جائے یا عبدالعزیٰ یعنی عزیٰ کا بندہ وغیرہ۔ پوری امت مسلمہ کے نزدیک اس قسم کے نام رکھنا حرام ہیں، کیونکہ اس میں عبودیت کا اظہار غیر اللہ کے لیے ہے۔

☆ ایسے ناموں سے بھی پرہیز کرنا چاہیے جن سے اسلامی قدر و منزلت مجروح ہونے کا اندیشہ ہو یا ان سے کفار کے ساتھ مشابہت کا پہلو نکلتا ہو یا ان سے ہلاکت و عذاب جیسے معانی کا اظہار ہوتا ہو جیسا کہ احلام: پراگندہ خواب دیکھنے والی، غادہ: چڑھتی جوانی والی عورت، شہاب: شعلہ چنگاری، حرب: جنگ و جدال وغیرہ، اس طرح پرویز وہ بادشاہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک پھاڑ دیا تھا، ایسے ناموں سے اسلامی تشخص مجروح ہوتا ہے لہٰذا ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔

☆ ہمارے ہاں یہ بھی رواج ہے کہ جو لفظ قرآن میں آئے وہ نام اپنی بیٹی یا بیٹے کے لیے منتخب کر دیا جاتا ہے خواہ اس کا معنی کتنا

---

❶ صحیح مسلم، الآداب: ۲۱۳۹۔ ❷ ابوداود، الادب: ٤٩٦٥۔ ❸ صحیح بخاری، الادب: ٦١٩٠۔
❹ صحیح مسلم، الآداب: ۲۱٤۳۔ ❺ صحیح مسلم، الآداب: ۲۱۳۷۔

ہی سنگین کیوں نہ ہو جیسا کہ آنیہ کا معنی انتہائی گرم ہے۔ یہ نام عام طور پر بچیوں کے لیے رکھا جاتا ہے۔ نام رکھتے وقت اس کے معنی پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

کھڑے ہو کر پانی پینا

سوال کھڑے ہو کر پانی پینے کے متعلق کیا حکم ہے، کیا کھڑے ہو کر پانی وغیرہ پیا جا سکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت سے لکھیں؟

جواب کھانے پینے کے آداب میں سے ہے کہ یہ کام بیٹھ کر تسلی سے کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کا زندگی بھر یہی معمول تھا، لیکن احادیث میں اس کے متعلق دو متضاد پہلو مروی ہیں چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی کھڑا ہو کر پانی نہ پیئے اور جو بھول کر ایسا کرے اسے چاہیے کہ قے کر دے۔'' [1]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی اس قسم کی روایت کتب حدیث میں مروی ہے۔ [2] لیکن درج ذیل احادیث سے کھڑے ہو کر پانی پینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پیا۔ [3]

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر پانی پیا اور فرمایا کہ لوگ کھڑے ہو کر پانی پینے کو ناپسند کرتے ہیں حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا تھا، جیسا کہ میں نے کیا ہے۔ [4] اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں چلتے پھرتے کھا لیا کرتے تھے اور کھڑے ہو کر پی لیا کرتے تھے۔ [5]

محدثین کرام نے ان بظاہر متعارض احادیث میں تطبیق کی متعدد صورتیں بیان کی ہیں:

☆ جواز کی احادیث کو ممانعت کی احادیث پر ترجیح دی جائے۔ ☆ ممانعت کی احادیث جواز کی احادیث سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ ☆ جواز کی احادیث ممانعت کی احادیث سے منسوخ ہیں۔ ☆ ممانعت کی احادیث حرمت پر نہیں بلکہ کراہت پر دلالت کرتی ہیں، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آخری صورت کو اختیار کیا ہے۔ [6]

ہمارا رجحان بھی یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پینا حرام نہیں بلکہ مکروہ ہے اگر کوئی کھڑے ہو کر پانی وغیرہ پی لے تو اسے حرام کا مرتکب نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی کوئی گناہ ہوگا، کیونکہ وضو سے بچا ہوا پانی اور زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا جائز ہے۔ اس کے علاوہ پانی بیٹھ کر ہی پینا چاہیے، کیونکہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے متعلق روایات انہی دو مواقع کے بارے میں ہیں۔ بہر حال انسان کو چاہیے کہ تسلی سے بیٹھ کر ہی پانی پینے کا اہتمام کرے، اگر کبھی کبھار کھڑے کھڑے پانی پی لیا جائے تو ان شاء اللہ کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ (واللہ اعلم)

روز قیامت ماں کے نام سے پکارنا

سوال سنا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔ اس میں کیا حکمت ہے کیا واقعی لوگوں کو ماں

---

[1] صحیح مسلم، الاشربہ: ۲۰۲۶۔ [2] مسند امام احمد، ص: ۳۲، ج ۳۔ [3] صحیح بخاری، الاشربہ: ۵۶۱۷۔
[4] بخاری، الاشربہ: ۵۶۱۶۔ [5] ابن ماجہ، الاطعمہ: ۳۳۰۱۔ [6] فتح الباری، ص: ۲۱۶، ج ۱۱۔

کے نام سے آواز دی جائے گی؟

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''قیامت کے دن لوگوں کو ان کے باپوں کے ساتھ پکارا جائے گا۔ [1] پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن ہر غدار کے لیے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا پھر پکارا جائے گا۔ یہ فلاں کے بیٹے فلاں کی دغا بازی اور غداری کا نشان ہے۔ [2] ایک حدیث جسے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن تمہیں تمہارے ناموں اور تمہارے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، لہٰذا تم اپنے لیے اچھے نام کا انتخاب کیا کرو۔'' [3]

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح اور صریح سنت سے جو بات ثابت ہے وہ یہی ہے کہ مخلوق کو قیامت کے دن ان کے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا اور ان کی ماؤں کے نام سے نہیں پکارا جائے گا۔ [4] کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں کچھ بچے غلط کاری کا نتیجہ ہیں جبکہ ان کا کوئی قصور نہیں ان پر پردہ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ماؤں کے نام سے آواز دیں گے، اس سلسلہ میں ایک روایت کا بھی سہارا لیا جاتا ہے جسے مجمع الزوائد میں طبرانی کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے۔ [5] ناجائز اولاد پر پردہ داری والی بات تو دنیا میں تو ان کا راز فاش ہو چکا ہے، اب قیامت کے دن ان پر پردہ پوشی کی کیا ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خاطر اپنے ضابطہ کو تبدیل کر دے؟ بہر حال ہمارے رجحان کے مطابق قیامت کے دن ہر انسان کو اس کے باپ کے نام سے ہی پکارا جائے گا، ماں کی طرف اس کی نسبت کرنا خلاف عقل و نقل ہے۔ (واللہ اعلم)

کھانے کے بعد ہاتھوں کا دھونا

سوال کھانے کے بعد کیا ہاتھوں کو دھونا ضروری ہے؟ اگر ان کو ویسے صاف کر لیا جائے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اس کی وضاحت کریں۔

جواب کھانے کے بعد اگر ہاتھوں پر خوارک کے اجزاء وغیرہ لگے ہیں تو انہیں اچھی طرح صاف کر لیا جائے، انہیں دھونا ضروری نہیں ہے، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ کو چکناہٹ وغیرہ لگی ہوتی ہے تو سوتے ہوئے کوئی کیڑا وغیرہ کاٹ لیتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق ہمیں ہدایت دی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص مر گیا اور اس کے ہاتھوں کو چکناہٹ وغیرہ لگی تھی جسے اس نے نہیں دھویا تھا، اس دوران اگر اسے کوئی نقصان پہنچے تو وہ خود کے علاوہ کسی دوسرے کو ملامت نہ کرے۔'' [6]

اس لیے بہتر ہے کہ کھانے کے بعد اپنے ہاتھوں کو پانی سے دھو لیا جائے یا اچھی طرح تولیے وغیرہ سے صاف کر لیا جائے، تاکہ ہاتھوں پر چکناہٹ لگنے کی صورت میں اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] کتاب الادب باب نمبر ۹۹۔ [2] صحیح بخاری، الادب: ٦١٧٧۔ [3] ابوداود، الادب: ٤٩٤٨۔
[4] تحفہ المودود، ص: ١٣٩۔ [5] مجمع الزوائد، ص: ٤٥، ج٣۔ [6] ابوداود: ٣٨٨٢۔

حقوق و واجبات

حقوق و واجبات

باپ کا بیٹے کے پلاٹ پر قبضہ کر لینا

سوال میں سعودیہ میں رہتا ہوں، میں نے وہاں رہتے ہوئے ایک پلاٹ خریدا تھا، جس پر میرے والد نے قبضہ کر لیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ حدیث کے مطابق ''تیرے مال میں میرا حق ہے۔'' کیا اس طرح کی کوئی حدیث ہے؟ اس کے متعلق وضاحت کریں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں اپنے حقوق کا ذکر کیا ہے وہاں والدین کے حقوق بھی بیان کیے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [1]

''تیرے رب نے فیصلہ کیا ہے کہ خاص اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔''

احسان میں یہ چیز شامل ہے کہ والدین کو بوقت ضرورت خرچہ وغیرہ مہیا کیا جائے، ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اولاد کو حکم دیا ہے:

﴿وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾ [2]

''دنیا میں معروف طریقہ سے ان کا ساتھ دو۔''

دنیاوی ضروریات نفقہ واخراجات کے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں، ان آیات کے پیش نظر ضروری ہے کہ ایسے تنگ دست والدین جن کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور نہ ہی ان کے پاس کوئی مال و دولت ہو، انہیں اولاد کے مال سے خرچہ مہیا کیا جائے، احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ والد اپنی اولاد کے مال سے اپنی جائز ضروریات پوری کرنے کا حقدار ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین مال جو تم کھاؤ وہ تمہارا کمایا ہوا مال ہے اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی سے ہے۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے لیے اپنی اولاد کے مال سے لینا، اس سے اپنی ضروریات پورا کرنا جائز ہے نیز

---

[1] ١٧/الاسراء: ٢٣۔ [2] ٣١/لقمان: ١٥۔

[3] جامع ترمذی، الاحکام: ١٣٥٨۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تو خود اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔'' [1]

سوال میں شاید اسی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص اپنے باپ کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس سے اپنے قرض کی واپسی کا تقاضا کرنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ [1]

باپ کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے بیٹے کا مال لینا جائز ہے خواہ وہ پلاٹ کی شکل میں ہو۔ بصورت دیگر باپ اپنے بیٹے کے مال کو بلا اجازت لینے کا مجاز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

دو دعوے داروں کے مابین فیصلہ کرنا

سوال ایک چیز کے متعلق دو شخص دعوے دار ہیں اور دونوں کے پاس شواہد موجود ہیں، ایسے حالات میں شرعی فیصلہ کیسے کیا جائے گا؟

جواب اگر ایک چیز کے متعلق دو دعوے دار ہوں اور دونوں کے پاس شواہد ہوں یا دونوں اپنا دعویٰ ثابت نہ کر سکتے ہوں تو ایسی صورت میں فقہاء کے دو موقف ہیں، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ دونوں کے پاس دلائل ہوں یا نہ ہوں، فیصلے کی صورت یہ ہوگی کہ جس چیز کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے اسے دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا جائے گا، اس کی دلیل حسب ذیل واقعہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے متعلق دعویٰ کیا پھر اس پر دونوں نے دو، دو گواہ پیش کر دیئے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا۔ [3] اسی طرح ایک اور حدیث ہے کہ ایک چیز کا دعویٰ کرنے والے دونوں آدمیوں کے پاس نہ تو کوئی ثبوت تھا اور نہ ہی وہ کوئی گواہ پیش کر سکے تو رسول اللہ ﷺ نے اس چیز کو دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا۔ [4] لیکن ان دونوں روایات کو علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ [5]

☆ اس سلسلہ میں دوسرا موقف یہ ہے کہ مدعیان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی۔ جس کے نام قرعہ نکل آئے گا وہ قسم اٹھا کر وہ چیز لے لے گا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی معاملہ میں ایک قوم پر قسم پیش کی تو وہ فوراً قسم اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے تاکہ جس کے نام قرعہ نکل آئے وہ قسم اٹھا کر اس چیز کا حق دار بن جائے۔ [6] اس موقف کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ دو آدمی ایک چیز کے متعلق جھگڑ پڑے ان میں سے کسی کے پاس گواہ نہیں تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ قسم دینے کے لیے قرعہ اندازی کر لیں۔ [7] اس کی صورت بھی یہ ہے کہ ایک چیز کے متعلق دو آدمی دعوے دار ہیں لیکن وہ چیز کسی کے پاس نہیں اور نہ ہی اس کا کسی کے پاس کوئی ثبوت ہے تو ایسے حالات میں ان دونوں کے لیے قرعہ اندازی کی جائے گی پھر جس کے نام قرعہ نکل آئے وہ قسم کے ذریعے

---

[1] ابو داود، البیوع: ۳۵۳۰۔ [2] صحیح ابن حبان، ص: ۲۲۶، ج۷ حدیث نمبر: ۴۲۴۵۔

[3] ابو داود، القضاء: ۳۶۱۵۔ [4] مسند امام احمد، ص: ۴۰۲، ج۴۔ [5] ارواء الغلیل، ص: ۲۷۶، ۲۷۷، ج۲۔

[6] صحیح بخاری، الشهادات: ۲۶۷۴۔ [7] ابو داود، القضاء: ۳۶۱۶۔

اس چیز کا حقدار ہوگا۔ ہمارے رجحان کے مطابق آخری موقف صحیح ہے اور صحیح احادیث کے عین مطابق ہے۔ (واللہ اعلم)

رقم لے کر گواہی دینا

سوال آج کل عدالتوں میں دولت اور مال کی بنیاد پر گواہ مل جاتے ہیں، وہ پیسہ لے کر گواہی دیتے ہیں، اس قسم کی گواہی سے جو فیصلہ ہوگا اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا شریعت میں ایسی گواہی دینے کی گنجائش ہے؟

جواب انسان نے جس چیز کے متعلق گواہی دینی ہو اس کے بارے میں ضروری ہے کہ وہ یقینی معلومات رکھتا ہو یا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، ظن وتخمین کی بنیاد پر یا دیکھے بغیر کسی چیز کی گواہی دینا جھوٹی گواہی ہے، جس کی شریعت نے بہت مذمت کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کبیرہ گناہوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا۔'' [1]

اللہ تعالیٰ نے جھوٹی گواہی سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔ (۲۲/الحج:۳۰) پھر خود کو گواہی کے لیے پیش کرنا جبکہ اس سے کسی نے گواہی کا مطالبہ نہ کیا ہو، ایسا قرب قیامت کے وقت ہوگا۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو ان کے قریب ہیں پھر جو ان کے قریب ہیں پھر ان کے بعد ایسے برے لوگ پیدا ہو جائیں گے جو گواہی دیں گے لیکن ان سے گواہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہوگا، وہ خائن ہوں گے، امین نہیں ہوں گے وہ نذر مانیں گے لیکن اپنی نذر پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا۔'' [2]

صورت مسئولہ میں جس قسم کی گواہی کا ذکر ہے، مذکورہ حدیث میں اسی کا بیان ہے گویا حدیث میں اس قسم کے گواہوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس گواہی کی بنیاد پر جو فیصلہ ہوگا شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، جس شخص کے حق میں اس قسم کی گواہی کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا جائے، وہ شخص اپنے لیے فیصلہ شدہ چیز کو حلال خیال نہ کرے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تو صرف ایک انسان ہوں، تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور تم میں سے کوئی اپنے دلائل بڑی خوبی اور چرب زبانی سے بیان کرتا ہے تو میں نے جو کچھ سنا ہوتا ہے، اس کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں، اسی بنیاد پر اگر میں کوئی چیز اس کے بھائی کے حق میں سے دوں تو میں اس کے لیے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔'' [3]

بہرحال صورت مسئولہ میں بیان کردہ گواہی کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس بنیاد پر کیا ہوا فیصلہ بھی انتہائی مخدوش ہے۔ اور جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے اسے وہ چیز لینا حلال نہیں ہے۔

قرضہ واپس نہ ملنے کا اجر

سوال ہم نے لوگوں سے کافی قرض واپس لینا ہے لیکن دینے والے غلط وعدہ کر کے بہت پریشان کرتے ہیں اللہ کے ہاں اجر ملنے کا پورا یقین ہے تاہم اگر رقم نہ ملے تو اگلے جہان ہمیں کیا اجر ملے گا؟ مزید تسلی اور اطمینان کے لیے مطلع کر دیں۔

---

[1] صحیح بخاری، الشہادات: ۲۶۵۳۔ [2] صحیح بخاری، الرقاق: ۶۴۲۸۔

[3] صحیح بخاری، المظالم: ۲۴۵۸۔

جواب کسی مسلمان کو قرض دے کر اس کی ضروریات کو پورا کرنا بہت بڑی فضیلت ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔ (1) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک آدمی کی مدد کرتا ہے، جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔ (2) لیکن رسول اللہ ﷺ نے قرض لینے کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ اس سے انسان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے، آپ نماز میں اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ ''اے اللہ! میں گناہ کرنے اور قرض لینے سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔'' کسی نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا بات ہے آپ اکثر قرض سے پناہ مانگتے ہیں تو آپ نے فرمایا آدمی جب مقروض ہوتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ (3) بلکہ بعض اوقات آپ یوں دعا کرتے تھے۔ ''اے اللہ! میں کفر اور قرض سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔'' ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا کفر اور قرض دونوں برابر ہیں تو آپ نے فرمایا ہاں، یعنی قرض بعض اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ (4) اس لیے انسان کو چاہیے کہ قرض لینے سے اجتناب کرے اگر کبھی ضرورت پڑ جائے تو قرض لے کر اسے اتارنے میں دیر نہ کرے، اگر قرض لیتے وقت نیت صاف ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ادائیگی کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص نے لوگوں سے قرض لیا اور اسے ادا کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ اسے ادا کرنے کی ضرور توفیق دیتا ہے۔ (5) اگر قرض لیتے وقت نیت خراب تھی تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اس کی نیت کے مطابق معاملہ کرے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص نے لوگوں سے اس نیت کے ساتھ قرض لیا کہ وہ اسے واپس نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اسے تباہ و برباد کرے گا۔ (6) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی سے قرض لیتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ ادا نہیں کرنا چاہتا وہ اللہ کے نام پر اسے دھوکہ دیتا ہے اور باطل طریقہ سے اس کے مال کو اپنے لیے حلال سمجھتا ہے ایسا آدمی جب اللہ کے حضور پیش ہوگا تو اس کی حیثیت چور کی ہوگی۔ (7)

جو شخص قرض لے کر بلاوجہ واپس کرنے سے ٹال مٹول کرتا ہے اور ادائیگی کے بغیر ہی دنیا سے چلا جاتا ہے تو قیامت کے دن مقروض کی نیکیاں قرض دینے والے کے کھاتہ میں ڈال دی جائیں گی اور اگر نیکیاں نہ ہوئیں تو قرض دینے والے کی برائیاں مقروض کے نامہ اعمال میں ڈال دی جائیں گی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے دن مفلس وہ شخص ہوگا جو بے شمار نیکیاں لے کر اللہ کے حضور آئے گا لیکن اس نے دوسروں کے حق دبائے ہوں گے، ظلم و زیادتی کی صورت میں عیب جوئی اور غیبت کرنے کی صورت میں یا قرض دبانے اور مزدوری ہڑپ کرنے کی صورت میں، ایسے حالات میں اس کی نیکیاں حقداروں کو دی جائیں گی یا ان کی برائیاں اس کے نامہ اعمال میں جمع کی جائیں گی اور بالآخر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ (8)

ان احادیث کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کا قرض دوسروں نے ناحق دبا رکھا ہے انہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ

---

(1) مسند امام احمد، ص: ۱۰٤، ج٤۔ (2) مسند امام احمد، ص: ۲۷٤، ج۲۔ (3) مسند امام احمد، ص: ۸۹، ج٦۔
(4) مسند امام احمد، ص: ۳۸، ج۳۔ (5) مسند امام احمد، ص: ۳٦۱، ج۲۔ (6) مسند امام احمد، ص: ٤۰، ج٥۔
(7) مسند امام احمد، ص: ۳۳۲، ج۲۔ (8) مسند امام احمد، ص: ۲۰۳، ج۲۔

قیامت کے دن حق مارنے والوں کی نیکیاں انہیں دی جائیں گی یا ان کی برائیاں حق مارنے والوں کے کھاتہ میں ڈال دی جائیں گی۔ (واللہ اعلم)

دوسرے دوکاندار سے چیز لے کر اپنے گاہک کو فروخت کرنا

سوال اگر کسی دوکاندار کے پاس گاہک کی مطلوبہ چیز نہیں تو یہ دوکاندار کسی دوسرے دوکاندار سے وہ چیز خریدے بغیر اپنے گاہک کو فراہم کرے اور اس چیز میں سے کچھ نفع اپنے لیے رکھے اور کچھ نفع اور اصل رقم دوسرے دوکاندار کو دے تو کیا ایسا کرنا درست ہے؟ قرآن وسنت سے دلیل دے کر ہمیں مطمئن کریں۔

جواب خرید وفروخت کے معاملات میں حسب ذیل آیت کریمہ بنیادی حقیقت کی حامل ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ﴾ [1]

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ، درست صورت یہ ہے کہ باہمی رضامندی سے آپس میں لین دین ہو۔''

باطل طریقوں سے مراد ہر وہ ذریعہ آمدنی ہے جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے اور باہمی رضامندی بھی شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہے، سودے بازی میں اگر باطل طریقہ اختیار کیا گیا یا ایک فریق کی پوری رضامندی نہ ہو تو شریعت نے اس طرح مال کھانے اور اسے استعمال کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اس وضاحت کے بعد ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کی متعدد صورتیں ہمارے معاشرہ اور بازار میں رائج ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

☆ دوکاندار کے پاس ایک گاہک آتا ہے اور اشیاء صرف خریدتا ہے، جبکہ دوکاندار کے پاس ضروریات کی ایک دو چیزیں نہیں ہوتیں تو وہ دوسرے دوکاندار سے لے کر گاہک کو فراہم کرتا ہے، اس کی قیمت مع منافع دوسرے دوکاندار کو دے دیتا ہے، اس میں خیر خواہی اور گاہک کے لیے سہولت ہے، اس سے گاہک بھی ''پکا'' ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆ پہلا دوکاندار اپنے نوکر کو اس چیز کی قیمت اپنے پاس سے دیتا ہے تاکہ وہ دوسرے دوکاندار سے خرید لائے پھر وہ اپنے گاہک کو مطلوبہ چیز فراہم کرتا ہے، اس صورت میں نفع لینے پر کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس نے اسے قیمت دے کر خرید لیا ہے پھر اسے آگے نفع کے ساتھ فروخت کیا ہے۔

☆ دوسرے دوکاندار سے مطلوبہ چیز خریدے بغیر یا شرح کمیشن طے کیے بغیر یا بازار میں رائج عرف عام سے ہٹ کر کوئی چیز لے کر گاہک کو فراہم کرنا، پھر اپنی مرضی سے دوسرے دوکاندار کو رقم دینا، شرعاً ایسا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ کسی چیز کا مالک نہیں تھا تو اسے آگے فروخت کرنے کی اجازت نہ تھی، اگر مالک نہیں تھا تو کمیشن کی شرح طے کی ہوتی یا بازار میں رائج عرف کو پیش نظر رکھا ہوتا، لیکن اس صورت میں دوکاندار نے کسی چیز کو مدنظر نہیں رکھا لہٰذا یہ آخری صورت ناجائز ہے اور باطل طریقہ سے دوسرے کا مال

---

[1] ٤/النساء: ٢٩۔

کھانا ہے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔ (واللہ اعلم)

وعدہ سے انحراف کرنا

سوال ایک آدمی نے اپنے بھائی کے ساتھ اس کے کہنے پر ایک ایکڑ زمین کا تبادلہ کیا۔ اس آدمی نے عدالت کے سامنے تبادلہ کا بیان دے دیا جبکہ فریق ثانی سے بیان لینے کی فوری ضرورت محسوس نہ کی گئی، بعد میں اس کا بھائی یعنی فریق ثانی بیان دینے سے انکاری ہوگیا بالآخر کوشش بسیار کے بعد وہ بیان دینے پر اس شرط کے ساتھ آمادہ ہوا کہ پہلا شخص مشترکہ ڈیرہ سے دستبردار ہو جائے جو آٹھ مرلہ پر مشتمل ہے، پہلے شخص نے اقرار کیا اور ڈیرہ سے دستبردار ہوگیا، اب وہی شخص ڈیرہ سے اپنا حصہ وصول کرنا چاہتا ہے اور یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ میں نے وہ بیان بامر مجبوری دیا تھا، اب کیا اسے مجبوری پر محمول کرتے ہوئے اپنا حصہ وصول کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔

جواب فریق ثانی نے وعدہ سے انحراف کرکے بہت زیادتی کی ہے جبکہ فریق اول نے اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا اور عدالت کے روبرو ایکڑ کے تبادلے کا بیان دیا، لیکن فریق ثانی کا اپنے بیان دینے کو مشترکہ ڈیرہ سے دستبرداری کے ساتھ مشروط کرنا بھی صحیح نہیں تھا تاہم فریق ثانی سے اپنا حق لینے کے لیے اسے قبول کرلیا، اور دستبرداری کا اعلان کرکے اسے چھوڑ دیا، اب اس کا اپنے وعدہ سے انحراف کرنا صحیح نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ [1]

''کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر مشتعل نہ کرے کہ تم عدل کرنا چھوڑ دو، عدل کیا کرو، یہی بات تقویٰ کے قریب تر ہے۔''

فریق اول نے ڈیرہ سے دستبرداری کا اعلان کرتے وقت کسی قسم کی مجبوری کا اظہار نہیں کیا، اب اس کا یہ کہنا کہ میں نے اپنا ایکڑ لینے کے لیے بامر مجبوری بیان دیا تھا قابل سماعت ہے، مسلمانوں کو اپنی شرائط کی پاسداری کرتے ہوئے ان کو پورا کرنا چاہیے۔ اس بنا پر فریق اول کا اس سے انحراف صحیح نہیں ہے اور جب اس نے اس مشترکہ ڈیرہ سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے تو اب اسے اپنا متروکہ حصہ وصول کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

الگ الگ افراد کا خطبہ دینا اور جماعت کرانا

سوال ہمارے ہاں جمعہ کے دن خطبہ جمعہ ایک عالم دین دیتے ہیں جبکہ جماعت کا فریضہ مسجد کے قاری صاحب سرانجام دیتے ہیں کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے کہ خطبہ عالم دے اور جماعت کوئی دوسرا قاری کرائے؟

جواب قرآن وسنت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص خطبہ دے وہی جمعہ کی نماز پڑھائے، رسول اللہ ﷺ نے اس عمل پر مداومت فرمائی ہے، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا بھی یہی معمول تھا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تم اس طرح نماز

---

[1] ٥/المائدة: ٨۔

پڑھو جیسا کہ تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔'' [1] لیکن اگر کسی عذر کی بنا پر خطبہ ایک عالم دین دیتا ہے اور جماعت کوئی دوسرا شخص کراتا ہے تو جائز ہے اور نماز میں کوئی خرابی نہیں ہوگی، اگر کوئی عذر کے بغیر ایسا کرتا ہے تو سنت کی خلاف ورزی کا گناہ ضرور ہوگا البتہ نماز ہو جائے گی لیکن اسے معمول بنانا کسی صورت میں صحیح نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کا معمول ہے کہ جو خطبہ دیتا وہی نماز پڑھاتا۔ (واللہ اعلم)

رہائشی پلاٹ پر زکوٰۃ

سوال جو پلاٹ ذاتی رہائش کے لیے لیا جائے کیا اس کی مالیت پر زکوٰۃ دینا ضروری ہے، اسی طرح اگر کسی نے تجارت کی غرض سے پلاٹ لیا۔ کیا اس پر زکوٰۃ قیمتِ خرید کے حساب سے دی جائے گی؟ وضاحت کریں۔

جواب ذاتی ضرورت کے لیے جو چیزیں خریدی جائیں ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، ہاں زیورات اگر ذاتی ضرورت یا استعمال کے لیے ہوں۔ ان میں زکوٰۃ دینا ضروری ہے، اس کے علاوہ کسی ذاتی چیز میں زکوٰۃ نہیں ہے، اگر کسی نے ذاتی ضرورت کے لیے پلاٹ لیا پھر اس نے فروخت کرنے کی نیت کر لی تو اس پر زکوٰۃ دینا ہوگی، البتہ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہیں دے گا۔ کیونکہ اس وقت نیت ذاتی استعمال کی تھی البتہ جب سے تجارت کی نیت کی تو اس پر زکوٰۃ پڑے گی، اور یہ زکوٰۃ بھی ایک سال گزرنے کے بعد واجب الاداء ہوگی۔ نیز اس پر زکوٰۃ موجودہ مالیت کے مطابق ادا کی جائے گی۔ قیمت خرید کا اعتبار نہیں ہوگا مثلاً جب خریدا تو اس کی قیمت 50000 ہزار روپیہ تھی۔ لیکن جب زکوٰۃ ادا کرنے کا وقت ہوا تو اس کی مالیت ایک لاکھ روپیہ ہوگئی تو اس صورت میں اسے ایک لاکھ روپیہ سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔ اس طرح ہر سال موجود مالیت کے حساب سے زکوٰۃ دی جائے، اگر کسی نے تجارتی غرض سے پلاٹ خریدا بعد میں اسے ذاتی رہائش کے لیے رکھ لیا تو اس وقت اس کی مالیت میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے بہر حال پلاٹ وغیرہ کی زکوٰۃ کا معاملہ اس کی نیت پر منحصر ہے۔ (واللہ اعلم)

سر پر پیار دینا

سوال ہمارے معاشرہ میں بزرگ حضرات چھوٹی بچیوں کے سر پر پیار دیتے ہیں، اس پر کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب محبت بھرے جذبات سے خیر و برکت کی دعائیں دیتے ہوئے بزرگوں کا بچوں اور بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرنے کو ہمارے معاشرہ میں ''پیار'' کہا جاتا ہے۔ دین اسلام نے اسے مشروع قرار دیا ہے چنانچہ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری خالہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئیں، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میرا یہ بھانجا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے خیر و برکت کی دعا فرمائی [2] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ۔

[2] صحیح بخاری، المرضی: ۵۶۷۰۔

بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔ ''بچوں کے لیے خیر و برکت کی دعا کرتے ہوئے ان کے سر پر ہاتھ پھیرنا۔'' [1]

ولید بن عقبہ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو اہل مکہ اپنے بچوں کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے، آپ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور ان کے لیے دعا خیر کرتے [2] حضرت جریج پر جب تہمت زنا لگی تو اس واقعہ میں نومولود کے سر پر ہاتھ پھیرنے کا ذکر ملتا ہے۔ [3] اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی امتوں میں بھی یہ فطرتی رسم قائم تھی، جسے اسلام نے بھی برقرار رکھا ہے بلکہ یتیم بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے کو بہت اہمیت دی ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے یتیم بچے یا بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود تھی تو ہاتھ کے نیچے آنے والے ہر بال کے عوض اسے نیکیاں دی جائیں گی۔ [4] ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی سنگدلی کا شکوہ کیا تو آپ نے بطور علاج یہ نسخہ تجویز کیا کہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور مسکین کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا کرو اس سے ترا دل نرم ہو جائے گا۔ [5] زیر بحث مسئلہ کی متعدد صورتیں ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

☆ بزرگ مرد محرم ہو تو اس کا اپنے سے چھوٹوں کو پیار دینا خواہ وہ بالغ ہی کیوں نہ ہوں۔

☆ بزرگ عورت محرمات سے ہے اس کا اپنے سے عمر میں چھوٹوں کو پیار دینا خواہ وہ حد بلوغ کو پہنچ چکے ہوں۔

☆ بزرگ مرد غیر محرم یا عورت غیر محرمہ کا نابالغ بچوں اور بچیوں کو پیار دینا۔ اس کے جواز میں دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ البتہ درج ذیل صورتوں میں اختلاف ہے۔

☆ بزرگ مرد غیر محرم ہو وہ اپنی رشتہ دار بالغ بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرے۔

☆ بزرگ عورت غیر محرمات سے ہو اور وہ اپنے رشتہ دار بالغ بچوں کو پیار دے۔

ان آخری دونوں صورتوں کے متعلق مختلف علماء سے رابطہ کرنے کے بعد دو موقف سامنے آئے ہیں۔

(ا) ایسا کرنا جائز نہیں ہے کہ کیونکہ شریعت میں اس کا ثبوت نہیں۔

(ب) ایسا کرنا جائز ہے کیونکہ شریعت نے اس سے منع نہیں کیا۔ فریقین کے دلائل پیش کرنے کے بعد آخر میں ہم اپنا موقف بیان کریں گے۔ جو حضرات اسے ناجائز قرار دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے بہترین نمونہ ہیں، آپ نے کبھی کسی بالغ بچی کے سر پر ہاتھ نہیں پھیرا حالانکہ آپ تمام لوگوں میں زیادہ پرہیز گار اور اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ نیز وہ امت کے لیے روحانی باپ کی حیثیت رکھتے بلکہ بعض مواقع پر آپ نے ایسے ارشادات فرمائے ہیں جن کے عموم سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً:

(الف) عورتوں سے بیعت لیتے وقت بعض خواتین کی طرف سے خواہش کا اظہار ہوا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ ہم سے مصافحہ

---

[1] صحیح بخاری، الدعوات، باب نمبر: ۳۱۔

[2] مسند امام احمد، ص: ۳۲، ج ٤۔ [3] مسند امام احمد، ص: ٤۳٤، ج ۲۔

[4] مسند امام احمد، ص: ۲۵۰، ج ۵۔ [5] مسند امام احمد، ص: ۲٦۳، ج ۲۔

کیوں نہیں کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا: ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔'' [1] جب بیعت کے وقت رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ سے نہیں لگا تو عام آدمی کے لیے عورتوں کے سر پر ہاتھ پھیرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟

(ب) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ نے کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں۔ [2]

جب رسول اللہ ﷺ جو خیر البشر ہیں اور قیامت کے دن اولاد آدم کے سردار ہوں گے، ان کے مبارک ہاتھوں نے کسی عورت کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں تو دوسرے غیر محرم مردوں کے لیے کس طرح اجنبی عورتوں کے سر پر ہاتھ پھیرنا جائز کیسے ہوسکتا ہے؟

(ج) جو عورت مرد کے لیے حلال نہیں ہے اسے ہاتھ لگانا بہت سنگین جرم ہے جیسا کہ حدیث میں ہے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر آدمی کے سر میں نوک دار لوہے سے سوراخ کر دیا جائے تو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ وہ کسی ایسی عورت کو ہاتھ لگائے جو اس کے لیے حلال نہیں ہے۔ [3]

امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو بیہقی اور طبرانی کے حوالہ سے بیان کیا ہے اور طبرانی کے راویوں کو صحیح کے راوی قرار دیا ہے، اسی طرح علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو امام رویانی کے حوالہ سے بیان کیا ہے اور اس پر صحیح ہونے کا حکم لگایا ہے۔ [4] اس حدیث کی رو سے بھی اجنبی عورت کو ہاتھ لگانے کی حرمت ثابت ہوتی ہے، البتہ کسی ناگہانی ضرورت کے پیش نظر عورت کو ہاتھ لگانے میں چنداں حرج نہیں مثلاً بیماری کی حالت میں ڈاکٹر یا طبیب کا نبض دیکھنا یا مکان کو آگ لگنے کی صورت میں اسے پکڑ کر مکان سے باہر نکالنا، لیکن پیار دیتے وقت اس کے سر کو ہاتھ لگانا کوئی حقیقی ضرورت نہیں۔ جو حضرات بزرگوں کے لیے اجنبی عورت کو پیار دینے کے متعلق نرم گوشہ رکھتے ہیں، ان کے پاس کوئی نقلی دلیلیں نہیں ہے البتہ وہ عقلی اعتبار سے کہتے ہیں کہ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے جو معاشرہ کے رسم ورواج سے تعلق رکھتا ہے چونکہ شریعت نے اس سے منع نہیں فرمایا، اس لیے ایسا کرنا جائز ہے، پھر ایسا کرنے سے تبلیغ وغیرہ کا بھی موقع ملتا ہے کہ اگر وہ ننگے سر ہو تو سمجھایا جاسکتا ہے۔ شریعت نے معاشرہ میں رائج، معروف، کو بہت حیثیت دی ہے اس لیے اسے جائز ہونا چاہیے پھر ایسے موقع پر کسی قسم کے منفی جذبات ابھرنے کا موقع بھی نہیں ہوتا جن کے پیش نظر اسے ممنوع قرار دیا جاسکے، اگر ایسا اندیشہ ہو تو اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، رسول اللہ ﷺ کی موخر الذکر حدیث کا تعلق ایسے حالات سے ہے جب ہاتھ لگانے والا دل کا کوڑھا اور نیت میں فتور رکھتا ہو۔ ہم نے انتہائی دیانتداری کے ساتھ فریقین یعنی مانعین اور مجوزین کے دلائل قارئین کے سامنے رکھ دیے ہیں، ہمارا رجحان یہ ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے پیش نظر اس سے اجتناب کیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عمر رسیدہ عورت کو پردہ کے سلسلہ میں کچھ نرمی دی ہے اس کے باوجود فرمایا ہے کہ اگر وہ اس نرمی کو استعمال کرنے سے پرہیز کریں تو یہی بات ان کے حق میں بہتر ہے۔ [5] البتہ مجوزین حضرات کے موقف کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اس کے پیش نظر اگر کوئی برخوردار عمر رسیدہ خاتون کے سامنے سر جھکا دے یا کوئی برخورداری اپنے کسی بزرگ کے

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۳۵۷، ج٦۔ [2] صحیح بخاری، الشروط: ۲۷۱۳۔ [3] الترغیب والترهیب، ص: ۳۹، ج۳۔
[4] الاحادیث الصحیحة، حدیث نمبر: ۲۲٦۔ [5] ۲۴/النور: ٦۰۔

سامنے پیار لینے کے لیے اپنا سر آگے کر دے تو ان کی حوصلہ شکنی نہیں کرنی چاہیے البتہ مسئلہ صحیح صورت حال سے انہیں ضرور آگاہ کر دیا جائے۔ ہمارے بعض خاندانوں میں ایسے موقع پر گلے ملنے کا رواج ہے اس کی کسی صورت میں اجازت نہیں دی جاسکتی اسی طرح سر پر ہاتھ پھیرتے وقت اگر کسی قسم کی شہوانی تحریک پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو بھی اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

بینک سے سود پر قرضہ لینا؟

سوال ایک آدمی کو کاروبار چلانے کے لیے رقم درکار ہے اور وہ بینک سے سود پر قرض لے کر اپنا کاروبار چلاتا ہے ایسے حالات میں سود پر قرض لینا جائز ہے؟

جواب ہمارے نزدیک سوال میں ذکر کردہ کوئی ایسی مجبوری نہیں جس کے پیش نظر سود لینا جائز قرار دیا جائے، سود پر قرض لے کر کاروبار چلانا، اس سے مزید تباہی ہوگی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ [1]

''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کی نشوونما کرتا ہے۔''

جب اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام کر دیا ہے تو ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے، ایسے کاروبار کو ترک کر دیا جائے جو سودی قرض کے بغیر نہیں چلتا، انسان کو چاہیے کہ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالے، سود پر کسی صورت میں قرض نہ لے کیونکہ اس میں ہلاکت ہے جو انسان قوی اور کمانے کے قابل ہے اسے کسب حلال کا اہتمام کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ وہ شخص جو لکڑیوں کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے، اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے چاہے وہ اسے کچھ دے یا نہ دے۔ [2]

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے محنت اور مزدوری کی عظمت کو اجاگر کیا ہے، مذکورہ شخص کو سود پر قرض لے کر کاروبار چلانے کی بجائے محنت اور مزدوری کو اختیار کرنا چاہیے۔

باپ کا بیٹے کا قرضہ اتارنا

سوال میرا ایک بیٹا شادی شدہ اور صاحب اولاد ہے، اس کے ذمے بہت سا قرض ہے لیکن اس کے مالی وسائل انتہائی محدود ہیں، کیا میں اپنی کمائی میں سے اس کا قرض اتار سکتا ہوں جب کہ احادیث میں اولاد کے درمیان عدل و مساوات کرنے کی تاکید ہے؟ اس کے متعلق میری راہنمائی کریں۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اولاد کے درمیان عدل واجب ہے، کسی کو دینا اور کسی کو محروم کرنا یا ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا حرام ہے، ہاں اگر کوئی معقول سبب ہو تو الگ بات ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔'' [3]

---

[1] ٢/البقرة: ٢٧٦۔ [2] صحيح بخاری، البيوع: ٢٠٧٤۔ [3] صحيح بخاری، الهبة: ٢٥٨٧۔

اگر اولاد میں سے کوئی بیمار ہے یا حصول علم میں کوشاں ہے تو ایسی وجوہات کی بنا ان پر دوسروں سے زیادہ خرچ کیا جا سکتا ہے، ہمارے رجحان کے مطابق عدل و مساوات کی دو اقسام ہیں:

☆ ایک قسم تو وہ ہے کہ کچھ بچے اپنی صحت و بیماری میں خرچہ کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں، اس قسم کی ضرورت کے متعلق عدل کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے، کم اور زیادہ ضرورت مند کے درمیان کوئی فرق نہ کیا جائے۔

☆ ایک قسم یہ ہے کہ ضروریات مشترک ہیں یعنی عطیہ، خرچہ اور شادی وغیرہ تو اس قسم میں کمی وبیشی کرنا جائز نہیں ہے۔ لیکن تمام بچوں پر مساوات کے ساتھ خرچ کیا جائے۔ لہٰذا اگر کوئی بچہ مقروض ہے اور اس کے مالی حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں تو اگر باپ اپنے بیٹے کا قرضہ اتارنے میں اس کا تعاون کرتا ہے تو ان شاء اللہ ایسا کرنا مساوات کے خلاف نہیں ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ (واللہ اعلم)

بچے کا کھیت کو آگ لگانا

سوال ایک بچے نے دن کے وقت گندم کے کھلیان کو آگ لگا دی۔ اس کے آگ لگانے میں کسی کے مشورے کو دخل نہیں اس سے کافی نقصان ہوا ہے، کیا اس نقصان کی تلافی بچے کے ورثاء کو کرنا ہو گی یا نہیں؟ نقصان ادا کرنے کی صورت میں پورے نقصان کے ذمہ دار ہوں گے یا کچھ نقصان ادا کرنا ہو گا؟

جواب شریعت اسلامیہ میں بعض افراد کو حقوق و واجبات کی ادائیگی میں مرفوع القلم قرار دیا گیا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ دیوانہ ہوش آنے تک، بچہ بالغ ہونے تک اور سونے والا بیدار ہونے تک مرفوع القلم ہیں [1] محدثین کرام نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بچہ مؤاخذہ کے لحاظ سے مرفوع القلم ہے اگر نیکی اور ثواب کے کام کرتا ہے تو اسے محروم نہیں کیا جائے گا البتہ جو حقوق انسانوں سے متعلق ہیں اس کا معاملہ کچھ الگ ہے اگرچہ بچے کو باز پرس نہیں ہو گی۔ تاہم اس کے ورثاء نقصان کے ذمہ دار ہوں گے چنانچہ فقہا نے صراحت کی ہے کہ بچہ میں اہلیت ادا معدوم معلوم ہوتی ہے، اس لیے اس کے اقوال و افعال پر کوئی شرعی مواخذہ نہیں ہو گا اور نہ ہی معاملات میں اس کے تصرفات کا اعتبار کیا جائے گا، زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ بچہ جب کسی کا نقصان کرے گا تو مالی لحاظ سے وہ قابل مواخذہ ہے البتہ بدنی لحاظ سے اسے سزا وغیرہ نہیں دی جائے گی مثلاً بچہ کسی کو قتل کر دیتا ہے یا کسی کے مال کو نقصان پہنچاتا ہے تو مقتول کی دیت اور مال کی تلافی بہر صورت کرنا ہو گی لیکن اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ [2]

اس طرح بچے کے مال میں زکوٰۃ بھی عائد ہوتی ہے جیسا کہ محدثین کرام نے لکھا ہے، اس بنا پر صورت مسئولہ میں جو نقصان ہوا ہے وہ بچے کے ورثاء ادا کریں گے اور شرعی طور پر یہ ان کی ذمہ داری ہے، بچے کے مرفوع القلم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے مواخذہ نہیں ہو گا اور نہ ہی اس پر کوئی اور ذمہ داری عائد ہو گی البتہ مالی نقصانات کی تلافی اس کے ورثاء پر عائد ہوتی ہے، وہ بھی پورا پورا نقصان ادا کرنا ہو گا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] مسند امام احمد، ص: ١٤٤، ج٦۔ [2] علم اصول الفقه، ص: ١٣٧۔

ہتھیائی رقم کی واپسی

سوال دو آدمیوں نے کسی شخص سے فراڈ کر کے مبلغ دو ہزار روپے ہتھیا لیے۔ اس جرم میں وہ دونوں برابر کے شریک ہیں، اور رقم کو تقسیم کر لیتے ہیں، اب ان میں سے ایک توبہ کر لیتا ہے چونکہ مالی معاملات میں توبہ کی شرط یہ ہے کہ مظلوم کا مال واپس کیا جائے۔ کیا اسے صرف اپنا حصہ مبلغ ایک ہزار روپیہ واپس کرنا ہوگا یا اپنی ذاتی گرہ سے دو ہزار واپس کرے گا؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب واقعی حقوق العباد کا معاملہ انتہائی سنگین ہے، مالی معاملات کے متعلق توبہ میں دو چیزیں پیش نظر رکھنا ہوتی ہیں، ایک تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے کیونکہ اس نے اللہ کی نافرمانی کی ہے دوسرے یہ کہ مظلوم کا مال واپس کیا جائے یا اسے راضی کر لیا جائے، اگر ایسا نہیں کیا گیا تو قیامت کے دن اسے نیکیاں دے کر یا مظلوم کی برائیاں لے کر حساب برابر کیا جائے گا۔ صورت مسئولہ میں جس شخص کو اللہ کا خوف دامن گیر ہوا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے دوسرے ساتھی کو اس توبہ پر آمادہ کرے، اسے خوف آخرت دلائے پھر دونوں مل کر اس کے نقصان کی تلافی کریں اور اس سے معافی بھی مانگیں اور آیندہ کے لیے ایسا فراڈ یا دھوکہ نہ کرنے کا مصمم ارادہ کریں، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو جسے اللہ کا خوف آیا ہے وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے حصے کی رقم مبلغ ایک ہزار روپیہ واپس کر کے مظلوم سے معاملہ کی وضاحت کر دے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اتنا دے کر اللہ کے ہاں اس کی رہائی ہو جائے گی اس پر دوسرے ہزار کا تاوان نہ ڈالا جائے جو اس کی ساتھی کے پاس ہے، کیونکہ برے کام کا بدلہ تو برے کام کے مطابق اور اس کے برابر ہوگا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۶۰﴾ [1]

''اور جو برائی لے کر اللہ کے ہاں حاضر ہوگا اسے اتنی ہی سزا دی جائے گی جتنی اس نے برائی کی تھی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ قیامت کے دن وہ معاملہ کرے گا جو اس کی شانِ رحیمی کے مطابق ہے۔

---

[1] ٦/الانعام: ١٦٠۔
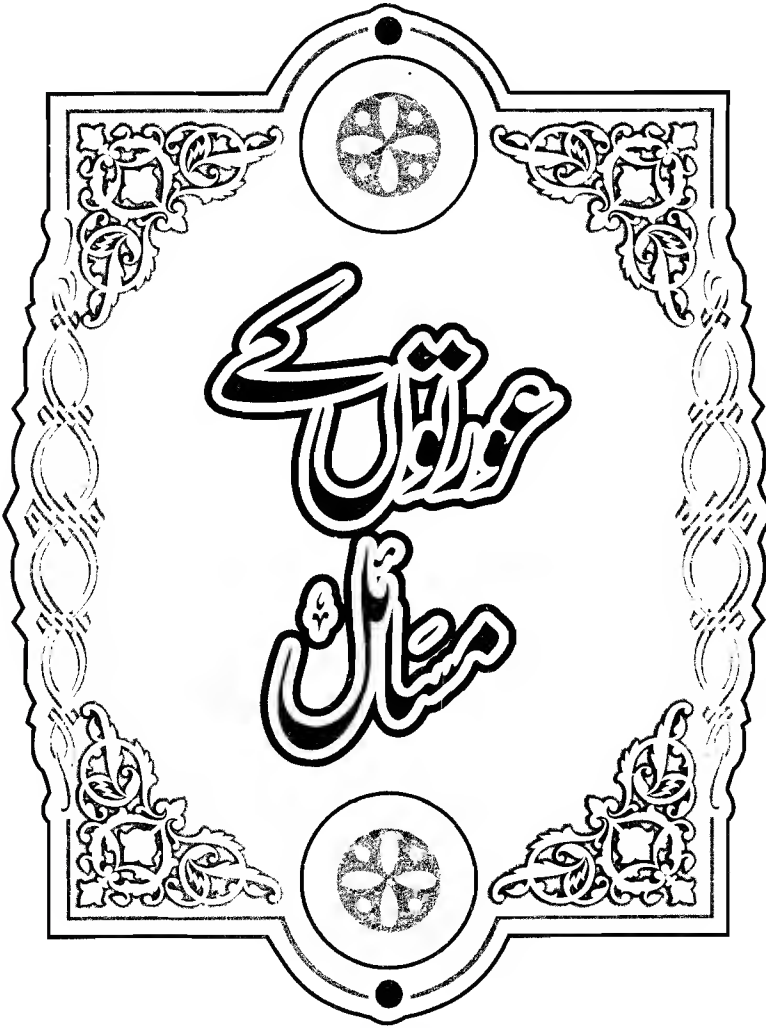
عورتوں کے مسائل

عورتوں کے مسائل

غیر محرم عورت سے مصافحہ کرنا

سوال ہمارے ایک بزرگ غیر محرم عورتوں سے مصافحہ کرتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں نیز اس عمل کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

جواب غیر محرم انسان کا عورتوں سے مصافحہ کرنا حرام اور ناجائز ہے، خود رسول اللہ ﷺ جب عورتوں سے بیعت لیتے تو فرماتے: ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ہوں۔'' [1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ کسی غیر محرم عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا، آپ ان سے صرف زبانی بیعت لیتے تھے۔ [2]

غیر محرم عورتوں سے مصافحہ کی ممانعت اس لیے ہے کہ ان سے مصافحہ کرنا بے شمار فتنوں کا پیش خیمہ ہے اس لیے سوال میں ذکر کردہ بزرگ کا یہ عمل درست نہیں۔ انہیں اس سے اجتناب کرنا چاہیے، بزرگی کی آڑ میں غیر شرعی کام کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ (واللہ اعلم)

عورتوں کا کھیلوں میں حصہ لینا

سوال عورتوں کا کھیلوں میں حصہ لینا شرعاً کیسا ہے؟ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک مرتبہ دوڑ لگانے کا مقابلہ کیا تھا، اس واقعہ کو بنیاد بنا کر عورتوں کا کھیلوں میں حصہ لینا جائز قرار دیا جاتا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس امر کی وضاحت کریں؟

جواب سوال میں جس واقعہ کو بنیاد بنا کر عورت کے لیے کھیلوں میں حصہ لینے کو جائز کیا گیا ہے ہم اس کی تفصیل بیان کر دیتے ہیں تاکہ اس بنیاد کا کھوکھلا پن ظاہر ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان دوڑ لگانے کا واقعہ زندگی میں دو مرتبہ پیش آیا ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خود بیان کرتی ہیں: ''میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک سفر میں تھی، اس وقت میری عمر زیادہ نہ تھی اور جسم بھی ہلکا پھلکا تھا، آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آگے بھیج دیا پھر آپ نے دوڑ لگائی، میں بھی آپ کے ساتھ اس دوڑ میں شریک تھی۔ چنانچہ میں آپ سے آگے بڑھ گئی، کافی عرصہ بعد میں پھر ایک مرتبہ آپ کے شریک سفر تھی جبکہ اس وقت

---

[1] سنن ابن ماجه، الجهاد: ٢٨٧٤۔ [2] صحيح بخاری، الطلاق: ٥٢٨٨۔

میرا جسم بھاری ہو گیا تھا اور میں گزشتہ واقعہ کو بھی بھول گئی تھی، آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آگے بھیج دیا پھر آپ نے میرے ساتھ دوڑ لگائی تو آپ آگے بڑھ گئے۔ اس پر آپ نے فرمایا: ''یہ سبقت، اس جیت کے بدلے میں ہے۔'' ❶

یہ واقعہ آبادی سے باہر کسی میدانی علاقہ میں پیش آیا، اس سے اچھے انداز میں معاشرتی زندگی کی تکمیل مقصود تھی تاکہ میاں بیوی کے درمیان محبت والفت اور یگانگت کا رشتہ مزید مضبوط ہو، خاوند کے لیے بیوی کے ساتھ اس طرح کا مقابلہ کرنا اب بھی جائز ہے بشرطیکہ وہ تنہائی میں ہو اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو، نیز اس سے کسی فتنہ کو ہوا نہ ملتی ہو۔ لیکن اس واقعہ سے برسرعام مقابلوں کا جواز کشید کرنا انتہائی محل نظر ہے۔ (واللہ اعلم)

بیوی کے فرائض

سوال ایک عالم دین نے دوران درس یہ مسئلہ بیان کیا کہ عورت کے لیے خاوند کی خدمت کرنا قطعاً واجب نہیں ہے، اس مسئلہ نے عورتوں میں ایک عجیب سا ہیجان پیدا کر دیا ہے، ازراہ کرم وضاحت فرما دیں۔

جواب ہمارے علم کے مطابق یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے، اسلامی معاشرہ کا یہ عرف ہے کہ بیوی اپنے خاوند کی عمومی خدمات بجا لایا کرتی ہے مثلاً کھانا پکانا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی کرنا وغیرہ۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی خدمت کی جس کا تذکرہ بعض احادیث میں ملتا ہے، اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے شوہر نامدار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مصروف رہتی تھیں۔ لہٰذا مذکورہ مسئلہ مغربی تہذیب کا حصہ تو ہو سکتا ہے اسلامی طرز زندگی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا مردوں کا امام بننا

سوال میں نے قرآن حفظ کیا ہوا ہے اور دینی تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ ہوں جب کہ میرا خاوند دین کے معاملہ میں واجبی سا علم رکھتا ہے، کیا میں گھر میں اس کی امامت کرا سکتی ہوں، کیونکہ حدیث میں ہے کہ لوگوں کی امامت وہ شخص کرائے جو کتاب اللہ کا زیادہ قاری ہو۔

جواب عورت، مردوں کی امام نہیں بن سکتی چاہے خواہ وہ اس کا خاوند، بیٹا یا بھائی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنا معاملہ کسی عورت کے سپرد کر دیا ہو۔'' ❷

عورت اگر مرد سے زیادہ پڑھی لکھی ہو تو بھی مردوں کی امامت کی اہل نہیں ہے ہاں وہ گھر میں عورتوں کی امامت کرا سکتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کرا سکتی ہے ❸ کیونکہ وہ قرآن کریم کی حافظہ تھیں جیسا کہ دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ ❹ امامت کراتے وقت اسے عورتوں کے آگے نہیں بلکہ درمیان میں

---

❶ مسند امام احمد، ص: ۲٦٤، ج٦۔ ❷ صحیح بخاری، المغازی: ٤٤٢٥۔

❸ ابو داود، الصلوٰۃ: ٥٩١۔ ❹ صحیح ابن خزیمہ، ص: ٨٩، ج٣۔

کھڑے ہونا چاہیے جیسا کہ حضرت حجیرۃ بنت حصین رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ہمیں نماز عصر پڑھائی تو وہ درمیان میں کھڑی ہوئیں۔ (1)

سائلہ نے جس حدیث کے پیش نظر خود کو اپنے خاوند کی امامت کرانے کا اہل قرار دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کی امامت وہ شخص کرائے جو کتاب اللہ کا زیادہ قاری ہو۔ (2)

اس حدیث کو بنیاد بنا کر عورت، مرد کے ساتھ یکجا ہونے کی صورت میں اس حکم کی مخاطب نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے معاشرہ کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا: یعنی مرد اور عورتیں، اس بنا پر مذکورہ صورت میں عورت، حدیث کے عموم میں داخل نہیں نیز دیگر احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ عورت، منصب امامت کی اہل نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا غیر محرم سے مصافحہ کرنا

سوال کیا عورت اپنے کسی بھی غیر محرم سے مصافحہ کر سکتی ہے؟ اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب کسی مرد کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی غیر محرم عورت سے مصافحہ کرے اور نہ ہی کسی عورت کے لیے ایسا کرنا جائز ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا، آپ ان سے صرف زبانی طور پر بیعت لیتے تھے۔ (3) رسول اللہ ﷺ نے جب عورتوں سے بیعت لی تو چند عورتوں نے آپ سے مصافحہ کرنے کی خواہش کی، آپ نے فرمایا: ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔'' (4)

ان احادیث کی روشنی میں کسی مرد کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ غیر محرم عورتوں سے مصافحہ کرے، اس سے فتنے کے اسباب پیدا ہوتے ہیں لہٰذا اس قسم کی رسم بد کو ترک کرنا ضروری ہے۔ البتہ عورت کا دیگر عورتوں سے یا محرم رشتے داروں سے مثلاً خاوند، باپ، بھائی اور بیٹے وغیرہ سے مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

ناجائز کام کی قسم اٹھانا

سوال میں نے اپنی بیوی کو مخاطب ہو کر قسم اٹھائی کہ تو اپنے میکے نہیں جائے گی، اب خیال آتا ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، میرے لیے اس کا کیا حل ہے؟

جواب انسان کو قسم اٹھاتے وقت خوب غور وفکر کرنا چاہیے، اگر کوئی قسم اٹھانے کے بعد دیکھتا ہے کہ مصلحت اس میں نہیں بلکہ قسم کے خلاف کام کرنے میں ہے تو اپنی قسم کو توڑ دیا جائے اور اس قسم کا کفارہ ادا کر دیا جائے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تو قسم اٹھائے پھر اس کام کے مقابلہ میں دوسرے کام کو بہتر سمجھے تو قسم کا کفارہ ادا کر کے دوسرا بہتر کام کر لے۔ (5)

قسم کے کفارہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

---

(1) بیہقی، ص: ۱۳۰، ج۳۔ (2) صحیح مسلم، الصلوٰۃ: ٦٧٣۔ (3) صحیح بخاری، الطلاق: ٥٢٨٨۔
(4) ابن ماجه، الجهاد: ٢٨٧٤۔ (5) صحیح بخاری، الایمان: ٦٦٢٢۔

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ ﴾ [1]

''اللہ تم سے تمہاری لغو قسموں کے متعلق مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جن قسموں کو تم نے مضبوط کر کے اٹھایا ہے، ان پر تم سے ضرور مواخذہ کرے گا۔ اس کا کفارہ دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا دینا ہے جو تم اپنے گھروں میں کھاتے ہو یا انہیں لباس دینا یا غلام آزاد کرنا ہے لیکن جو شخص ان کی طاقت نہ رکھے تو اس کے ذمے تین دن کے روزے ہیں، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم اٹھالو اور اپنی قسم کی حفاظت کیا کرو۔''

اس حدیث اور آیت کے پیش نظر صورت مسئولہ میں قسم اٹھانے والے کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو میکے جانے کی اجازت دے اور قسم توڑ دے اور پھر آیت میں مذکور اس کا کفارہ ادا کر دے، انسان کو چاہیے کہ وہ قسم اٹھاتے وقت خوب سوچ و بچار کرے، یہ کوئی بچوں کا کھلونا نہیں ہے کہ جب چاہے اسے توڑ لے اور جب چاہے اسے جوڑ لے۔ (واللہ اعلم)

تنہائی میں دم کرنا

سوال ہمارے گاؤں میں ایک مولانا صاحب دم کرتے ہیں، بعض اوقات عورتوں کی حالت کے پیش نظر انہیں کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر میں بھی ٹھہراتے ہیں اور دم کرتے وقت تنہا رکھتے ہے، ایسے حالات میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب شرعی طور پر کسی بھی عورت سے غیر محرم کے لیے تنہائی اختیار کرنا حرام ہے خواہ وہ خلوت قرآن کریم کا دم کرنے کے لیے ہی کیوں نہ ہو، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''خبردار! جو آدمی کسی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرتا ہے ان دونوں میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔'' [2]

اس حدیث کے پیش نظر کسی بھی مرد کو غیر عورت کے ساتھ خلوت اختیار کرنا حرام ہے، صورت مسئولہ میں سب سے زیادہ سنگین جرم دم کرنے والے کا غیر عورت کو اپنے گھر میں ٹھہرانا ہے، ایسا کرنا تو برائی کو دعوت دینا ہے اور فساد پھیلانے کے وسائل سے ہے، ہر مسلمان مرد اور عورت کو ایسے اقدام سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے اس کی عزت و ناموس پر حرف آتا ہو، اگر دم کے بغیر چارہ نہ ہو تو محرم کی موجودگی میں دم کیا جائے اور غیر عورت کو اپنے گھر ٹھہرانے کا تکلف نہ کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا عورتوں کو امامت کرانا

سوال کیا گھر میں عورت، دوسری عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے، اگر جماعت کرانا ہو تو کیا اس کے لیے اذان اور تکبیر کہی جائے یا تکبیر کہہ کر جماعت کرانا کافی ہوگا؟

جواب عورتوں کے لیے اذان کہنا مشروع نہیں ہے، یہ امور صرف مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں، البتہ تکبیر کہہ کر

---

[1] ۵/المائدۃ: ۸۹۔ [2] ترمذی، الفتن: ۲۱۶۵۔

عورتیں، باجماعت نماز ادا کرسکتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایک بزرگ خاتون حضرت ام ورقہ بنت نوفل رضی اللہ عنہا کو اس امر کی اجازت دی تھی، کیونکہ یہ خاتون قرآن کریم کی حافظہ تھی، حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (1) رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے ایک بہت بوڑھا موذن مقرر کیا تھا اور حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کرایا کرے۔ (2) گھر والوں میں مرد حضرات شامل نہیں ہیں کیونکہ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ ''وہ اپنے گھر کی عورتوں کی امامت کرے۔'' (3)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اجازت دی تھی کہ ان کے لیے اذان کہی جائے اور وہ اپنے اہل خانہ کی فرض نماز میں امامت کرائیں کیونکہ وہ حافظہ قرآن تھیں۔ (4) جب عورت جماعت کرائے تو وہ آگے کھڑی ہونے کے بجائے عورتوں کے درمیان کھڑی ہو جیسا کہ حضرت حجیرہ بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ہمیں نماز عصر پڑھائی تو وہ ہمارے درمیان کھڑی ہوئیں۔ (5) بہرحال عورت اگر امامت کی اہلیت رکھتی ہے یعنی اسے قرآن مجید یاد ہے تو وہ عورتوں کی امامت کراسکتی ہے اور جماعت کراتے وقت وہ عورتوں کے درمیان میں کھڑی ہوگی اور فرض اور نفل دونوں کی جماعت کراسکتی ہے۔

گھر کے خاص راز فاش کرنا

سوال میری بیوی گھر کی خاص باتیں اپنی سہیلیوں کو بتاتی ہے، میں نے اسے سمجھایا ہے لیکن وہ باز نہیں آتی اس کے متعلق شرعی ہدایت کیا ہیں، اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

جواب کچھ مردوں اور عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کی خاص باتیں باہر نشر کرتے ہیں۔ مرد حضرات اپنے دوستوں کو اور خواتین اپنی سہیلیوں کو بتاتی ہیں، حالانکہ کوئی بھی غیرت مند مرد یا عورت ان باتوں کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا، یہ ایسا حرام کام ہے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ﴾ (6)

''نیک عورتیں وہ ہیں جو فرمانبردار ہوں اور ان کی عدم موجودگی میں اللہ کی حفاظت ونگرانی میں ان کے حقوق کی نگرانی کرنے والے ہوں۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ غائبانہ طور پر خاوند کے حقوق کی نگہداشت کرنا فرمانبردار بیوی کی امتیازی علامت ہے اور جو بیوی گھر کے راز اپنی سہیلیوں سے کہتی ہے وہ اپنے خاوند کے حقوق میں خیانت کا ارتکاب کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے، جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں موجود نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارے مال اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔'' (7)

---

(1) ابو داود، الصلوٰۃ: ۵۹۱۔ (2) ابو داود، الصلوٰۃ: ۵۹۲۔ (3) دارقطنی، الصلوٰۃ: ۱۰۶۹۔
(4) صحیح ابن خزیمہ، الصلوٰۃ: ۱۶۷۶۔ (5) سنن الکبریٰ للبیھقی، ص: ۱۳۰، ج۳۔
(6) ٤/النساء: ٣٤۔ (7) ابن ماجہ، النکاح: ۱۸۵۷۔

بیوی کا خاوند کے راز افشا کرنا خاوند کے ساتھ خیانت کے مترادف ہے۔ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’قیامت کے دن اللہ کے نزدیک مقام اور مرتبے کے اعتبار سے بدترین شخص وہ ہوگا جو اپنی بیوی سے مباشرت کرتا ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتی ہے پھر وہ اپنا راز لوگوں میں پھیلائیں۔ [1]

ان احادیث کی روشنی میں بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنی عادت بد پر نظر ثانی کرے، خاوند کو بھی خود پر کنٹرول کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کتاب وسنت کے احکام پر عمل کی توفیق دے۔آمین

حمل کے آخری مرحلہ میں بیوی سے ہم بستری کرنا

سوال میری بیوی حمل کے آخری مرحلہ میں ہے، کیا اس حالت میں اس سے ہم بستری کرنا جائز ہے؟ کتاب وسنت کے مطابق راہنمائی کریں۔

جواب انسان، دوران حمل اپنی بیوی سے جب چاہے ہم بستری کرسکتا ہے۔کتاب وسنت میں اس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں ہے لیکن اگر ایسا کرنے سے کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ ہو تو یہ فعل حرام ہے۔اگر نقصان کا اندیشہ نہیں البتہ تکلیف اور مشقت ہو تو اس صورت میں بہتر ہے کہ ہم بستری نہ کی جائے کیونکہ بیوی کو مشقت میں ڈالنا حسن معاشرت کے خلاف ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ [2]

’’اور ان عورتوں سے احسن انداز میں معاشرت اختیار کرو۔‘‘

بہر حال صورت مسئولہ میں دوران حمل آدمی اپنی بیوی سے ہم بستری کرسکتا ہے بشرطیکہ کسی قسم کے نقصان کا خطرہ نہ ہو اور اگر اس سے بیوی تکلیف محسوس کرے تو بھی اس سے اجتناب بہتر ہے۔(واللہ اعلم)

مریضہ کا دودھ پلانا

سوال ایک عورت کو ایڈز کا مرض لاحق ہے، کیا وہ ایسے حالات میں اپنے تندرست بچے کو دودھ پلاسکتی ہے اور اس کی پرورش کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔

جواب طب جدید نے اس سلسلہ میں جو معلومات فراہم کی ہیں، ان کے مطابق ایڈز کی شکار ماں اپنے بچے کو دودھ پلا سکتی ہے اور اس کی پرورش کرسکتی ہے کیونکہ بچے کو دودھ پلانے اور اس کی پرورش کرنے سے بچے کو خطرہ یقینی نہیں ہے، اس مسئلہ میں اس کی حالت عام ہے جس میں ایک دوسرے سے میل جول ہوسکتا ہے البتہ یہ بیماری جنسی ملاپ سے آگے پھیلتی ہے اس لیے میاں بیوی میں سے جو تندرست ہو اسے یہ حق ہے کہ وہ ایڈز کے مریض سے الگ ہو جائے خواہ وہ خاوند ہو یا بیوی، اطباء کا کہنا ہے کہ ایڈز کا مرض جنسی تعلقات قائم کرنے سے دوسرے کو بھی لگ جاتا ہے، بہر حال دودھ پلانے اور بچوں کی پرورش کرنے سے اس کا کوئی

---

[1] صحیح مسلم، النکاح: ۱۴۳۷۔ [2] ٤/النساء: ۱۹۔

اندیشہ نہیں لہٰذا ایڈز کی شکار ماں اپنے تندرست بچے کو دودھ پلا سکتی ہے۔ شریعت میں اس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اگر طبی طور پر کوئی ممانعت نہیں تو وہ اپنے بچے کی پرورش کرسکتی ہے اور اسے دودھ بھی پلا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

بسوں میں گداگری کرنا

سوال بسوں اور گاڑیوں میں جوان لڑکیاں بھیک مانگتی ہیں، ان کا طریقہ واردات یہ ہے کہ پہلے کارڈ اور ٹافیاں تقسیم کرتی ہیں پھر کارڈ اکٹھے کرتے وقت بھیک مانگتی ہیں، کیا ان کے ساتھ تعاون کرنا جائز ہے، انہیں روپیہ پیسہ دینے سے ثواب ہوگا؟

جواب بسوں اور گاڑیوں میں جو جوان لڑکیاں بھیک مانگتی ہیں، یہ دراصل بے حیائی اور بے غیرتی کی اشاعت کرتی ہیں، ان کے صحت مند بھائی یا باپ یا خاوند گھر میں ہوتے ہیں اور وہ ان جوان لڑکیوں کو مانگنے کے لیے بھیج دیتے ہیں یہ ان کا پیشہ ہے بلکہ اس کی آڑ میں ناگفتہ بہ واقعات کا ارتکاب کیا جاتا ہے، ان کے ساتھ تعاون کرنا برائی اور فحش کاری کی اشاعت کرنا ہے، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سوال کیا حالانکہ اسے سوال کرنے کی ضرورت نہ تھی، اسے قیامت کے دن اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرے پر خراشیں ہوں گی۔'' [1]

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص میری ایک بات قبول کرے میں اس کے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں میں نے عرض کیا میں قبول کرتا ہوں، آپ نے فرمایا: لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کرنا۔

اس ارشاد نبوی کے بعد حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنی سواری پر سوار ہوتے اور ان کا کوڑا گر جاتا تو وہ کسی سے یہ نہ کہتے کہ میرا کوڑا مجھے پکڑا دو بلکہ خود سواری سے اتر کر اسے اٹھاتے [2] بہر حال بسوں اور گاڑیوں میں پیشہ ورقسم کے بھکاری آتے ہیں خاص طور پر نوجوان لڑکیاں گدگری کی آڑ میں بے حیائی پھیلاتی ہیں، ان سے تعاون نہیں کرنا چاہیے۔ ان سے تعاون کرنا بے حیائی کو فروغ دینا ہے لہٰذا ایک مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

غسل جنابت سے پہلے حیض آنا

سوال ایک عورت کے ذمے غسل جنابت کرنا تھا، لیکن اسے حیض آ گیا، اب اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب اگر کسی مرد یا عورت نے غسل جنابت کرنا ہو تو بلاوجہ تاخیر کرنا مناسب نہیں ہے، اس حکمی نجاست کو جس قدر ممکن ہو، جلدی دور کرلیا جائے، لیکن اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی عورت غسل جنابت نہیں کرسکی، اس دوران اسے حیض آ گیا تو اب الگ سے غسل جنابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ نفسیاتی طور پر اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہے تو الگ بات ہے تاہم پیش آمدہ صورت حال میں اسے غسل جنابت کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے، جب حیض سے فارغ ہو تو دونوں کے لیے ایک ہی غسل کافی ہوگا، حیض کی کثافت، جنابت سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ جنابت کی حالت میں روزہ رکھنے کی اجازت ہے جبکہ بحالت حیض روزہ رکھنے کی ممانعت ہے، ہمارے رجحان کے مطابق اسے الگ سے غسل جنابت کے تکلف کی ضرورت نہیں بلکہ ایام سے فراغت کے بعد ایک ہی غسل کافی ہوگا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح الترغیب، نمبر: ۸۰۰۔ [2] مستدرك حاكم، ص: ۴۱۲، ج۱۔

چہرے کا پردہ

سوال ہمارے ہاں کچھ روشن خیالوں کا کہنا ہے کہ اسلام میں عورت کے لیے چہرے کا پردہ ضروری نہیں ہے جب ان کے سامنے یہ آیت پیش کی جاتی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ﴾ [1]

''اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی چادر کے پلو اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔''

وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد چادر کو اپنے جسم پر لپیٹنا ہے جسے پنجابی میں بکل مارنا کہتے ہیں۔ براہ کرم اس الجھن کو دور کریں۔

جواب دراصل عورت کا چہرہ ہی وہ چیز ہے جو مرد کے لیے عورت کے باقی تمام بدن سے زیادہ پرکشش ہوتا ہے اگر اسے ننگا رکھنے کی اجازت دی جائے اور اسے شرعی حجاب سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے تو حجاب کے احکام بے سود ہیں، سوال میں آیت کریمہ کا جو معنی کیا گیا ہے یہ لغوی، عقلی اور نقل کے اعتبار سے غلط ہے، اب ہم اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

☆ لغوی لحاظ سے ادناء کا معنی قریب کرنا، جھکانا اور لٹکانا ہے، قرآن میں یدنین کے بعد علی کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کسی چیز کو اوپر سے لٹکا دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جب اس کا معنی لٹکانا ہے تو اس کا معنی سر سے لٹکانا ہے جس میں چہرہ کا پردہ خود بخود آجاتا ہے۔

☆ عقلی اعتبار سے اس لیے غلط ہے کہ اگر کوئی شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے لڑکی کا چہرہ نہ دکھایا جائے باقی سارا جسم دکھایا جائے، تو وہ اس پر اطمینان کا اظہار نہیں کرے گا یہ ممکن ہے کہ لڑکی کا صرف چہرہ دکھا دیا جائے تو وہ مطمئن ہو جائے، جب یہ چیزیں ہمارے مشاہدہ میں ہیں تو چہرے کو پردے سے کیونکر خارج کہا جا سکتا ہے؟

☆ نقل کے اعتبار سے یہ معنی درست نہیں ہے کیونکہ سورۂ احزاب ۵ ہجری میں نازل ہوئی، اس کے بعد واقعہ افک ۶ ہجری میں پیش آیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کی تفصیل بیان کرتی ہیں کہ میں اسی جگہ بیٹھی رہی، اتنے میں میری آنکھ لگ گئی، حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ وہاں آئے، اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اونچی آواز سے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، اتنے میں میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اپنی چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ [2]

بہرحال روشن خیال لوگوں کا یہ موقف مبنی برحقیقت نہیں ہے کہ چہرے کا پردہ مطلوب نہیں، بلکہ اس سلسلہ میں صحیح موقف یہی ہے کہ چہرے کا پردہ اسلام میں مطلوب ہے، اسلامی معاشرتی زندگی کا بھی یہی تقاضا ہے۔ (واللہ اعلم)

چھوٹے بچوں کا محرم بننا

سوال خواتین کا اپنے فیملی ڈرائیور کے ہمراہ محرم کے بغیر سفر کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کچھ عورتیں اپنے بچوں کو

---

[1] ۳۳/الاحزاب: ۵۹۔ [2] صحیح بخاری، المغازی: ۴۱۰۱۔

ہمراہ لے جاتی ہیں، کیا چھوٹے بچے محرم کے قائم مقام ہو سکتے ہیں؟ کیا تبلیغی سفر کرنا بھی درست نہیں ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں تفصیل سے آگاہ کریں۔

جواب کسی خاتون کا محرم کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں ہے، خواہ اکیلی ہو یا جماعت، دوران سفر محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے، یہ سفر خواہ کسی دنیاوی غرض کے لیے ہو یا اس سے مقصود تبلیغ کرنا ہو، سر پرست اور محرم حضرات کا اس سلسلہ میں تساہل اور چشم پوشی کرنا درست نہیں، اس سے کئی ایک خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، عورت خواہ بڑی عمر کی ہی کیوں نہ ہو، اس کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ اپنے فیملی ڈرائیور کے ساتھ تنہا سفر کرے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہیں ہوتا مگر ان دونوں میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔'' [1]

جو حضرات اپنی محرم خواتین کے لیے اس امر کو پسند کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیوث جیسے بدترین الفاظ سے یاد کیا ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق اگر کسی خاتون کے ساتھ اس کے نابالغ بچے بھی ہوں تب بھی محرم کے بغیر اس کا سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ بچے کسی صورت میں محرم کے قائم مقام نہیں ہو سکتے، جس شخص کے ذریعے ممنوعہ خلوت ختم کی جاسکتی ہے اس کا بڑا ہونا ضروری ہے۔ اس بنا پر کم سن کا موجود ہونا کافی نہیں ہے۔ خواتین کا یہ تصور کہ اگر انہوں نے اپنے ساتھ کسی بچے کو لے لیا ہے تو خلوت ختم ہوگئی بہت خطرناک اور انتہائی غلط ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''اگر کوئی اجنبی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ کسی تیسرے محرم شخص کے بغیر خلوت کرتا ہے تو باتفاق علما یہ فعل حرام ہے، اس طرح اگر دونوں کے ساتھ کوئی ایسا شخص ہو جس سے اس کی کم سنی کی وجہ سے شرم وحیا نہ کی جاتی ہو تو اس کے ذریعے ممنوعہ خلوت ختم نہیں ہو سکتی۔'' [2]

خواتین کی جماعت کا اکیلے ڈرائیور کے ساتھ تبلیغی سفر کرنا بھی صحیح نہیں ہے اور مدرسہ کا ناظم بھی اس سلسلہ میں محرم نہیں بن سکتا، خواہ وہ بڑی عمر کا ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ جس شخص سے نکاح ہو سکتا ہے وہ محرم نہیں ہو سکتا اس بنا پر عورت کا اجنبی مرد یا فیملی ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں سفر کرنا کسی بھی جگہ خلوت اختیار کرنے سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ عورت کو شہر کے اندر یا شہر کے باہر اس کی رضامندی یا اس کی رضا کے بغیر کہیں بھی لے جا سکتا ہے، اس سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی، وہ مجرد خلوت سے زیادہ خطرناک اور سنگین ہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

نوکرانی کا گھر میں کام کرنا

سوال ہمارے گھر میں ایک نوکرانی کام کاج کرتی ہے، بعض اوقات میں گھر میں نہیں ہوتی، صرف میاں ہوتے ہیں اور وہ نوکرانی گھر میں کام کرتی رہتی ہے، اس کے متعلق کتاب وسنت کا کیا حکم ہے؟ براہ کرم ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب گھر میں کام کرنے والی نوکرانی پر وہی احکام نافذ ہیں جو عام عورتوں کے لیے ہیں، وہ غیر محرم لوگوں سے پردہ کرے گی اور آپ کے میاں اس کے لیے غیر محرم ہیں، اس کے سامنے نوکرانی کا اپنی زیب وزینت کا اظہار جائز نہیں ہے بلکہ اگر گھر

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۱۸، ج ۱۔ [2] شرح نووی، ص: ٤٣٤، ج ۱۔

میں آپ کے میاں اکیلے ہیں تو نوکرانی کا گھر میں کام کاج بھی محل نظر ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کوئی آدمی کسی عورت کے ساتھ خلوت نہیں کرتا مگر تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔'' ❶

ان احادیث کی روشنی میں ہمیں اپنی گھریلو طرز معاشرت کے متعلق غور کرنا ہوگا، گھر میں کام کاج کرنے والی نوکرانی بھی عورت ہے اور اس پر وہی پابندیاں ہیں جو عام عورت کے لیے ہوتی ہیں لہٰذا نوکرانی کو بھی آپ کے میاں سے پردہ کرنا ہوگا اور ان دونوں کا اکیلے گھر میں اکٹھے رہنا بھی کئی ایک فتنوں کا پیش خیمہ بن سکتا ہے، بلکہ ایسے واقعات ہم روزانہ اخبارات میں پڑھتے ہیں جو ہماری ندامت اور ذلت کا باعث ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ایسے حالات میں قوانین اسلام پر عمل کرنا ہوگا، اسی میں ہماری عافیت ہے۔ (واللہ اعلم)

باپ کی غیر منصفانہ بات ماننا

سوال میرے بھائی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، عقیقہ کے موقع پر مجھے والدین نے دعوت دی، لیکن اس دن میرے خاوند کسی کام کی وجہ سے مصروف تھے، اس لیے ہم اس دن دعوت میں شریک نہ ہو سکے، میرے والد محترم اس بات پر میرے خاوند سے بہت ناراض ہوئے اور مجھے ان سے علیحدگی اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں جبکہ میرے اپنے خاوند سے تعلقات بہت اچھے ہیں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں، اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بہت پریشان ہوں، ایک طرف خاوند ہیں تو دوسری طرف میرے والد محترم ہیں دونوں کا کہا ماننا ضروری ہے۔

جواب صورت مسئولہ میں والد محترم کا رویہ عدل وانصاف کے منافی ہے، خاص طور پر لڑکیوں کے معاملہ میں تو انہیں بہت بردباری اور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا، وجہ نزاع بھی اتنی بڑی نہیں ہے کہ لڑکی کو خاوند سے علیحدگی اختیار کرنے کا مشورہ دیا جائے بلکہ اسے مجبور کیا جائے، ایسے حالات میں لڑکی کا اپنے والد محترم کی بات مان کر گھر بیٹھ رہنا یا اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، جس سے ہمیں اجتناب کرنا چاہیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو، اس کی بجا آوری کے لیے کسی کی بات کو نہ مانا جائے بلکہ اس کا انکار کر دیا جائے۔'' ❷

ہمارے رجحان کے مطابق ایسے حالات میں والد محترم کی بات کو نہ مانا جائے بلکہ اپنے خاوند کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کی جائے ویسے بھی شادی کے بعد عورت اپنے خاوند کا کہا ماننے کی پابند ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں نے کسی کو حکم دینا ہوتا کہ وہ کسی انسان کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔'' ❸

ایک روایت کے مطابق اس کی وجہ بایں الفاظ بیان فرمائی کہ خاوند کا عورت پر بہت بڑا حق ہے۔ ❹

شریعت کی نظر میں شوہر کی اطاعت کا حق والدین کی اطاعت سے بڑھ کر ہے چنانچہ سیدنا حصین رضی اللہ عنہ کی پھوپھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کسی کام کے لیے حاضر ہوئی، جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا:

---

❶ مسند امام احمد، ص:۱۸، ج۱۔ ❷ صحیح بخاری، الانعام: ۷۱۴۴۔

❸ ابو داود، النکاح: ۲۱۴۰۔ ❹ السنن الکبریٰ للنسائی عشرۃ النساء: ۹۱۴۷۔

''کیا تم شوہر والی ہو؟'' اس نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ آپ نے پوچھا: ''کیا تو اس کی خدمت کرتی ہے؟'' وہ کہنے لگی میں حسب استطاعت اس کی خدمت بجالاتی ہوں، پھر آپ نے فرمایا: ''تم نے اس امر پر غور کرنا ہے کہ خاوند کا مقام و مرتبہ تیرے مقابلہ میں کس قدر بلند ہے وہ تیرے لیے جنت ہے یا دوزخ ہے۔'' ❶

اس حدیث سے خاوند کے مرتبے اور مقام کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی اطاعت، فرمانبرداری اور خدمت گزاری سے جنت حاصل کی جاسکتی ہے جبکہ اس کی نافرمانی اور خدمت سے پہلوتہی دوزخ کا باعث ہے، لڑکی کو چاہیے کہ وہ نرمی کے ساتھ اپنے والد کو اپنے گھر کی آبادی کا احساس دلائے اور بلاوجہ ضد اور ہٹ دھرمی کے انجام سے آگاہ کرے۔ (واللہ اعلم)

عورت کا عورت کی محرم بننا

سوال کیا کوئی عورت دوسری عورت کے لیے محرم بن سکتی ہے یعنی اس کے ساتھ سفر کرسکتی ہے، حج پر جاسکتی ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کے حوالے سے جواب دیں۔

جواب اسلام نے عورت کی عزت و ناموس کی حفاظت کے، لیے سفر میں محرم ساتھ ہونے کی شرط لگائی ہے تاکہ وہ اسے غلط مقاصد کے حامل لوگوں سے محفوظ رکھے۔ اہل علم نے محرم ہونے کے لیے پانچ شرائط لگائی ہیں۔ ❶ مرد ہو، ❷ مسلمان ہو، ❸ بالغ ہو، ❹ عاقل ہو، ❺ وہ اس عورت کے لیے ابدی طور پر حرام ہو۔

واضح رہے کہ جن رشتہ داروں سے وقتی طور پر نکاح حرام ہے مثلاً بہنوئی اور پھوپھا وغیرہ وہ محرم نہیں ہیں۔ صورت مسئولہ میں کوئی عورت کسی دوسری عورت کے لیے محرم نہیں بن سکتی، اس لیے کوئی عورت دوسری عورت کے ساتھ (بطور محرم) سفر نہیں کرسکتی اور نہ ہی حج پر جاسکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''عورت، صرف محرم کے ساتھ ہی سفر کرے۔'' ❷

ہمارے رجحان کے مطابق سفر خشکی کا ہو یا ہوائی یا بحری، سب کا ایک ہی حکم ہے۔ کسی عورت کو شرعی طور پر یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ محرم کے بغیر سفر کرے اور عورت، کسی عورت کی محرم نہیں ہوسکتی لہٰذا اس کے ساتھ سفر کرنا بھی ناجائز ہے۔ (واللہ اعلم)

نکاح کے ۶ ماہ بعد بچہ کو جنم دینا

سوال اگر کوئی عورت نکاح کے چھ ماہ بعد بچے کو جنم دے تو شرعاً اس بچے کی کیا حیثیت ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب قرآن کریم نے ایک مقام پر حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت یکجا بیان کی ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَحَمْلُهُۥ وَفِصَٰلُهُۥ ثَلَٰثُونَ شَهْرًا﴾ ❸

''اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔''

دوسرے مقام پر مدت رضاعت بیان کی ہے کہ رضاعت کی پوری مدت دو سال ہے۔ ❹

---

❶ مسند امام احمد، ص: ۳٤۱، ج٤۔ ❷ بخاری، الجهاد: ۳۰۰٦۔

❸ ٤٦/الاحقاف: ۱۵۔ ❹ ۲/البقرة: ۲۳۳۔

تیسرے مقام پر فرمایا کہ

﴿ وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ ❶

''ماں کو دودھ چھڑانے میں دو سال لگ گئے۔''

ان آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے کیونکہ قرآن کریم نے حمل اور دودھ چھڑانے کی مجموعی مدت تیس ماہ بیان کی ہے پھر دودھ چھڑانے کی مدت دو سال کا ذکر کیا، اس مدت رضاعت کو مجموعی مدت سے منہا کریں تو باقی چھ ماہ حمل کی مدت رہ جاتی ہے، چنانچہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان آیات سے یہ استدلال کیا ہے کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے جیسا کہ حضرت معمر بن عبداللہ جہنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے قبیلہ کے ایک آدمی نے کسی عورت سے شادی کی تو اس نے شادی کے چھ ماہ بعد بچہ جنم دیا، اس کے خاوند نے اس امر کا ذکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا تو انہوں نے اس عورت کو رجم کرنے کا حکم دیا، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ بات پہنچی تو انہوں نے مذکورہ بالا آیات سے استدلال کر کے مسئلہ کی وضاحت کی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ ❷

ہمارا رجحان بھی یہ ہے کہ چھ ماہ کے بعد اگر کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے تو وہ بچہ حرامی نہیں بلکہ حلال ہی کا ہوگا اور اگر چھ ماہ سے پہلے پیدا ہو جائے تو وہ موجودہ خاوند کا نہیں بلکہ کسی اور مرد کا ہوگا۔ زیادہ واضح الفاظ میں وہ لڑکا ولد الزنا ہوگا اور اس کا وراثت سے بھی کچھ تعلق نہیں ہوگا اور بچے کی ماں کو زنا کی حد پڑ سکتی ہے۔ موجودہ طبی تحقیقات کے مطابق حمل کی کم از کم مدت ۲۸ ہفتے قرار دی گئی ہے، اگر یہ تحقیق صحیح ہو تو بھی شریعت نے اس مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کے پیش نظر اس مدت میں انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے اور حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ قرار دی ہے، چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو والد یا عورت کا خاوند اس کے نسب سے انکار کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ (واللہ اعلم)

عورت کا جانور ذبح کرنا

سوال کیا عورت کوئی جانور ذبح کر سکتی ہے، اگر عورت ذبح کرے تو اس جانور کا گوشت کھایا جا سکتا ہے؟

جواب قرآن و حدیث میں عورت کے متعلق کوئی ممانعت نہیں ہے کہ وہ ذبح نہ کرے یا اس کا ذبیحہ ناجائز ہے، اس لیے عورت ذبح بھی کر سکتی ہے اور عورت کا ذبح کردہ جانور کھایا بھی جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک عورت نے پتھر کی دھار سے بکری کو ذبح کر دیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے اسے کھانے کا حکم دیا۔ ❸

اس حدیث سے دو مسائل کا پتہ چلا: ❶ ذبح کرنے کے لیے صرف چھری ہی نہیں بلکہ ہر تیز دھار چیز سے ذبح کیا جا سکتا ہے۔ ❷ عورت ذبح کر سکتی ہے اور اس کا ذبح کیا جانور استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

---

❶ ۳۱/لقمان: ۱۴۔ ❷ تفسیر ابن کثیر، ص: ۱۶۶، ج ۴۔

❸ صحیح بخاری، الوکالہ: ۲۳۰۴۔

بوقت ضرورت پڑوسی سے کسی چیز کا تبادلہ کرنا

سوال ہمارے معاشرہ میں کچھ عورتیں اپنی پڑوسن سے بوقت ضرورت آٹا لے لیتی ہیں، پھر چند دنوں کے بعد واپس کر دیتی ہیں، ایک عالم دین نے مسئلہ کیا ہے کہ ایسا کرنا سود ہے براہ کرم اس کی وضاحت کریں؟

جواب خرید وفروخت کرتے وقت اگر ایک ہی جنس کی دو اشیاء کا تبادلہ کیا جائے تو دو چیزوں کا خیال رکھا جائے۔

① کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ نہ ہو۔

② دونوں طرف سے نقد ہو۔

اگر کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کیا یا ایک طرف ادھار اور دوسری طرف سے نقد تو ایسی دونوں صورتیں سود ہیں، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سونا، سونے کے بدلے، چاندی، چاندی کے بدلے، گندم، گندم کے بدلے، جو، جو کے بدلے، کھجور، کھجور کے بدلے اور نمک، نمک کے بدلے یہ تمام اشیاء برابر، برابر اور نقد بنقد فروخت کی جائیں پھر جو زیادہ لے یا زیادہ دے تو اس نے سودی کاروبار کیا۔ سود لینے والا اور سود دینے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں۔[1]

واضح رہے کہ تجارت میں سود کی دو قسمیں ہیں:

① ربا الفضل: ایک جنس کی دو اشیاء کو کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا۔

② ربا النسیہ: اس میں کمی بیشی نہ ہو لیکن ایک طرف سے نقد اور دوسرے طرف سے ادھار کا معاملہ ہو، سود کی یہ دونوں اقسام خرید وفروخت سے متعلق ہیں، البتہ معاشرتی طور پر ایک گھر والا اپنے پڑوسی سے وقتی طور پر کوئی چیز لیتا ہے۔ مثلاً گندم، آٹا، گھی اور چینی وغیرہ اور پھر چند دنوں بعد میسر آنے پر اسے واپس کر دیتا ہے تو یقیناً خرید وفروخت نہیں بلکہ تعاون باہمی کا ایک طریقہ ہے، اسے کسی صورت میں ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

اولاد کی خاطر دوسری عورت کا پیٹ کرایہ پر لینا

سوال میں جرمنی میں رہائش پذیر ہوں، میری بیوی کے رحم میں کوئی خرابی ہے، جس کی وجہ سے استقرار حمل نہیں ہوتا، مجھے کچھ دوستوں نے مشورہ دیا ہے کہ ہم میاں بیوی کے نطفہ امشاج کو کسی تیسری عورت کے رحم میں رکھ کر صاحب اولاد ہو سکتے ہیں، ہمارے ہاں اس طرح کی عورتیں دستیاب ہیں جو اپنا پیٹ کرایہ پر دیتی ہیں، اس طرح اولاد حاصل کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق ہمیں آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

جواب سوال میں ذکر کردہ صورت حال جدید میڈیکل کی ترقی، مادہ پرستی اور حصول زر کے برگ وبار ہیں، یہ وبا ہندوستان میں بھی عام ہے، وہاں مجبور وبے بس عورتیں کسی غیر مرد کے نطفہ کی نشوونما کے لیے اپنے رحم کرایہ پر دیتی ہیں، اس طرح انہیں خاصی رقم مل جاتی ہے، ہمارے رجحان کے مطابق یہ کاروبار ناجائز اور حرام ہے جس کی حسب ذیل وجوہات ہیں:

---

[1] صحیح مسلم، المساقاۃ: ۱۵۸٤۔

☆ قرآن کریم کی صراحت کے مطابق بچے کی وہ ماں ہوتی ہے جو اسے جنم دے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ﴾ ❶

''ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا ہے۔''

ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا﴾ ❷

''اللہ تعالیٰ نے تمہیں، تمہاری ماؤں کے پیٹ سے بایں حالت نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔''

جب کہ صورت مسئولہ کے مطابق بچہ جنم دینے والی کے بیضۃ المنی سے وہ بچہ پیدا نہیں ہوا بلکہ مخلوط مادہ منویہ کو اس کے رحم میں رکھا گیا ہے، بچہ تو اسی عورت کا جزو ہے جس کا بیضۃ المنی اس کے معرض وجود میں آنے کا سبب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ماں وہی عورت ہے جس کے بیضۃ المنی سے اس کی پیدائش ہوئی ہے، ایسے حالات میں پیدا ہونے والے بچے کی ماں کس عورت کو قرار دیا جائے گا؟ ہمارے نزدیک وہ عورت جس کے رحم میں شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کا مادہ منویہ پہنچایا گیا ہے وہ بدکار اور زانیہ عورت ہے، جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

پھر میاں بیوی کے مادہ منویہ کا حاصل کرنا اپنی جگہ پر قابل اعتراض ہے، اس کی بعض صورتیں شرعاً حرام ہیں، اس بنا پر ایک مسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ حصولِ اولاد کے لیے کسی بھی ناجائز کام کا سہارا لے بلکہ اسے صبر سے کام لینا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے آہ وزاری کے ساتھ دعا کرتا رہے، اس کے علاوہ کثرتِ استغفار کو اپنا معمول بنائے، اللہ تعالیٰ اسے اس عالم رنگ و بو میں اولاد سے محروم نہیں رکھے گا۔ قرآن کریم میں ایسے واضح اشارات ملتے ہیں کہ کثرت سے استغفار سے اللہ تعالیٰ اولاد نرینہ عطا کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)

عورت کے لیے جنت کی نعمتیں

سوال اکثر خواتین دریافت کرتی ہیں کہ مردوں کو تو جنت میں حوریں دی جائیں گی لیکن عورتوں کو کیا ملے گا؟ اس کے متعلق وضاحت کردیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اہل جنت کے متعلق فرمایا ہے:

﴿وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۚ﴾ ❸

''وہاں جو چاہے گا اور آنکھوں کو اچھا لگے گا موجود ہوگا اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۭ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۧ﴾ ❹

---

❶ ۵۸/المجادلة: ۲۔ ❷ ۱۶/النحل: ۷۸۔ ❸ ۴۳/الزخرف: ۷۱۔ ❹ ۴۱/حم السجدة: ۳۱،۳۲۔

''وہاں جس چیز کے لیے تمہارا جی چاہے گا ملے گی اور تم جو بھی چیز طلب کرو گے تمہارے لیے موجود ہوگی، اللہ بخشنے والے مہربان کی طرف سے میزبانی ہوگی۔''

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ﴾ [1]

''کوئی نفس نہیں جانتا کہ ہم نے کیا کچھ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان پوشیدہ کر رکھا ہے۔''

یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ انسانی نفوس سب سے زیادہ جس چیز کی خواہش رکھتے ہیں وہ شادی ہے، اس بنا پر جنت میں مردوں اور عورتوں کی اس خواہش کا بھرپور انتظام ہوگا، مردوں کو دنیاوی نیک بیویوں کے علاوہ جنت کی حوریں بھی عطا کی جائیں گی اور عورتوں کو کامل رجولیت کے حامل شوہر ملیں گے جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ ان کی جوانی ہمیشہ رہے گی اور وہ کبھی بڑھاپے سے دوچار نہیں ہوں گے۔'' [2]

بلکہ اہل جنت کے لیے عام منادی کی جائے گی کہ تم ہمیشہ جوان رہو گے اور تم پر بڑھاپا طاری نہیں ہوگا۔ [3]

جنت میں اللہ تعالیٰ نیک عورت کی شادی اس کے صالح دنیوی شوہر سے کردی جائے گی اور اگر کسی عورت نے دنیا میں شادی نہیں کی ہوگی تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی شادی ایسے مرد سے کرے گا جس سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہوگی۔ بہر حال اللہ تعالیٰ اگر مردوں کو حوریں دیں گے تو عورتوں کو کامل رجولیت کے حامل خاوند عطا کریں گے، اس کی مزید تفصیل ابن ماجہ، کتاب الزھد، حدیث نمبر: ۴۳۳۷ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

غیر محرم رشتہ دار سے پردہ کرنا

سوال میں ابھی چھوٹا تھا کہ میری بڑی ہمشیرہ کی شادی ہوگئی، اب ماشاء اللہ میری شادی ہوچکی ہے اور میری بچیاں بھی جوان ہیں، کیا میری بچیاں ہمارے بہنوئی سے پردہ کرنے کی پابند ہیں جبکہ وہ انہیں اپنی اولاد کی طرح دیکھتے ہیں، اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کریں۔

جواب پردے کا مسئلہ بڑی نزاکت کا حامل ہے لیکن ہم لوگ اس سلسلہ میں بہت غفلت کا شکار ہیں، ہمارے ہاں عام طور پر ممانی اور چچی، خاوند کے بھتیجے یا بھانجے سے پردہ نہیں کرتیں، اسی طرح پھوپھا اور خالو سے پردہ نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ یہ تمام رشتہ دار محرم نہیں ہیں کہ ان سے پردہ نہ کیا جائے، محبت و پیار اپنی جگہ پر ہے لیکن پردے کے سلسلہ میں کسی قسم کی لچک کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ جن رشتہ داروں سے پردہ نہیں کرنا چاہیے ان کی فہرست قرآن کریم میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ دیگر تمام رشتہ دار غیر محرم ہیں۔ جب بچی جوان ہوجائے تو اسے چاہیے کہ وہ غیر محرم رشتے داروں سے پردہ کرے۔ عزت و ناموس کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔ آمین

---

[1] ۳۲/السجدۃ: ۱۷۔ [2] صحیح مسلم، الجنة: ۷۱۵۶۔ [3] مسلم، الجنة: ۷۱۵۷۔

مرد کا عورت کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ایک بوڑھا مؤذن مقرر کیا تھا اور آپ اپنے گھر کے جملہ افراد کی امامت کرواتی تھیں، اس سے عورتوں کا مردوں کی جماعت کرانا ثابت کیا جاتا ہے، اس مسئلہ کی وضاحت کریں؟

جواب مذکورہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کی ملاقات کے لیے ان کے گھر جاتے تھے اور اذان دینے کے لیے آپ نے ایک مؤذن مقرر کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا کہ آپ اپنے اہل خانہ کی امامت کرادیا کریں۔ [1]

اس حدیث سے عورتوں کا مردوں کی امامت کرانا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ دوسری حدیث میں اس امر کی وضاحت ہے کہ ام ورقہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر اور محلے دار عورتوں کی امامت کراتی تھیں، چنانچہ ایک روایت میں ہے: ''بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو اجازت دی تھی کہ ان کے لیے اذان اور اقامت کہی جائے تاکہ وہ اپنے گھر اور محلے والی عورتوں کی امامت کریں۔ [2]
اس حدیث پر امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''فرض نماز میں عورت کا عورتوں کی امامت کرانے کا بیان'' [3] اس وضاحت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے ان کا مؤذن نماز نہیں پڑھتا تھا وہ صرف اذان دینے پر متعین تھا۔ (واللہ اعلم)

عورت کا آمدنی سے بڑھ کر مطالبہ کرنا

سوال میری بیوی، دوسری عورتوں کو دیکھ کر مجھ سے ایسی چیزوں کا مطالبہ کرتی ہے جسے میں پورا نہیں کرسکتا، کیونکہ میری آمدنی کے ذرائع انتہائی محدود ہیں، اس سلسلہ میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ قرآن وحدیث کے مطابق میری الجھن کو حل کریں۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی کا خرچہ خاوند کے ذمہ ہے، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم پر معروف طریقہ سے ان عورتوں کو کھلانا پلانا اور انہیں لباس مہیا کرنا لازم ہے۔'' [4] ایک دوسری حدیث میں حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ انہیں لباس مہیا کرنے اور انہیں کھانا مہیا کرنے میں تم ان سے اچھا سلوک کرو۔'' [5]

لیکن اخراجات کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے کیونکہ کسی عورت کو زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی کو کم، اسی طرح کوئی عورت دن میں دوبار کھانا کھاتی ہے اور کوئی تین بار کھانا کھانے کی عادت ہوتی ہے، کسی کا علاج سستی ادویات سے ہوجاتا ہے اور کسی کو مہنگے علاج کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ یہ بات اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ اس سلسلہ میں خاوند کی حیثیت کو ضرور مدنظر رکھا

---

[1] ابو داود، الصلوٰۃ: ۵۹۲۔ [2] دارقطنی، ص: ۲۷۹، ج۱۔ [3] صحیح ابن خزیمہ، ص: ۸۹، ج۳۔
[4] صحیح مسلم، الحج: ۱۲۱۸۔ [5] ترمذی، الرضاع: ۱۱۶۳۔

جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ ﴾ [1]

''صاحب حیثیت کو اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے اور جس پر اس کا رزق تنگ کر دیا گیا ہے اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ہمت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تو کھائے تو بیوی کو کھلائے اور جب تو پہنے تو بیوی کو بھی پہنائے۔ [2]

صورت مسئولہ میں عورت کا رویہ اچھا نہیں کیونکہ وہ دوسری عورتوں کو دیکھ کر اپنے مطالبات خاوند کے ہاں پیش کرتی ہے، اسے کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے اور اپنے خاوند کے ذرائع آمدنی کے مطابق ہی خرچ کا مطالبہ کرنا چاہیے، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک حدیث کی نشاندہی کی ہے۔

''بنی اسرائیل کی ابتدائی ہلاکت یہ تھی کہ ایک تنگ دست شخص کی بیوی اسے لباس یا زیورات لانے کی اتنی تکلیف دیتی تھی جتنی صاحب حیثیت خاوند کی بیوی زیورات کی تکلیف دیتی ہے۔ [3] بہر حال بیوی کو اس قسم کے غریب خاوند کی حالت زار پر رحم کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

خاوند کا بیوی کو ملازمت پر مجبور کرنا

سوال میرا شوہر مالدار ہے، لیکن مجھے ملازمت پر مجبور کرتا ہے، ان حالات میں کیا مجھے اپنے خاوند کی بات کو ماننا چاہیے اور ملازمت کر کے اخراجات میں حصہ ڈالنا چاہیے؟

جواب اگر خاوند صاحب حیثیت ہے اور بیوی کو ملازمت پر مجبور کرتا ہے تو بیوی پر اس سلسلہ میں اس کی بات ماننا ضروری نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ میں حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا کا کردار ہمارے لیے نمونہ ہے وہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! ابوسفیان رضی اللہ عنہ صاحب حیثیت ہونے کے باوجود گھر کے اخراجات کے سلسلہ میں کنجوس واقع ہوا ہے، مجھے وہ اتنا خرچہ نہیں دیتا جو میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے کافی ہو، میں نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ خفیہ طور پر اس کے مال میں سے کچھ لے لیتی ہوں، کیا ایسا کرنے سے مجھ پر کوئی گناہ تو نہیں ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات سن کر فرمایا: ''معروف طریقہ سے اتنا مال لے لیا کرو جو تمہیں اور تمہارے بچوں کو کافی ہو جائے۔'' [4]

اہل علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بیوی کا خرچہ اس کے خاوند پر فرض ہے، ایسے حالات میں خاوند کا اپنی بیوی کو ملازمت کے لیے مجبور کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، عورت کی ذمہ داری یہ ہے کہ گھر کی چار دیواری میں رہتے ہوئے اپنے خاوند کی خدمت بجالائے اور

---

[1] ٦٥/الطلاق: ٧۔ [2] ابو داود، النکاح: ٢١٤٢۔ [3] الاحادیث الصحیحہ: ٥٩١۔
[4] بخاری، البیوع: ٢٢١١۔

اپنے بچوں کی تربیت کرے، بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کو یاد دلائے کہ وہ مرد ہے اور خرچہ کرنے کی وجہ سے ہی بیوی پر اس کی سربراہی قائم ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ [1]

''مرد، عورتوں کے ذمہ دار اور منتظم ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے اور اس لیے بھی کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔''

خاوند کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس فانی دنیا کا مال حاصل کرنے کے لیے اپنی بیوی کو ملازمت پر مجبور کرے حالانکہ وہ صاحب حیثیت اور مالدار ہے اور اسے ملازمت وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بیوی اچھے انداز سے اپنے خاوند کو اس بات کا احساس دلائے اور اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرے۔ (واللہ اعلم)

محرم عورت کے ہمراہ غیر محرم کو عمرہ پر لے جانا

سوال ہماری پڑوسن کا کوئی محرم رشتہ دار موجود نہیں، وہ ہمارے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے جانا چاہتی ہے جب کہ میرے ساتھ میری والدہ اور بیوی ہے، کیا شرعاً اسے ہم ساتھ لے جا سکتے ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب اسلام نے کسی عورت کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، کیونکہ سفر ایک عذاب کا ٹکڑا ہے، صنف نازک کو دوران سفر معاونت کی ضرورت پڑ سکتی ہے، ایسے حالات میں محرم ہی اس کے کام آ سکتا ہے، اس کے علاوہ عورت کی پاکدامنی اور ناموس کی حفاظت کا تقاضا ہے کہ وہ محرم کے بغیر کوئی بھی سفر نہ کرے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بھی عورت محرم کے بغیر ہرگز سفر نہ کرے۔''

آپ کا یہ فرمان سن کر ایک آدمی کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا تو فلاں فلاں جنگ میں نام لکھا گیا ہے، میں وہاں جا رہا ہوں اور میری بیوی حج پر جا رہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنی بیوی کے ساتھ حج پر جاؤ۔'' [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جہاد جیسے اہم فریضے کو چھوڑ کر بیوی کے ساتھ جانے کا حکم دیا جو حج کا ارادہ رکھتی تھی، یہ حکم اس بات کی دلیل ہے کہ سفر میں عورت کے لیے محرم کا ہونا ضروری ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بہت اہم مسئلہ ہے لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا، ٹریول ایجنٹ حضرات محرم کے بغیر جانے والی عورت کے ساتھ کسی اجنبی شخص کو بطور محرم منتھی کر دیتے ہیں، جب کہ ایسا کرنا جھوٹ اور فراڈ کے علاوہ شریعت اور سعودی قانون کی خلاف ورزی ہے، ہمارے رجحان کے مطابق ایسی عورت پر حج فرض ہی نہیں جس کا کوئی محرم نہیں ہے، کیونکہ عورت کے لیے زاد سفر کے علاوہ محرم کا ہونا بھی شرط ہے، اندیشہ ہے کہ ایسا کرنے سے ثواب کے بجائے گناہ ملے، لہٰذا اس قسم کے حیلہ سے اجتناب کیا جائے۔ واضح رہے کہ عورت کا ہر وہ شخص محرم بن سکتا ہے جس سے کبھی بھی نکاح نہیں کر سکتی۔ مثلاً باپ، بھائی اور بیٹا وغیرہ، جن رشتے داروں سے وقتی طور پر نکاح حرام ہے مثلاً بہنوئی اور

---

[1] ٤/النساء: ٣٤۔ [2] صحیح بخاری، الجهاد: ٣٠٠٦۔

پھوپھا وغیرہ، وہ محرم نہیں بن سکتے، اس کے علاوہ عورت کا دیور، چچازاد اور ماموں زاد بھی اس کا محرم نہیں بن سکتا، یاد رہے کہ محرم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مرد مسلمان، عاقل اور بالغ ہو، نیز وہ عورت پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو۔ (واللہ اعلم)

مسلمان عورت کو کن کن لوگوں سے پردہ نہیں کرنا چاہیے؟

سوال مسلمان عورتوں کو کن کن لوگوں سے پردہ نہیں کرنا چاہیے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں اس امر کی وضاحت کریں؟

جواب مسلمان عورت صرف اپنے محرم مردوں سے پردہ نہیں کرے گی، ان کے علاوہ دیگر تمام لوگوں سے پردہ کرنا چاہیے۔ عورت کا محرم وہ شخص ہوتا ہے جس سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہوتا ہے مثلاً باپ، بھائی اور بیٹا وغیرہ۔ محارم کی حسب ذیل تین اقسام ہیں:

☆ نسبی محارم: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرابت داری کی وجہ سے محرم بنتے ہیں، قرآن کریم نے سورۂ نور [1] میں ایسے لوگوں کی تفصیل بیان کی ہے اور وہ حسب ذیل ہیں:

① آباء واجداد: عورت کا والد اور اس کے اوپر والے آباء واجداد، ان میں نانا اور اس کا والد بھی شامل ہے۔

② بھائی: عورت کے بیٹے اور ان کی اولاد در اولاد، ان میں پوتے اور نواسے وغیرہ سب شامل ہیں۔

③ بھائی: اس سے مراد حقیقی، پدری اور مادری بھائی بھی شامل ہیں، یہ بھی عورت کے لیے محرم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

④ بھانجے اور بھتیجے: عورت کے بھائی کے بیٹے اور ان کی اولاد در اولاد، اسی طرح عورت کی بہن کے بیٹے اور ان کی اولاد در اولاد ان میں شامل ہے۔

⑤ چچا اور ماموں: ان دونوں کا اگرچہ قرآن کریم میں ذکر نہیں ہے تاہم انہیں والد کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور انہیں محارم میں شمار کیا گیا ہے۔

☆ رضاعی محارم: اس سے مراد وہ محارم ہیں جو عورت کے لیے دودھ کی وجہ سے محرم بن جاتے ہیں، دودھ کا رشتہ بھی نسبی رشتہ کی طرح ہے، جس طرح نسبی محرم کے سامنے عورتوں کے لیے پردہ نہ کرنا مباح ہے، اسی طرح دودھ کی وجہ سے محرم بننے والے شخص کے سامنے اس کے لیے پردہ نہ کرنا مباح ہے، حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے دودھ کی وجہ سے بھی ان رشتوں کو حرام کردیا ہے جنہیں نسب کی وجہ سے حرام کیا ہے۔'' [2]

کسی عورت کا دودھ پینے سے اس کا خاوند، باپ اور اس کے بیٹے بھائی قرار پاتے ہیں، لہٰذا ان رضاعی محارم سے بھی پردہ نہ کرنا مباح ہے، احادیث میں رضاعی چچا سے پردہ نہ کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ [3]

☆ سسرالی محارم: عورت کے لیے کچھ رشتہ دار ایسے ہوتے ہیں جو نکاح کی وجہ سے محرم بن جاتے ہیں اور ان سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہوجاتا ہے۔ مثلاً:

---

[1] ٢٤/النور: ٣١۔ [2] مسند امام احمد، ص: ١٣١، ج١۔ [3] صحیح بخاری، النکاح: ٥١٠٣۔

(الف) بہو کے لیے خاوند کا باپ یعنی سسر محرم کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

(ب) ساس کے لیے بیٹی کا خاوند یعنی داماد بھی محرم بن جاتا ہے۔

(ج) والد کی بیوی کے لیے وہ بیٹے جو اس کی دوسری بیوی کے بطن سے ہوں، محرم ہیں اور ان سے نکاح حرام ہے، قرآن کریم نے ان کے محرم ہونے کی صراحت کی ہے۔ [1]

مذکورہ محرم رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے تمام لوگوں سے عورت کو پردہ کرنا چاہیے۔

---

[1] ٢٤/النور: ٣١۔
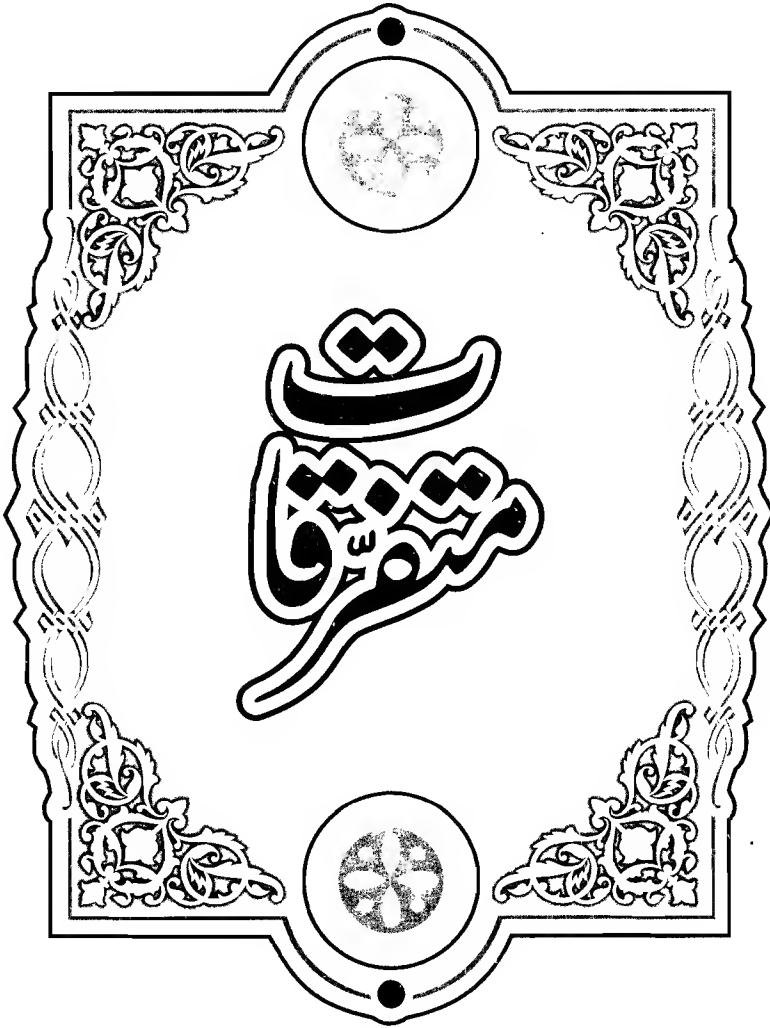
متفرقات

متفرّقات

حرام اشیاء کا بطور دوا استعمال کرنا

سوال میرے بھائی کی کمر میں درد رہتا ہے، بہت علاج معالجہ کرایا ہے لیکن ابھی تک آرام نہیں آیا، ایک حکیم سے رابطہ ہوا ہے تو اس نے ایک دوا بنانے کے متعلق کہا، یہ بھی وضاحت کی ہے کہ اس میں کچھ افیون بھی استعمال کی جائے گی، کیا اس قسم کی دوا کو بطور علاج استعمال کیا جاسکتا ہے، جس میں افیون یا اس جیسی دوسری چیز کی آمیزش ہو؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب حرام اشیاء بطور دوا استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، حضرت طارق بن سوید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کو بطور دوا استعمال کرنے کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے۔'' [1]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبیث دوا سے منع فرمایا ہے۔ [2]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حرام اشیاء میں تمہارے لیے کوئی شفا نہیں رکھی ہے۔ [3]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس میں شفاء نہیں خواہ اطباء حضرات ان میں دعویٰ ہی کیوں نہ کریں، حلال اشیاء کو بطور علاج استعمال کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی جس کی کوئی دوا نہ ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ پر یقین واعتبار کرتے ہوئے حلال چیزوں سے علاج کیا جائے۔ اگر اللہ نے چاہا تو وقت مقررہ پر ضرور شفا ملے گی۔ (واللہ اعلم)

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ

سوال کچھ حضرات کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نوری تھے، اس موقف کی کیا حیثیت ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب قرآن مجید میں ہے کہ ﴿ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ ﴾ [4] ''کیا ان لوگوں نے اللہ کی مخلوق میں سے کچھ نہیں دیکھا کہ اس کا سایہ دائیں بائیں اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتا رہتا ہے۔''

---

[1] صحیح مسلم، الاشربه: ۱۹۸۴۔
[2] ابن ماجه، الطب: ۳۴۵۹۔
[3] صحیح بخاری، تعلیقا قبل حدیث نمبر ۵۶۱۴۔
[4] ۱۶/النحل:۴۸۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز بھی اللہ کی مخلوق ہے اس کا سایہ ہے اور وہ ڈھلتا رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور آیت کے عموم سے آپ ﷺ کا سایہ ثابت ہوتا ہے، اس کے علاوہ احادیث میں آپ ﷺ کے سائے کا ثبوت موجود ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ دوپہر کا وقت تھا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سایہ کو دیکھا۔ [1] حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے جب ربیع الاول کا مہینہ آیا تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے، انہوں نے آپ ﷺ کا سایہ دیکھا۔ [2] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمہارا اور اپنا سایہ دیکھا۔'' [3]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ موجود تھا، ان کے مقابلہ میں کوئی ایسی صحیح حدیث مروی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہیں تھا، پھر قرآن کریم نے متعدد آیات میں رسول اللہ ﷺ کی بشریت کا ذکر کیا ہے، ان سے معلوم ہوا ہے کہ آپ ﷺ نوری نہیں بلکہ بشر تھے۔

گھریلو ناراضگی کی وجہ سے پانچ ماہ کے حمل کو ضائع کرنا؟

سوال میری لڑکی کو سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا ہے جبکہ وہ پانچ ماہ کی حاملہ ہے اور دھمکی بھی دی ہے کہ ہم نے صرف بچہ حاصل کرنا ہے، اس کے بعد ہم نے اسے طلاق دے دینی ہے، کیا اس صورت میں بچی کا حمل ضائع کیا جا سکتا ہے تاکہ اس کا آگے نکاح کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو؟

جواب دین اسلام جذبات میں آکر کسی قسم کے فیصلے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، اگر پانچ ماہ کی حاملہ بچی کو سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا ہے تو اس صورت حال کے پیش نظر ہمیں کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے جس کی شریعت نے ہمیں اجازت نہیں دی ہے۔ خاندان میں جو صاحب بصیرت اور عقلمند حضرات ہیں، انہیں درمیان میں لا کر حالات کا جائزہ لیا جائے، اگر بچی کا کوئی قصور ہے تو اسے سمجھایا جائے، اگر سسرال والے قصوروار ہیں تو انہیں اپنے مؤقف اور رویے پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہا جائے، اس طرح کے معاملات کو مل بیٹھ کر حل کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے صلح اور مل بیٹھنے میں خیر و برکت رکھی ہے۔ ایک موہوم صورت پر بنیاد رکھ کر اتنا بڑا اقدام نہ کیا جائے جس کے متعلق ہمیں قیامت کے دن باز پرس ہو۔ اسلام ہمیں ایسے حالات میں حمل ضائع کرنے کی اجازت نہیں دیتا، خاص طور پر جب چار ماہ سے زائد مدت کا حمل ہو اور اس میں روح پڑ چکی ہو تو اسے ضائع کرنا قتل ناحق کے مترادف ہے۔ ہاں اگر ایسی صورت حال سامنے آجائے کہ وہ حمل بچی کے لیے جان لیوا ثابت ہونے کا اندیشہ ہو اور کوئی تجربہ کار سمجھ دار ڈاکٹر کی رپورٹ پر اعتماد کرنے پر اسے ضائع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صورت مسئولہ میں اسے ضائع کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اس موقع پر ہم سائلہ کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ صبر سے کام لے، سسرال کے ہاتھوں مجبور ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کرے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے، برادری کے ذریعے اس مسئلہ پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۱۳۱، ج۶۔ [2] مسند امام احمد، ص: ۳۳۸، ج۶۔

[3] صحیح ابن خزیمہ، ص: ۵۱، ج۲۔

فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کرنا؟

سوال فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے، جبکہ آج تصویر ہماری زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔قرآن و سنت کے مطابق اس کا کیا حکم ہے؟

جواب شریعت میں تصویر کشی حرام ہے، اس بنا پر فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کرنا بھی حرام ہے، حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے سنگین عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔ [1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہا اے ابن عباس رضی اللہ عنہ! میری معیشت میرے ہاتھ کا ہنر ہے اور میں تصاویر بنا کر فروخت کرتا ہوں، یہی میرا ذریعہ معاش ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں تجھے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سناتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے بھی کوئی تصویر بنائی تو اللہ اسے اس وقت تک عذاب سے دو چار رکھے گا، جب تک وہ شخص اپنی بنائی ہوئی تصویر میں جان نہ ڈال دے اور وہ کبھی اس میں جان نہیں ڈال سکے گا۔''

وہ آدمی یہ حدیث سن کر کانپ اٹھا اور اس کا رنگ فق ہو گیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تیرا اور کوئی ذریعہ نہ ہو تو ایسی چیزوں کی تصویریں بنا جس میں روح نہ ہو مثلاً درخت وغیرہ۔ [2]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''ان تصاویر کی خرید و فروخت جن میں روح نہ ہو۔'' [3]

ہمارے ہاں جو فوٹو گرافی کا پیشہ کرتے ہیں وہ انسانوں کی تصویریں بناتے ہیں، اس لیے یہ پیشہ شرعاً درست نہیں ہے البتہ ایسی چیزوں کی تصاویر بنانا اور اسے بطور پیشہ اختیار کرنا جائز ہے جن میں روح نہ ہو جیسا کہ حدیث کے آخر میں وضاحت ہے اگر تم تصاویر بنانا ہی چاہتے ہو تو ان درختوں کی اور ہر اس چیز کی تصویر بنا سکتے ہو جس میں روح نہ ہو۔ ہماری مجبوری اور تصویر کا زندگی کے لیے جزو بن جانا ایک الگ موضوع ہے، لیکن اس سے یہ بات کشید نہیں کی جا سکتی کہ اسے بطور پیشہ اختیار کرنا جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

قسم کو پورا کرنا

سوال میں نے قسم اٹھائی تھی کہ فلاں کام کروں گا، لیکن میں اسے کر نہیں سکا، اس کام کا وقت بھی گزر چکا ہے اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ وضاحت کریں۔

جواب جب کوئی مسلمان قسم اٹھائے تو اسے پورا کرنے کی بھرپور کوشش کرے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاحْفَظُوٓا أَيْمَانَكُمْ﴾ [4] ''اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ قسم کو پورا کرو کیونکہ قسم توڑنے والے پر گناہ ہوتا ہے۔'' [5]

اگر کوئی آدمی کسی وجہ سے قسم پوری نہیں کر سکا تو اسے اس کا کفارہ دینا چاہیے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

---

[1] صحیح بخاری، اللباس: ٥٩٥٤۔ [2] صحیح بخاری، البیوع: ٢٢٢٥۔ [3] بخاری، البیوع، باب نمبر ١٠٤۔
[4] ٥/المائدہ: ٨٩۔ [5] مسند امام احمد، ص: ١١٤، ج٦۔

﴿فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ١ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ١ؕ﴾ ❶

''قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا دیا جائے جو اپنے گھر والوں کو تم کھلاتے ہو یا انہیں لباس دیا جائے یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کی جائے اور جس کو استطاعت نہ ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔''

اب لونڈی یا غلام دستیاب نہیں ہیں۔ صرف اوسط درجے کا کھانا یا انہیں لباس بنا کر دینا ہے۔ اگر کوئی آدمی صاحب ثروت نہیں تو اسے تین دن کے روزے رکھنے کا حکم ہے، واضح رہے کہ کفارہ قسم میں جن اشیاء کا ذکر ہے مثلاً کھانا یا لباس وغیرہ ہی دینا چاہیے، اس کی قیمت ادا کرنا صحیح نہیں۔ (واللہ اعلم)

بریرہ نام رکھنا؟

سوال میرے دوست کے ہاں بچی پیدا ہوئی تو میں نے اس کا نام بریرہ تجویز کیا، میرے دوست نے کہا کہ بریرہ نامی عورت نے رسول اللہ ﷺ کا ایک مرتبہ کہا نہیں مانا تھا، اس لیے مجھے یہ نام پسند نہیں ہے، اس واقعہ کی کیا حقیقت ہے، کیا اس وجہ سے یہ نام نہیں رکھنا چاہیے؟

جواب حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ایک قابل قدر صحابیہ ہیں، رسول اللہ کا اس پر بڑا اعتماد تھا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ جب وہ لونڈی تھیں تو مغیث رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی سے نکاح کر دیا گیا جو کسی کے غلام تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے خرید کر آزاد کر دیا تو اسے اپنے خاوند کی زوجیت میں رہنے کا اختیار دیا گیا چونکہ وہ آزاد ہو چکی تھیں، اس لیے انہوں نے ایک غلام کی زوجیت میں رہنا پسند نہ کیا، بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میرا خاوند مجھے اتنی رقم بھی دے تب بھی میں اس کے ہاں رہنے کو تیار نہیں ہوں۔ ❷

دوسری طرف مغیث رضی اللہ عنہ کو ان سے بڑی محبت تھی، وہ مدینہ طیبہ کے گلی کوچوں میں اپنی بیوی کے فراق سے روتے اور آنسو بہاتے رہتے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے اسے دیکھا کہ وہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے روتا رہتا اور روتے روتے اس کی داڑھی تر ہو جاتی، رسول اللہ ﷺ نے یہ کیفیت دیکھ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا مغیث کی بریرہ سے محبت اور بریرہ کی اس سے نفرت باعث تعجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر کہا کہ تم اسے اختیار کر لو اور اپنے مؤقف سے رجوع کر لو، حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ ﷺ کا حکم ہے تو مجھے بسر و چشم قبول ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حکم نہیں بلکہ میں اس کی صرف سفارش کرتا ہوں، حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا اگر آپ کا صرف مشورہ ہے حکم نہیں ہے تو مجھے اس مغیث کی کوئی ضرورت نہیں۔ ❸

واقعہ کی حقیقت تو اس قدر ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ نے کسی قسم کی نفرت یا ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا کہ اس نے میرا مشورہ یا سفارش نہیں مانی ہے، لہٰذا مجھے اس سے نفرت ہے، احادیث میں اس قسم کی بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا، بلکہ اس پاکباز

---

❶ ٥/المائدۃ: ٨٩۔ ❷ صحیح بخاری، الفرائض: ٦٨٥٨۔

❸ صحیح بخاری، الطلاق: ٥٢٨٣۔

عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب تہمت لگی تو آپ کا پورا پورا دفاع کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زبردست دباؤ کے باوجود انہوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عفت و پاکدامنی کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا، ایسے حالات میں کسی مسلمان کو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا یا ان کے نام سے نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر کو نظر انداز نہیں کیا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ملنے والے اختیارات کو استعمال کیا ہے اور یہ ان کا ایک حق تھا۔ (واللہ اعلم)

زیر سماعت کیس مجرم کو معاف کرنا

سوال ایک آدمی نے چوری کی، سامان کے مالک نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا، کیا وہ عدالت میں جانے کے بعد چور کو معاف کر سکتا ہے تاکہ اس سے حد ساقط ہو جائے، قرآن وسنت اس معاملہ میں ہماری کیا راہنمائی کرتے ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ خود معاف کرنے والا ہے اور معافی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے لیکن چوری کے معاملات عدالت میں جانے سے پہلے پہلے معاف ہوتے ہیں۔ جب کوئی معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہو تو مالک کو معاف کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آپس میں حدود معاف کر دو اور جس حد کا معاملہ میرے پاس آ جائے تو وہ واجب ہو جائے گی۔''[1]

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چور کا چوری ثابت ہونے پر ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو جس کی چوری ہوئی تھی، اس نے کہا میں نے یہ چیز اسے ہبہ کر دی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے میرے پاس لانے سے پہلے تو نے ایسا کام کیوں نہ کیا۔''[2]

اگرچہ کچھ ائمہ کرام کا مؤقف ہے کہ عدالت میں جانے کے بعد بھی اگر مالک معاف کر دے تو حد ساقط ہو جائے گی لیکن مذکورہ احادیث سے اس مؤقف کی تردید ہوتی ہے، لہٰذا عدالت میں پہنچنے سے پہلے پہلے معاف کر دینے کا حق ہے، اس کے بعد وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ (واللہ اعلم)

شکم مادر میں بچے کی روح کب پڑتی ہے

سوال ایک حدیث میں ہے کہ ماں کے پیٹ میں حمل کے چوتھے مہینے جنین میں روح پڑتی ہے جبکہ جدید طب کے مطابق حمل کے چوتھے یا پانچویں ہفتے بچہ حرکت کرنے لگ جاتا ہے، حدیث کی صداقت کے متعلق ہمیں پورا یقین ہے البتہ طب جدید سے اس کی مطابقت کیسے ہوگی؟

جواب ہمارے نزدیک رحم مادر میں جنین کے حرکت کرنے کو اس کی زندگی سے منسلک کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ خارجی یا داخلی اسباب کی وجہ سے بہت سی بے جان چیزیں حرکت کرتی نظر آتی ہیں، اس امر کے متعلق طب جدید کے ماہرین ابھی تک کوئی متفقہ مؤقف اختیار نہیں کر سکے کہ دوران حمل انسانی زندگی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے؟ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ جب مرد اور عورت کا نطفہ آپس میں مل کر کائنات کے چوہدری یعنی انسان کی پہلی اینٹ بن جائے تو اسی وقت سے اس کی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے،

---

[1] ابوداود، الحدود: ٤٣٧٦۔ [2] مستدرك حاكم، ص: ٣٨٠، ج ٤۔

جبکہ کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ مرد کے نطفہ میں جو کروڑوں کیڑے متحرک ہیں جس سے اس عالم رنگ و بو کی تمام عورتوں کو بار آور کیا جا سکتا ہے، اس نطفہ کے ساتھ انسانی زندگی کو کیوں نہ منسلک کیا جائے، جدید سائنسی آلات مائیکروسکوپ اور الٹرا ساؤنڈ مشین کی ایجاد نے ماہرین طب کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ ان کی مدد سے رحم مادر میں نشو ونما پانے والے جنین کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں لیکن ان تمام تر انکشافات کے باوجود ان حضرات کے لیے یہ بات معمہ بنی ہوئی ہے کہ جنین میں روح کب پھونکی جاتی ہے؟ تاہم قرآن کریم اور احادیث نے اس سربستہ راز کو آج سے چودہ سو سال قبل ہی ظاہر کر دیا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور ہم نے انسان کو ایک منتخب مٹی سے پیدا کیا پھر ہم نے اسے نطفے کی شکل میں ایک ساکن جگہ میں رکھا پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو جما ہوا خون بنا دیا پھر جمے ہوئے لہو سے گوشت کی بوٹی بنائی پھر اس بوٹی سے ہڈیاں بنائیں پھر ان ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنایا پھر اس کو ایک نئی صورت میں لا کھڑا کیا۔'' [1]

اس آیت کریمہ میں گوشت اور ہڈیوں کے مرحلہ کے بعد نشا کا مرحلہ بیان ہوا ہے جس کے لیے حرف ''ثم'' استعمال کیا گیا ہے، یہی وہ وقفہ ہے جس میں جنین کے اندر روح پھونکی جاتی ہے حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے۔

''تمہاری پیدائش کا سلسلہ یوں ہے کہ ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ ٹھہرتا ہے پھر وہ خون کا ٹکڑا بنتا ہے، چالیس دن اس حالت میں رہتا ہے پھر وہ گوشت کا ٹکڑا بنتا ہے اور چالیس دن اس حالت میں رہتا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتے ہیں اور اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔'' [2]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنین میں روح پھونکنے کا مرحلہ 120 دن یعنی چار ماہ کے بعد ہے (واللہ اعلم)

ربع دینار چوری پر ہاتھ کاٹنا

سوال حدیث میں ہے کہ ربع دینار کی مالیت پر چوری کرنے سے ہاتھ کاٹا جائے گا، موجودہ حساب سے ربع دینار کتنی مالیت کا ہے؟

جواب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چور کا ہاتھ صرف ربع دینار یا اس سے زیادہ مالیت چوری کرنے پر کاٹا جائے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس وقت ربع دینار تین درہم کے برابر تھا۔ [3] سونے کے نصاب سے متعلق روایات سے پتہ چلتا ہے کہ دینار، مثقال کے برابر ہوتا تھا، موجودہ نظام کے مطابق ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کے مساوی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دینار کا وزن بھی ساڑھے چار ماشہ ہے اس حساب سے ربع دینار 1.125 ماشہ کا ہوگا، اعشاری نظام کے مطابق 3 تولہ کے 35 گرام ہوتے ہیں جبکہ تین تولہ 36 ماشہ کے مساوی ہے۔ اس اعتبار سے گرام اور ماشہ میں معمولی سا فرق ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق ایک گرام سونا یا اس کی مالیت کے برابر چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جائے گا، جب ہاتھ سے جرم کیا

---

[1] ٢٣/المومنون:١٢۔١٤۔ [2] صحیح بخاری، التوحید: ٤٥٤٧۔

[3] مسند امام احمد، ص: ٨٠، ج٦۔

ہے تو اللہ کے ہاں اس کی یہ حیثیت ہے کہ معمولی سی مالیت چوری کرنے پر اسے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے، اس کے برعکس جب ہاتھ بے گناہ اور معصوم ہوگا تو اس کی قیمت اللہ کے ہاں یہ ہے کہ ایک انگشت کی دیت دس اونٹ ہیں یعنی اگر کسی نے ایک انگلی ضائع کردی ہے تو اسے دس اونٹ بطور دیت دینا ہوں گے۔ ❶

فحاشی کی اشاعت کے لیے مکان کرایہ پر دینا

سوال ٹی وی، وی سی آر اور فلموں کا کاروبار کرنے والوں کو اپنی دکان کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب دور حاضر میں ٹی وی، وی سی آر اور سی ڈی وغیرہ کو فحش کاری اور بے حیائی پھیلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، قرآن کریم نے بے حیائی پھیلانے والوں کا سخت نوٹس لیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ❷

''یقیناً وہ لوگ جو مسلم معاشرہ میں بے حیائی پھیلانے کو پسند کرتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے، اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے ہو۔''

مذکورہ آیت میں فاحشہ سے مراد ہر وہ کام ہے جو انسان کو شہوانی خواہش میں تحریک پیدا کرنے کا سبب ہو، آج کل فحاشی کی اشاعت بہت وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے، اس میں تھیٹر، سینما گھر، کلب ہاؤس، ویڈیو، ٹی وی پر شہوت انگیز اور زہد شکن گانے، اسی طرح فحاشی پھیلانے والا لٹریچر، ناول، افسانے، بسوں میں نصب وی سی آر، اخبارات و اشتہارات میں عورتوں کی عریاں تصاویر، ناچ گانے کی محفلیں اور ہوٹلوں کے پرائیویٹ کمرے فحاشی پھیلانے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اسی طرح بعض اداروں نے نوجوان لڑکیوں کو سیل مین کے طور پر ملازم رکھا ہوتا ہے تاکہ مردوں کے لیے وہ باعث کشش ہوں اور ان کے کاروبار کو فروغ حاصل ہو، الغرض سوال میں مذکور ٹی وی، وی سی آر اور فلموں کا کاروبار شرعاً ممنوع ہے کیونکہ یہ سب بے حیائی، عریانی اور فحاشی پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں، فحاشی کی یہ تمام اقسام قابل دست اندازیٔ پولیس ہیں، اس طرح کا کاروبار کرنے والوں کو اپنی دکان کرایہ پر دینا حرام کام میں تعاون کی وجہ سے ناجائز ہے قرآن کریم میں ہے:

﴿وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪﴾ ❸

''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو، گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون مت کرو۔''

اس آیت کریمہ کے پیش نظر ٹی وی، وی سی آر اور فلموں کا کاروبار کرنے والوں کو اپنی دکان کرایہ پر نہیں دینی چاہیے اور نہ ہی

---

❶ جامع ترمذی، الدیات: ۱۳۹۱۔ ❷ ۲۴/النور: ۱۹۔ ❸ ۵/المائدہ: ۲۔

اس سلسلہ میں داڑھی مونڈ ھنے والے اور فوٹو گرافر کے ساتھ کوئی تعاون کرنا چاہیے، ہمارے نزدیک بینک کو دکان کرایہ پر دینا بھی درست نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

مردوں کے لیے سونے کا دانت لگانا؟

سوال مردوں کے لیے سونے کا دانت لگوانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کلی کرتے وقت اسے اتارنا ہوگا یا اتارے بغیر کلی کرنا صحیح ہوگا؟

جواب اگر سونے کا دانت مردوں کی مجبوری اور ضرورت ہو تو مرد حضرات سونے کا دانت لگوا سکتے ہیں۔ بصورت دیگر جائز نہیں ہے کیونکہ حدیث کے مطابق مردوں کے لیے سونا پہننا اور انہیں بطور زیورات استعمال کرنا حرام ہے، عورتیں اگر سونے کا دانت بطور زیب وزینت استعمال کرتی ہوں تو جائز ہے بصورت دیگر اسراف ہے، اس کی اجازت نہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کی عورتوں کے لیے سونے اور ریشم کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ [1]

اگر کسی نے ضرورت کے پیش نظر سونے کا دانت لگوایا تھا تو فوتگی کے بعد اگر آسانی سے اتارا جا سکے تو اسے اتار لینا چاہیے کیونکہ سونا مال ہے اور وفات کے بعد وہ اس کے وارثوں کا ہو چکا ہے، اگر کسی نے مصنوعی دانت لگوائے ہوں تو وضو یا غسل کرتے وقت انہیں اتارنا ضروری نہیں ہے کیونکہ دانتوں کا اپنی جگہ سے بار بار اتارنا اور انہیں دوبارہ لگانا بہت مشکل کام ہے، اس بنا پر وضو کرتے وقت انہیں اتارنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے محکمہ میں ملازمت کرنا

سوال خاندانی منصوبہ بندی میں ملازمت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے، اس ملازمت سے ملنے والی تنخواہ کا کیا حکم ہے۔ نیز جو شخص اپنی بیوی کو اس قسم کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کرے، کیا وہ امامت کا حقدار ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب جو کام شرعاً حرام ہیں، ان کی ملازمت ناجائز اور حرام ہے مثلاً سود لینا دینا حرام ہے اسی طرح شراب فروخت کرنا بھی ناجائز ہے' اس کاروبار میں ملازمت کرنا بھی درست نہیں ہے۔ اسی طرح ان کی کمائی بھی حرام ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت سعید بن ابی حسن کہتے ہیں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس تھا جب ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا اے ابن عباس رضی اللہ عنہ! میں فوٹو گرافی کرتا ہوں اور ہاتھ سے تصویریں بنا کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص تصاویر بناتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ سزا دے گا اور کہے گا کہ اس میں روح پیدا کرو، لیکن وہ اس تصویر میں روح نہیں پھونک سکے گا، وہ آدمی یہ حدیث سن کر کانپ گیا اور اس کا رنگ فق ہو گیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تو نے تصاویر کو ہی ذریعہ معاش بنانا ہے تو ایسی چیزوں کی تصاویر بناؤ جس میں روح نہ ہو مثلاً

---

[1] ترمذی، اللباس: ۱۷۲۰۔

درخت اور پہاڑ وغیرہ۔ [1]

بخاری نے اس پر یوں عنوان قائم کیا ہے "ایسی تصاویر کی خرید وفروخت جن میں روح نہ ہو۔"

صورت مسئولہ میں منصوبہ بندی کے متعلق سوال ہے کہ اس میں ملازمت کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اس سلسلہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ بعض حالات میں منصوبہ بندی کی شرعاً اجازت ہے لیکن اس کی تحریک چلانا درست نہیں ہے، اس میں عورتوں کی بعض مخصوص امراض کا بھی علاج کیا جاتا ہے، وہاں اگر فیشن کے طور پر منصوبہ بندی کی جاتی ہو اور "بچے دو ہی اچھے" کی آواز عام کرنا مقصود ہو تو شرعاً اس میں ملازمت کرنا صحیح نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لیے ایک منہ دیا ہے تو کمانے کے لیے دو ہاتھ عطا فرمائے ہیں، اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ ذریعہ معاش کے لیے حلال اور جائز ذرائع کو استعمال میں لائے، اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کو اس محکمہ میں ملازمت کے لیے مجبور کرتا ہے تو یہ گناہ کے کام پر تعاون کرنا ہے البتہ اس کی امامت صحیح ہے، اگرچہ بہتر ہے کہ اسے حق الخدمت زیادہ دیا جائے تاکہ وہ اپنی بیوی کو اس کام پر مجبور نہ کرے۔" (واللہ اعلم)

کیا خرگوش کا گوشت حلال ہے؟

سوال کیا مادہ خرگوش کو خون آتا ہے؟ ایسے حالات میں اسے کھایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ہمارے ہاں کچھ لوگ اسے نہیں کھاتے اور کہتے ہیں کہ اسے خون آتا ہے۔

جواب خرگوش کو خون آتا ہے یا نہیں، اس کا تعلق مشاہدہ سے ہے، ہمارے علم کے مطابق اس کی مادہ کو عورتوں کی طرح خون آتا ہے، بعض احادیث میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مادہ خرگوش لائی گئی، جس شخص نے اسے پیش کیا تھا اس نے کہا میں نے اسے خون آنے کی حالت میں دیکھا ہے۔ [2]

اس کے باوجود یہ ایک حلال جانور ہے، رسول اللہ ﷺ نے خود اس کے گوشت کو تناول فرمایا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے ایک خرگوش کا پیچھا کیا، لوگ اس کے پیچھے دوڑے اور تھک گئے، آخر کار میں نے اسے پکڑ لیا اور اسے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس لایا، انہوں نے اسے ذبح کیا اور اس کی دونوں رانیں رسول اللہ ﷺ کو پیش کیں تو آپ نے انہیں قبول فرمایا۔ [3] اس کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی اس کے حلال ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ (واللہ اعلم)

مالیخولیا کے لیے گدھی کا دودھ استعمال کرنا

سوال مالیخولیا کے لیے گدھی کا دودھ تجویز کیا جاتا ہے کہ سر پر اس کی مالش کی جائے، کیا اسے بطور دوا استعمال کیا جا سکتا ہے؟

جواب حرام اور پلید اشیاء کو بطور دوا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے خبیث دوا سے منع فرمایا ہے۔ [4]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے: اللہ تعالیٰ نے حرام اشیاء میں تمہاری شفاء نہیں رکھی۔ [5]

---

[1] صحیح بخاری، البیوع: ۲۲۲۵۔ [2] نسائی، الصید: ۴۳۱۶۔ [3] صحیح بخاری، الذبائح: ۵۵۳۵۔
[4] مسند امام احمد، ص: ۳۰۵، ج۲۔ [5] صحیح بخاری، الاشربۃ قبل: ۵۶۱۴۔

ان احادیث کی روشنی میں کسی بھی نجس اور حرام چیز کو بطور دوا استعمال نہیں کیا جا سکتا، گدھی حرام ہے اور اس کا دودھ بھی حرام ہے لہٰذا اسے بطور دوا استعمال نہیں کرنا چاہیے، البتہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں کا پیشاب بطور دوا استعمال کرنے کی اجازت دی ہے جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت ہے۔ [1]

اونٹوں کا پیشاب نجس اور حرام نہیں البتہ گدھی کا دودھ اس قبیل سے نہیں ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے اگر چہ بطور مالش ہی کیوں نہ ہو۔ (واللہ اعلم)

ذبح شدہ جانور کے پیٹ سے مردے بچے کا حکم

سوال ذبح شدہ جانور کے پیٹ سے اگر کوئی مردہ بچہ برآمد ہو تو کیا وہ حلال ہے یا حرام، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب اسلامی شریعت کے مطابق ذبح شدہ جانور کے پیٹ سے جو مردہ بچہ برآمد ہو وہ حلال ہے اگر کوئی چاہے تو اسے استعمال میں لا سکتا ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ماں کے ذبح کرنے سے اس کے پیٹ کا بچہ از خود ذبح ہو جاتا ہے۔'' [2]

اگر چہ بعض فقہاء نے اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ بچہ مردہ ہے اور مردہ حرام ہوتا ہے، حالانکہ جس ذات نے مردار کو حرام کیا ہے، اس نے ذبح شدہ جانور کے پیٹ سے برآمد ہونے والے بچے کو مچھلی اور ٹڈی کی طرح خاص کر دیا ہے، جس طرح مچھلی اور ٹڈی کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں وہ ذبح کے بغیر ہی حلال ہیں، اس طرح ماں کے پیٹ کا بچہ بھی از خود ذبح ہے اور حلال ہے، ہمارے رجحان کے مطابق اسے مردار کہنا درست نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی ماں کا جزو بدن ہے اور جانور کے ہر جزو کو ذبح نہیں کیا جاتا۔ بہرحال ذبح شدہ جانور کے پیٹ سے اگر بچہ برآمد ہو تو وہ حلال ہے اور اس کا استعمال کرنا بھی جائز ہے۔ ہاں اگر کسی کا دل اسے استعمال کرنے پر آمادہ نہ ہو تو الگ بات ہے لیکن اسے حرام کہنا محل نظر ہے۔

۱۵ شعبان کو فیصلوں کی رات کہنا

سوال کیا شعبان کی پندرھویں رات فیصلوں کی رات ہے، اور کیا اس رات اللہ تعالیٰ ایک سال تک فیصلے اپنے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے؟ براہِ کرم اس کے متعلق ہماری راہنمائی کریں۔

جواب شعبان کی پندرھویں رات کو ہمارے ہاں شب برأت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس رات کے متعلق عام نظریہ یہی ہے کہ یہ رات فیصلوں کی رات ہے، بطور دلیل درج ذیل آیت کو پیش کیا جاتا ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ ﴾ [3]

''یقیناً ہم نے اسے بابرکت رات میں اتارا ہے، بے شک ہم خبردار کرنے والے ہیں، اس رات میں ہر مضبوط کام

---

[1] صحیح بخاری، الطب: ٥٦٨٦۔ [2] مسند امام احمد، ص: ٣١، ج٣۔ [3] ٤٤/الدخان: ٤،٣۔

کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔''

اگر چہ اس آیت میں ''بابرکت رات'' کا ذکر آیا ہے جس میں قرآن مجید اتارا گیا، اسی رات میں سال بھر کے واقعات کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اب اس امر کا پتہ کرنا ہے کہ وہ کون سی رات ہے؟ ہم اپنی مرضی سے اس رات کا تعین کرنے کے مجاز نہیں ہیں، جب ہم قرآن کریم میں اس کی تفسیر تلاش کرتے ہیں تو ہمیں اس امر کی وضاحت ملتی ہے کہ اس ''بابرکت رات'' سے مراد شب قدر ہے جو رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاقت راتوں میں آتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ ۝١﴾ [1]

''بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں اتارا ہے۔''

دوسرے مقام پر ہے کہ رمضان المبارک وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ (البقرہ) اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ وہ رات ماہ رمضان میں ہے اور اسی میں انسان کی زندگی، موت، رزق اور دیگر حالات و واقعات کا ایک سال تک کے لیے فیصلہ کر دیا جاتا ہے، چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اس بابرکت رات اور فیصلوں والی رات سے مراد لیلۃ القدر ہے اور جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد شعبان کی پندرہویں رات ہے جیسا کہ حضرت عکرمہ سے یہ بات نقل کی گئی ہے، اس کی بات درست نہیں ہے کیونکہ نص قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ رات رمضان میں آتی ہے۔ [2]

ہمارے رجحان کے مطابق شعبان کی پندرہویں رات کو فیصلوں کی رات قرار دینا بالکل غلط ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور شعبان کی پندرہویں رات کے متعلق جتنی احادیث وارد ہیں، وہ سب کمزور ہیں اور محدثین کے معیار صحت پر وہ پوری نہیں اترتیں۔ لہٰذا اس رات عبادت کا خصوصی اہتمام کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ ہی یہ رات فیصلوں والی رات ہے، یہ رات شب قدر ہے جو ماہ رمضان میں آتی ہے۔ (واللہ اعلم)

عاشوراء کی فضیلت پر حدیث کی صحت

سوال الترغیب والترھیب کے حوالہ سے ایک حدیث نظر سے گزری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص عاشوراء کے دن اپنے اہل وعیال کے لیے وسعت اور فراخی کرے گا اللہ تعالیٰ تمام سال اس پر وسعت فرمائے گا۔ مجھے یہ حدیث الترغیب و الترھیب کے عربی نسخہ میں نہیں مل سکی، اس حدیث کے متعلق روشنی ڈالیں نیز بتائیں کہ اس کے مضمون کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

جواب علامہ عبدالعظیم منذری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ [3] آخر میں لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام بیہقی وغیرہ نے تعدد طرق سے بیان کیا ہے اور یہ حدیث کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، اس حدیث کی تمام اسانید ضعیف ہیں تاہم انہیں ایک دوسرے سے ملانے کی بنا پر کچھ تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ [4]

---

[1] ۹۷/القدر:۱۔ [2] تفسیر ابن کثیر، ص: ۱۶۳، ج ٤۔ [3] الترغیب والترھیب، ص: ۱۱٦، ج ۲۔ [4] حوالہ مذکور۔

اسی طرح صاحب مشکوٰۃ نے رزین کے حوالہ سے اس حدیث کو بیان کیا ہے جسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، پھر حضرت سفیان کے حوالہ سے لکھا ہے انہوں نے فرمایا کہ ہم نے اس کا تجربہ کیا تو حدیث کے مطابق اسے صحیح پایا، اسی طرح امام بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوسعید اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے بیان کیا ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ❶

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے تمام طرق ضعیف ہیں، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے اور ایسا موقف اختیار کرنا کوئی بعید از عقل نہیں کیونکہ احادیث کی صحت تجربہ کی محتاج نہیں جیسا کہ سفیان سے بیان کیا ہے۔ ❷

اگرچہ بعض علماء نے اس حدیث کو قابل حجت قرار دیا ہے لیکن ہمارے رجحان کے مطابق یہ حدیث انتہائی کمزور ہے، امام ابن جوزی، ابن تیمیہ، عقیلی اور زرکشی رحمۃ اللہ علیہم نے اسے خود ساختہ کہا ہے، اس حدیث کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ یہ حدیث انتہائی منکر ہے۔ ❸

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ عاشوراء کے دن غسل کرنے، سرمہ لگانے، مہندی استعمال کرنے، بہترین کھانے پکانے اور خوشی کا اظہار کرنے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مروی ہے؟ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں فرمایا: اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے اور نہ ہی ائمہ اسلام نے ان کاموں کو اس دن مستحب قرار دیا ہے، ائمہ اربعہ سے بھی اس سلسلہ میں کچھ منقول نہیں، نیز قرون فاضلہ میں ان امور کے متعلق کچھ مروی نہیں ہے البتہ کچھ متاخرین نے یہ احادیث بیان کی ہیں۔ مثلاً جو شخص اس دن اپنی آنکھوں میں سرمہ ڈالے گا اس کی آنکھیں سارا سال خراب نہیں ہوں گی اور جو شخص عاشوراء کے دن غسل کرے گا وہ سارا سال بیماریوں سے محفوظ رہے گا۔ نیز اس سلسلہ میں ایک خودساختہ حدیث بیان کی جاتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھلا جھوٹ ہے، پھر انہوں نے مذکورہ حدیث کو بیان کیا ہے۔ ❹

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن کا روزہ مشروع قرار دیا ہے بلکہ آپ اس دن کا خود بھی روزہ رکھتے تھے، انواع واقسام کے کھانوں کا اہتمام روزے کے منافی ہے، ہمیں صرف روزے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ باقی تمام امور سے اجتناب کیا جائے کیونکہ اسلاف سے ایسا کرنا ثابت نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

مشرک کا ذبیحہ

سوال: مشرک کے ذبیحہ کے متعلق کیا حکم ہے؟ یعنی اس کا ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے، نیز جو شخص خود کو مسلمان کہلاتے ہیں اور شرک کا ارتکاب بھی کرے ان کے ذبیحہ کا کیا حکم ہے؟

جواب: ذبح کرنا بھی ایک عبادت ہے جو مشرک سے قبول نہیں کی جاتی، اس لیے جو بنیادی طور پر مشرک ہیں مثلاً ہندو

---

❶ مشکوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل الصدقہ۔ ❷ حاشیہ مشکوۃ، ص: ۶۰۱، ج ۱۔
❸ لسان المیزان، ص: ۴۳۹، ج ۴۔ ❹ الفتاویٰ، ص: ۳۰۰، ج ۲۵۔

سکھ اور بدھ مت وغیرہ ان کا ذبیحہ حرام ہے البتہ وہ اہل کتب جو سماوی شریعت کے قائل ہیں قرآنی صراحت کے مطابق ان کا ذبیحہ جائز قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪﴾ [1]

''اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے جائز ہے۔''

اس آیت کریمہ میں کھانے سے مراد ذبیحہ ہے لیکن اس کے لیے بھی شرط ہے کہ حلال جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے، نزول قرآن کے وقت اہل کتاب کی دو اقسام میں شرک پایا جاتا تھا جیسا کہ قرآن میں ہے کہ یہودی حضرت عزیر علیہ السلام اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے، اس کے باوجود ان کے ذبیحہ کو مشروط طور پر ہمارے لیے حلال قرار دیا گیا ہے، اسی طرح دور حاضر کے مسلمان جو معیاری نہیں ہیں البتہ کلمہ گو، نماز وروزہ کے قائل وفاعل ہیں، اگر بظاہر کوئی شرکیہ کام کریں تو ان کا ذبح کردہ جانور حرام نہیں ہوگا، ہاں اگر وہ شرک وبدعت کو اپنے لیے حلال سمجھتے ہوں۔ ضد اور ہٹ دھرم کے طور پر شرک کا ارتکاب کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کے ذبیحہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واضح رہے کہ اگر کسی انسان میں شرک کے اسباب موجود ہوں تو اسے مشرک قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کوئی موانع نہ ہوں، اگر اسباب کے ساتھ کوئی رکاوٹ یا مانع موجود ہو تو انہیں مشرک نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم نے اپنی تالیف ''مسئلہ ایمان وکفر'' میں کی ہے، مکتبہ اسلامیہ سے اسے حاصل کرکے اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

یتیمی کی مدت

سوال اگر کسی کا والد فوت ہو جائے تو وہ کس وقت تک یتیم رہتا ہے، شریعت نے اس کی کیا حد مقرر کی ہے؟ کتاب و سنت سے اس کی وضاحت کریں۔

جواب اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ احتلام کے بعد یتیمی نہیں ہے۔ (بیہقی، ص: ۳۲۰، ج ۷) امام ابوداؤد نے اس پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔

''یتیمی کب ختم ہوتی ہے؟'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے اس وقت تک یتیم رہتے ہیں، جب تک وہ بالغ نہ ہوں، اگر بالغ ہو جائیں تو شرعاً یہ حالت ختم ہو جاتی ہے اب یہ سوال کہ انسان بالغ کب ہوتا ہے؟ مختلف احادیث کے پیش نظر اس کی تین علامتیں ہیں:

1. بچے کو احتلام آجائے یا بچی حالتِ حیض سے دوچار ہو جائے جیسا کہ مذکورہ حدیث میں ہے۔
2. جب بچے یا بچی کی عمر پندرہ سال ہو جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ غزوۂ احد کے دن چودہ چودہ سال کے تھے تو انہیں جنگ میں شرکت کی اجازت نہ ملی تھی لیکن آئندہ سال جب وہ پندرہ برس کے ہوئے تو غزوۂ خندق میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ [2]

---

[1] ۵/المائدۃ:۵۔ [2] صحیح بخاری، المغازی: ۴۰۹۷۔

3 زیرناف بال اگ آئیں چنانچہ حدیث میں ہے کہ غزوۂ بنی قریظہ کے دن جس شخص کے زیرناف بال اگے ہوئے ہوتے اسے قتل کردیا جاتا اور جس کے بال نہ ہوتے اسے چھوڑ دیا جاتا۔ 1

بہرحال بلوغ کے بعد یتیمی کی حالت ختم ہوجاتی اور بلوغ کی مذکورہ بالا تین علامتیں ہیں۔

عزت وناموس کی خاطر جان قربان کرنا

سوال جب پاکستان بنا تو کئی عورتوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے اپنی عزت وناموس بچانے کے لیے نہر یا کنویں میں چھلانگیں لگا کر خودکشی کرلی۔ کیا ایسا کرنا قرآن وحدیث کی رو سے جائز ہے؟ براہِ کرم اولین فرصت میں اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب شریعت اسلامیہ میں ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دین واخلاق، مال ومتاع، جسم وجان اور عزت وناموس کا دفاع کرے، اگر ان کی حفاظت کرتے ہوئے جان، جان آفریں کے حوالے ہوجائے تو رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کو شہید قرار دیا ہے اگرچہ یہ شہادت میدان کارزار میں جان قربان کردینے سے کمتر درجہ کی ہے، تاہم اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا انسان انتہائی پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو انسان اپنے اہل وعیال کو بچاتے ہوئے کام آجائے یا اپنے خون وجسم کی حفاظت میں فوت ہوجائے یا اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے تو وہ شہید ہے۔'' 2

ایک روایت میں ہے کہ جو انسان اپنے مال ومتاع کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوجائے وہ شہید ہے۔ 3

عزت وناموس کا دفاع کرنے والا بھی شہید ہے بلکہ اپنے آپ سے کسی کے ظلم کو دور کرتے ہوئے قتل ہوجانے والا بھی شہید ہے۔ 4

اپنی عزت کا دفاع کرنا اور اس سلسلہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا بہت اچھی موت ہے لیکن اس سلسلہ میں خودکشی کی اجازت نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ ایک انسان کو گہرا زخم لگا، وہ اس کی تاب نہ لاسکا تو اس نے خود کو قتل کردیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندے نے اپنی جان دینے کے متعلق مجھ سے جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے میں نے اس پر جنت کو حرام کردیا ہے۔ 5

خودکشی کرنے والے کے متعلق بہت سی احادیث کتب حدیث میں مروی ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے تیز دھار والے آلے سے خود کو ختم کیا وہ جہنم میں اسی طرح سزا سے دوچار ہوگا۔'' 6

جس نے گلہ گھونٹ کر خود کو ختم کیا یا پیٹ میں چھرا گھونپ کر اپنے آپ کو قتل کرلیا، اسے قیامت کے دن اسی قسم کی سزا دی جائے گی۔ 7

ان احادیث کی روشنی میں عزت وناموس کو بچانے کے لیے خودکشی کی اجازت نہیں دی جاسکتی بلکہ ہمارے رجحان کے مطابق اس قسم کے حالات میں مردانہ وار مقابلہ کیا جائے اور اپنی جان اگر قربان ہوتی ہے تو اس سے دریغ نہ کیا جائے، امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ''کیا آدمی دشمن کو گرفتاری پیش کرسکتا ہے؟ اور جو گرفتاری کے بجائے جان

---

1 ابوداود حدیث: ٤٤٠٤۔ 2 مسند امام احمد، ص: ١٩٠، ج ١۔ 3 صحیح بخاری، حدیث: ٢٤٨٠۔
4 مسند الامام احمد، ص: ٣٠٥، ج ١۔ 5 بخاری، الجنائز: ١٣٦٤۔ 6 بخاری، الجنائز: ١٣٦٣۔
7 صحیح بخاری، الجنائز: ١٣٦٥۔

دے دے اس کا کیا حکم ہے؟'' [1]

پھر انہوں نے ایک طویل حدیث پیش کی ہے، جس میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دس آدمیوں کو جاسوس بنا کر روانہ کیا اوران کے امیر حضرت عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ عسفان اور مکہ کے درمیان بنولحیان نے ان کا گھیراؤ کر لیا اور انہیں امان دینے کا وعدہ کیا بشرطیکہ وہ خود کو دشمن کے حوالے کر دیں حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے گرفتاری دینے کے بجائے اپنی جان کا نذرانہ دینے کو ترجیح دی، اس طرح سات آدمی شہید ہو گئے جبکہ حضرت خبیب، ابن دثنہ اور عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہم نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ [2]

اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ثابت کیا ہے کہ بوقت ضرورت گرفتاری پیش کی جا سکتی ہے لیکن خودکشی کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تبوک کے لیے روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی کمزور آدمی ہمارے ساتھ روانہ نہ ہو۔'' ان میں ایک آدمی کمزور سواری پر نکلا اور اس سے گر کر مر گیا لوگوں نے کہا یہ شہید ہے، یہ شہید ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا کہ ''اعلان کر دو جنت میں نافرمان آدمی داخل نہیں ہو گا۔'' [3]

ان تصریحات کے پیش نظر کسی خاتون کا عزت وناموس بچانے کے لیے خودکشی کرنا محل نظر ہے۔

داڑھی مونڈھنے والے حجام کو دوکان کرایہ پر دینا

سوال شیو (داڑھی مونڈھنا) کی کمائی اور اس کے لیے دوکان کرایہ پر دینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب داڑھی مونڈھنا حرام ہے اور اس پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے، کیونکہ جو اعمال حرام ہوتے ہیں، ان پر اجرت لینا بھی حرام ہے، شراب نوشی حرام ہے، اسے کشید کرنے کی اجرت لینا بھی حرام ہے، اسی طرح حرام کام کے لیے دکان کرایہ پر دینا بھی شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے حرام کام میں تعاون کرنا ہے قرآن کریم میں ہے:

﴿ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ [4]

''گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو۔''

لہٰذا شیو کے لیے دکان کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے جیسا کہ بینک کو دکان کرایہ پر دینا جائز نہیں۔'' (واللہ اعلم)

زچگی میں وفات پا جانا

سوال ایک عورت بچے کی پیدائش کے موقع پر دورانِ آپریشن فوت ہو جاتی ہے، کیا اسے بھی شہادت کا رتبہ ملے گا اگرچہ اس کی موت ڈاکٹر کی کوتاہی سے واقع ہوئی ہو؟

جواب دوران زچگی فوت ہونے والی عورت کو شہداء میں شمار کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ وہ

---

[1] كتاب الجهاد، باب نمبر: ١٦٩۔ [2] صحیح بخاری، الجهاد: ٣٠٤٥۔
[3] فتح الباری، ص: ١١١، ج٦۔ [4] ٥/المائدة: ٢۔

عورت جو بچے کی پیدائش کے سبب فوت ہو جائے شہید ہے۔ [1] شرعی اصطلاح میں یہ شہادت صغریٰ ہے، دین اسلام کی سربلندی کے لیے میدان کارزار میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا شہادت کبریٰ ہے لیکن دور حاضر میں زچگی کے آپریشن دو وجہ سے کیے جاتے ہیں۔

1. رحم مادر میں بچے کی حالت بایں طور ہوتی ہے کہ نارمل طریقہ سے اس کی پیدائش ممکن نہیں ہوتی بلکہ ایسے حالات میں آپریشن ناگزیر ہوتا ہے، ایسے حالات میں اگر دوران آپریشن زچہ فوت ہو جائے تو وہ بلاشبہ شہداء میں ہوگی اگرچہ اس کی موت ڈاکٹر کی کوتاہی سے ہی کیوں نہ ہو۔

2. بچے کی پیدائش معمول کے مطابق ہونا ممکن ہوتی ہے لیکن بطور فیشن پیدائش کے وقت تکلیف سے بچنے کے لیے آپریشن کا سہارا لیا جاتا ہے حالانکہ زچگی کے دوران تکلیف کی شدت فطرت کے عین مطابق ہے اور اس تکلیف کی وجہ سے پیدائش ممکن ہوتی ہے ایسے حالات میں اگر بلاضرورت آپریشن کا سہارا لیا جاتا ہے تو اس دوران اگر موت واقع ہو جائے تو اسے شہداء میں شمار کرنا محل نظر ہے بلکہ ایسے حالات میں آپریشن کا سہارا لینا ہی خلاف فطرت ہے۔ (واللہ اعلم)

بطور دوائی کچا لہسن کھانا

سوال ہماری مسجد کے امام نے یہ مسئلہ بیان کیا کہ کچا لہسن استعمال کرنا منع ہے۔ جبکہ میرے لیے اسے بطور دوا تجویز کیا گیا ہے کہ اس کے استعمال سے خون گاڑھا نہیں ہوتا، میں سخت پریشان ہوں، قرآن وحدیث کے مطابق میری پریشانی دور کریں۔

جواب لہسن واقعی ہی بہت مفید چیز ہے اور اس کا استعمال کئی ایک بیماریوں کا علاج اور سد باب ہے، اسے کچا اور پکا کر دونوں طرح استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص (کچا) لہسن یا پیاز کھائے وہ ہم سے دور رہے یا فرمایا وہ ہماری مسجد سے دور رہے اور اپنے گھر بیٹھے۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ نے اس کے کھانے سے منع نہیں فرمایا بلکہ اس کی بو سے ناگواری کا اظہار کیا ہے، اگر کسی وجہ سے اس کی بو کو ختم کر دیا جائے تو اسے استعمال کر کے عام مجالس اور مسجد میں آنا منع نہیں ہے، آج کل بازار سے لہسن کا سفوف بھی مل جاتا ہے جس میں کوئی بو وغیرہ نہیں ہوتی بلکہ اس کا استعمال بھی آسان ہے، بہر حال پیاز، مولی اور لہسن وغیرہ استعمال کیا جا سکتا ہے البتہ ان کی بو سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے اس کا بندوبست ضرور ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

دریائے نیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط ڈالنا

سوال اکثر واعظین یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ دریائے نیل کا پانی بہنا بند ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی طرف ایک خط لکھا جب وہ خط دریائے نیل میں ڈالا گیا تو اس کا پانی دوبارہ جاری ہو گیا، یہ واقعہ صحیح ہے؟

جواب یہ واقعہ بایں الفاظ مشہور ہے کہ جب مصر فتح ہوا تو لوگوں نے فوج کے سالار حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۲۰۱، ج ٤۔ [2] صحیح بخاری، الاعتصام: ۷۳۵۹۔

کہ ہمارے ہاں دریائے نیل اس وقت بہتا ہے جب قمری مہینہ کی گیارہ تاریخ کو رات کے وقت ایک جوان لڑکی اس کی نذر کی جائے، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر جواب دیا کہ اسلام میں ایسا نہیں ہوسکتا، تاہم انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف اس سلسلہ میں ایک خط لکھا، امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جوابی رقعہ لکھا جس میں یہ عبارت تحریر تھی: ''اللہ کے بندے عمر کی طرف سے دریائے نیل کے نام! اگر تو خود بخود بہتا ہے تو ہمیں تیری قطعاً کوئی ضرورت نہیں اور اگر تجھے اللہ تعالیٰ جاری کرتا ہے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تجھے جاری کر دے۔'' جب یہ خط دریائے نیل میں ڈالا گیا تو وہ دس ہاتھ بلند ہو کر بہنے لگا۔ [1]

تفسیر ابن کثیر میں بھی یہ واقعہ بیان ہوا ہے [2] لیکن یہ روایت ضعیف اور ناقابل قبول ہے بلکہ یہ تمام قصہ بے بنیاد اور باطل ہے کیونکہ اسے بیان کرنے والا عبداللہ بن لہیعہ راوی مدلس ہے جو اپنے استاد قیس بن حجاج سے بصیغہ عن بیان کرتا ہے۔

قیس بن حجاج تبع تابعی ہے جو اپنے نامعلوم استاد سے اس کہانی کو بیان کرتا ہے وہ "عمن حدثه" کے الفاظ سے اس روایت کو ذکر کرتا ہے۔ بہر حال یہ قصہ صحیح سند سے ثابت نہیں ہے واعظین کو چاہیے کہ وہ ایسے بے بنیاد قصے کہانیاں بیان کرنے سے اجتناب کریں۔ (واللہ اعلم)

غصہ پینے کی فضیلت

سوال ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اس شخص کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں جو غصہ آنے کے بعد معاف کر دے جبکہ وہ اسے نافذ کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو۔'' کیا یہ حدیث کے الفاظ ہیں، اگر ہیں تو حدیث کی کس کتاب میں ہیں۔

جواب مذکورہ الفاظ کے ساتھ کوئی حدیث میرے علم میں نہیں ہے البتہ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کے الفاظ درج ذیل ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص غصہ پی جائے جبکہ وہ اس پر عمل درآمد کی قدرت رکھتا ہو تو اللہ اسے قیامت کے دن برسرِ مخلوق بلائے گا اور اسے اختیار دے گا کہ جنت کی حورعین میں سے جسے چاہے منتخب کر لے۔'' [3]

واقعی اپنے سے کمزور پر غصہ آئے تو اسے قابو کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اصل بہادری یہی ہے کہ ایسے موقع پر غصہ نکالنے کی بجائے معاف کر دیا جائے، اللہ کے ہاں اس کی جزا ہے کہ حوریں تو ہر جنتی کو ملیں گی لیکن غصہ پر قابو پا کر ظلم سے اجتناب کرنے والے کو اپنی پسند کی حوریں منتخب کرنے کا حق دیا جائے گا، قرآن کریم میں اہل ایمان کی اہم صفت یہ بیان کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳۴﴾ [4]

''اور غصہ کو پی جانے والے نیز لوگوں سے درگزر کرنے والے، اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکار لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کے متعلق ان کی حسنِ صفات کی وجہ سے جنت کی ضمانت دی ہے جیسا کہ آپ کا ارشاد گرامی

---

[1] البدایه والنهایة، ص: ٢٣، ج١۔ [2] تفسیر ابن کثیر: ٤٦٤، ج٤۔

[3] جامع ترمذی، البر والصله: ٢٠٢١؛ ابو داود، الادب: ٤٧٧٧؛ ابن ماجه، الزهد: ٤١٨٦۔ [4] ٣/آل عمران: ١٣٤۔

ہے: ''میں اس شخص کے لیے جنت کی ایک جانب خوبصورت محل کی ضمانت دیتا ہوں جو جھگڑا چھوڑ دے اگر چہ حق پر ہو۔ اور جنت کے درمیان ایک محل کی، اس شخص کے لیے جو جھوٹ چھوڑ دے اگر چہ مزاح کے طور پر ہو نیز جنت کی اعلیٰ منازل میں ایک محل اس شخص کے لیے ہے جو اپنے اخلاق کو عمدہ بنا لے۔'' [1]

معلوم ہوتا ہے کہ سائل کے لیے دونوں احادیث کے الفاظ خلط ملط ہو گئے ہیں، بہرحال ہمیں چاہیے کہ مذکورہ اچھی صفات کو اپنے اندر پیدا کریں تاکہ اللہ کے ہاں جنت کی نعمتوں کے حقدار ہوں۔ (واللہ اعلم)

اللہ کا بذات خود روح نکالنا

سوال ایک عالم دین نے مسئلہ بیان کیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی روح حضرت عزرائیل نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے نکالی تھی، اس کی وضاحت کریں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے کائنات میں مختلف کاموں کی بجا آوری کے لیے مختلف فرشتوں کی ڈیوٹی لگائی ہے، ان میں ملک الموت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ فوت ہونے والوں کی ارواح قبض کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ [2]

''آپ ان سے کہہ دیں کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے تمہاری روح قبض کر لے گا پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ملک الموت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مرنے والوں کی روح نکالنے کے لیے تعینات ہے۔ صورت مسؤلہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ ''ان کی روح عزرائیل نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے نکالی تھی۔'' یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ کتاب وسنت اور تاریخ اسلامی میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ہمارے رجحان کے مطابق درج بالا قانون کے مطابق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی روح بھی ملک الموت نے ہی نکالی ہے۔ جیسا کہ ان کے والد گرامی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک بھی اسی فرشتہ نے قبض کی تھی۔ (واللہ اعلم)

میرج ھال کرائے پر دینا

سوال میرج ہال تعمیر کر کے شادی کے پروگرام کے لیے کرایہ پر دینا شرعاً کیسا ہے، آیا اس میں کتاب وسنت کے اعتبار سے کوئی قباحت تو نہیں ہے؟

جواب مومن کی شان یہ ہے کہ وہ خود بھی کوئی خلاف شریعت کام نہ کرے اور نہ ہی خلاف شرع کام کا سبب بنے۔ انگوروں کی خرید وفروخت جائز ہے لیکن اگر کوئی شراب کشید کرنے کے۔ لیے انگور خریدنا چاہے تو بیچنے والے کو اسے انگور بیچنا جائز نہیں ہے، اسی طرح میرج ہال کی تعمیر لوگوں کی سہولت کے لیے ہے اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے لیکن ہمارے ہاں شادی بیاہ کے

---

[1] ابوداود، الادب: ۴۸۰۰۔ [2] ۳۲/السجدہ: ۱۱۔

موقع پر بہت سے کام خلاف شریعت ہوتے ہیں، مثلاً: ❶ موسیقی اور گانے بجانے کا کھلے بندوں اہتمام ہوتا ہے۔ ❷ فوٹو اتارنے اور مووی بنانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا جاتا۔ ❸ بے حجابی اور بے پردگی نیز مرد وزن کا اختلاط بھی عام ہے۔ اسی طرح دیگر خلاف شرع کام بھی ہوتے ہیں، لہٰذا ایسے کاموں کے لیے میرج ہال کرایہ پر دینا، گناہ کے کاموں میں تعاون کرنا ہے جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو، گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کیا کرو۔'' ❶

لہٰذا ہمارا رجان یہ ہے کہ اس قسم کے ہال تعمیر کرنے میں سرمایہ خرچ کرنے کے بجائے کسی اور کام میں سرمایہ لگایا جائے، جس میں حلال منافع کی امید ہو، جیسا کہ عمارت تعمیر کر کے بینک کو کرایہ پر دینا جائز نہیں، اسی طرح دوسرے ناجائز کاموں کے لیے بھی کوئی عمارت کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

میڈیکل کمپنی میں بطور ریپ ملازمت کرنا

سوال میں ایک کمپنی میں میڈیکل ریپ کے طور پر کام کرتا ہوں، میرے شعبہ میں کچھ کمپنیاں ڈاکٹر حضرات کو خطیر رقم دیتی ہیں تاکہ وہ ان کی تیار کردہ دوائی مریضوں کو لکھ کر دے، کیا اپنی خریداری بڑھانے کے لیے ڈاکٹروں کو بھاری رقم پیش کرنا جائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو ایسی کمپنی میں ملازمت کرنا حلال ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب ڈاکٹر حضرات شعبہ خدمت خلق کا ذریعہ اور باعزت وسیلہ کسب معاش ہے، لیکن افسوس کہ اس میں ہوس زر اور جلب مال کی بہتات نظر آتی ہے، بہت کم ڈاکٹر ایسے ہیں جو مریض سے ہمدردی رکھتے ہوں اور اس کی صحت وسلامتی کے لیے ان کے دل دھڑکتے ہوں، اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو مریض کی صحت کے بجائے اس کی جیب پر نظر رکھتے ہیں، لوگوں سے پیسے بٹورنے کے لیے ان حضرات کے ہاں کئی ایک مراحل ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ سب سے پہلا مرحلہ مشورہ فیس کا ہے، اس کے لیے پہلے ٹائم لینا پڑتا ہے پھر اپنے نمبر کا انتظار کرنا پڑتا ہے، ان کے ہاں مشورہ فیس تین طرح کی ہے: ❶ کلینک میں مشورہ فیس، ❷ گھر جا کر مریض دیکھنے کی مشورہ فیس۔ ❸ ایمرجنسی مشورہ فیس۔

☆ دوسرا مرحلہ ٹیسٹ رپورٹ کا ہے، مریض کو مختلف قسم کے ٹیکے لکھ دیئے جاتے ہیں اور مخصوص لیبارٹری سے ٹیسٹ کرانے کی تلقین کی جاتی ہے، جتنے مریض لیبارٹری پر جائیں گے، اسی حساب سے شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کا کمیشن باعزت طریقہ سے گھر پہنچ جاتا ہے۔

☆ تیسرا مرحلہ دوائی لکھ کر دینے کا ہے، ادویات تیار کرنے والی بڑی بڑی کمپنیاں، ان سے رابطہ کرتی ہیں اور انہیں خطیر رقم یا بہترین ہوٹل میں قیام وطعام اور سیر وتفریح کی پیشکش کرتی ہیں تاکہ ڈاکٹر صاحب ان کی تیار کردہ ادویات مریضوں کو لکھ کر دیں۔

☆ چوتھا مرحلہ اپنے پاس سے دوائی دینے اور ڈرپ لگانے کا ہے، مختلف کمپنیوں کی طرف سے بطور نمونہ ادویات ان کے ہاں

---

❶ ۵/المآئدۃ:۲۔

موجود ہوتی ہیں، جن پر لکھا ہوتا ہے کہ ان کی خرید وفروخت ممنوع ہے اس کے باوجود ان کی قیمت وصول کر کے جیب میں ڈال لی جاتی ہے۔

☆ پانچواں اور آخری مرحلہ آپریشن کا ہے، مریض آپریشن تھیٹر میں لیٹا ہوتا ہے دوسری طرف لواحقین کی دوڑ لگائی جاتی ہے کہ فلاں دوائی لاؤ، فلاں ٹیکے کی ضرورت ہے، اس قسم کی اکثر ادویات دوبارہ میڈیکل سٹور پر پہنچ جاتی ہیں، بہر حال ہمارے معاشرہ میں یہ پیشہ کالی بھیڑوں کی وجہ سے خاصہ بدنام ہو چکا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے تو وہ اسے ضرور فائدہ پہنچائے۔'' [1]

ہمارے رجحان کے مطابق میڈیکل کمپنیاں جو ڈاکٹر حضرات کو رقم یا سیر وتفریح کی پیشکش کرتی ہیں، یہ ایک رشوت ہے جو ان کی خریداری بڑھانے کے لیے پیش کی جاتی ہے، ڈاکٹر حضرات بھی اس نمک کو حلال کرنے کے لیے ایسی ادویات لکھ دیتے ہیں جن کی مریض کو قطعاً ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جب ڈاکٹر مریض سے مشورہ فیس وصول کرتا ہے تو اسے مریض کے ساتھ ہر لحاظ سے ہمدردی کرنا چاہیے، اگر ڈاکٹر کو کوئی کمپنی بطور رشوت کسی چیز کی پیشکش نہیں کرتی تو ایسے حالات میں میڈکل ریپ کے طور پر کام کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن عام طور پر اس قسم کی پیشکش اپنے کارندوں کے ذریعے کی جاتی ہیں، اگر اس سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا جا سکتا ہو تو میڈکل کمپنی میں ریپ کے طور پر کام کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

مسجد میں گم شدہ بچوں کا اعلان کرنا

سوال مسجد میں گم شدہ بچوں کا اعلان کرنا جائز ہے یا نہیں، والدین جو بچے کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے اگر مسجد میں اعلان کر دیا جائے تو کیا حرج ہے؟

جواب مسجد میں کسی بھی گم شدہ چیز کا اعلان کرنا شرعاً منع ہے کیونکہ مساجد اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں، اس طرح کے اعلانات عبادت کے منافی ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی کسی آدمی کو مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو اسے یوں جواب دے: اللہ کرے وہ چیز تجھے واپس نہ ملے۔ کیونکہ مساجد اس مقصد کے لیے نہیں بنائی گئیں۔'' [2] ایسے حالات میں والدین سے ہمدردی کرنے کی یہ صورت ہونی چاہیے کہ مسجد سے باہر کسی حجرہ میں الگ سپیکر کا انتظام کر دیا جائے جو اس طرح کے اعلانات کے لیے وقف ہو، بہر حال مساجد میں کسی قسم کی گم شدہ چیز کا اعلان کرنا منع ہے۔ لہٰذا اسے ایک جذباتی مسئلہ بنانے کے بجائے اس امتناعی حکم پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

امیر کے بغیر رہنا

سوال رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''تین آدمیوں کے لیے امیر شرعی کے بغیر رہنا جائز نہیں۔'' یہ حدیث کس کتاب میں ہے اس کا مفہوم کیا ہے نیز وضاحت کریں کہ وہ تین قسم کے لوگ کون کون سے ہیں؟

---

[1] صحیح مسلم، الطب: ۵۷۳۱۔ [2] مسلم، المساجد: ۵۶۸۔

جواب یہ حدیث امام احمد، سنن بیہقی اور ابوداؤد میں ہے، سوال میں مذکورہ الفاظ مجھے نہیں مل سکے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آبادی سے باہر جب مکین ہوں تو انہیں اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنا لینا چاہیے۔'' ❶

اس حدیث کا تعلق سفر سے ہے کہ دوران سفر کسی کو امیر سفر بنا لینا چاہیے تاکہ اجتماعیت برقرار رہے اور نظم وضبط کے ساتھ سفر جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ حدیث میں اس کی صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تین آدمی سفر کو نکلیں تو کسی ایک کو امیر ضرور بنائیں۔'' ❷

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ حدیث بیان کی تو وہ سفر میں تھے تو ان کے شاگرد حضرت نافع نے عرض کیا کہ اس حدیث کے پیش نظر آپ ہمارے امیر ہیں۔ ❸

واضح رہے کہ اس قسم کی امارت ''امارت صغریٰ'' کہلاتی ہے، جس میں سفر کی زندگی کو ایک ضابطہ سے ادا کیا جاتا ہے، پھر انسان کو امارت کبریٰ کے قیام کے لیے بھی کوشاں رہنا چاہیے، جسے قرآن نے ''اولی الامر'' سے تعبیر کیا ہے، اس کی اطاعت مشروط ہوتی ہے، جب تک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق عمل پیرا ہوں گے، ان کی اطاعت ضروری ہے بصورت دیگر ان کی اطاعت ضروری نہیں، بہرصورت مندرجہ بالا حدیث سفر سے متعلق ہے کہ سفر کرتے وقت انسان کو چاہیے کہ اپنے سے بہتر کسی شخص کو امیر بنا کر اپنے سفر کو جاری رکھے، اس سے مراد حدود اللہ قائم کرنے والا امیر نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سیہہ کا حلال ہونا

سوال کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''سیہہ'' کو خبیث قرار دیا ہے اور کیا یہ اس بنا پر حرام ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب کسی صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''سیہہ'' کو خبیث نہیں کہا اور نہ ہی اسے حرام قرار دیا ہے، البتہ ایک روایت میں اس کی تفصیل کچھ اس طرح بیان ہوئی ہے کہ نمیلہ فزاری سے روایت ہے کہ اس نے کہا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس تھا، ان سے سیہہ کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے یہ آیت پڑھی:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ ❹

''آپ ان سے کہہ دیں کہ جو وحی میری طرف آئی ہے میں تو اس میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا ہوں جو کھانے والے پر حرام کی گئی ہو، الا یہ کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا خنزیر کا گوشت، کیونکہ وہ ناپاک ہے۔ یا فسق ہو جو اللہ کے علاوہ کسی اور نام سے مشہور کر دی گئی ہو۔''

ایک شخص جو ان کے پاس تھا کہنے لگا میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سیہہ کا

---

❶ مسند امام احمد، ص: ۱۷۷، ج۲۔ ❷ ابوداؤد، الجهاد: ۲۶۰۸۔
❸ بیهقی، ص: ۲۵۷، ج۵۔ ❹ ۶/الانعام: ۱۴۵۔

ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: ''وہ تو خبائث سے ہے، یہ سن کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے تو ٹھیک ہے۔ (مسند امام احمد، ص: ۳۸۱، ج ۲) لیکن اس حدیث کی سند میں تین راوی مجہول ہیں۔

(۱) عیسیٰ بن نمیلہ الفزاری، (۲) اس کا والد نمیلہ فزاری، (۳) حضرت ابوہریرہ سے بیان کرنے والا ''شیخ'' اس بنا پر یہ روایت قابل حجت نہیں ہے۔

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو ضعیف ابی داؤد میں درج کر کے اس کے ضعف کو برقرار رکھا ہے۔ [1] ہمارے رجحان کے مطابق ایک ضعیف حدیث پر بنیاد رکھتے ہوئے ایک جانور کو حرام نہیں کہا جا سکتا، اس لیے یہ حلال ہے اور اس کے حرام ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ ہاں اگر کسی کا دل نہ چاہے تو الگ بات ہے اسلام انسان کو کسی چیز کے استعمال کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ (واللہ اعلم)

انسان کے بالغ ہونے کی علامات؟

سوال انسان کے بالغ ہونے کی کیا علامات ہیں، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا صراحت ہے؟

جواب مختلف احادیث کے مطابق مرد وزن کی درج ذیل بلوغ کی علامت ہیں۔

1. جب کہ عمر پندرہ سال کی ہو جائے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ جنگ احد کے وقت میری عمر چودہ سال کی تھی تو مجھے جنگ میں شرکت کی اجازت نہ ملی لیکن غزوۂ خندق میں میری عمر پندرہ سال کی ہوئی تو مجھے جنگ میں شامل کر لیا گیا۔ [2]
2. زیر ناف بالوں کا اُگنا چنانچہ جنگ قریظہ کے دن جس شخص کے بال اُگے تھے اسے قتل کر دیا جاتا اور جس کے بال نہ اُگے ہوتے اسے چھوڑ دیا جاتا۔ [3]
3. احتلام آجائے تو بھی بالغ ہونے کی علامت ہے، چنانچہ حدیث میں ہے: ''احتلام آجانے کے بعد دور یتیمی ختم ہو جاتا ہے۔'' [4]
4. اسی طرح لڑکی کو جب حیض آنا شروع ہو جائے تو بھی اس کے بالغ ہونے کی علامت ہے، لیکن ہمارے ملکی قانون میں 18 سال کی عمر کو بالغ ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ غالباً فقہ حنفی میں بھی بلوغ کا یہی معیار ہے، درج بالا احادیث کے پیش نظر یہ معیار انتہائی محل نظر ہے۔

جیل میں احکام الٰہی پر عمل کرنا

سوال میں کسی وجہ سے سنٹرل جیل ساہیوال میں ہوں، یہاں پر رشوت، جھوٹ، فراڈ، دھوکہ دہی اور شیطنت برسر عام چلتی ہے، از راہ کرم مجھے آگاہ فرمائیں کہ یہاں زندگی کیسے بسر کی جائے؟ نیز درج ذیل باتوں کی وضاحت کر دیں، یہاں کہا جاتا ہے کہ: (الف) جیل دنیا کی دوزخ ہے، (ب) یہاں کوئی نماز نہیں اور نہ ہی گالی دینا جرم ہے۔ (ج) 302 ایک ایسا جرم ہے اگر اسے درخت کے ساتھ لگا دیا جائے تو وہ بھی سوکھ جاتا ہے، میں نے یہ بھی سنا کہ جیل کے کارندے دوزخی ہیں۔ ان تمام باتوں کی کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کر دیں۔

---

[1] حدیث نمبر ۸۱٤۱۔ [2] صحیح بخاری، المغازی: ۵۰۹۷۔
[3] ابو داود، کتاب الحدود: ٤٤٠٤۔ [4] بیہقی، ص: ۳۲۰، ج ۷۔

جواب واقعی جیل کی زندگی بہت عجیب اور سبق آموز ہوتی ہے چونکہ راقم الحروف نے خود پندرہ دن تک کیمپ جیل لاہور کی ہوا کھائی ہے اس لیے عملی تجربہ ہوا کہ وہاں رشوت، جھوٹ اور فراڈ وغیرہ عام ہوتا ہے۔ ہوا یوں کہ جامعہ سلفیہ سے فراغت کے بعد مدینہ یونیورسٹی حصول تعلیم کے لیے جانا تھا کچھ وقت فارغ تھا اس لیے مدرسہ رحمانیہ گارڈن ٹاؤن میں تدریس کا شعبہ سنبھال لیا۔ مدرسہ کے کونے میں بریلوی حضرات کی مسجد تھی، اہل مدرسہ اس مسجد پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے کیر کلاں کے چند لوگوں کی خدمات حاصل کر لی گئیں، انہوں نے ہوائی فائرنگ کی تو محلے کے لوگ باہر نکل آئے، پولیس کو پتہ چلا اور انہوں نے کارروائی کی جس کے نتیجہ میں راقم الحروف کو بھی ساتھ دھر لیا گیا۔ ہمیں ایک دن وحدت روڈ تھانے میں رکھا گیا پھر چالان کر کے کیمپ جیل پہنچا دیا، اس طرح جیل کے اندرونی ماحول کو دیکھنے کا موقع ملا اور پندرہ دن اپنے ناکردہ گناہ کی سزا بھگتنا پڑی۔

رسول اللہ ﷺ نے غالباً جیل کے کارندوں کے متعلق فرمایا ہے: ''لوگوں کی دو قسمیں ایسی ہیں جو اہل جہنم ہیں لیکن میں نے انہیں ابھی تک نہیں دیکھا ہے ان میں سے ایک وہ ہیں جن کے ہاتھوں میں بیلوں کی دموں کی طرح کوڑے ہوں گے اور وہ ان کے ذریعے لوگوں کو پیٹیں گے۔'' [1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں مزید وضاحت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! اگر تیری زندگی نے تیرا ساتھ دیا تو تو ایسے لوگوں کو دیکھے گا جن کے ہاتھوں میں بیلوں کی دموں کی طرح کوڑے ہوں گے وہ اللہ کے غضب میں صبح کریں گے اور اللہ کی ناراضگی میں ان کی شام ہوگی۔ [2]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ وہ اللہ کی ناراضگی میں صبح کریں گے اور اس کی لعنت میں ان کی شام ہوگی۔ [3]

ہمارے ذاتی رجحان کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے جن سخت دل لوگوں کی نشاندہی کی ہے اس سے مراد جیل کے کارندے اور پولیس والے ہیں جو بلاوجہ لوگوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہیں، چنانچہ جیل میں ہم نے ایک دفعہ صبح کی نماز مسجد میں ادا کرنے کا پروگرام بنایا جب کہ اس وقت حاضری اور جیل کے اندر کام تقسیم ہوتے تھے، ہماری قطار جب مسجد کی طرف جانے لگی تو ان ظالموں نے بارش کی طرح ہم پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں اور وہ ہانک کر گول چکر لے گئے جہاں حاضری لگائی جاتی تھی، ایسے حالات میں انسان کو حکمت عملی سے کام لینا چاہیے اور اللہ کے دین کو پھیلانے کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ سائل چونکہ دارالحدیث اوکاڑہ سے فارغ التحصیل ہے اس لیے جیل میں درس قرآن کی داغ بیل ڈال دی جائے، اس کے اثرات بہت اچھے ہوں گے جس کا ہمیں عملی تجربہ ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے جیل کے اندر مسجد میں جماعت اور درس قرآن اپنے ذمے لے لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صبح کی حاضری اور صفائی وغیرہ سے مجھے مستثنیٰ کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے پندرہ دن کے بعد ضمانت کا بندوبست کر دیا۔ وللہ الحمد اولا وآخرا

اب سائل کے سوالات کا ترتیب وار جواب دیا جاتا ہے۔

1. موحدین کے لیے جیل میں جانا سنت یوسف علیہ السلام ہے، وہاں توحید کی نشر واشاعت کی جائے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے

---

[1] صحیح مسلم، اللباس: ۵۵۸۲۔ [2] صحیح مسلم، الجنة: ۷۱۹۵۔

[3] صحیح مسلم، الجنة: ۷۱۹۶۔

اس فریضہ کو ادا کیا تھا۔

❷ جیل، دنیا کی دوزخ نہیں ہے بلکہ انسان یہاں آزمائش سے دوچار ہوتا ہے اگر اپنے آپ پر کنٹرول رکھے تو کندن بن کر باہر نکلتا ہے۔

❸ جیل میں نمازوں کی پابندی کی جائے اور گالی گلوچ سے پرہیز کیا جائے، اگرچہ وہاں کا ماحول بہت گندہ ہوتا ہے تاہم انسان خود کو اس ماحول سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

❹ دفعہ 302 قاتل پر لگائی جاتی ہے یہ جرم واقعی بہت سنگین ہے، سزا کے طور پر ممکن ہے کہ قاتل کو بھی تختہ دار پر لٹکا دیا جائے الا یہ کہ مدعی حضرات سے صلح ہو جائے یا اللہ تعالیٰ کوئی اور راستہ نکال دے۔

❺ جیل کے کارندے واقعی بہت سخت ہوتے ہیں اور قیدیوں کو تختہ مشق بناتے رہتے ہیں' ان کے متعلق ہم نے اپنا رجحان پہلے بیان کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سائل کو رہائی دے اور اس کے لیے ذرائع و اسباب پیدا کرے نیز وہ مقتول کے ورثاء کو صلح پر آمادہ کر دے تاکہ برخوردار کی رہائی کا راستہ ہموار ہو جائے۔ (واللہ اعلم)

ٹیکہ کے ذریعے جانور سے دودھ حاصل کرنا

سوال دودھ دینے والے جانور سے ٹیکہ کے ذریعے دودھ حاصل کرنا شرعاً کیسا ہے، کیا یہ غیر فطرتی طریقہ نہیں ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب جانوروں کے حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ اسے پیٹ بھر کر چارہ کھلایا جائے پھر اس سے کام لیا جائے، رسول اللہ ﷺ سے ایک اونٹ نے شکایت کی تھی کہ اس کا مالک اسے چارہ کم دیتا ہے اور کام زیادہ لیتا ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے اس کے مالک کو بلا کر تنبیہ فرمائی اور جانوروں کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کی۔ [1]

جانور کی حقِ ادائیگی کے بعد اس سے ہر ممکن صورت میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے چونکہ جانور کا دودھ اس کے اہم فوائد سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے بطور خاص اس فائدہ کا ذکر کیا ہے۔ [2] اس لیے جانور اگر اڑیل مزاج ہے اور عام طریقہ سے دودھ نہ دیتا ہو تو ٹیکہ لگا کر دودھ حاصل کرنا جائز ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے البتہ بھوکے پیٹ اس سے انجکشن کے ذریعہ دودھ حاصل کرنا فطرت کے خلاف ہے، ایک مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سفید بگلا حلال ہے یا حرام؟

سوال سفید رنگ کا بگلا جو فصلوں میں عام دیکھا جاتا ہے جب انہیں پانی دیا گیا ہو، قرآن و حدیث میں اس کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق کیا وارد ہے؟

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۱۷۳، ج ٤۔ [2] ١٦/النحل:٦٦۔

جواب اصل کے اعتبار سے ہر چیز حلال ہے اور حرام صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہو اور جس سے انہوں نے خاموشی اختیار کی ہو وہ بھی معاف ہے چنانچہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے اور جس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے وہ ان اشیاء سے ہے جن سے اس نے درگزر فرما دیا ہے۔'' [1]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

﴿وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ [2]

''وہ نبی ان کے لیے پاکیزہ اشیاء حلال قرار دیتا ہے اور خبیث اشیاء ان پر حرام کرتا ہے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ غیر خبیث اشیاء پاکیزہ اور حلال ہیں نیز حدیث بالا کے مطابق جس چیز کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے وہ بھی قابل معافی ہے، ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر رحمت کرتے ہوئے کچھ چیزوں سے خاموشی اختیار کی ہے لہٰذا تم ان کی کُرید نہ کرو۔ [3]

اشیاء کی خباثت کو مندرجہ ذیل امور سے معلوم کیا جاسکتا ہے:

☆ شریعت میں اس کی حرمت کے متعلق نص موجود ہو، مثلاً گھریلو گدھے۔

☆ جن جانوروں کو مارنے کا حکم دیا گیا ہے مثلاً چوہیا، سانپ اور چیل وغیرہ۔

☆ جن جانوروں کو مارنے سے منع کیا گیا ہو مثلاً بلی وغیرہ۔

☆ جو چیز انسان کے لیے جسمانی طور پر ضرر رساں ہو مثلاً زہر۔

☆ جو چیز عقل کو نقصان پہنچاتی ہو جیسے تمام نشہ آور اشیاء، شراب وغیرہ۔

☆ جو جانور مردار کھاتا ہو جیسے گدھ وغیرہ۔

☆ جسے ناجائز طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو مثلاً غیر اللہ کے لیے ذبح کردہ یا کافر کا ذبح کردہ۔

☆ ہر کچلی والا جانور

☆ ہر چنگال والا پرندہ۔

مذکورہ بالا امور کی روشنی میں جب بگلے کو دیکھا جاتا ہے تو وہ ان میں سے کسی کی زد میں نہیں آتا وہ ایک پرندہ ہے نیچے سے شکار کر کے اپنے پنجے میں پکڑ کر نہیں کھاتا، وہ صرف فصلوں سے نکلنے والے حشرات کو کھاتا ہے، اس لیے اسے حلال قرار دیا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس کی حرمت کے متعلق کوئی واضح دلیل موجود نہیں، اس لیے اصل کے اعتبار سے بھی حلال معلوم ہوتا ہے، نیز یہ ایسی اشیاء سے ہے جن کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے لہٰذا یہ حلال ہے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ابن ماجه، الاطعمه: ٣٣٦٧۔ [2] ٧/الاعراف: ١٥٧۔ [3] دارقطنی، ص: ١٨٣، ج ٤۔

کرسمس کے موقع پر عیسائیوں کو تحائف دینا

سوال کرسمس کے موقع پر عیسائیوں کو تحائف وغیرہ دینے کی شرعاً گنجائش ہے یا انہیں ایسے موقع پر کچھ نہ دیا جائے، جب کہ وہ ہمیں اسلامی تہوار کے موقع پر تحائف دیتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب مشرکین اور کفار کی دو اقسام ہیں: ❶ جو کھلے بندوں مسلمانوں سے دشمنی کرتے ہیں، ❷ جو کفر وشرک پر رہتے ہوئے مسلمانوں سے دشمنی نہیں کرتے۔

سورۃ ممتحنہ آیت ۸، ۹ میں ان دونوں اقسام کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جو کافر اور مشرک خواہ وہ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہوں مسلمانوں سے کھلے طور پر دشمنی رکھتے ہیں، انہیں تحائف دینا یا ان سے تحائف لینا شرعاً جائز نہیں کیونکہ ان سے محبت اور تعلق خاطر کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور ایسے کفار ومشرکین سے دوستی اور موالات سے منع کیا گیا ہے، کہ دوسری قسم کے کفار ومشرکین سے حسن سلوک اور رواداری کرنے کی اجازت ہے، انہیں تحائف دیئے جا سکتے ہیں اور ان سے تحائف لینے کی بھی اجازت ہے جیسا کہ درج ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔

☆ فروہ جذامی نے رسول اللہ ﷺ کو ایک خچر بطور ہدیہ دیا تھا اور آپ نے حنین کے دن اس پر سواری کی تھی۔ ❶

☆ دومتہ الجندل کے سردار نے رسول اللہ ﷺ کو ایک ریشمی جبہ بطور ہدیہ دیا تھا جسے آپ ﷺ نے قبول فرمایا۔ ❷

☆ غزوۂ خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت نے زہر آلود بکری بطور ہدیہ دی تھی جو بطور دعوت پیش کی گئی، آپ نے اس دعوت کو قبول فرمایا۔ ❸

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایران کے بادشاہ نے رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ بھیجا تو آپ نے اسے قبول فرمایا، روم کے بادشاہ نے آپ کو تحفہ بھیجا تو آپ نے اسے بھی قبول فرمایا، اسی طرح مختلف بادشاہوں نے آپ کو تحائف بھیجے آپ نے ان سب کو قبول فرمایا۔ ❹

صورت مسئولہ میں کرسمس کے موقع پر عیسائیوں کو کوئی تحفہ دینا ان کے تہوار میں شریک ہونا ہے ایسے حالات میں انہیں کوئی تحفہ نہ دیا جائے تاکہ انہیں اپنے باطل مذہب پر قائم رہنے کی حوصلہ افزائی نہ ہو اور نہ ہی ان سے تحائف لینے چاہئیں چونکہ ایک حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مشرکین کی میل کچیل سے منع کیا گیا ہے۔'' آپ نے یہ اس وقت فرمایا تھا جب عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ نے حالتِ شرک میں آپ کو ایک اونٹنی بطور ہدیہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ ❺

ہمارے نزدیک مذکورہ احادیث میں تطبیق کی بھی صورت معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کا ہدیہ قبول کرنے سے انکار کیا جو اپنے ہدیے کے ذریعے محض دوستی اور اظہار محبت چاہتا تھا اور آپ نے ان لوگوں کے ہدیے قبول فرمائے جن سے امید تھی کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں گے اور ان کے دلوں میں اسلام کی محبت والفت اتر جائے گی، اس کے قومی تہوار

---

❶ صحیح مسلم، الجهادو السیر: ۱۷۷۵۔ ❷ صحیح بخاری، الهبه: ۲۶۱۵۔ ❸ صحیح بخاری، الهبه: ۲۶۱۷۔
❹ ترمذی، السیر: ۱۵۷۲۔ ❺ ابوداود، الخراج: ۳۰۵۷۔

کے موقع پر انہیں ہدیہ دینا یا اپنے قومی تہوار کے موقع پر غیر مسلم حضرات کے ہدایا قبول کرتے وقت مذکورہ بالا امر کو ضرور ملحوظ رکھا جائے، بہرحال ہم اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ قومی تہوار کے علاوہ دونوں میں تحائف کا تبادلہ کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ محض اظہار محبت مقصود نہ ہو بلکہ انہیں اسلام سے مانوس کرنا پیش نظر ہو۔ (واللہ اعلم)

تکبیر پڑھ کر اونٹ کی دُم کاٹنا

سوال اگر اونٹ کسی گہرے گڑھے میں گر جائے جہاں سے اسے زندہ نکالنا مشکل ہو اور اسی حالت میں پڑا رہنے سے اس کے مرنے کا اندیشہ ہو تو ایسے حالات میں کیا کیا جائے؟ ہمارے ہاں ایک آدمی نے مسئلہ بیان کیا کہ بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ کر اس کی دم کو کاٹ دیا جائے تو وہ ذبح ہو جاتا ہے۔

جواب صورت مسئولہ میں جو اونٹ کو ذبح کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، اس کا قرآن و حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ جہالت پر مبنی ایک رسم معلوم ہوتی ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ’’جب کسی قوم کا کوئی اونٹ بدک جائے اور قوم میں سے کوئی شخص خیر خواہی کی نیت سے اسے تیر سے نشانہ لگا کر مار ڈالے تو جائز ہے‘‘ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔ [1]

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ حسب ذیل ہیں، فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک سفر میں تھے، ایک اونٹ بدک کر بھاگ نکلا تو ایک آدمی نے اسے اپنے تیر سے مارا، اللہ تعالیٰ نے اسے روک دیا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اونٹ بھی بعض اوقات جنگلی جانوروں کی طرح بدکتے ہیں، لہٰذا ان میں جو تمہارے قابو سے باہر ہو جائیں ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو۔‘‘ [2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی وجہ سے جانور کو ذبح کرنا مشکل ہو جائے تو تیر یا نیزہ مار کر اسے حلال کرنا درست ہے اور ایسا کرنا ذبح ہی کی طرح ہے، اس کا گوشت استعمال کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر واقعی اونٹ کو باہر نہیں نکالا جا سکتا تو اسے تکبیر پڑھ کر نیزہ وغیرہ سے حلال کیا جا سکتا ہے، لیکن بسم اللہ واللہ اکبر پڑھ کر صرف اس کی دم کاٹنے والی بات جاہلانہ رسم ہے، عقل و نقل سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، حدیث میں بیان کردہ صورت پر صورت مسئولہ کو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب بھی کسی جانور کو ذبح نہ کیا جا سکتا ہو تو اس کے ساتھ حدیث میں بیان کردہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

چوتھی دفعہ شراب نوشی کرنے پر قتل کرنا

سوال میرے ایک دوست نے پوچھا ہے کہ چوتھی مرتبہ شراب نوشی کرنے پر قتل کر دینے کا ذکر احادیث میں ہے، اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں کہ آیا واقعی ایسے شرابی کو قتل کر دینے کا حکم ہے؟

جواب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جب کوئی شراب نوشی کرے تو اسے

---

[1] صحیح بخاری، الذبائح باب نمبر ۳۷۔ [2] صحیح بخاری، الذبائح: ۵۵۴۴۔

کوڑے مارو، دوسری مرتبہ شراب پیئے تو پھر کوڑے لگاؤ، پھر تیسری مرتبہ شراب نوشی کرے تو پھر کوڑے لگاؤ مگر جب چوتھی مرتبہ شراب نوشی کرے تو اس کی گردن اڑا دو۔ 1 لیکن چوتھی مرتبہ شراب پینے پر قتل کا حکم منسوخ ہے، چنانچہ اس حدیث کے بعد امام ترمذی فرماتے ہیں ''شراب پینے والے کو قتل کرنے کا حکم پہلے تھا، اب منسوخ ہو چکا ہے، اسی موقف پر عام اہل علم ہیں، ہم ان کے درمیان کسی اختلاف کو نہیں جانتے اور اس مسئلے کی مزید تاکید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی منقول ہے کہ ''مسلمان کا خون تین چیزوں کے علاوہ حلال نہیں ہے، ایک جان کے بدلے جان، دوسرے شادی شدہ زانی اور تیسرے مرتد۔'' 2 امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شراب پینے والا لایا گیا تو آپ ﷺ نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ 3 اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کوئی شراب پیئے تو اسے کوڑے لگاؤ اور اگر چوتھی مرتبہ پیئے تو اسے قتل کر دو۔'' راوی کہتا ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے شراب پی رکھی تھی تو آپ ﷺ نے اسے مارا لیکن قتل نہیں کیا۔ 4 البتہ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف ہے کہ چوتھی مرتبہ شراب پینے پر اسے قتل کر دیا جائے، لیکن جمہور اہل علم کا مؤقف ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ قتل کا حکم منسوخ ہے۔ 5

صحیح بخاری میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی موافقت

سوال شنید ہے کہ صحیح بخاری میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی موافقت کچھ روایات ہیں، کیا اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تائید میں بھی کوئی روایت موجود ہے؟

جواب صحیح بخاری میں کسی امام کی نہیں بلکہ امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی احادیث ہیں جو حق کی تائید و توثیق کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کی ہیں، اس سلسلہ میں کسی کی موافقت یا مخالفت قطعاً پیش نظر نہیں، صرف دلیل کی بنیاد پر حق کی موافقت اور باطل کی مخالفت کی ہے جیسا کہ درج ذیل تفصیل سے پتہ چلتا ہے:

☆ شوافع کے نزدیک جمعہ کی ادائیگی کے لیے کم از کم چالیس آدمیوں کا ہونا ضروری ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے بایں الفاظ عنوان قائم کیا: ''جب نماز جمعہ میں لوگ امام کو چھوڑ کر چلے جائیں تو باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ امام کی نماز صحیح ہے۔''

پھر آپ نے ایک حدیث بطور دلیل بیان فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہ آدمیوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا فرمائی۔ 6

☆ احناف کے ہاں جمعہ کی ادائیگی کے لیے متعدد شرائط ہیں، ان کے ہاں عام دیہاتوں میں جمعہ نہیں ہوتا، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے ایک عنوان قائم کیا ہے: ''دیہاتوں اور شہروں میں جمعہ کی ادائیگی'' پھر آپ نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ عبدالقیس کی ایک جواثی نامی بستی میں شروع ہوا جو بحرین کے علاقہ میں تھی۔ 7

---

1 مسند امام احمد، ص: ۵۱۹، ج ۲۔ 2 ترمذی حدیث: ۱٤٤٤۔ 3 مسند امام احمد، ص: ۲۹۱، ج ۲۔
4 بیهقی، ص: ۳۱٤، ج ۷۔ 5 نیل الاوطار، ص: ٦٠٤، ج ٤۔ 6 صحیح بخاری، الجمعه: ۹۳٦۔
7 صحیح بخاری، الجمعة: ۸۹۲۔

☆ حنابلہ کے ہاں زوال آفتاب سے پہلے جمعہ جائز ہے۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت فرمائی کہ یہ موقف درست نہیں بلکہ ایک عنوان ان کی تردید میں بایں الفاظ قائم کیا: ''جب سورج ڈھل جائے تو جمعہ کا وقت شروع ہوتا ہے۔'' پھر آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوال آفتاب کے بعد جمعہ ادا کرتے تھے۔ [1]

☆ مالکیہ کے ہاں بارش کی وجہ سے جمعہ چھوڑنا جائز نہیں' امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مؤقف کی تردید کرتے ہوئے ایک عنوان قائم کیا ہے ''جو بارش کی وجہ سے جمعہ ادا نہ کر سکے تو اس کے لیے رخصت ہے'' پھر انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی، آپ نے فرمایا: ''اگرچہ جمعہ کی ادائیگی بہت ضروری ہے تاہم بارش کی وجہ سے میں نہیں چاہتا کہ تمہیں مشقت میں ڈالوں تم مٹی اور کیچڑ سے لتھڑے ہوئے مسجد میں آؤ۔'' [2]

بہر حال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حق کی تائید ونصرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو اپنی مبارک کتاب میں جمع فرمایا ہے۔

کفّار کے ممالک کی طرف سیر وسیاحت کے لیے جانا

سوال اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہم مسلمان سیر وتفریح کے لیے کسی کافر ملک کا انتخاب کرتے ہیں، کیا سیر وسیاحت کے لیے ایسے ممالک میں جانا جائز ہے جہاں غیر مسلم لوگوں کی حکومت ہو؟

جواب کفار کے ممالک کی طرف سفر کرنا جائز ہے، لیکن اس کے لیے تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو حسب ذیل ہیں:

1. اس کے پاس شرعی علم اس قدر ہو کہ وہ کفار کے شکوک وشبہات کا شافی جواب دے سکے۔
2. اس پر دینی رنگ اس قدر غالب ہو کہ غیر مسلم لوگوں کی تہذیب سے متاثر نہ ہو سکے۔
3. اسے سفر کرنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو جو اسلامی ممالک میں پوری نہ ہو سکتی ہو۔

اگر مذکورہ شرائط کسی میں نہیں پائی جاتی ہیں تو اسے غیر مسلم ممالک کا سفر نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں اس کے اخلاق وکردار کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہاں اگر علاج یا تعلیم وغیرہ کے حصول کے لیے غیر مسلم ممالک میں جانا ہے جو اپنے ملک میں حاصل نہ ہو سکتی ہو تو مذکورہ شرائط کے ساتھ سفر کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے، جہاں تک سیر وتفریح کی اور سیاحت کا تعلق ہے، اس کے لیے مسلم ممالک میں بہت سے تفریحی مقامات ہیں، جنہیں دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا اگر انسان کے پاس فرصت کے لمحات میسر ہوں اور وہ سیر وسیاحت کا شوق پورا کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے مسلم ممالک کا رخ کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

سالگرہ منانا

سوال بچے کی پیدائش کے بعد جب اس کی ولادت کا دن دوبارہ آتا ہے تو سالگرہ منائی جاتی ہے، اس موقع پر سالگرہ کا کیک کاٹا جاتا ہے اور تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا ہے، خوشی ومسرت کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کے متعلق شرعی حیثیت واضح کریں۔

جواب اہل اسلام کے ہاں اس انداز سے سالگرہ منانا مستحسن امر نہیں ہے، یہ سالگرہ جواز کی نسبت بدعت کے زیادہ

---

[1] صحیح بخاری، الجمعہ: ۹۰۴۔ [2] بخاری، الجمعہ: ۹۰۱۔

قریب ہے، مغربی لوگ اس طرح سے سالگرہ مناتے ہیں اور کیک وغیرہ کاٹتے ہیں، مسلمان کو ایسے مواقع پر اہل مغرب کی مخالفت کا حکم ہے، اگر کوئی اس کا اہتمام ثواب سمجھ کر کرتا ہے تو اس کے ناجائز ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں کی ولادت یا آیندہ یوم ولادت کے موقع پر ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا ہے۔ بچے کی ولادت کے ساتویں دن عقیقہ کرنے کا حکم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں بھی بچوں کی پیدائش ہوتی تھی انہوں نے آیندہ یوم ولادت کے وقت سالگرہ منانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا ہے، لہٰذا ہمیں بھی ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے جنہیں رسول اللہ ﷺ کے بعد تین افضل صدیوں میں نہیں کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔'' [1]

ایک حدیث بایں الفاظ منقول ہے: ''جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے بارے میں ہمارا امر نہ ہو تو وہ بھی مردود ہے۔'' [2]

بہر حال بچوں کی سالگرہ کو اگر دینی رنگ نہ بھی دیا جائے تو بھی مغربی تہذیب سے تعلق کی بنا پر اسے اختیار کرنا اور اس کے متعلق خصوصی اہتمام کرنا ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

ایک لاکھ لیٹر دودھ سے مردہ چھپکلی برآمد ہونا

سوال ہمارے قریب ایک ڈیری فارم میں بڑے بڑے ٹینکروں کے ذریعے دیہاتوں اور قصبوں سے دودھ لا کر جمع کیا جاتا ہے، تقریباً ایک لاکھ لیٹر کی مقدار میں جمع شدہ دودھ سے مردہ چھپکلی برآمد ہوئی، مالکان نے اس دودھ سے ۵ ٹن کریم نکال کر اسے ضائع کر دیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ کریم کھانے کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ لیبارٹری کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ مذکورہ کریم میں کسی قسم کے زہریلے اثرات نہیں پائے گئے، اس سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں دو چیزیں تحقیق طلب ہیں: ① طہارت ونجاست کے اعتبار سے اس کی کیا حیثیت ہے؟ ② اس میں زہریلے اثرات کہاں تک ہیں؟ جہاں تک دودھ کی کثیر مقدار کی طہارت ونجاست کا تعلق ہے تو اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث مروی ہے: رسول اللہ ﷺ سے اس پانی کے متعلق سوال ہوا جو کسی میدانی علاقہ میں ہو اور وہاں درندے چوپائے بھی اسے پینے کے لیے آتے جاتے ہوں تو آپ نے فرمایا کہ جب پانی کے کم از کم دو قلے ہوں تو وہ نجاست سے متاثر نہیں ہوتا۔ [3]

ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ جب پانی دو قلے ہو تو پلید نہیں ہوتا۔ [4]

ایک روایت میں ہے کہ پانی پاک ہے اسے کوئی چیز پلید نہیں کرتی الا یہ کہ اس میں پڑی ہوئی نجاست کی وجہ سے اس کا رنگ، ذائقہ یا ہوا تبدیل ہو جائے۔ [5]

ان حالات کی بنا پر امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ جب پانی دو قلوں سے کم ہو تو محض نجاست گرنے سے وہ پلید ہو جاتا ہے اگر دو قلے یا اس سے زیادہ ہو تو پلید نہیں ہوتا ہاں اگر نجاست کی وجہ سے پانی کے اوصاف ثلاثہ (رنگ، ذائقہ اور بو)

---

[1] صحیح بخاری، الصلح: ۲۶۹۷۔ [2] صحیح مسلم، الاقضیہ: ۱۷۱۸۔ [3] ترمذی، الطہارۃ: ۶۷۔
[4] ابوداود، الطہارۃ: ۶۷۔ [5] بیہقی، ص: ۲۷۹، ج ۱۔

میں سے کوئی وصف بدل جائے تو پلید ہو جائے گا اور دو قلے پانی پانچ مشکوں کے برابر ہے۔'' [1]

عربی زبان میں قلہ بڑے مٹکے کو کہتے ہیں جس میں تقریباً ۲۵۰ رطل پانی آتا ہے۔ یہ مقدار ہمارے دو من پچیس سیر آٹھ چھٹانک کے برابر ہے، دو قلے تقریباً ۵۰۰ رطل یعنی پانچ من گیارہ سیر کے برابر ہوتا ہے، اتنی مقدار پانی کو ماء کثیر کہا جاتا ہے، جو اس میں گری ہوئی نجاست سے متاثر نہیں ہوتا، ہاں اگر اتنی مقدار پانی کا ذائقہ یا رنگ یا ہوا نجاست کی وجہ سے بدل جائے تو پانی پلید ہو جائے گا، صورت مسئولہ میں دودھ کو پانی پر قیاس کیا جا سکتا ہے، جو مقدار میں اس قدر زیادہ ہے کہ ایک مردہ چھپکلی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، اس سے دودھ کے ذائقے، رنگ اور ہوا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تاہم مالکان نے اس سے ۵ ٹن کریم نکال کر اسے ضائع کر دیا، اب دیکھا جائے کہ چھپکلی کی وجہ سے اس کریم میں زہریلے اثرات کس حد تک ہیں، اس کی صراحت سوال میں کر دی گئی ہے کہ لیبارٹری ٹیسٹ سے معلوم ہوا ہے کہ ۵ ٹن کریم میں کسی قسم کے زہریلے اثرات نہیں ہیں، مزید تسلی کے لیے کسی اچھی لیبارٹری سے اسے دوبارہ ٹیسٹ کر لیا جائے اگر واقعی اس میں کسی قسم کے زہریلے اثرات نہیں ہیں تو اسے کھانے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور اگر اس میں کچھ اثرات ہیں تو اسے صابن بنانے میں استعمال کیا جا سکتا ہے، اتنی مقدار کو محض شکوک و شبہات کی بنا پر ضائع کر دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔ (واللہ اعلم)

دینی پروگرام کے لیے مخصوص تاریخ یا دن مقرر کرنا

سوال دینی پروگرام کرنے کے لیے کوئی خاص دن یا خاص وقت مقرر کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے جب کہ دیگر مکاتب فکر ان دنوں خرافات و بدعات کی محفلیں منعقد کرتے ہوں مثلاً ۹، ۱۰ محرم اور ۱۲ ربیع الاوّل کے دن دینی پروگرام کرنا پھر اس دن اہل محفل کو شربت پلانا اور کھانے کا اہتمام کرنا، ان دنوں تقاریر کا اہتمام کرنا جائز ہے یا شریعت میں ایسا کرنا ناجائز ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب دینی پروگرام منعقد کرنے کی دو صورتیں حسب ذیل ہیں:

❶ سامعین کی سہولت یا فرصت کے پیش نظر دن یا وقت یا جگہ کا تعین کرنا مثلاً اتوار کے دن عام لوگوں کو چھٹی ہوتی ہے یا نماز عشاء کے بعد وقت فارغ ہوتا ہے یا کسی ہال میں سامعین با سہولت آ سکتے ہیں تو ایسے حالات میں دن، وقت یا جگہ کا تعین کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ مستحسن امر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو وعظ و نصیحت کے لیے جمعرات کا دن مقرر کیا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو وائل کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کے دن لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے تھے تو ایک آدمی نے کہا: اے ابو عبدالرحمٰن! ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمیں ہر دن وعظ کیا کریں، انہوں نے فرمایا کہ میں تمہاری اکتاہٹ کو ناپسند کرتا ہوں، اور وعظ کے لیے میں تمہارا خیال رکھتا ہوں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا خیال رکھتے تھے، مبادا ہم اکتا جائیں۔ [2]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''جو تشنگان علم کے لیے دن مقرر کر لے تو جائز ہے۔''

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو وعظ کرنے کے لیے مخصوص جگہ اور مخصوص وقت طے کیا ہوا تھا جیسا کہ حضرت ابو سعید

---

[1] ترمذی: ۶۷۔ [2] صحیح بخاری، العلم: ۷۰۔

خدری رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں اس کی صراحت کی ہے۔ [1] بہرحال مخصوص حالات میں وعظ ونصیحت کے لیے دن مقرر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

❷ اہل بدعت نے اپنی بدعات وخرافات کے رواج کے لیے مخصوص مقامات اور دن مقرر کیے ہیں، وہ دن یا مقامات ان کے لیے شعار کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً: مرنے کے بعد تیسرے، ساتویں اور چالیسویں دن کو ہمارے ہاں میت کے ایصال ثواب کے لیے خاص رسومات قرآن خوانی اور ختم وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

محرم کی نویں اور دسویں نیز ربیع الاول کی بارہ تاریخ میں ایک مخصوص طبقہ خرافات و بدعات کی محافل منعقد کرتا ہے اور ان محافل میں شرک و بدعت کی تعلیم دیتا ہے پھر ان دنوں کھانے اور شربت پلانے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں لوگوں کو بیدار رکھنے کے لیے مسجد میں چراغاں کیا جاتا ہے پھر عبادت گزار حضرات کو مصروف رکھنے کے لیے اجتماعی محفل ذکر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ان دنوں اہل حق کو چاہیے کہ اہل بدعت کا طرز عمل اختیار نہ کریں بلکہ وعظ کرنے کے لیے ان دنوں کے علاوہ دوسرے ایام کا انتخاب کریں، بلکہ ایسا کرنے سے ان کی پوری پوری مشابہت ہوتی ہے، پھر عام آدمی کو ان دنوں میں بدعات کے ارتکاب کی دلیل مل جاتی ہے، کیونکہ اہل حق ان دنوں تقریر کرتے ہیں جب کہ اہل بدعت ان دنوں ختم اور قرآن خوانی کا اہتمام کرتے ہیں۔ قرآن پڑھنا اچھی چیز ہے لیکن اس کے لیے ایک خاص طریقہ اور دن کی تعیین بدعت کے زمرہ میں آتی ہے، اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ ان دنوں قرآن پڑھنے کا عمل محل نظر ہے پھر جس انداز اور اسلوب سے ان محافل میں پڑھا جاتا ہے۔ شرعی اعتبار سے وہ انتہائی قابل اعتراض ہے، جب ان دنوں اجتماعی ذکر یا قرآن خوانی جائز نہیں تو تقریر کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟ جب کہ تقاریر کے لیے بھی اس طرح کا اہتمام کیا جاتا ہے جس طرح اہل بدعت اپنی بدعات کے رواج کے لیے کرتے ہیں، جیسا کہ لوگ مزاروں پر غیر اللہ کے نام کی دیگیں چڑھاتے ہیں، ہم وہاں جا کر اللہ کے نام کی خیرات کریں تو شریعت نے اسے پسند نہیں فرمایا کیونکہ ایسا کرنے میں اہل بدعت کی مشابہت پائی جاتی ہے، چنانچہ حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بوانہ مقام پر اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا وہاں دورِ جاہلیت کا کوئی بت تھا جس کی پوجا پاٹ کی جاتی ہو؟'' اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہاں اس طرح کی کوئی چیز نہ تھی اور نہ اب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا وہاں دورِ جاہلیت کی عیدوں میں سے کوئی عید منائی جاتی تھی؟'' اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہاں کوئی جشن یا عید کا اہتمام نہیں ہوتا، اس وضاحت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاؤ وہاں اپنی نذر پوری کرو کیونکہ اللہ کی نافرمانی میں نذر کا پورا کرنا ضروری نہیں اور نہ ہی اس میں جس کا انسان مالک نہیں۔'' [2]

---

[1] صحیح بخاری، العلم: ۱۰۱۔

[2] ابوداود، الایمان والنذور: ۳۳۱۳۔

عاشوراء کا روزہ رکھنا

سوال شرعی طور پر عاشوراءِ محرم کی کیا حیثیت ہے، اس دن کھانے پینے کا خوب اہتمام کیا جاتا ہے پھر دودھ کی سبیلیں بھی لگائی جاتی ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اس کے روزہ کی کیا فضیلت ہے اور یہ روزہ کس دن رکھنا چاہیے، کیا نویں یا دسویں محرم یا دونوں کا روزہ رکھنا ہوگا؟ وضاحت تحریر کریں۔

جواب محرم کا مہینہ اللہ کے ہاں بڑی قدر و منزلت کا حامل ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے عزت و احترام والا مہینہ قرار دیا ہے، رسول اللہ ﷺ اس دن کے روزے اور رمضان کے روزوں کو دوسرے دنوں پر بڑی فضیلت دیتے تھے اور بڑے اہتمام کے ساتھ اس کا روزہ رکھتے تھے۔ [1]

لیکن ہم لوگوں نے اس دن کے حوالے سے بہت سی بدعات جاری کر لی ہیں اور اسے کھانے پینے کا دن سمجھ لیا ہے، اس دن بڑے اہتمام سے خصوصی کھانوں کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ میٹھے پانی اور دودھ کی سبیلیں لگائی جاتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جشن بہاراں ہے جسے بڑے شوق سے منایا جاتا ہے، نا معلوم یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا غم ہے یا ان کی شہادت کا جشن ہے جسے بڑے زور و شور سے ہم مسلمان مناتے ہیں؟

زمانہ قدیم سے اس دن کی اہمیت مسلمہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات دی اور فرعون اور اس کے لشکر کو پانی میں غرق کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قوم یہود اس آزادی کی خوشی میں روزہ رکھتے تھے، پھر رسول اللہ ﷺ نے بھی اس دن کا روزہ رکھا اور دوسرے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ بھی اس دن کا روزہ رکھیں، جیسا کہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہود عاشوراء کے دن کو جشن کے طور پر مناتے تھے اور اس دن اپنی عورتوں کو خصوصی طور پر زیورات پہنا کر خوشی مناتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس دن کا روزہ رکھا کرو۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ رمضان کے بعد سب سے افضل روزے ماہ محرم کے روزے ہیں کیونکہ ماہ محرم اللہ کا مہینہ ہے اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز یعنی تہجد ہے یہ نماز بہت فضیلت والی ہے۔ [3]

سیدہ ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے آس پاس رہنے والوں کو یہ حکم دیا کہ وہ یوم عاشوراء کا روزہ رکھیں چنانچہ ہم خود بھی روزہ رکھتیں اور اپنے چھوٹے بچوں کو بھی روزہ رکھواتیں، جب بھوک کی وجہ سے بچے روتے تو ہم ان کے سامنے کھلونے رکھ دیتیں تاکہ ان کے ساتھ دل بہلاتے رہیں۔ [4]

بلکہ آپ ﷺ نے اس کے متعلق باقاعدہ اعلان کرایا کہ جس شخص نے اس دن کا روزہ رکھا ہے وہ تو اپنا روزہ پورا کرے اور جس نے روزہ نہیں رکھا وہ بقیہ دن کچھ نہ کھائے پیئے۔ [5]

جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ ﷺ نے اسے اختیاری روزہ قرار دے دیا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

---

[1] صحیح بخاری، الصوم: ۲۰۰۶۔ [2] صحیح مسلم، الصیام: ۲۶۶۰۔ [3] مسند امام احمد، ص: ۳۴۴، ج ۲۔
[4] صحیح مسلم، الصیام: ۲۶۶۹۔ [5] صحیح مسلم، الصیام: ۲۶۶۹۔

مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ دورِ جاہلیت میں قریش عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ بھی اس دن کا روزہ رکھتے تھے پھر جب آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو بھی آپ ﷺ اس دن کا روزہ رکھتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس دن کا روزہ رکھنے کے متعلق حکم دیتے تھے، اس کے بعد جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ نے اس کے متعلق اختیار دیا اور فرمایا: ''جس کا جی چاہے وہ اس دن کا روزہ رکھ لے اور جو چاہے وہ روزہ چھوڑ دے۔'' [1]

احادیث میں اس دن روزہ رکھنے کی فضیلت بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے یوم عاشوراء کے روزے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس دن کا روزہ پچھلے ایک سال کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ کسی کام کے متعلق اللہ کی طرف سے امر نہ دیا جاتا تو آپ ﷺ اہل کتاب کی موافقت کو پسند کرتے تھے۔ [3]

پھر آپ کو اہل کتاب کی مخالفت کرنے کا حکم دیا گیا چنانچہ آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ یہود و نصاریٰ بھی اس محرم کی تعظیم بجالاتے ہیں تو آپ ﷺ نے عاشوراء کے روزے کے متعلق بھی ان کی مخالفت کرنے کا عزم کر لیا چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آپ ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا تو ان حضرات نے آپ ﷺ کو بتایا کہ اس دن کی تو یہود و نصاریٰ بھی تعظیم کرتے ہیں، آپ ﷺ نے ان کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''جب آیندہ سال آئے گا تو ان شاء اللہ ہم نو محرم کا روزہ بھی رکھیں گے۔'' لیکن اگلا سال آنے سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں آیندہ سال زندہ رہا تو نویں کا روزہ بھی رکھوں گا۔'' [4]

اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرتے ہوئے دسویں محرم کے ساتھ نویں محرم کا روزہ بھی رکھا جائے کیونکہ عاشوراء تو دسویں تاریخ کو ہے، اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ دسویں کے بجائے صرف نویں محرم کا روزہ رکھا جائے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ایک عمل کا سہارا لیا جاتا ہے حالانکہ انہوں نے خود فرمایا ہے: ''یہود کی مخالفت کرو، نویں اور دسویں محرم کا روزہ رکھو۔'' اس طرح کہ اس سے ایک دن پہلے یا اس کے ایک دن بعد روزہ رکھو۔'' [5]

اس حدیث کے پیش نظر کچھ اہل علم کا مؤقف ہے کہ جو شخص نو محرم کا روزہ نہ رکھ سکے وہ دس محرم کا روزہ رکھنے کے بعد یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرتے ہوئے گیارہ محرم کا روزہ رکھ لے۔ ہمارے رجحان کے مطابق دسویں محرم کا روزہ کسی صورت میں نہ ترک کیا جائے البتہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت میں اس کے ساتھ نویں تاریخ کا روزہ رکھ لیا جائے، اگر کوئی نویں محرم کا روزہ نہیں رکھ سکا تو وہ دسویں محرم کے ساتھ گیارہ محرم کا روزہ رکھ لے۔ (واللہ اعلم)

---

[1] صحیح مسلم، الصیام: ۲٦۳۷۔ [2] صحیح مسلم، الصیام: ۲۷٤۷۔ [3] صحیح بخاری، اللباس: ۵۹۱۷۔
[4] صحیح مسلم حدیث نمبر ۲٦٦۷۔ [5] مسند امام احمد، ص: ۲٤۱، ج ۱۔

اسلام میں ذات پات کا مقام

سوال کیا اسلام میں ذات پات کی کوئی حیثیت نہیں ہے؟ اگر کوئی حیثیت نہیں تو لوگ اپنے نام کے ساتھ کیوں لکھتے ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اسلام میں ذات پات کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس ذات پات کو کسی صورت میں فخر ومباہات کا ذریعہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ پیدائش اور خلقت کے اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں، کیونکہ ان کا پیدا کرنے والا ایک رب ہے، تمام انسانوں کا مادہ تخلیق اور طریق پیدائش بھی ایک ہی ہے۔ نیز ان سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے، اس کے علاوہ کسی شخص کا کسی خاص ایک قوم یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے، اس میں انسان کے اپنے ارادہ، انتخاب اور اس کی اپنی کوشش کو کوئی دخل نہیں ہے، اس بنا پر کوئی معقول وجہ نہیں کہ ذات پات کے اعتبار سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا، برائیوں سے نفرت کرنے والا اور نیکی اور تقویٰ کی راہ پر چلنے والا ہو، ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، وہ اپنی اس خوبی کی بنا پر قابل قدر ہے اور جس شخص کا حال اس کے برعکس ہو وہ بہرحال ایک کمتر درجے کا انسان ہے وہ گورا ہو یا کالا، قریشی ہو یا حبشی، مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ [1]

''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، تمہاری ذاتیں اور قبیلے اس لیے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل عزت وہی ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہو۔''

اس آیت کے مطابق ذات پات اور خاندان اور قبیلے سے صرف یہ فائدہ ہے کہ ان کے ذریعے ایک دوسرے کا تعارف حاصل ہوتا ہے، ایک شخص کا نام اسامہ ہے اور اس کے باپ کا نام زید ہے، دوسرے کا نام اور ولدیت بھی یہی ہے تو الگ الگ قبیلہ یا برادری سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان میں امتیاز ہو جائے گا کہ ایک اسامہ بن زید انصاری ہے اور دوسرا اسامہ بن زید قریشی ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے ان چیزوں کو باہمی تفاخر وتنافر کا ذریعہ بنالیا ہے، کوئی تو نسل کی بنیاد پر بڑا بن بیٹھا ہے اور دوسروں کو حقیر اور ذلیل خیال کرتا ہے اور کوئی قوم، رنگ اور زبان کی وجہ سے شریف اور اعلیٰ درجہ کے انسان بن بیٹھے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ میری امت میں چار کام جاہلیت کی یادگار ہیں، لوگ انہیں ترک نہیں کریں گے ایک حسب ونسب پر فخر کرنا۔ دوسرا نسب میں طعنہ زنی کرنا۔ تیسرا ستاروں کو بارش برسنے میں مؤثر خیال کرنا اور چوتھا مصیبت کے وقت رونا، دھونا اور ہائے وائے کرنا۔ [2]

اس سلسلہ میں آپ کا درج ذیل فرمان بھی راہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے فخر وغرور کو دور

---

[1] ٤٩/الحجرات:١٣۔ [2] صحیح مسلم، الجنائز: ٩٣٤۔

کر دیا ہے اور اپنے ماں باپ پر فخر کرنے کو بھی نابود کر دیا ہے، لوگ صرف دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں، ایک نیک اور پرہیزگار جو اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے اور دوسرا فاجر اور شقی جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، لوگوں کو اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دینا چاہیے بصورت دیگر وہ اللہ کی نظر میں گندگی کے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے۔'' [1]

بہر حال اسلام میں ذات پات کی حیثیت باہمی تعارف کی ہے، اس لیے تعارف کے طور پر اپنے نام کے آگے لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ اسے فخر اور غرور کا ذریعہ ہرگز نہیں بنانا چاہیے۔

مال کی حفاظت میں مارا جانا

سوال ہمارے گھر میں ڈاکو آ گئے، میرے بیٹے نے ہمارا اور ہمارے مال کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان اللہ کے حوالے کر دی، اسے گولی لگی وہ اسی وقت اللہ کو پیارا ہو گیا، ایسی موت کے متعلق شرعی طور پر کیا حکم ہے؟ قرآن و حدیث کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب کاش کہ ہمارا ملک امن کا گہوارہ ہوتا لیکن ہر طرف جنگل کا قانون ہے، یہاں نہ کسی کی جان محفوظ ہے اور نہ ہی کسی کے مال کی حفاظت کی جاتی ہے، ڈاکو جب چاہتے ہیں جسے چاہتے ہیں لوٹ لیتے ہیں، افسوس یہ ہے کہ ہمارے محافظ ان کے ساتھ ملے ہوتے ہیں، ایسے حالات میں نہایت حکمت عملی کے ساتھ کوئی اقدام کرنا چاہیے۔ قرآن و حدیث کے مطابق اپنی جان، اپنے مال، اہل و عیال اور عزت و دین کے دفاع میں مارے جانا شہادت کی موت ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا گیا وہ شہید ہے، جو اپنے اہل و عیال کے دفاع میں قتل کر دیا گیا وہ بھی شہید ہے، جو اپنا دین بچاتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے اور جو اپنی جان بچاتے ہوئے قتل کر دیا گیا وہ بھی شہید ہے۔'' [2]

فقہی اصطلاح میں اس قسم کی شہادت کو شہادتِ صغریٰ کہتے ہیں، البتہ شہادت کبریٰ یہ ہے کہ جو مجاہد میدان کارزار میں اللہ کے دین کو بلند کرنے کا عزم لے کر اپنی جان اللہ کے حوالے کر دے، صورت مسئولہ میں نوجوان نے اہل خانہ اور اہل خانہ کے مال کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان اللہ کے سپرد کی ہے، حدیث بالا کے مطابق وہ شہید ہے لیکن اس قسم کی شہادت اس انسان کے لیے کارآمد ہے جس کا عقیدہ صحیح ہو، اگر عقیدہ خراب ہے تو شہادت کبریٰ بھی اس کے کام نہیں آ سکے گی، اللہ تعالیٰ ہماری اور ہمارے اموال کی حفاظت فرمائے۔ آمین!۔

خاوند کے رضاعی باپ سے پردہ کرنا

سوال میرے خاوند نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا، اس لیے وہ اس کی رضاعی ماں ہے اور اس کا شوہر اس کا رضاعی باپ ہے، کیا میرے لیے اپنے خاوند کے رضاعی باپ سے پردہ کرنا ضروری ہے یا حقیقی باپ کی طرح اس سے پردہ نہیں کرنا ہو گا؟

---

[1] مسند امام احمد، ص: ۳۶۱، ج ۲۔ [2] ابوداود، السنة: ۴۷۷۲۔

قرآن وحدیث کے مطابق اس کی وضاحت کریں۔

جواب صورت مسئولہ میں خاوند کا رضاعی باپ، بیوی کا رضاعی سسر ہے، قرآن وحدیث کے مطابق حقیقی سسر سے بہو پردہ نہیں کرے گی چنانچہ سورۃ النور آیت نمبر ۳۱ میں اس امر کی صراحت ہے کہ عورت اپنے خاوند کے باپ کے سامنے اپنی زینت کا اظہار کرسکتی ہے۔

عورت کا حقیقی سسر بہو پر نسبی اعتبار سے حرام نہیں ہے بلکہ وہ تو شادی کی وجہ سے حرام ہوا ہے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ﴾ [2]

''تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں بھی تم پر حرام ہیں۔''

رضاعی بیٹا، مرد کا صلبی اور سگا بیٹا نہیں ہے، اس بنا پر اگر عورت کے خاوند کا کوئی رضاعی باپ ہو تو وہ عورت اس سے پردہ کرے گی اور اس کے سامنے اپنا چہرہ ننگا نہیں کرے گی کیونکہ اس کے ساتھ اس کا کوئی سسرالی رشتہ قائم نہیں ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)

ساس کا بوسہ لینا

سوال کیا کوئی آدمی اپنی ساس کا بوسہ لے سکتا ہے، وضاحت کریں؟

جواب مرد کی ساس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تمہاری بیویوں کی مائیں بھی تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔ [3]

اس آیت کی رو سے ساس اپنے داماد سے پردہ نہیں کرے گی اور داماد کو اپنی ساس کا چہرہ دیکھنے کی اجازت ہے کیونکہ وہ بھی حقیقی ماں کے درجہ میں ہے۔ اس کی عزت وتکریم بالکل اس طرح کی جائے جس طرح انسان اپنی حقیقی ماں کا اکرام واحترام کرتا ہے۔

لیکن آج کل کے پرنٹ میڈیا نے ان رشتوں کو پامال کر دیا ہے، بعض بدبخت ایسے بھی ہیں جو اپنی ساس سے منہ کالا کرنے سے باز نہیں آتے، اس میں ساس کی خواہش بھی ہوتی ہے، ایسے واقعات اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اس بنا پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ داماد اپنی ساس کا چہرہ تو دیکھ سکتا ہے اور اگر جذبات پر کنٹرول کرنے کی ہمت ہو تو اپنی ساس کا بوسہ بھی لے سکتا ہے، ہاں اگر وہ بوڑھی ہے تو پھر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر وہ جوان ہے اور جذبات پر کنٹرول نہ رکھنے کا اندیشہ ہو تو بوسہ وغیرہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

قوالیوں کی حقیقت

سوال میں نے دوران سفر ایک قوالی سنی، قوال بار بار اس طرح شعر پڑھ رہا تھا: ''حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جب تک اذانِ فجر نہ دی...... قدرت خدا کی دیکھئے مطلق سحر نہ ہوئی۔'' اس واقعہ کی تفصیل کیا ہے؟

جواب قوالیاں من گھڑت اور خود ساختہ واقعات پر گائی جاتی ہیں تاکہ جاہل لوگوں میں شرکیہ عقائد کو پھیلایا جائے اور

---

[1] ٤/النساء:٢٣۔ [2] ٤/النساء:٢٣۔

بدعات کو رواج دیا جائے' ہمارے معاشرہ میں قوالی کو باوضو ہو کر بڑے ادب و احترام سے سنا جاتا ہے، ہمارے رجحان کے مطابق فحش گانے بھی برے اور اخلاق کو بگاڑنے والے ہیں لیکن قوالی کا درجہ فحش گانے سے بھی آگے ہے کیونکہ اس سے عقائد ونظریات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اس کے باوجود لوگ اسے سننا کار ثواب خیال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے، عربی لغت کے اعتبار سے قوال، زیادہ بک بک کرنے والے کو کہتے ہیں، اس مفہوم کے پیش نظر قوالی بھی بک بک پر ہی مشتمل ہوتی ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے، سوال میں ذکر کردہ شعر کی اصل حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ دوران سفر فرمایا: ''آج رات کون ہماری حفاظت کرے گا؟ مبادا ہم نماز فجر سے رہ جائیں۔''

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! میں اس ڈیوٹی کو سرانجام دوں گا، پھر وہ مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے تاکہ فجر ہوتے ہی اذان دیں لیکن کچھ دیر بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی غافل ہو کر سو گئے، جب آفتاب گرم ہوا تو بیدار ہوئے، رسول اللہ ﷺ بھی جاگے اور دیگر صحابہ کرام بھی اٹھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اونٹوں کی مہاریں پکڑ کر یہاں سے جلدی چلو کیونکہ یہ شیطان کی جگہ ہے، پھر آگے جا کر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وضو کرنے کا حکم دیا، وہاں دن چڑھے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی اور فجر کی نماز باجماعت ادا کی گئی۔ [1]

واقعہ اس قدر ہے جو ہم نے اختصار سے بیان کر دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور دیگر صحابہ کرام اس وقت بیدار ہوئے جب سورج طلوع ہو کر گرم ہو چکا تھا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بھی سورج طلوع ہونے کے بعد اذان دی لیکن قوال حضرات نے اس واقعہ کو غلط رنگ دیا اور پھر لوگوں کے عقائد خراب کرنے کے لیے اسے خوب ہوا دی ہے۔

سرکاری اہل کار کو تحفہ دینا

سوال جو اہل کار سرکاری طور پر کسی کام کے لیے تعینات ہوتے ہیں، ان کو تحفہ وغیرہ دینا اور ان کے تحائف قبول کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ تفصیل سے ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب سرکاری طور پر جو آدمی کسی کام کے لیے تعینات ہے اور اسے باقاعدہ اس کام کی تنخواہ ملتی ہے تو ایسے لوگوں کو تحائف دینا اور ان کے تحائف قبول کرنا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ وہ اس کام کی باقاعدہ تنخواہ لیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس شخص کو ہم کسی کام پر تعینات کریں اور ہم اسے اس کام کا مقررہ معاوضہ بھی دیں تو پھر وہ جو کچھ بھی اس تنخواہ کے علاوہ لے گا وہ خیانت ہوگی۔'' [2]

سرکاری اہل کار کو چاہیے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ اپنا کام سرانجام دے، اس پر وہ کسی قسم کا تحفہ قبول نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا رشوت اور خیانت میں شامل ہے ہاں اگر تحفہ کسی غرض کے بغیر ہو اور اسے عہدہ سے پہلے بھی تحفہ دیا جاتا تھا تو اسے قبول کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو لازماً تحفہ دینے والا اس سرکاری اہل کار کو اپنی طرف مائل کر کے اپنے مقاصد کو اس کے ذریعے پورا کرنا چاہتا ہے اور اپنے حق میں فیصلہ کرانا چاہتا ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں سرکاری اہل کار کو تحفہ دینے اور اسے قبول

---

[1] صحیح بخاری، مواقیت: ۵۹۵۔ [2] ابوداود، البیوع: ۲۹۴۳۔

کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنے بھائی کی سفارش کرے پھر اسے تحائف دیے جائیں اور وہ انہیں قبول کرے تو یہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے کو آیا ہے۔'' ❶

لٰہذا ایسے حالات میں تحائف دینے اور لینے سے اجتناب برتنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

اسقاط حمل کب جائز ہے؟

سوال میری بیوی پانچ ماہ کی حاملہ ہے، طبی رپورٹ سے پتہ چلا ہے کہ بچہ ناقص الخلقت ہونے کی وجہ سے معمول کی زندگی نہیں گزار سکے گا، یا وہ کسی خطرناک موروثی بیماری کا شکار ہوگا، کیا ایسی صورت میں اس کا اسقاط جائز ہے؟ کیونکہ وہ پیدا ہونے کے بعد والدین اور معاشرہ پر بوجھ ہوگا، کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں؟

جواب ماں کے پیٹ میں جو بچہ پرورش پاتا ہے، اسے جنین کہا جاتا ہے، اس کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔

❶ میاں بیوی دونوں کا مادہ منویہ مل کر نطفہ امشاج کی شکل میں رحم میں استقرار پاتا ہے پھر وہ جما ہوا خون بن جاتا ہے۔

❷ دوسرے مرحلہ میں وہ گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے اور انسانی اعضاء کی تخلیق ہوتی ہے، حتی کہ انسانی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

❸ تیسرے مرحلہ میں اس کے اندر روح پھونک دی جاتی ہے اور وہ جیتا جاگتا انسان بن جاتا ہے، ان تینوں مراحل کی ایک حدیث میں نشاندہی کی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق اس کی ماں کے پیٹ میں اس طرح مکمل کی جاتی ہے کہ وہ چالیس روز تک نطفہ رہتا ہے پھر اتنی ہی مدت جما ہوا خون رہتا ہے پھر اتنی ہی مدت گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے پھر اللہ تعالیٰ چار باتیں لکھنے کے لیے اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے وہ اس کا کردار، اس کی عمر، اس کا رزق اور اس کا بدنصیب یا سعادت مند ہونا لکھتا ہے، پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔'' ❷

ان تینوں مراحل میں اسقاط جائز نہیں ہے کیونکہ شریعت نے نکاح کو اس لیے مشروع قرار دیا ہے کہ اس کے ذریعے توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''تم محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جنم دینے والی عورت سے نکاح کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کے باعث دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔'' ❸

نکاح کے اس مقصد کے پیش نظر اسلام نے ہمیں ہر اس عمل سے منع کیا ہے جو اس مقصد کے متصادم ہو مثلاً مانع حمل ادویات، نس بندی اور اسقاط حمل وغیرہ۔

☆ حمل کے پہلے مرحلہ کا اسقاط اس لیے منع ہے کہ عورت کے رحم میں نطفہ قرار پا جانے کے بعد بالآخر وہ زندگی اختیار کر لیتا ہے، اس لیے اس نطفہ امشاج پر بھی زندگی کا حکم ہوگا حرم میں چڑیا کا انڈا توڑ دینا، زندہ چڑیا شکار کرنے کے حکم میں ہے، لٰہذا رحم مادر میں نطفہ کے جانے اور قرار پانے کے بعد اس کو برباد کرنا جائز نہیں ہے اور اعضاء کی تخلیق سے پہلے بھی ایسا عمل اختیار کرنا جس سے وہ تولید کے قابل نہ رہے اور اس کا اسقاط ہو جائے، درست نہیں ہے۔

---

❶ ابوداود، البیوع: ۳۵۴۱۔ ❷ صحیح بخاری، بدء الخلق: ۳۲۰۸۔ ❸ ابوداود، النکاح: ۲۰۵۰۔

☆ حمل کا دوسرا مرحلہ جب کہ اس کے اعضاء تخلیق ہو جائیں، اس کا اسقاط بھی حرام ہے اگر چہ اس میں جان نہ پڑھی ہو کیونکہ ایسی صورت میں وہ حمل عورت کے جسم کا ایک حصہ ہوتا ہے، جس طرح کسی کا قتل کرنا درست نہیں، اس کے جسم کے کسی حصہ کو کاٹ دینا بھی جائز نہیں ہے پھر یہ جسم اور اس کا ہر ہر حصہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہے۔ ہم اللہ کی ملک میں اللہ کی مرضی کے خلاف کوئی بھی تصرف کرنے کے مجاز نہیں ہیں، کسی انسان کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اپنے جسم کے کسی حصہ کو کاٹ ڈالے یا خودکشی کرے اگر چہ یہ اسقاط قتل نفس کے درجہ کا گناہ نہیں تاہم اس کے ناجائز ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔

☆ حمل کا تیسرا مرحلہ، جب جنین میں جان پڑ جائے اور یہ چار ماہ کے بعد ہوتا ہے، اس مرحلہ میں اس کا اسقاط حرام اور ناجائز ہے کیونکہ اس میں روح اور آثار زندگی پیدا ہو چکے ہیں، اس حالت میں اسے ضائع کرنا قتل نفس کے برابر ہے۔ اس میں اور دوسرے انسانوں کے قتل میں فرق یہ ہے کہ اسے ماں کے پیٹ میں قتل کرنا ہے اور دوسرے انسان کو دنیا میں آ جانے کے بعد مار دینا ہے، دونوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ؀﴾ [1]

''اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے مت قتل کرو، ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بلاشبہ ان کا قتل بہت بھاری گناہ ہے۔''

اس آیت کے مخاطب جہاں وہ لوگ ہیں جو اپنے بچوں کو اس دنیا میں آنے کے بعد زندہ درگور کرتے تھے وہ لوگ بھی ہیں جو شکم مادر میں پرورش پانے والے بچوں کو زندگی سے محروم کر دیتے ہیں، اگر ایسی صورت سامنے آجائے کہ ماں کی جان خطرے میں ہو اور حمل کے اسقاط کے بغیر اس کی جان بچانا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں حمل کا اسقاط کیا جا سکتا ہے خواہ وہ کسی مرحلہ میں ہو کیونکہ سنگین نقصان سے بچنے کے لیے ہلکے نقصان کو برداشت کر لینا عین انصاف اور قرین قیاس ہے۔ ماں کی موت ایک سنگین نقصان ہے اور اس کے مقابلہ میں حمل کا اسقاط اس سے کم درجہ کا نقصان ہے پھر ڈاکٹر حضرات کی تشخیص کوئی یقینی اور حتمی نہیں ہوتی کہ اسے بنیاد بنا کر ایک جان کو ضائع کر دیا جائے، ان کی تحقیق ایک ''ظن'' کے درجہ میں ہے کہ یہ بچہ آیندہ معمول کی زندگی نہیں گزار سکے گا، شریعت میں ایسے ظن کو بنیاد بنا کر اتنا بڑا نقصان کرنا جائز نہیں ہے۔ صورت مسؤلہ میں حمل کو پانچ ماہ گزر چکے ہیں اور وہ تیسرے مرحلہ میں داخل ہو چکا ہے اس لیے ڈاکٹروں کے کہنے پر اسے ضائع کرنا غیر قانونی اور غیر اسلامی بلکہ غیر انسانی حرکت ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم)

جانوروں کی پیوندکاری کرنا

سوال آج کل جانوروں کی پیوندکاری کی جاتی ہے، جس طرح گھوڑے کی ایک نسل کی دوسری نسل کے اختلاط سے خچر تخلیق کی گئی ہے، اس طرح ایک بھیانک اور ناپاک درندے خنزیر کے اختلاط سے گائے کی ایک نسل پیدا کی گئی ہے، چونکہ مذکورہ

---

[1] ۱۷/بنی اسرائیل: ۳۱۔

گائے دودھ بہت دیتی ہے، اس لیے عوام الناس میں کافی مقبول ہو رہی ہے، کیا یہ حقیقت پر مبنی ہے اگر صحیح ہے تو کیا اس طرح کے جانور کا دودھ اور گوشت حلال ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اگرچہ اس سوال کا تعلق جدید سائنس سے ہے، کتاب وسنت سے نہیں، ہمارے ہاں یہ المیہ ہے کہ جو حضرات کتاب وسنت کے حاملین ہیں وہ جدید سائنس سے بے بہرہ اور ماہرین سائنس کتاب وسنت سے عاری ہوتے ہیں، راقم الحروف بھی قرآن وحدیث کا طالب علم ہے۔ جدید سائنس کے متعلق معمولی سی معلومات رکھتا ہے تاہم اس سوال کے حوالہ سے میں نے محکمہ لائیوسٹاک کے عملہ سے رابطہ کیا۔ ماہرین سائنس سے بھی معلومات حاصل کی ہیں، ان معلومات کو قرآن وحدیث کی روشنی میں قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴾ [1]

''اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کر دیئے ہیں شاید تم سبق حاصل کرو۔''

اس آیت کے کئی ایک مفہوم بیان کیے جاتے ہیں، ہمارے رجحان کے مطابق درج ذیل مفہوم قرین قیاس ہے۔ زوجین سے مراد نر اور مادہ ہے، ہر نر مادہ کا زوج ہے اور ہر مادہ نر کا زوج ہے، جانداروں میں ایک دوسرے کا زوج تو سب کے مشاہدہ میں آچکا ہے، نباتات میں بھی یہ سلسلہ قائم ہے، بار برداری ہوائیں نر درختوں کا تخم مادہ درختوں پر ڈال دیتی ہیں تو انہیں پھل لگتا ہے، جس علاقے میں کھجوریں زیادہ ہوتی ہیں وہاں کے باشندے خود نر کھجوروں کا تخم مادہ کھجوروں پر ڈال دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی مدینہ طیبہ تشریف آوری کے موقع پر اہل مدینہ کھجوروں پر یہی عمل کرتے تھے، جس سے آپ نے منع فرمایا تو اگلے سال پھل بہت کم ہوا۔ اس کے بعد آپ نے اس کی اجازت دے دی، شرعی اصطلاح میں اس عمل کو ''تابیر نخل'' کہا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی مقام پر تن تنہا درخت پھل نہیں لاتا۔ جدید تحقیق کے مطابق یہ سلسلہ جمادات میں بھی پایا جاتا ہے۔ بجلی کا نیوٹل اور فیس ہونا، ایک حقیر ذرہ میں الیکٹرون اور پروٹون کا مثبت اور منفی ہونا انسان کے علم میں آچکا ہے۔ جمادات تو کیا کائنات کی ہر چیز ذرات ہی کا مجموعہ ہوتی ہے، اس نر و مادہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ چلایا کہ ان دونوں نر و مادہ کے ملاپ سے ایک تیسری چیز وجود میں آتی ہے، جس میں اصل نر و مادہ کے خواص موجود ہوتے ہیں۔ اسے سائنسی اصطلاح میں اس طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر جاندار کی نسل باقی رکھنے اور اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کا ایک نظام بنا رکھا ہے، اس نے ہر جاندار میں جرثومے پیدا کیے ہیں جنہیں کروموسوم کہا جاتا ہے پھر ہر جنس میں کروموسوم کی تعداد، شکل وصورت اور ان کی ترتیب مختلف ہے مثلاً انسان کے اندر چھیالیس کروموسوم ہیں جن کے تئیس (۲۳) جوڑے بنتے ہیں، جنسی ملاپ کی صورت میں بائیس جوڑے جسم کی نشوونما کے لیے اور تیئسواں جوڑا افزائش نسل کے لیے ہوتا ہے، قرآن کریم نے نطفہ امشاج سے انسان کو آگے چلایا ہے، اگر ان کی تعداد، شکل وصورت اور ترتیب میں فرق ہو جائے تو کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، اگر پیدا ہو جائے تو وہ افزائش نسل کے قابل نہیں ہوتی ہمارے ہاں اس کی مثال گدھے اور

---

[1] ۵۱/الذریات: ۴۹۔

گھوڑے کے ملاپ سے خچر پیدا کرنا ہے، اگر چہ شریعت نے اس سے منع کیا ہے تاہم فوجی حضرات اپنی ضرورت کے لیے مصنوعی بار آوری کے ذریعے خچر کو پیدا کرتے ہیں یہ خچر خود آگے افزائش نسل کے قابل نہیں ہوتا خواہ نر ہو یا مادہ، اس کی پیدائش صرف اس کی ذات تک محدود رہتی ہے۔ اس کے آگے نسل نہیں چلتی ہے، اس وضاحت کے بعد ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ سائنسی اعتبار سے یہ ناممکن ہے کہ خنزیر اور گائے کے ملاپ سے کوئی نسل پیدا کی جائے جس میں گائے کی خصوصیات ہوں اور دودھ دینے کے اعتبار سے وہ خنزیر کی خصوصیات کی حامل ہو۔ موجودہ اسٹریلین گائے مستقل ایک جنس ہے جس کی آگے نسل چلتی ہے، ان میں نر و مادہ دونوں جوڑے رہتے ہیں، جب پاکستان میں اس نسل کی پہلی کھیپ آئی تو بلوچستان کے ٹھنڈے علاقہ میں رکھا گیا۔ اس کھیپ میں نر اور مادہ دونوں قسم کے جانور تھے، ان کے ملاپ سے آگے نسل بھی چلائی گئی، میں نے اس سلسلہ میں اس وقت کے محکمہ لائیوسٹاک کے ڈائریکٹر سے ملاقات کی، اگر یہ گائے خنزیر کے ملاپ سے پیدا ہوئی تو اس کی نسل آگے نہ چلتی جیسے خچر کی نسل آگے نہیں چلتی ہے، دودھ زیادہ دینے کی اور کئی وجوہات ہوسکتی ہیں، اس سلسلہ میں غذائیں اور چارہ بھی کافی معاون ہوتا ہے میں نے رینالہ فارم میں ایسی گائیں خود دیکھیں ہیں جن کے پیٹ پر ایک پیچدار پائپ لگا ہے ان کے معدے تک پہنچتا ہے۔ انہیں چارہ کھلانے کے بعد پائپ کھول کر پتہ کیا جاتا کہ یہ چارہ کتنی مدت میں ہضم ہوتا ہے پھر زود ہضم چارے کا انتخاب کر کے دودھ زیادہ حاصل کیا جاتا ہے، چارے کے علاوہ دیگر غذائی مواد بھی کھلایا جاتا ہے تاکہ وہ زیادہ دودھ دیں، بہر حال اس مفروضے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ یہ نسل گائے اور خنزیر کے ملاپ سے پیدا کی گئی ہے واقعاتی اعتبار سے ایسا ہونا اس لیے بھی ناممکن ہے کہ گائے کے کروموسوم ساٹھ اور خنزیر کے صرف اڑتیس ہوتے ہیں، ان دونوں کی تعداد میں بائیس کروموسوم کا فرق ہے پھر ان کی شکل و صورت میں واضح فرق ہے کہ مادہ خنزیر کے سولہ تھن ہوتے ہیں جبکہ گائے کے صرف چار تھن ہیں۔ خصوصیات کے اعتبار سے بھی فرق ہے کہ خنزیر انتہائی بے حیا جانور ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا ہے پھر جن ممالک میں اس کا گوشت کھایا جاتا ہے وہ انتہائی بے حیا اور بے شرم ہیں، اگر ایسا ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کو یہ حکم نہ دیتا کہ ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلو، صرف ایک ایک جوڑا ہی کافی تھا پھر ان کے باہمی ملاپ سے آگے نسل چلائی جاسکتی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا:

﴿ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ﴾ [1]

''ہم نے نوح سے کہا کہ اس کشتی میں ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا نر مادہ رکھ لو۔''

بہر حال خنزیر ایک الگ جنس ہے اور گائے ایک دوسری جنس ہے، ان کا باہمی ملاپ ناممکن تو نہیں البتہ اس سے کسی جنس کا پیدا ہونا ناممکن ہے، یورپ میں فرنگی تہذیب سے وابستہ خواتین کتوں سے بدکاری کراتی ہیں لیکن کبھی اس کے نتیجہ میں کوئی نسل پیدا ہوئی ہے؟ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، مجھے اس حوالہ سے اپنے فقہاء کرام سے شکوہ ہے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں فرضی صورتیں بیان کر کے دوسروں کو پریشان کیا ہے، صرف ایک مفروضہ ملاحظہ فرمائیں۔

اگر بکری اور کتے کے ملاپ سے ایسا بچہ پیدا ہو جس کا سر کتے جیسا اور باقی دھڑ بکرے کا ہو تو اس کے حلال وحرام ہونے

---

[1] ١١/هود: ٤٠۔

کے متعلق فقہاء احناف نے حسب ذیل وضاحت کی ہے۔ اس کے سامنے گوشت اور چارہ ڈالا جائے، اگر وہ گوشت کھائے تو اس کا گوشت حرام ہے کیونکہ بنیادی طور پر وہ کتا ہے اگر وہ چارہ کھائے تو ذبح کرنے کے بعد اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا جائے اور باقی گوشت استعمال کرلیا جائے کیونکہ وہ بنیادی طور پر بکرا ہے اور اگر وہ چارہ اور گوشت دونوں کھائے تو پھر اسے مارا جائے، اگر بھونکتا ہے تو اس کا گوشت استعمال کے قابل نہیں کیونکہ وہ کتا ہے اور اگر وہ بکری کی طرح ممیاتا ہے تو ذبح کر کے اس کا سر پھینک دیا جائے اور باقی حصہ کھالیا جائے کیونکہ وہ بنیادی طور پر بکرا ہے۔ اگر مارنے سے دونوں قسم کی آوازیں برآمد ہوں تو اس کا پیٹ چاک کیا جائے اگر اس سے اوجھڑی نکلے تو اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا جائے اور باقی حصہ قابل استعمال ہے اور اوجھڑی کی بجائے صرف انتڑیاں ہی برآمد ہوں تو وہ کتا ہے اور اسے استعمال نہ کیا جائے۔ [1]

ہم اس فتویٰ پر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے، صرف اتنا کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ دنیا میں کبھی ایسا ہوا ہے؟ کیا ایسا ہونا عادتاً ممکن ہے؟ کیا اس سائنسی دور میں اس قسم کے مفروضوں سے اسلام اور اہل اسلام کے متعلق لوگ کیا کہیں گے؟ دراصل اس قسم کے بیسوں مسائل ایسے ہیں جنہوں نے اسلامی شریعت کو اغیار کی نظر میں بدنام کر ڈالا ہے۔ سوال میں ذکر کردہ صورت بھی اس قسم کی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی نے مذکورہ فتویٰ پڑھ کر گائے اور خنزیر کے ملاپ کا افسانہ تراش لیا ہو۔ ہمارے ہاں بکریوں کی ایک قسم ہرن سے ملتی جلتی ہے، اس کے سینگ، سر، منہ اور آنکھیں بالکل ہرن جیسی ہوتی ہیں، اس کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جنس بکری ہرن کے ملاپ کا نتیجہ ہے، اس طرح برائلر مرغی کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی پیدائش باپ کے بغیر ہوتی ہے لہٰذا اس کا گوشت جائز نہیں ہے، یہ بھی محض ایک مفروضہ ہے، جہاں مرغی فارم ہیں وہاں مرغ بھی رکھے ہوتے ہیں، وہ مرغیاں جو انڈے دیتی ہیں ان کے بچے نکالے جاتے ہیں لیکن وہ بچے مشینی ہوتے ہیں اگرچہ وہ اکیس دن کے بعد ہی نکلتے ہیں تاہم وہ مرغیوں کے محتاج نہیں ہوتے، ان بچوں کو ایک خاص طریقہ سے نر اور مادہ کی چھانٹی کی جاتی ہے جو مرغ ہوتے ہیں انہیں برائلر کے طور پر مارکیٹ میں لایا جاتا ہے اور مرغیوں کو انڈوں کے لیے رکھا جاتا ہے، ان کو کیمیاوی غذا کھلا کر انڈے حاصل کیے جاتے ہیں، ان انڈوں سے بچے نہیں نکلتے کیونکہ یہ انڈے صرف غذا سے حاصل کیے جاتے ہیں، ان میں مرغ کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جو مرغی انڈے دے دے کر تھک جائے پھر انڈے نہ دے اور غذا زیادہ کھائے اسے لیر کے نام سے مارکیٹ میں لایا جاتا ہے، اس کا گوشت برائلر کے مقابلہ میں سستا ہے، بہرحال برائلر گوشت کے استعمال میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، اگر کسی کا دل نہ کرے تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ بہرحال صورت مسئولہ کے متعلق ہمارا مؤقف یہ ہے کہ آسٹریلین گائے جو دودھ بہت دیتی ہے، اس میں خنزیر کا کوئی حصہ نہیں ہے، اور نہ ہی خنزیر کے ملاپ سے یہ پیدا ہوئی ہے اور ایسا ہونا ممکن نہیں ہے جب کہ ہم نے واضح کہا ہے، جنس کو آگے چلانے کے لیے کروموسوم کی تعداد، شکل وصورت اور ان کی ترتیب میں یکسانیت ہونا ضروری ہے، گائے اور خنزیر میں ایسا ہونا ناممکن ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی کچھ روایات بھی ہیں جو آپ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمائیں تھی، جنہیں ہم نے شرح بخاری میں تفصیل سے بیان کیا ہے جو آج کل آخری مراحل میں ہے قارئین کرام سے اپیل ہے کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے ضرور دعا کریں اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

---

[1] فتاویٰ قاضی خان برحاشیہ عالمگیری، ص: ۵۳۷، ج ۳۔